کُلیّات چودھری محمد علی رُدولوی

(15 مئی 1882 - 10 ستمبر 1959)

(جلد دوم)

ترتیب وتدوین

مسعود الحق

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک۔ 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 066 110

کُلیّات چودھری محمد علی رُدولوی

(15 مئی 1882-10 ستمبر 1959)

(جلد دوم)

ترتیب وتدوین

مسعود الحق

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک۔1، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔110 066

Kulliyat-e-Chaudhry Mohammad Ali Rudaulvi Vol. II

Edited by

Masood ul Haque

پہلا ایڈیشن : 1100

سنہ اشاعت : ستمبر 2005 شک 1927

قیمت : -/172 روپے

شمار سلسلۂ مطبوعات : 1241

کمپوزنگ : پرنس گرافکس، نئی دہلی

ISBN : 81-7587-108-3 (Set)

ISBN : 81-7587-110-5 (Vol. II)

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: فہمی کمپیوٹرس، جامع مسجد دہلی- 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی وادبی کتابوں کی مکرر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان وادب کے ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب دھیرے دھیرے نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کماحقہ، واقفیت بھی نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت عہدِ قدیم کے شاعروں اور نثر نگاروں سے لے کر عہد جدید کے شاعروں اور نثر نگاروں تک تمام اہم اہلِ فکروفن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے بلکہ زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الواسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیاتِ چودھری محمد علی ردولوی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کررہی ہے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ایس۔ موہن
ڈائرکٹر انچارج

چودھری محمد علی رُدولوی

(15 مئی 1882 — 10 ستمبر 1959)

ترتیب

انتساب

ہما خالہ مرحومہ (بیگم سید اخلاق حسین مرحوم)

اور

چودھری صاحب کے قدر شناس محمود ایاز صاحب مرحوم

(ایڈیٹر 'سوغات' بنگلور)

کے نام

مسعودالحق

مذہب

عرضِ مرتّب

یونائیٹڈ انڈیا پریس، لکھنؤ میں چھپی ہوئی اس کتاب پر کوئی تاریخ نہیں ہے۔ چودھری صاحب کی یہ کتاب پہلی بار غالباً 1951 میں چھپی۔ 12 فروری 1952 کے اپنے خط میں اپنی بیٹی ہما بیگم کو لکھتے ہیں ''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ دونوں (دوسری کتاب 'کشکول' ہے) کتابیں میری زندگی میں چھپ تو گئیں۔'' (بیٹی کے نام ایک دوسرے خط سے پتہ چلتا ہے کہ 'کشکول' اگست 1951 میں پریس میں تھی۔)

نیاز فتح پوری نے 'نگار' میں 'میرا مذہب' کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

''اس کتاب میں چودھری محمد علی صاحب رئیس ردولی نے اپنا مذہب نہیں اپنے مشرب کو پیش کیا ہے اور یہ مشرب وہی ہے جس کو بیدلؔ نے اس طرح ذکر کیا ہے:

مشربِ پروانہ از آتش نداند طور را

چودھری صاحب مذہباً اثناءعشری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن چونکہ وہ دنیا کے ہر تعلق کو انسانی و اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا مذہب بھی دراصل انسانیت پر مبنی ہے جس کا دوسرا نام میری اصطلاح میں لامذہبیت ہے..... چودھری صاحب نے اس کتاب میں تبرّا، تاسی، عزاداری، متعہ سب ہی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور اتنے حقیقت افروز انداز میں کہ سنّی اسے پڑھ کر شیعہ ہوسکتا ہے اور شیعہ سنّی۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد میں دیر تک سوچا کیا کہ اگر ہر شیعہ محمد علی ہوجائے اور ہر سنّی نیاز فتح پوری تو کیا ہو؟ شاید دنیا بے دین اور رہنے کے قابل۔''

(ہما بیگم کے نام خط 'گویا دبستان کھل گیا')

(ولا تکونوا من المشرکین) من الذین فرقوا دینهم وکانوا شیعًا

کل حزب بما لدیهم فرحون ۝ (الروم)

محمد علی ردولوی عفی عنہ

فہرست

انتساب

''ہر مسلمان کے نام، سواء اُن کے
جنھوں نے مذہب کو روزی کا ٹھیکرا بنایا۔''

محمد علی عفی عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے غریب دیباچے تجھ کو کون پڑھے گا

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

جو شخص کسی موضوع پر حاوی نہ ہو، اس کا کتاب لکھنا ظلم ہے۔ زبان سے غلط بات نکالنا بھی ظلم ہے۔ مگر لکھنے میں تو یہ غضب ہے کہ ''نوشتہ بماند سیہ بر سپید''

گر کور کمر بہ باغبانی بندد   او را چہ زیاں بر گل و ریحاں ستم است

خالی ڈھارس اسی خیال سے ہوتی ہے کہ اس بیہڑ میدان میں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے ایسے نہ معلوم کتنے ہوں گے۔ یہ تو میں اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ جو واقعی عذرات اس رسالہ کے لکھنے کے میرے پاس ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔ یہ کسی کو تعلیم دینے کے لیے نہیں لکھا گیا ہے۔ یہ تو ایک اعتراف ہے جو ایک گنہگار اپنے پروردگار اور اس کے بندگانِ نیکوکار کے آگے کر رہا ہے اپنے خالق سے دعا ہے کہ مجھے معاف کرے اور ہدایت فرمائے اور مخلوق سے استدعا ہے کہ پڑھ کر عبرت کرے اور میرے لیے دعاء استغفار فرمائے۔

دل میں ایک چھپی ہوئی خواہش یہ بھی تھی کہ کاش اس رسالہ سے "واعتصموا بحبل الله جمیعاً و لاتفرقو" کی بھی صورت بندھ جاتی۔ مگر افسوس یہ سعادت میری تقدیر میں نہ تھی۔ اس چیز کا خواب میں ہمیشہ دیکھا کیا تھا اور اصل غرض اس رسالہ کی بھی یہی تھی۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ بغیر کھرونچے لگائے اپنی بات دوسروں کے سامنے رکھ دوں مگر افسوس صد افسوس یہ کمال مجھے ودیعت ہی نہیں ہوا تھا۔

جی میں جو آئے کیجیو پیارے   ایک ہونا نہ در پئے آزار

یہ شرف خدا کے نیک بندوں کو عطا ہوتا ہے۔ ہم ایسے گئے گذرے بندوں کے لیے نہیں۔ پھر بھی اگر پڑھنے والے میرے انداز بیان پر غور کم کریں اور میرے منشاء کو ڈھونڈھنے پر زیادہ زور دیں تو شاید کچھ یگانوں کی بیگانگی کم ہوجائے۔ گو اسلام کا تفرقہ رونے کا مقام ہے۔ مگر ان گئے حالوں پر بھی کچھ باتیں ہیں جو جگر جگر دگر دگر کی خوش آئند جھلک دکھا دیتی ہیں۔ بشرطیکہ آدمی خود اختلاف کے مزے نہ لینا شروع کردے۔ مغرب کی نماز اور افطار میں جو فرق یار لوگوں نے کر رکھا ہے ہر شخص کو معلوم ہے۔ شیعہ دیر ہی کرتا چلا جاتا ہے۔ سنّی جلدی ہی مچائے ہے۔ حالانکہ دونوں "ثم اتموالصیام الی اللیل" پر مضبوط ہیں۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو شاید صدوق علیہ الرحمہ کا جن سے بڑا آدمی معصومین کو چھوڑ کر شیعوں کے یہاں نہیں گذرا ہے۔ حکم ہے کہ قرصِ آفتاب غائب ہونے کے بعد مغرب کی نماز میں انتظار کی ضرورت نہیں۔ غروب آفتاب بدیہات میں سے ہے جس میں مجتہد یا مولوی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ سنّی حضرات بھی افطار اور مغرب میں وہ عجلت کرتے ہیں کہ دیکھ کر صاف سمجھ میں آتا ہے کہ فرق کرنا اصل مقصد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دیر نہ ہونے پائے ورنہ روزہ مکروہ ہوجائے گا۔ لیکن اگر روزہ جلدی کھل گیا تو کیا ہوگا۔ ان کانوں نے اذان سنی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان آنکھوں نے دھنک دیکھا ہے۔ اونچی اونچی دیواروں پر دھوپ کی زردی بھی دیکھی ہے۔ یہ اسی جلد بازی کا نتیجہ ہے جو حضرات علماء نے اپنے مریدین اور مقلدین پر قبضہ رکھنے کے لیے کیا ہے۔ ایک چھوٹی سی مسجد کے زیر سایہ خرابات یعنی غریب خانہ ہے خدا کا ایک بندہ اس میں اذان دیتا ہے اور چاہے کوئی آئے نہ آئے وہ مسجد میں وقت سے حاضر ہوجاتا ہے۔ ان مولوی صاحب کے پیچھے میں نے اکثر نماز پڑھی ہے۔ رمضان شریف گذر چکے تھے شوال کا مہینہ تھا۔ مولوی صاحب نے اذان دی اس کے بعد آسمان پر دھنک دکھائی دیا۔ میں نے بعد کو مولوی صاحب سے ازراہ بے تکلفی کہا ''مولوی صاحب میں تو آپ کو مسلمان سمجھتا تھا، مگر آپ تو بڑے سنّی ہی نکلے۔'' اس دن سے مولوی صاحب کی اذان سب اذانوں کی بعد ہی ہوتی ہے اور کسی پڑھے لکھے سنّی نے اعتراض بھی نہیں کیا کہ تم نے اذان دیر کو دی۔ اکثر حضرات فرنگی محل نے بھی مغرب کی نماز ان کے پیچھے پڑھی ہے مگر کسی نے اشارتاً کنایتہً

بھی ان پر دیر کو اذان دینے کا الزام نہیں لگایا۔

نکاح ایک دوسرا مسئلہ اسی طرح کا ہے۔ حضرات علمائے فریقین نے اپنے مقلدین اور مریدین کے جہل پر بھروسا فرما کر ایک صاحب نے اس کا نام "نکاح" رکھا ہے، اور دوسرے نے صیغہ۔ لغت میں نکاح کے معنی شاید صیغے سے وسیع تر ہیں۔ لیکن معاہدۂ نکاح دونوں میں عام ہے۔ شرائط میں اہلِ سنت کے یہاں ایجاب و قبول مہر و اعلان ضروری ہے۔ شیعوں کے یہاں بھی یہی سب کچھ ہے صرف اعلان کی شرط نہیں ہے۔ میں عرض کرتا ہوں جن معاہدوں میں اعلان ہو جاتا ہے ہزار میں نو سو ننانوے ہوتے ہیں۔ پھر ان میں تو فرق نہ کریں۔ عموماً دو حضرات صیغہ جاری کرتے ہیں اور ایک صاحب نکاح پڑھتے ہیں۔ حالانکہ ایک آدمی بھی صیغہ جاری کرسکتا ہے اور دو آدمی بھی نکاح پڑھ سکتے ہیں۔

مجھ کو صرف یہ عرض کرنا ہے۔

تو برائے وصل کردن آمدی　　نے برائے فصل کردن آمدی

جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کو لوگ معمولی بات سمجھتے ہیں۔ جس کے اوپر گذر چکی ہو وہی جانے۔ میری پہلی شادی کے وقت نکاح کا تجربہ مجھ کو کم تھا جو جو آفتیں سنی شیعہ اعزا کے ہاتھوں میری مرحومہ بی بی اور مجھ کو جھیلنی پڑی ہیں وہ ہم ہی جانتے ہیں یا ہمارے اعزا بروز قیامت انشاء اللہ جانیں گے۔

میری پہلی بی بی مرحومہ پر زور ڈالا جاتا تھا کہ وہ شیعہ ہو جائے مگر میں نے اس مرحومہ کو صلاح دی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ہرگز اپنا مذہب نہ بدلے چنانچہ مرحومہ کا اپنے قدیم طریقے پر انتقال ہوا اور اسی طریقہ پر سپرد خاک ہوئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

میں خود وصیت کر چکا ہوں اور کہتا ہوں کہ خدا ایسا کرے کہ ہر "لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہنے والا مجھ کو سپرد خاک کرے۔ اور میرے لیے نماز مغفرت پڑھے۔ نہ یہ کہ میرے جنازے پر لاٹھیاں اٹھ جائیں اور میرا مردہ اس آخری حق سے محروم رہے جو کلمات شہادتین پر یقین رکھنے والے کا حق ہے۔

سنّی شیعہ کی شادی آپس میں نہ ہونا عجیب تازہ مصیبت ہے۔ اس خیال سے ضرور رکاوٹ ہوتی ہے کہ ممکن ہے شوہر بی بی پر ظلم کرے لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ رشتہ محبت قائم ہوجانے سے دلوں کی سختیاں کم ہوجائیں۔ کچھ دن ہوئے ایک شیعہ لڑکی کا عقد ایک سنی لڑکے کے ساتھ طے ہورہا تھا۔ فریقین کے اکثر اعزا مخالفت پر تُل گئے۔ عین وقت پر ایک شیعہ مولوی صاحب نے صیغہ جاری کرنے سے انکار کردیا۔ ناچار دوسرے مولوی صاحب جو میرے بھتیجے ہیں اور جن کی شاگردی اور استادی پر مجھ کو فخر ہے، انھیں مجتہد سلمہ الرحمٰن نے دونوں طرف سے عقد پڑھا۔ یہ مجتہد صاحب علی گڑھ کالج میں ابھی تک شیعہ ڈین تھے۔ ان کے پیچھے اکثر سنّی لڑکے نماز پڑھا کرتے تھے اور اکثر شیعہ لڑکے سنّیوں کی جماعت میں نماز پڑھ کر شیعہ رجسٹر میں آکر حاضری لکھا دیتے تھے۔ موصوف نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ شیعہ سنی طلبہ کو تاریخِ اسلام ساتھ پڑھائی جائے مگر مولویت نے درمیان میں تلوار رکھ دی۔ عمرانیات کی رو سے بھی شیعہ سنّی میں قرابت بند ہوجانا بڑی نکبت ہے۔ نوجوان حضرات اس پر غور فرمائیں میرے پڑھنے والے! اختلاف پیدا کرنے والوں کی حد اس درجہ تک پہنچ چکی ہے کہ ایک صاحب السلام علیکم فرماتے ہیں اور دوسرے صاحب سلامٌ علیکم کہتے ہیں۔ حالانکہ زیارات میں شیعہ ہر جگہ السلام علیک یا اباعبداللہ وغیرہ پڑھتے ہیں اور سنّی قرآن میں سلامٌ علیٰ آل یٰسین وغیرہ پڑھتے ہیں۔ میں نے جل کر الف لام اور تنوین دونوں چھوڑ دی ہیں اور صرف جولاہوں کے سلامالیکم پر اکتفا کی ہے۔ مسلمان یہ نہ خیال فرمائیں کہ سنّی شیعہ میں ہر جگہ اختلاف ہی اختلاف ہے۔ میں نے ایک بات میں پوری طرح اتفاق بھی دیکھا ہے۔ ہر مسلمان اس پر فخر کرتا ہے اور بجا فخر کرتا ہے کہ اسلام نے صفائی کے اصول سکھائے اور ہر جگہ اس کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ مسواک کے لیے بھی سنت ہے کہ نماز کے پہلے کی جائے۔ میں نے حرم مدینہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جیسے ہی اذان شروع ہوئی اکثر شرع کے پابند حضرات نے جیب سے یا عمامے کے پیچ سے چھوٹی چھوٹی مسواکیں نکالیں اور سنت کی پیروی شروع کردی۔ چونکہ حرم میں قالین کا فرش ہے اس لیے تھوک تو سکتے نہیں لہٰذا ملغوبہ کیا ہوا؟ میں نے اپنی آنکھوں سے سنی اور شیعہ علماء کو یہ کرتے دیکھا ہے۔ یہ ہے صفائی اور یہ ہے سنت رسولؐ کی پیروی۔

آخر میں ان حضرات سے معافی کا پھر خواستگار ہوں جن کو یہ کتاب پڑھ کر تکلیف پہنچے۔ طنزیہ عبارت لکھتے لکھتے عادت خراب ہوگئی ہے جیسے کوئی شریر لڑکا ہوتا ہے کہ راستہ چلتے شرارت کیا کرتا ہے۔ (ورنہ غالب مرحوم تصرف معاف فرمائیں)

طنز و مذاق ہو پہ طبیعت بری نہیں
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

آخر میں عزیزی غلام اصغر صاحب کا شکریہ ہے جن کی امداد کے بغیر یہ کتاب تیار ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ اسناد ڈھونڈھنا، مسودہ صاف کرنا، مسکرامسکرا کر میرا دل بڑھانا، ان تمام باتوں کا بہت بہت ممنون ہوں۔

برخوردار محمد رضا شبر سلمہ کو خدا علم و عمر و دولت دے جنھوں نے آخری نقل اتاری اور جہاں میں الول جلول آدمی املا وغیرہ میں غلطی کرگیا تھا یا روا روی میں کچھ کا کچھ لکھ گیا تھا اس کو ٹھیک کیا۔

''مصنف''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا باب

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالعَاقِبَةُ لِلمتقِين وَالصَّلوٰة وَالسَّلام عَلىٰ خَاتِم النبين وَ آله الا طهار المجتنبين و اصحابه الاَخْيَار اَجْمَعِين۔

اما بعد!

راقم الحروف محمد علی ردولوی عفی عنہ انانیت کا شکار باوجود استغفار کے بھی انانیت کا شکار ہی رہتا ہے۔ ''میں'' کے استعمال سے پریشان ہے مگر ''میں'' پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ناچار آپ بھی درگذر سے کام لیجیے اور اگر کوئی اچھی بات نکل آئے تو اس کو قبول کیجیے۔ نہیں تو بہ نظر عبرت میرے لیے دعائے خیر کیجیے اور اس تحریر اور تحریر کرنے والے کو بھول جائیے۔

لارڈ مارلے کو جب وایکاؤنٹ کا خطاب بادشاہ انگلستان نے دیا تو انھوں نے لارڈ منٹو کو لکھا ''ملک اور قوم کی خدمت میں عمر کاٹ دی، اس بڑھاپے میں وہ چیز گلے پڑی جس سے عمر بھر بگاڑ رہا۔ اب آخر عمر میں خطاب کلنک کا ٹیکہ ہو کے ماتھے پر لگا۔ تو حُبِّ وطن کے لیے یہ بھی قبول ہے۔ اس بڑھاپے میں دربار عوام کی محنت نہ ہو سکے گی، لیکن اس ذریعہ سے دربار امراء ہی میں کچھ تھوڑا بہت مشغلۂ خدمت جاری رہے گا، نہ معلوم سچ یا جھوٹ اسی طرح میں بھی اپنے دل کو سمجھاتا ہوں کہ یہ حقیر ''میں'' کی بھرمار اسی وجہ سے کر رہا ہے۔ خدا جانے اصلیت کیا ہے۔

میں شیعہ گھر میں پیدا ہوا اور شیعہ تربیت پائی لیکن تبرا سے ہمیشہ نفرت رہی۔ یہ پہلی بناء مذہب سے بغاوت کی تھی جو مجھ کو یاد ہے۔ میری بڑی بہن مرحومہ کے لیے ایک مولوی نوکر تھے۔ جب میری بسم اللہ ہوئی تو میں بھی ان کے پاس بٹھا دیا گیا۔ ان مولوی صاحب کا تھوڑا سا حال بیان کردوں تو شاید میری تربیت کا پتہ چل جائے۔ ان کا نام مولوی

واجد علی تھا۔ سن تقریباً چالیس اور پچاس کے درمیان میں رہا ہوگا۔ چھوٹا سا قد، منھ پر کھچڑی داڑھی، تلاوت بڑی روانی سے کرتے تھے، دو روپیہ مہینہ اور کھانا پاتے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا علاقہ کورٹ میں تھا۔ اس لیے عسرت میں بسر ہوتی تھی۔ مگر غرور اور بڑائی کا سامان پھر بھی مہیا تھا۔ جو لڑکے میرے ساتھ کھیلتے تھے، وہ اپنے انداز سے مجھ پر ظاہر کرتے تھے کہ تم امیر آدمی کے بچے ہو، ہمارے یہاں سے مولوی صاحب کو تین جوڑے روٹی اور دال دونوں وقت ملتی تھی۔ یہ روٹیاں بہت پتلی اور چھوٹی ہوتی تھیں دو روٹیاں ان میں سے مولوی صاحب کبوتروں کے لیے توڑتے تھے۔ باقی دس روٹیوں میں جو بیٹھا ہو اس کو بہ اصرار شریک کر لیتے تھے۔ پیٹ نہ بھرنے کی شکایت جہاں تک یاد ہے کبھی نہ کی۔ نہ کوئی انداز ایسا یاد ہے جس سے یہ بات نکلتی ہو۔ تین مہینے کے روزے رکھتے تھے اور ہر وقت خوش رہتے تھے اس سن میں ہم پڑھتے کیا رہے ہوں گے مگر یہ مجھ کو یاد ہے کہ اکثر کاندھے لگا کر مجھ کو سلا دیتے تھے اور آب دست بھی دے دیتے تھے۔

میری عمر کے ساتویں سال دوسرے مولوی مقرر ہوگئے، اس لیے یہ واقعات میری عمر کے چھٹے سال تک کے ہیں۔ ہمارے دادا سنّی تھے مگر دادی شیعہ تھیں۔ میرے والد بذات خود شیعہ ہوگئے تھے اس لیے میرے گھر میں (کم سے کم مردانہ میں) تشیع کا رواج کم تھا، کیونکہ نوکر چاکر سب سنّی ہی تھے۔ البتہ اندر غوطہ طہارت غیر مسلم کے یہاں کی چیز سے احتیاط پورے طور سے تھی۔ مجالس، تعزیہ داری اور دوسرے تمام مناسک جو شیعہ گھروں میں ہوتے ہیں برابر ہوتے تھے، کیونکہ میری والدہ مرحومہ بڑے کٹر شیعہ گھر کی تھیں۔ آٹھویں محرم کو حاضری بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ مجھ سے بھی تبّرا کہنے کو کہا جاتا تھا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ میں نے ایک بار انکار کیا۔ میرے یہاں عورتوں نے کہا کہ یہ اثر سنّی مولوی کا ہے۔ وہ نکال دیے جائیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے اس میں میری سزا کی بھی غرض تھی، کیونکہ میں مولوی صاحب سے زیادہ مانوس تھا۔ اور لوگ جانتے تھے کہ اس طرح لڑکا دب جائے گا۔ میری سرتابی کی خبر مولوی صاحب تک بھی پہنچی تھی۔ مولوی صاحب کا روّیہ میرے دل پر نقش کا الحجر ہے۔ مولوی صاحب مجھے گود میں لے لیتے تھے اور پیار کرتے تھے اور کہتے تھے جاؤ بیٹا جو کچھ تمھاری ماں کہتی ہیں کہہ دو۔ پیار کرنے میں ان کی بیچ سے منڈی ہوئی

مونچھیں میرے گال پر گڑ جاتی تھیں۔ یہ مجھ کو آج تک خوب یاد ہے اور جو کچھ سمجھاتے رہے ہوں مجھ کو یاد نہیں۔ لیکن اس امر کا پورا یقین ہے کہ انھوں نے تشیّع کے خلاف کسی موقع پر کچھ نہیں کہا۔ گو اور لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے باپ بے تعصب تھے۔ گویا اسی طرح سے شیعیت کے خلاف رجحان دلایا جاتا تھا۔ اس زمانہ کے بعد جہاں تک خیال جاتا ہے میں پوری طرح سے شیعہ رہا اور مجلسوں میں کمسنی ہی میں بڑا باکی مشہور تھا۔ یہ حالت اس وقت تک ہے۔ خیر اب تو بڑھاپے کی وجہ سے رقت بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ اکثر باتیں کرنے میں رسول اللہؐ اور امام حسینؑ کا نام بغیر متاثر ہوئے نہیں لے سکتا۔ مگر اس میں بڑا حصہ اعصاب کی کمزوری بھی معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال میرے دل میں اہلِ بیت کی محبت ہمیشہ جاگزیں رہی اور آج بھی عقل کی بنا پر بہت ہے۔ گو عقیدت کی بنا پر اس درجہ کی نہ ہو تب بھی میں ان حضرات کی دماغی، دلی، وجدانی، نسلی اور روحانی فضیلتوں کا خیال کر کے خوش ہوتا ہوں اور دل کے اندر بحمد للہ ایک کشادگی پاتا ہوں۔

میرے یہاں علاوہ اور مناسک عزاء کے مہندی بھی اٹھتی تھی۔ جوانی پر پہنچ کر سب سے پہلے اس معاملہ میں دلی پریشانی شروع ہوئی، مجالس میں اور یوں بھی شیعہ علماء اور پڑھے لکھے حضرات سے سنتا آتا تھا کہ حضرت قاسم کی شادی کی روایت کربلا میں ضعیف ہے۔ ضعیف کے لفظ کے معنی تو جانتا تھا مگر علم حدیث میں اس کے اصطلاحی معنوں سے ناواقف تھا جب معلوم ہوا کہ یہ وہ روایتیں ہیں جن میں اُس وقت سے لے کر اِس وقت تک تمام راویوں کا سلسلہ ایک طرح کا نہیں تو سمجھ میں آیا کہ یہ ان الفاظ میں سے ہے جن کے لیے بجائے ایک بدنما لفظ کے ایک خوبصورت لفظ استعمال کیا جاتا ہے جیسے آٹھ برس کے گھوڑے کو "ملے پنچ" کہتے ہیں۔ کسی بحث میں ضعیف روایت قابل قبول نہیں سمجھی جاتی، مگر ہم مقلدین کو دھوکے میں رکھنے کے لیے کافی ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس آفت میں جو کربلا میں تھی شادی کیا ہوئی ہوگی۔ مگر اس خیال کو ظاہر کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ساتویں محرم کو ہمارے یہاں دس بجے رات کو مہندی اٹھتی تھی اور تقریباً دو بجے حضرت عباسؑ کی درگاہ پہنچ جاتی تھی۔ پھر ردولی کے محرم میں ترقی ہوجانے کی وجہ سے

ہماری مہندی اکثر صبح ہوتے ہوتے درگاہ پہنچنے لگی۔ لوگوں کی تکلیف، ماتم کی محنت اور اس کے ساتھ یہ بھی ڈر کہ کہیں روشنی کا سامان نہ کم پڑ جائے۔ میں ہمیشہ سے چاہتا تھا کہ لوگ جلدی کریں مگر جوشِ عقیدت میں میری بات کم مانی جاتی تھی۔ ایک بار ہم گھر اس وقت پہنچے جب صبح کی نماز کا وقت قریب تھا۔ لوگوں نے ہاتھ پانوں دھوئے، چائے پی، اتنے میں صبح کی اذان ہوئی۔ گو اس وقت میں نماز کا پابند نہ تھا مگر اہلِ بیت کے کارنامے دل میں حاضر تھے۔ میں نے لوٹے اور تسلے رکھوا دیے کہ مومنین نماز بھی ادا کرلیں۔ مگر ایک صاحب نے بھی یہ نہ کیا۔ ممکن ہے کہ بعض نے گھر پر جاکر پڑھی ہو لیکن میرے یہاں سے مسکرا مسکرا کر سب چلے گئے۔ میری آنکھیں کھل گئیں کہ نماز قائم کرنے کی بہترین مثال کربلا میں ہوئی اور ہم نے گریہ و بکاء و ماتم اور عقیدت کے باوجود نماز نہیں پڑھی۔

اب ہمارے وطن کا محرم اور ترقی پکڑ گیا۔ بڑی لمبی مجلسیں، بڑے علمی مذاکرے، منطق کی الٹ پھیر بڑھ گئی۔ مومنین مختلف وجوہ سے مجلسوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ مگر رقت کم ہوگئی، لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ جب تک گریۂ و زاری کا خوب شور نہ ہو عموماً ذاکرین پنڈ نہیں چھوڑتے۔ اگر ایک بینیہ ٹکڑے پر رقت خوب نہ ہوئی تو ذاکر صاحب نے پھر سے تمہید شروع کی اور پھر کوئی بینیہ گوشہ نکالا۔ اس ڈر سے کہ کہیں صاحب پھر سے تمہید نہ شروع کردیں۔ لوگ ہو ہو کرکے رو پڑتے ہیں، بڑی مجلسوں میں کچھ رونے والوں کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ اکثر تو یہی ہوتا ہے کبھی کبھی کسی ذاکر کی پرجوش تقریر اور واقعی دل سے پڑھنے پر بے اختیار گریہ ہوتا بھی ہے۔ چاہے مجلس تھک گئی ہو اور پریشان ہوکر رودے یا واقعی دل سے رونا آئے۔ ہر شخص ختمِ مجلس پر خوشنودی ہی ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے ''تمام مجلس'' خوب ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال گذرنے لگا کہ تمام مجلس رونا کیسے ہوسکتا ہے۔

ایک حدیث بھی بیان کی جاتی۔ "من بکی علی الحسین اوبکی و تباکی اوجت له الجنة" اول تو اس کے ترجمہ میں منطق کا کمال دکھایا جاتا ہے۔ یعنی ''تباکی'' کے معنی بجائے بہ تکلف رونے کے۔ ''رونے والوں کا سا منہ بنانا'' بیان کیے جاتے ہیں۔ گو دونوں میں فرق ظاہر ہے، لیکن اگر کوئی جرأت کرکے اعتراض کرے تو جواب موجود ہے کہ ''منہ بنانے میں بہ تکلف رونا تو ہوتا ہی ہے۔'' (قربان جایئے اس منطق کے)

علاوہ اس کے پڑھے لکھے لوگوں نے مجھ کو بصیغۂ راز بتایا بھی ہے کہ یہ حدیث کسی معصوم تک پہنچتی بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی شیعہ صاحب اس معاملہ میں میری تسکین کر دیں تو انشاء اللہ عنداللہ ماجور ہوں گے اور یہ ناچیز بھی ہدیۂ تشکر پیش کرے گا۔

مآلِ مجلس اہل بیت کی پیروی اگر کہی جائے تو ایک بات بھی ہے۔ خود رونا مآلِ مجلس کیسے ہوا؟

جس وقت مصائب اہلِ بیت سن کر گریہ گلوگیر ہوتا ہے تو پڑھے لوگ پکار اٹھتے ہیں "یَالَیْتَنِی کُنْتُ مَعَهُمْ فَافُوز فَوزًا عَظِیماً" چنانچہ میں بھی یہی کرتا تھا اور اپنے زعمِ ناقص میں دل سے کرتا تھا۔ حقائق کی ستم ظریفی دیکھیے یہ آیۂ قرآن پاک میں کسی موقع ☆ پر آئی ہے۔

جب پہلی عالمگیر لڑائی شروع ہوئی اور عراق بھی انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا تو میں نے محسوس کیا کہ بھئی "یَالَیْتَنِی" ہم کہتے تو ہیں مگر جی میں دوسری ہی بات ہے۔

کربلا، نجف، کاظمین، سامرہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور ہم چپ رہے۔ ہم سے جب چھوٹی چھوٹی قربانیاں نہیں ہو سکتیں تو کربلا کی قربانیاں کیسے ہوتیں۔ دل نے کہا ''محمد علی ہیز ہو، نامرد ہو، جب تم جانتے ہو کہ یہ قربانیاں تم سے نہیں ہو سکتیں تو فضول اپنے نفس کو دھوکا دینے کے لیے "یالیتنی" کیوں کہتے ہو۔ اگر تم امام حسینؑ کی تاسی کرو تو مواقع آج بھی موجود ہیں مگر تم سے نہیں ہوتا۔ پھر یہ جھوٹ موٹ کیا ہوا باندھتے ہو بجائے یالیتنی کہنے کے حاضر و ناظر، سمیع و بصیر خدا کے آگے شرمندہ ہو۔ اتنا بڑا جھوٹ اپنے نامۂ اعمال میں لکھوا رہے ہو خیر تم سے قربانی کہاں ہوگی۔ اور تاسی کیا ہوگی۔ یہی بے

☆ یا ایهاالذین آمنوا خذ و احذرکم فانفرو ثبات او نفرو جمیعاً. و ان منکم لیبطئن فان اصبتکم مصیبة قال قد انعم الله علیّ اذلم أکن معهم شهیدا. و لئن اصبکم فضل من الله لیقولن کان لم تکن بینکم و بینه مودة یا لیتنی کنت معهم فافوز فوزاً عظیما. ترجمہ: ایمان والو خوب اپنی خبرداری کرلو۔ پھر جدا جدا فوج کی صورت میں کوچ کر کے ایک ساتھ چلو۔ تم میں وہ لوگ بھی ہیں جو جہاد میں جانے سے پہلوتہی کرتے ہیں اور کوئی مصیبت تم پر پہنچتی ہے تو کہتے ہیں اللہ نے ہم پر فضل کیا۔ ہم مجاہدین کے ساتھ موجود نہ تھے۔ اور اگر ہم پر اللہ کا فضل ہوا تو اس طرح کہتے ہیں گویا تم میں اور ان میں کچھ دوستی ہی نہ تھی۔ کاش میں ان کے ساتھ ہوتا تو مجھے بھی بڑی کامیابی حاصل ہوتی۔ (سورۃ نساء آیۃ ۷۱-۷۲-۷۳)

ایمانی چھوڑ دو کہ "یالیتنی" کہتے ہی شرمایا کرو۔ چنانچہ برسہا برس ہو گئے یہ بڑی بات اس چھوٹے سے منہ سے نہیں نکلی۔

گو میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے دل کی صحیح کیفیات نکال کر آپ کے آگے رکھ دوں۔ مگر یہ سہل کام نہیں ہے۔ آدمی ا.پنے زعم ناقص میں واقعہ بیان کرتا ہے۔ مگر نفس نقاب کے اندر نقاب اور اس کے اندر نقاب ڈالے بہروپیا بنا بیٹھا رہتا ہے اور لکھنے والا خود دھوکا کھا جاتا ہے۔ ع

ہیں خواب ہی میں جو ابھی جاگے ہیں خواب سے

اس لیے پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ میرے اعتراف کو ایک پلّہ میں رکھیں اور اپنے نفس اور خیالات کو دوسرے پلّہ میں اور پھر اندازہ کرلیں۔ اگر میرا والا پلّہ ہلکا ٹھہرے تو بجائے مجھ سے نفرت کرنے کے ازراہ ترحم میرے لیے ہدایت اور مغفرت کی دعا مانگیں۔

بہرحال سنئے۔ میرے ایک ہم وطن کے یہاں مجلس تھی۔ میں بھی شریک مجلس تھا۔ ذاکر صاحب نے منبر پر پہنچ کر مجھے قریب منبر بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد لڑکیوں کو انگریزی اسکولوں میں پڑھانے اور بورڈنگ ہاؤس میں رکھنے پر اعتراضات جڑے۔ جہاں تک خیال پڑتا ہے اس وقت میری ہی لڑکیاں الہ آباد یا لکھنؤ کے اسکولوں میں پڑھنے گئی تھیں۔ اس بات کو حاضرین میں سے سب نے محسوس کیا کہ ذاکر کا روئے سخن میری ہی طرف تھا اور اسی دن سے ان کی مجلس اور تقریروں کے سننے کے وقت میرا نفس ہمیشہ شریک رہا۔ میرے دل نے کہا۔ ذاکر صاحب کا یہ مطلب ہوگا کہ اگر اس نے (یعنی میں نے) بانی مجلس سے لڑائی کرلی تو بھی اچھا ہے اور اگر یہ کہا بدا تو بھی ایک ملحد کو خوب ذلیل کیا۔ میں نے یہ خیال کیا کہ اگر بانی مجلس سے لڑ گیا تو جو شخص مجھ سے خار کھاتا ہے اس کو خوشی ہوگی۔ میرے وطن کے حضرات اہلِ سنت الگ خوش ہوں گے کہ شیعوں میں خوب تفرقہ پڑا۔ اس لیے میں پی گیا۔

ان ذاکر صاحب سے مجھ سے چشمک کیوں تھی؟ شروع جوانی سے میرے خیالات

صرف ملحدانہ نہیں بلکہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ بالکل دہریت کے تھے اور منھ پھٹ بھی ہمیشہ کا تھا۔ آدمی کی طبیعت عجیب گورکھ دھندا ہے۔ میرے خیالات ''مِل'' ''ہربرٹ اسپنسر'' اور اسی طرح کے دوسرے مصنفین کی کتابیں پڑھ کر دہریت کے ہوگئے تھے۔ مگر بچپن کی تربیت کی وجہ سے باوجود بہت سے شکوک کے پھر بھی شیعوں کا صرف ہمدرد ہی نہیں تھا بلکہ شیعوں کو جادۂ مذہب سے ہٹا ہوا بھی نہیں سمجھتا تھا۔ تبرّا ہمیشہ خلاف طبیعت رہا اور شروع شروع اگر کہا بھی تو جی کے اندر شرمندہ سا ہوا۔

اس کے سمجھانے کے لیے ایک دوسرا قصہ بیان کرنا پڑے گا۔ مولانا کرامت حسین صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ بیرسٹر اور سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ جنھوں نے اپنی عمر کی پوری کمائی لگا کر کرامت حسین مسلم گرلز کالج قائم کیا تھا جو آج تک لکھنؤ میں ہے۔ بڑے ذی علم تھے۔ ان کی تصانیف قانون و اخلاقیات کے اوپر ایسی تھیں کہ امریکن اخباروں نے جہاں نہ مروت کا سوال تھا نہ سفارش کا ان کی تعریف میں لکھا ہے کہ ''ان کو پڑھ کر'' جرمی بنتھم اور آسٹن'' یاد آجاتے ہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو لوگ ان کی نماز جنازہ پڑھنے سے رکتے تھے۔ ان کے چچازاد بھائی مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے پڑھائی۔ یہ بزرگ بڑے فلسفی بھی تھے اور ہربرٹ اسپنسر کے ماہر تھے۔ میں بھی ان کے قدموں سے لگا رہا اور یہ زمانہ میری عقل و دماغ کی صیقل کا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے ایک مختصر رسالہ ''یادگار کرامت حسین مرحوم'' کے نام سے لکھا۔ جس میں بعض باتیں سخت لکھ دیں اور میں بھی ''لاادریت'' کا خطاب پا گیا اور شرمندہ نہ ہوا۔ شیعہ عموماً مجھ سے خفا ہوگئے مگر میں آزاد خیالی پر فخر ومباہات ہی کیا کیا۔ اگر کھاتے پیتے گھر کا آدمی نہ ہوتا تو شاید دوسروں کے ڈر سے اپنے خیالات کا اشتہار نہ دیتا۔

میرے ایک دوست یکرنگ اور بڑے قابل آدمی شیخ ولایت علی قدوائی مرحوم تھے۔ ان کی صحبت میں یہ باتیں اور چمک اٹھیں اور دوسرے پہلو سے بھی میرے اوپر ان مرحوم کا بہت اثر ہوا۔

شیعہ لوگوں کا رجحان یوں ہی ارسٹاکریسی کی طرف مائل ہے اور پھر میری تربیت بھی کالون تعلق دار اسکول (جو اب کالج ہے) میں ہوئی تھی جس سے اس قسم کے خیالات او،

مضبوط ہو گئے تھے۔ ولایت علی مرحوم کی صحبت میں مجھ کو ڈیماکریسی کی خوبیاں معلوم ہونے لگیں۔ خیالات جو بچپن سے انگریز پرستی کی طرف راغب تھے اس میں فرق آنے لگا۔ لیکن جائداد سے محروم ہونے کا دھڑکا اور آرام کی زندگی بسر کرنے کے بعد تکلیف کا خوف۔ یہ چیزیں پالٹیکس کے میدان میں انگریزوں کے خلاف آنے سے روکتی رہیں۔ پھر بھی گورنمنٹ کے خوش آمدیوں میں میرا شمار کبھی نہیں ہوا۔ گو میرا مدعا صرف اپنی مذہبی ارتقاء کا بیان کرنا ہے مگر ایک واقعہ عرض کرتا چلوں جس سے شاید میری افتادِ طبیعت کا پتہ چل سکے۔

ایک انگریز ڈپٹی کمشنر میرے بڑے دوست تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا ''میں تمھارا بہی خواہ ہوں اور تمھارے لیے میں نے ایک کام تجویز کیا ہے جس میں تم کو بڑے بڑے فائدے ہوں گے اور وہ یہ ہے کہ جو باتیں تم دوسروں کو کرتے سنو اس کی رپورٹ ہم کو دیا کرو۔'' میں نے کہا: ''دوستی کی آڑ لے کر اور باتوں باتوں میں آپ مجھ سے سب کچھ پوچھ سکتے ہیں کیونکہ مجھ کو راز رکھنے کی حکمت ہی معلوم نہیں۔ لیکن اگر ارادتاً آپ کو اس قسم کی رپورٹیں دوں گا تو پھر میرا دل مجھ کو اس قدر برا کہے گا کہ میں شاید سو نہ سکوں۔ وہ مجھ سے بہت مایوس ہوئے اور دوسرے ہی دن ایک صاحب کو اسی خدمت کے لیے مامور کر دیا۔ ان کو ہزار روپے کی معافی ملی۔ خان بہادر ہوئے اور دوسرے اعزاز بھی ہاتھ آئے۔ اس قصہ سے شاید میرے پڑھنے والوں کو کچھ پتہ چل گیا ہوگا کہ مذہب کے مقابلہ میں بھی دل میں کچھ اور منہ میں کچھ مجھ سے کبھی بن نہ پڑا تھا۔

دوسرے ذاکرین جو میرے قصبہ میں مجلس پڑھنے کے لیے آیا کیے وہ بھی مجھ کو اسی حقارت کی نظر سے دیکھا کیے۔ میرے قصبہ کے ایک صاحب جن سے مجھ سے کافی یگانگی اور خلوص تھا اور جو باوجود مراسم کے میرے مذہبی خیالات کو برا سمجھتے تھے ہنسی کے پیرایہ میں ایک دن میرے عقائد پر اعتراض کرنے لگے۔ کچھ تعزیہ داری کا ذکر تھا مجھ کو تاؤ آ گیا اور میں نے بھی سختی سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔ اس وجہ سے ان سے تو ملال ہو ہی گیا مگر اسی دن سے کم و بیش میرے عقائد دوسروں پر کھل گئے۔

—

O

دوسرا باب

اسی زمانہ میں میری بی بی مرحومہ حج کو گئیں۔ دوسرے یا تیسرے دن میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کسی کو بتائے چلا گیا۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات سے میرے دل کو ہمیشہ لگاؤ رہا۔ چنانچہ ایک قصہ عرض کرتا ہوں۔

میں اپنے تشیّع کے زمانہ میں ایک مرتبہ محفلِ حال و قال میں قوالی سن رہا تھا۔ قوالوں نے رباعی شروع کی۔

صبا تحیت شوقم بہ آں جناب رساں حدیث ذرۂ بیدل بہ آفتاب رساں
در آں مقام کہ آرام گاہ حضرت اوست زمیں بوس و سلام من خراب رساں

میرے اوپر عجیب طرح کا اثر ہوا۔ یعنی سر سے پاؤں تک ایک رَو دوڑ گئی۔ اس کو روکنے کی کوشش میں میرے جسم میں کپکپی پڑ گئی۔ دل کے اندر یہ خیال آیا کہ اب گھر نہ جاؤ۔ اسی طرف سے سیدھے اٹھو اور مدینہ نکل چلو۔ طرفۃ العین میں جانے کا پروگرام تو بن نہیں سکتا تھا، لیکن اس خیال نے پوری طرح سے مجھ پر ایک لحظہ کے لیے قبضہ کر لیا تھا۔ کون جانے کہ میرا نام اسی وقت درباریوں میں نہ لکھ لیا گیا ہو۔ ع

رحمت حق بہانہ می جوئد

زمانہ گزر گیا اور میری کفر و الحاد و عقیدت کی دیوانی ہانڈی دَم پر چڑھی رہی۔

کچھ باتیں آگے پیچھے ہوتی جاتی ہیں مگر یہ ناگزیر ہے۔ میرے خیال میں باوجود اس خامی کے اگر میں اپنی برائیوں یا خیالی اچھائیوں میں کوئی کمی بیشی نہ کر گیا تو میرا مطلب حاصل ہے۔ اور شاید ایک آدمی کی صحیح یا قریب بہ صحت تصویر کھنچ جانے سے دوسرے کا بھی فائدہ ہو جائے۔ میرے ایک دلی دوست تھے جو بہت صفات رکھتے تھے وہ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ تم میں یہ بڑا عیب ہے کہ دل میں کوئی بات اچھی یا بری رکھتے نہیں۔ اس

خیال سے ایک امید لگی ہے کہ شاید کچھ باتیں دیانت کے ساتھ بیان کر جاؤں۔

اب اپنے حج کے سفر کی طرف عود کرتا ہوں، جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اس زمانہ میں میرا الحاد اگر عزت الکمال کے درجہ سے بھی اتر آیا تھا تب بھی باقی ماندہ زیادہ مضبوط ہوگیا تھا۔ لوگوں نے مجھ سے پوچھا ''تم بھی حج کو جاتے ہو'' میں نے کہا ''میں کہاں جاؤں گا'' مرحومہ کے جانے کے بعد رات کو یہ خیال ہوا ''محمد علی اچھا موقع ہے'' دل میں بی بی کے دیکھنے کا بھی خیال تھا مگر اس کے ساتھ یہ خیال کہ ایسا مبارک موقع ہاتھ سے نکل جائے گا دل میں اچھا خاصہ درجہ رکھتا تھا۔ دل نے کہا اگر آج نکل چلو تو خوب ہو۔ نہیں تو پھر مدینہ کی زیارت نصیب نہ ہوگی۔

میرے پڑھنے والو! جب میں مدینہ منورہ کی حاضری یا اپنی بی بی مرحومہ کا ذکر کرتا ہوں تو ''بور''[1] ہو جاتا ہوں، لوگ زبان حال سے کہتے ہیں ''لو غضب ہوا۔''

''مدینہ طیبہ کا کیا کہنا، مگر بیان کی کوئی حد بھی ہونی چاہیے۔ بار بار وہی قصہ کہاں تک مزہ دے۔ بی بی کے ذکر پر کہتے یں ''اے لو بڑھیا نہ معلوم کب مر چکی۔ مجور صاحب نے دوسری شادی بھی کرلی۔ مگر ہماری جان کا عذاب چلا جاتا ہے۔'' ہمدردوں کو کون سمجھائے کہ جوانی کا ساتھی بڑھاپے میں بھی دکھ دے جاتا ہے۔ میرے ناظرین اگر اس جگہ پر تھوڑا سا چھوڑ جائیں گے تو مجھے شکایت نہ ہوگی۔ بہر حال کچھ غیر مکمل کپڑے اور کچھ غیر مکمل زاد سفر لے کر نکل تو کھڑا ہوا مگر دل میں کہتا تھا کہ محمد علی تم ملحد، بے ایمان، تم کو اس دربار میں باریابی کیسے مل سکتی ہے۔ پہلی ٹھوکر تو یہ لگی کہ لکھنؤ پہنچ کر یہ پتہ چلا کہ بجائے نئے کپڑوں کے پرانے کپڑوں کی گٹھری اٹھا لایا ہوں۔ مگر میں ریل پر سوار ہو ہی گیا۔ جھانسی میں ریل چھوٹ گئی۔ میرے ہم وطن اور بچپن کے یار مولوی بدرالحسن صاحب وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان کے ہاں ٹک گیا۔ دل نے کہا اس روک ٹوک کا مقابلہ تم کب تک کر سکتے ہو۔ مگر میں دوسرے دن بمبئی چل ہی دیا۔ وہاں بی بی سے ملاقات ہوئی۔ مسکرا کر کہنے لگیں ''ہم کو رخصت کرنے چلے آئے۔'' میں نے کہا ''ہم بھی چلیں گے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ''تم اور حج'' میری ایک عزیزہ بھی جا رہی تھیں۔ وہ مجھ سے پردہ کرتی تھیں۔

1. لفظ انگریزی ہے جس کے معنی ''مرد یست'' کم عقل کہ بے ارادہ مکلف باشد (ترجمہ از راقم)

کہنے لگیں "مجھے یقین نہیں جب تک جہاز چل نہ نکلے گا میں تمھارے سامنے نہ آؤں گی۔

سب لوگ ٹکٹ خرید چکے تھے۔ اب ہم ٹکٹ لینے چلے۔ دفتر میں معلوم ہوا کہ فرسٹ اور سیکنڈ کسی میں بھی جگہ باقی نہیں۔ بچپن کی عادت خراب تھرڈ کلاس میں جانے پر نفس مردود کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ اگلے جہاز کا انتظار کرنے میں "بڑھیا کے نکاح میں سو سو دھوکے۔" نہ معلوم کیا کیا بدگمانیاں دل میں آتی تھیں۔ جیسے کوئی کان میں کہتا تھا "اب کھل گیا نا" آخر تم کو کیوں بلائیں کس بنا پر تم کو روضۂ مبارک دکھائیں۔" کون ایسے گن ڈھنگ کون ایسے جو بنا کہ معشوق حقیقی تمھارا عاشق ہوجائے۔ گھونگھٹ الٹ کر تمھارا پھٹا منھ دیکھے۔ تم جس قابل ہو وہی ہو کے رہے گا۔ یہاں ایک ہفتہ میں تاج محل کی کاکٹیل اور فرنچ بل کے پرانے احباب روپیہ اڑا دیں گے۔ بس حج ہو چکا، اتنے میں اسی جہاز کے وسیع دفتر میں ایک طرف سے آواز آئی۔ "محمد علی کے تار کا جواب آیا؟" میں نے کان کھڑے کیے۔ معلوم ہوا کہ کوئی محمد علی ہیں رودولی کے انھوں نے اپنی بی بی کے لیے ایک فرسٹ کلاس ریزرو کرایا تھا ان کو تار دیا گیا تھا کہ تمھارا ریزرویشن اس وقت تک موجود ہے اطلاع دو کہ تمھاری بی بی جائیں گی کہ نہیں۔"

ہوا یہ تھا کہ میں نے ریزرویشن کے لیے لکھا تھا اور جواب بھی آیا تھا کہ روپیہ بھیج دو۔ مگر جو لوگ حج کر آئے تھے انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ تاریخ روانگی بدل جائے یا اور کوئی آفت آئے، پہلے سے روپیہ کیوں بھیجو۔ جگہ وافر ہوتی ہے اور ہر وقت مل جاتی ہے۔ چنانچہ میری بی بی نے وہاں پہنچ کر اپنا ٹکٹ خرید لیا تھا اور میری تحریر پر جو جگہ مقرر کردی تھی وہ الگ باقی رہی جس کیبن میں میری بی بی جارہی تھیں وہ دو برتھ کا تھا۔ اس میں یا کوئی عورت یا میں خود جاسکتا تھا۔

کار سازِ ما بہ فکرِ کارِ ما   فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

مگر مجھ کو اپنے اعمال کی بنا پر اب بھی دھڑکا رہا کہ تم چلے بھی گئے تو راستہ میں مرتے کتنی دیر لگتی ہے۔ میری منطق یہ تھی کہ اللہ میاں کسی میرے ایسے آدمی کے لیے اگر مجھ سے مشورہ لیتے تو ایمانداری سے مجھ کو کہنا پڑتا۔ بار الٰہا اس مردود کو اس پاک سرزمین

پر قدم نہ رکھنے دے۔ ارے میں نے کوئی گلا نہیں کاٹا تھا لیکن اپنی حرکتوں سے ڈرا ہوا تھا۔ مگر اللہ میاں اور بندے میں جو فرق ہے آپ جانتے ہی ہیں۔ ہم بھی پہنچ گئے ۔

بصدر مصطبہ ام می نشاند اکنوں یار گدائے شہر نگہ کن کہ میر مجلس شُد [1]

جدہ پہنچ کر میں انگریزی کانسل سے ملا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ آیا شیعوں پر کوئی ایسی سختی تو نہیں ہے کہ ان کو تقیہ کرنا پڑے۔ اس نے جواب دیا کہ سعودی لوگ حنفیوں سے زیادہ خفا ہیں۔ شیعوں کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کو جانتے ہیں کہ گئے گذروں میں ہیں۔ میں نے کانسل سے کہا کہ اگر مجھ کو معلوم ہو جائے کہ بحیثیت شیعہ کے کہیں ایسی تکلیف اٹھاؤں گا جو برداشت نہ کرسکتا ہوں تو میرے خیال میں اس وقت جب آدمی اتفاقیہ آفت میں پھنس جائے تو تقیہ کرلے اور پھر اس مقام سے علیحدہ ہو جائے، کیونکہ روز روز تقیہ کرنا میرے نزدیک جائز نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں نے اس وجہ سے دریافت کیا تھا کہ اگر ایسا ڈر ہو تو میں عمرہ کرکے واپس آجاؤں۔ یہ میں نے ضرور کہا تھا لیکن اگر ایسی صورت ہوتی تو شاید میں برابر تقیہ کیے رہتا۔ گویا اس کانسل سے میں اتنا جھوٹ بولا تھا، کیونکہ اتنی دور جاکر اور پھر فوراً واپس آنا مجھ سے نہ ہوسکتا۔ تقیہ کی نسبت تب اور آج میں میرے خیالات میں بڑا اختلاف ہوگیا ہے۔ آج میری سمجھ میں آتا ہے کہ تقیہ آدمی ہمیشہ کرتا ہے یہ کم و بیش فطری سی بات ہے۔ اسی فطرت یعنی حفاظت خود اختیاری کی بنا پر حضرت عمار بن یاسر کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے تقیہ کیا۔ اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ عمار کے ایمان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ قرآن شریف میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حال ہے۔ مگر وہ قرآن کے پہلے کا واقعہ ہے۔ اس لیے صرف نظیر کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ قرآن پاک میں یہ قانون موجود ہو، ورنہ نظیر بغیر قانون کے کیا کام آسکتی ہے۔ قرآن شریف میں تقیہ کے بارے میں سورۂ آل عمران کے تیسرے رکوع میں

---

[1] آج کے کچھ مہینے پہلے میری مرحومہ بی بی نے مجھ سے سفر حج کے متعلق دیوان حافظ میں فال دکھائی تھی اس میں یہ امید افزا شعر نکلا تھا ۔

ساقی چو شاہ نوش کند بادہ صبوح گو جام زر بہ حافظ شب زندہ دار بخش

اس وقت تو ہم یہی سمجھے کہ بی بی ہی کو حج نصیب ہوگا۔ یہ تو بعد میں سمجھ میں آیا کہ حافظ جی نے اسی وقت ہم کو بھی بشارت دی تھی۔

آیت[1] موجود ہے۔ جس سے تقیہ کا حکم صریحی نکلتا ہے لیکن وہ صرف کفار کے مقابلہ میں ہے۔

آیا مسلمان کے مقابلہ تقیہ کیا جاسکتا ہے؟

یہ ذرا مشکل مسئلہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حنفی مذہب میں قیاس سے کام لیا جاتا ہے۔ حضرات شیعہ قیاس پر ہنستے ہیں۔ مگر مجبوراً موقع بے موقع خود بھی کر جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو تقیہ مسلمانوں کے مقابلہ میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کے احکام فطرت پر مبنی ہیں اور حفاظت خود اختیاری میں فطرت کافر اور مسلمان کا فرق نہیں کرتی۔ اس لیے وقت ضرورت مسلمان کے مقابلہ میں تقیہ کیا جاسکتا ہے۔ کسی کو تلوار مار دینا جائز نہیں ہے لیکن حفاظت خود اختیاری میں مار دینا جائز ہے۔ اسی طرح مسلمانوں سے بھی تقیہ کرنا فطرت کے موافق ہے۔ تقیہ کا مسئلہ اب بھی حل نہیں ہوا۔ اکثروں کا دعویٰ ہے کہ ائمہ نے بھی تقیہ کیا ہے۔ یہ بڑی ٹیڑھی بات ہے۔ غور کیجیے تو آخر وہ بھی انسان تھے۔ پھر ان کو اپنے گروہ کی حفاظت بھی کرنی تھی۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں رہی ہے۔ جہاں ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے خون کا پیاسا نہ رہا ہو۔ ایسی حالت میں میری سمجھ میں آتا ہے کہ ائمہ بھی تقیہ کر سکتے تھے۔ اب صرف ایک چھوٹی سی بات دیکھنی ہے۔ یعنی آیا مذہبی مسائل میں بھی تقیہ کر سکتے ہیں؟ میری ناچیز رائے میں مسائل میں ائمہ تقیہ نہیں کر سکتے۔ امام حسین علیہ السلام نے تو کیا نہیں، امام احمد بن حنبل نے تو کیا نہیں اگر تقیہ واجب تھا تو ان حضرات نے کیوں نہیں کیا۔ یا کم از کم امام حسینؑ نے کیوں نہیں کیا۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ ہر چھوٹی بات پر اس مسئلہ سے فائدہ اٹھانا وہی منطقی کر سکتا ہے جو دین سے محبت کم رکھتا ہو اور حریف مخالف کے ہرانے کا زیادہ خیال رکھتا ہو یا خود غرضی کی بنا پر شرعی

---

1. لایتخذالمومنین الکفرین اولیا عرمن دون المومنین۔ و یفعل ذالك فلیسن من الله فی شئ الا تفقرمنهم تقة و بحذركم الله نفسه والی الله المصیر۔ ترجمہ: مسلمانوں کو چاہیے کہ مسلمانوں کے سوا کافروں کو رفیق نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا اس سے اور اللہ سے کچھ سروکار نہیں، لیکن کسی طرح ان سے بچنا ہو تو خیر۔ اللہ تم کو اپنے جلال سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کے پاس جانا ہے۔

مسئلہ کو آلہ کار بنانا چاہتا ہو۔ اس مسئلہ کو میں خود اس سے زیادہ نہیں سمجھ سکا ہوں۔ خدا مجھ پر رحم کرے۔

بہت سے حجاج کفایت اور آسانی کے خیال سے مدینہ منورہ کی حاضری کے لیے چلے گئے۔ ہم معلم صاحب کی دھوکہ بازی میں آ کر مکہ معظمہ چلے آئے اور عمرہ کیا۔ اس کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ اور پھر واپس آ کر حج کیا۔ میرے بیان کرنے میں واقعات آگے پیچھے ہوگئے ہیں۔ عمرہ اور حج کا بیان میں نے ساتھ ساتھ بیان کردیا ہے۔ اس کے بعد مدینہ کا حال لکھا ہے جیسے آم کھانے میں جو آم سب سے مزے کا نکلتا ہے اس کو سب کے بعد کھانے کے لیے لوگ رکھ لیتے ہیں۔ مکہ معظمہ جوں جوں قریب آتا جاتا تھا دل میں ایک کیفیت پیدا ہوتی جاتی تھی۔ کتنی اس میں رعب خداوندی سے تھی اور کتنی سب لوگوں کو اس عالم میں دیکھ کر بہ تکلف مومنیت پیدا کرنے کی تھی۔ یہ میں نہیں بیان کرسکتا۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ زیادہ تر تصنع کی تھی۔ گویا میں بہ کوشش اپنے اوپر رعب خداوندی طاری کر رہا تھا۔ حرم پاک میں پہنچ کر یہی حالت بہت بڑھ گئی۔ طواف کیا، حجر اسود کو بوسے دیے، سعی کی، قصر کروایا اور احرام کھول ڈالا۔

بھائی مٹھو میرے قدیم خدمت گار اور دلی بہی خواہ، جوانی کے راز دار اور بڑھاپے کے یار غمگسار نے حرم میں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا ''جو کچھ میں نے تمھارا کھایا پیا ہو وہ معاف کردو۔'' میں کچھ دست پاچہ سا ہوکر رہ گیا اپنے گناہوں کے خیال سے کانپ گیا اور مٹھو کی فراست کا بھی قائل ہوگیا۔ میں نے کہا میں نے معاف کیا اور میرا خدا معاف کرے۔ اس گھڑی البتہ مجھ کو رعب خداوندی کا جو احساس ہوا وہ اب تک سب سے زیادہ تھا۔

اس جگہ اللہ میاں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جس کا ربط کچھ دور آگے چل کر شاید مل جائے۔ میرے مرشد اور پیر کرامت حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ وجود باری تعالیٰ کے بارے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وجدانی دلائل بہت سے ہیں مگر عقلی نہیں۔ "عرفت ربی بفسخ العزائم" انھیں دلیلوں میں سب سے روشن دلیل ہے۔ ان کے فرمانے سے میں بھی یہی کہنے لگا اور آج تک وہی حال ہے۔

میرے دل میں وجدانی دلیل جو سب سے زیادہ دل نشیں ہوئی وہ خود میرے اوپر

گذری ہوئی ہے۔ میں گھوڑے پر سے اکثر گرا۔ میرا تجربہ ہے کہ جب میں گرنے لگا تو گرنے کے دوران میں تمام پہلے کی افتادگیاں آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ اسی طرفۃ العین میں میں نے ہر بار کہا ''محمد علی پہلے تم بچ بچ گئے مگر اب کی ایسے جارہے ہو کہ بچنا ناممکن ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال آتا رہا کہ ممکن ہے بچ جائیں۔ یہ بچ جانے کی امید کہاں سے آئی؟ ممکن ہے گزشتہ تجربوں کی بنا پر آئی ہو، لیکن مادی پہلو سے نظر کرتے ہوئے اور اسباب وعلل کی کسوٹی پر کس کر دیکھتا ہوں تو پوری طرح یہ اعتراض دل پر جمتا نہیں، کیونکہ صحیح یا غلط اس وقت نہ بچنے کا یقین تو دل میں سوسیکڑہ تھا۔ پھر یہ بچ جانے کی آس کہاں سے لگی تھی۔ گزشتہ تجربہ کی بنا پر اس وجہ سے نہیں کہا جاسکتا کیونکہ دل کو یقین تھا کہ اب کی بار کا گرنا گزشتہ گرنے سے مختلف ہے۔ اور اس مرتبہ گر کر بچ جانے کا تجربہ آئندہ ہونے والا تھا اور ابھی پیش نہیں آیا تھا۔ پھر یہ امید کہاں سے بندھی کہیں یہ بات تو نہ ہو کہ علاوہ مادی چیزوں کے آدمی میں کوئی چیز اور ہو جس کو "امر ربّی" کہتے ہیں اور اسے کچھ ایسا علم ہو جس کی خبر مادی جسم کو نہ ہو۔ یہی ''بے دلیل کی دلیل ہے'' جس پر میں اپنا شمار اللہ کے ماننے والوں میں کرتا ہوں۔ بار الہٰا، تو بھی کر اور اس سیاہ دل میں ایک روشنی کی کرن بھیج دے۔ آمین۔ رب العالمین۔ مانگتے تو ہیں دینے نہ دینے کا اختیار دوسرے کو ہے۔

زاہد شراب کوثر و حافظ پیالہ خواست تا درمیانہ خواستۂ کردگار چیست

وجود باری تعالیٰ کی بحث ایک نئی امریکن کتاب میں ہے۔ اس کتاب کا نام ہے۔ Man does not stand alone — By Coessy Morrison

تقویت ایمان کے لیے اس کو بھی لکھے دیتا ہوں۔ کتاب اس وقت میرے سامنے نہیں ہے، لیکن اس کا مفہوم ایک بیاض میں ٹانک لیا تھا۔ پیش کرتا ہوں۔ صفحہ ۵ پر ہے۔

''تمھاری آنکھ کا شیشہ آنکھ کے پردے پر سایہ ڈالتا ہے۔ اور اعصاب سایہ کو درست کردیتے ہیں کہ ٹھیک تصویر پردے پر اتر آئے۔ اس پردے میں نو پرت ہیں۔ تمام پردوں کی دبازت مل کر معمولی کاغذ کی موٹائی بھر ہوگی۔ آخری پردہ جو ہے وہ مخروطی اور گلیوں کی شکل کا بنا ہوا ہے۔ اس میں تین کروڑ گلیاں اور تین لاکھ مخروطی شکلیں ہیں۔ پہلے

تصویر الٹی اترتی ہے، اس کو دماغ تک سیدھی کر کے پہنچانے میں لاکھوں اعصاب کام کرتے ہیں۔ گرمی اور روشنی الگ دکھانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ تب جا کر صحیح چیز دکھائی دیتی ہے۔ اگر ان میں سے ایک جزو بھی نکال ڈالا جائے تو آنکھ دیکھ نہ سکے۔"

یہ سب از روئے ارتقاء کیسے ہوگیا۔ ذرا مشکل سوال ہے۔

صفحہ چوبیس پر ہے۔

"آکسیجن کو لے لیجیے۔ اس کا حساب تعجب خیز انداز سے بیٹھتا ہے۔" ہَو میں آکسیجن، نائٹروجن اور آرگنیں نی ان زینن اور کریٹن گیسیں ہیں۔ پانی بھی خفیف سا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائڈ دس ہزار حصوں میں تین حصے ہوگا۔ بہت کم مقدار میں اور گیسیں بھی ہیں جو آگ یا بجلی دکھانے کے کام میں آتی ہیں۔ نائٹروجن تقریباً اٹھہتر فی سیکڑا ہے اور آکسیجن اکیس فی سیکڑا ہے۔ باقی ایک سیکڑے میں اور گیسیں ہیں۔ سمندر کی سطح کا حساب لیتے ہوئے پورے روئے زمین کی سطح پر ایک انچ پر پندرہ پونڈ کا بوجھ پڑتا ہے۔ اس میں آکسیجن بھی شریک ہے۔ باقی آکسیجن مٹی میں دبی ہے اور یہ اب تک مصرف میں نہیں آئی ہے اور یہ 15/8 حصہ پانی کا تیار کرتی ہے۔ آکسیجن ذی روح کی سانس کے لیے ضروری ہے اور یہ صرف ہَو سے حاصل ہوتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف اسی قدر آکسیجن ہَو میں رکھی گئی ہے جو انسان کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ کیسے ہوا۔ اگر بجائے اکیس سیکڑا ہونے کے فرض کیجیے یہ پچاس سیکڑا ہوتی تو ہر چیز جل اٹھتی۔ پھر فرض کیجیے یہ کم ہوتی دس سیکڑا رکھ لیجیے تو دنیا میں آگ نہ رہ جاتی۔ اگر خود یہ آکسیجن مٹی میں دبی ہوئی آکسیجن سے مل جائے تو بھی حیات نہیں رہ سکتی۔ نباتات کے لیے کاربن ڈائی آکسائڈ بڑی ضروری چیز ہے۔ یہ گیس نباتات سے حیوان کو ملتی ہے اور حیوانات سے نباتات کو۔ ان تمام چیزوں پر حیات کا دارومدار ہے۔ یہ سب چیزیں کیسے اسی مناسبت سے آگئیں جس کے بغیر زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک بٹا دس لاکھ بھی اتفاق نہیں ہوسکتا کہ گیسیں ٹھیک ٹھیک اسی تناسب سے آگئیں جو زندگی کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔ اگر کہا جائے اتفاق سے ہوگیا تو گویا ریاضی کو پس پشت ڈال دیا۔ و ان من شیٔ الا عند ناخز ائنه و ماتنزله الا بقدر معلوم[1]۔

---

[1] سورہ حجر آیت ۲۱۔ تمام چیزوں کے خزانے ہمارے پاس ہیں مگر بمقدار معلوم ہم انھیں اتارتے رہتے ہیں۔

اتفاق کا حساب سمجھنے کے لیے دس پیسوں پر چاکو (چاقو) کی نوک سے ایک سے دس تک سلسلہ وار گنتی لکھ جایئے۔ دسوں پیسوں کو ملا کر جیب میں ڈال لیجیے۔ اب کوشش کیجیے کہ پہلے نمبر ایک نکلے۔ ۱۰/۱ امید ہے کہ ایک نمبر کا پیسہ نکل آئے جب نکل آوے تو پھر وہ پیسہ جیب میں ڈال لیجیے۔ اب کوشش کیجیے کہ نمبر ۲ پیسہ نکل آوے۔ اس بار ۱۰۰/۱ امید ہے کہ نکل آوے۔ اس کو پھر جیب میں ڈال لیجیے۔ اب کی نمبر ۳ پیسہ نکالنے کی امید ۱۰۰۰/۱ رہ گئی۔ دس تک پہنچتے پہنچتے کروڑوں اور اربوں کا حساب آ کر بیٹھے گا۔ حضرات! از روئے ریاضی اتفاق سے زیادہ ٹھیک اترنے والی دوسری چیز ہے نہیں۔ اب دہریت کے طرف دار ذرا غور فرمائیں کہ تمام گیسوں اور آنکھ کا مکمل نظام یہ سب اتفاق سے ہوجانا از روئے ریاضی قیاس سے کتنا بعید اور گدھے پن سے کتنا قریب ہے۔

چیونٹیوں کے حال میں ایک کتاب پڑھی تھی کہ جب ان کی مختلف قوموں میں لڑائی ہوچکتی ہے تو فاتح گروہ اپنے کشتوں کو دفن کرتا ہے اور غنیم کے کشتوں کو نہیں دفن کرتا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ علاوہ انسان کے جانوروں میں بھی دوسرے عالم کا خیال ہے۔

اب پھر اپنے حال کی طرف عود کرتا ہوں کہ تقیہ کی نہ ضرورت محسوس ہوئی اور نہ میں نے کیا۔

شنیدم کہ در روزِ امید و بیم بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

چونکہ میری مرحومہ بی بی سنّی تھیں اور چونکہ انھیں کے قدموں کی برکت سے مجھے حج نصیب ہوا تھا۔ اس لیے میں بھی سنّی معلم کے یہاں ٹھہرا تھا اور زیادہ تر طواف سنّی ہی معلم کے ساتھ کرتا تھا۔ دونوں فرقوں کی کتابیں دیکھیں دونوں معلموں کے ساتھ طواف وغیرہ کیا۔ مجھ کو تو یہ پتہ چلا کہ اگر زوائد جن کا نام مستحبات رکھا گیا ہے نکال ڈالے جائیں تو کچھ زیادہ فرق نہیں میں نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو اس راز سے واقف نہیں پایا، کیونکہ کوئی ہمارا ایسا ڈھل مُل یقین حاجی تھا نہ کوئی دونوں سے واسطہ رکھتا تھا۔

اب دوسرے دن سے دل اور دماغ کی تباہ کاری شروع ہوئی۔

''یار محمد علی! اللہ میاں تو لامکاں ہیں۔ ان کا گھر کیسا؟ اور اسی طرح توبہ توبہ معاذ اللہ اجودھیا میں بھی سات چکر لگاتے ہیں۔'' ان خیالات سے دل کانپ جاتا ہے اور اپنے جہنمی ہونے کا یقین بڑھتا جاتا ہے۔ اللہ میاں سے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگتا ہوں کہ میرے پروردگار مجھ کو سنبھال لے۔ میرے اوپر رحم فرما، مجھ کو شیطانی وسوسوں سے بچا لے۔

مرادلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار　بہ کعبہ بروم و بازش برہمن آوردم

معلوم نہیں کہ میرا نام دفتر اسلام سے خارج کردیا گیا یا ارحم الرحمین نے باقی رکھا۔ پھر دل میں خیال گذرا کہ کہیں حجر اسود کو بوسہ دینے کا تو یہ اثر نہ ہو۔ حجر اسود کے لیے مشہور بھی ہے کہ آدمی کی اصلیت کو اوپر نکال لاتا ہے اور کھول دیتا ہے۔ حجر اسود تو خیر بڑی چیز ہے اس سے بہت کم درجہ کی چیزیں ہیں جو واقعی بری ہیں۔ آدمی کی اصلیت کو کھول دیتی ہیں۔ دولت کو دیکھیے۔

بادہ نوشیدن و ہشیار نشستن سہل است
گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

اس سے بھی بری چیز شراب ہے۔ کسی کو شراب پلا دیجیے، اصلیت معلوم ہوجائے گی۔ میں نے لوگوں کو ذرا سے سرور میں آیات قرآنی کی تلاوت کرتے سنا ہے اور دیکھا ہے۔ میں نے شرابیوں کو صرف ذرا سی پی لینے میں خدا سے توبہ کرتے اور گناہ کے خیال سے روتے دیکھا ہے۔ زیادہ پینے والا تو اپنے آپے سے باہر ہوجاتا ہے اس کا ذکر نہیں۔ میں نے یہ حالتیں تھوڑی سی پی لینے میں دیکھی ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھا ہے کہ گھونٹ گلے سے اترا نہیں اور فحش کی بھرمار ہوگئی۔ غیبت کا طومار بندھ گیا۔ کسی کمینے کو بر سرحکومت کر دیجیے۔ پھر دیکھیے میرے خیال میں یہی حال میرا بھی ہوا۔ میری جتنی برائیاں تھیں عود کر آئیں۔ اگر شاید کہیں کوئی پڑی پڑائی اچھائی بھی رہی ہوگی تو وہ بھی اوپر آگئی ہوگی مگر اتنا تو میرے تجربہ میں آیا ہے کہ شیعہ سنی سے میں ہمیشہ پریشان رہا۔ بہت سی باتوں کا منہ سے نکالنا کیسا دل میں سوچتے ڈرتا تھا۔ مگر حجر اسود کا بوسہ دینے کے بعد وہ کھلم کھلا کہنے لگا۔ اب حجر اسود کے بوسہ کے بعد یہی اثر غیر مسلم پر ہوگا کہ نہیں؟ از روئے نفسیات نہ ہو تو تعجب نہیں۔ میں خود اس مسئلہ کی گہرائیوں تک نہ از روئے نفسیات پہنچ سکا

نہ از روئے اعتقاد۔ میرے ساتھیوں میں سے ایسے بھی تھے جو اپنی بی بی سے کہہ اٹھتے تھے ''تم ہی نے ہم کو اس آفت میں ڈالا ہے۔ اب یہاں سے ہماری لاش جائے گی۔'' مجھ کو صرف موت کا دھڑکا رہتا تھا، ورنہ کوئی اور بات اس طرح پچھتانے کی اگر رہی بھی ہوگی تو بہت کم۔ نمازیں پڑھ کر دعائیں مانگ کر فرحت ہوتی تھی۔ دل باغ باغ ہوتا تھا۔ دل میں نیکیاں آتی تھیں، انشراح قلب ہوتا تھا اور وہی آرزو بڑھتی جاتی تھی کہ مرنے کے پہلے مدینہ کی زیارت ہو جائے۔

ایک دن کا قصہ سنئے۔ میں جو حرم میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کعبہ شریف کا دروازہ کھلا ہے بے اختیار دوڑ پڑا۔ مگر مجمع اس قدر تھا کہ لکڑی کی سیڑھی جو لگا دی گئی تھی اور جس کے ذریعہ سے لوگ بیت اللہ میں داخل ہوتے تھے اس پر نہ چڑھ سکا اور مایوس لوٹ آیا۔ پھر ایک دن اسی طرح کا اتفاق ہوا کہ دروازہ کھلا ہوا دیکھا۔ آج میں نے ارادہ کرلیا کہ چاہے جو کچھ ہو انشاء اللہ تعالیٰ ضرور جاؤں گا۔ اور دیوانہ وار پہنچ ہی گیا۔ وہاں دیکھا کہ کلید بردار صاحب جن کا اسم شریف شیبی تھا دروازے کے پاس ایک صندوق سی چیز پر بیٹھے ہیں۔ اور ایک آدمی آب زمزم لیے کھڑا ہے۔ انھوں نے مجھ کو دیکھتے ہی نذر مانگی۔ میں نے ایک چاندی کا سکہ تلے اوپر ہاتھ رکھ کر پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا ''دو!'' عموماً لوگ کچھ پیسے دیتے ہیں۔ میں نے جو خوشی میں روپیہ پیش کیا یقیناً وہ سمجھ گئے کہ یہ بے وقوف ہے اس لیے دو مانگے میں نے دس کا نوٹ نکالا اور آٹھ روپے واپس مانگے۔ انھوں نے فرمایا روپیہ میرے پاس نہیں ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان کے آدمی کے پاس تھیلی میں کافی مال تھا۔ میں نے وہ نوٹ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا کہ مطلوبہ رقم آپ کے دولت خانہ پر آکر دے جاؤں گا۔ یہ صاحب پہلی لڑائی میں بھاگ کر یا قید ہوکر ہندستان آئے تھے اس لیے اردو سمجھتے تھے۔ بڑی عنایت سے فرمایا دو دو رکعتیں چاروں طرف پڑھو۔ چنانچہ میں نے پڑھیں۔ وہاں پہنچ کر ضرور میرے دل میں ایک حالت پیدا ہوئی۔ کچھ ناز، کچھ فخر، کچھ مباہات، کچھ یہ شکر کہ اللہ نے اپنے اس گنہگار بندے کو یہ مبارک دن دکھایا۔ رعب خداوندی کی کیفیت کم تھی۔ بجائے اس کے کہ کچھ اس قسم کی کیفیت تھی جو غالب نے بیان کی۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

چنانچہ "ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم" ایک صاحب مجھ سے بالکل ملے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ دیوار سے چھوٹ کر ایک کنکری ہمارے سامنے گری تھی۔ انھوں نے اٹھا کر جیب میں رکھنا چاہا، یقیناً اس لیے کہ اپنے ساتھ قبر میں رکھنے کی وصیت کر جائیں گے میرے دل میں خیال آیا کہ یہاں بھی یہ حرکت۔ اس وقت میں تشہد پڑھ رہا تھا مگر بے اختیاری میں میرا ہاتھ زانو پر سے سیدھا ہوگیا اور ان غریب نے کنکری چھوڑ دی۔ یہ فعل بالکل اضطراری ہوا اور نہ پھر انھوں نے کچھ کہا، نہ میں نے۔ خدا مجھ کو معاف کرے۔ خانہ کعبہ کے اندر سنا تھا کہ اوپر کی طرف نہ دیکھنا چاہیے کیونکہ یہ غرور کی نشانی ہے مگر اس وقت غرور کا تصور کہاں تھا۔ ہم تو دوسرے رنگ میں تھے۔ دل نے کہا اگر بچہ زانو پر پیشاب کر دیتا ہے تو باپ کب خفا ہوتا ہے۔ ہم تو اوپر دیکھیں گے۔ چنانچہ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا۔ دیکھا کہ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ایک سلاخ لگی ہے جس میں سیکڑوں برتن، خاص دان، دودھ دان، کشکول وغیرہ کے ایسے لٹکے ہیں یہ سب چاندی بلکہ زیادہ تر سونے کے ہیں۔ میں نے شیبی صاحب سے اس بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا مجھ کو نہیں معلوم۔ یہ ہمیشہ سے اسی طرح لٹکتے چلے آئے ہیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے انھوں نے کہا کہ فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت صلعم نے کنجی ہمارے مورث اعلیٰ کو دی تھی اس وقت بھی یہ برتن ایسے ہی تھے۔ بیس اکیس برس کی بات ہے مگر جہاں تک یاد ہے انھوں نے یہی کہا تھا۔ خانہ کعبہ کی اندرونی دیوار میں الٹے پلٹے ٹکڑے پتھر کے لگے ہیں۔ جن میں بعض میں یونانی طرز کے نقش و نگار کا پتہ چلتا ہے۔ سنا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن زبیر نے جب کعبہ پھر سے بنوایا تھا اسی زمانہ میں ساحل پر کوئی یونانی جہاز تباہ ہوا تھا اور یہ پتھر اسی میں کے ہیں۔ یہ کسی نظام کے ماتحت نہیں جڑے ہیں بلکہ بے ترتیب یونہی الٹے پلٹے لگا دیے گئے ہیں۔

ایک واقعہ اور بھی قابل ذکر ہے۔ جس رات کو میں حج کے جانے کے اوپر متفکر تھا۔ میرے عنایت فرما خان بہادر محبوب حسین خاں مرحوم فیض آبادی اتفاق سے مجھ سے ملنے

آئے اور انھوں نے یہ صلاح دی کہ میں ضرور حج کو چلا جاؤں اور سارا، تذبذب دور کردیا۔ خدا ان کو جزائے خیر دے۔ چنانچہ میں انھیں کی کار پر لکھنؤ گیا۔ راستہ میں انھوں نے کہا تھا کہ "تمھاری لاادریت اور فلسفیانہ الحاد سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن پھر بھی ایک بات گوش گزار کیے دیتا ہوں کان میں پڑی رہے۔ انھوں نے کہا کہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امام مہدی صاحب العصر علیہ السلام حج میں شریک ہوتے ہیں۔ اکثر کسی خوش نصیب مومن کو ان کی زیارت نصیب ہوجاتی ہے۔ ذرا اس کا خیال رکھنا۔" آگے چل کر میں اس مسئلہ پر اپنے خیالات بیان کروں گا اس جگہ پر صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہ میرا عقیدہ نہیں ہے۔ اب قصہ سنیے۔ ایک شام کو شاید ساتویں ذی الحجہ تھی یا اور کوئی تاریخ مغرب کی نماز پڑھ کر حرم میں بیٹھا تھا کہ مجھ کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔ کسی سے پوچھ کر میں رفع حاجت کے لیے گیا، وہاں سے نکل کر مجھ کو پورب پچھم کا اندازہ نہ رہ گیا۔ چارسو گز لمبا اور تقریباً تین سو گز چوڑا حرم بیت اللہ۔ اس کے چاروں طرف ایک طرح کی عمارتیں، متحیر کھڑا تھا کہ ہمارے ساتھی کس طرف بیٹھے ہیں اور میں نے اپنا جوتا کہاں رکھا ہے۔ اتنے میں ایک صاحب عربی لباس میں اور واقعی نورانی صورت کے میرے پاس تشریف لائے اور اچھی خاصی اردو میں مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ کس کی تلاش میں ہیں۔ میں نے حال بیان کیا۔ انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کرکے بتایا، تمھارے ساتھی اس طرف بیٹھے ہیں۔" میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ان بزرگ کا ہاتھ مصافحہ کے بہانہ سے خوب مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور دریافت کیا کہ حضور کون بزرگ ہیں۔ انھوں نے کہا "میرا نام خیاط ہے" (شروع کا حصہ نام مجھے یاد نہیں) اور میں ایک معلم ہوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے کپڑوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ لکھنؤ کے ہیں اور عبدالقادر سکندر کے حاجی معلوم ہوتے ہیں۔ اب میں ان کا ہاتھ اسی طرح پکڑے ہوئے اور سوچ رہا ہوں، جوتا گیا اپنی ایسی تیسی میں اور ساتھی گئے بھاڑ میں، ہم کو اگر یہ سعادت خدا نصیب کرے تو پھر کسی چیز کی پروا نہیں۔ اب میں جلدی جلدی خیال دوڑا رہا ہوں کہ امام ہمام کے اس کلام میں توریہ تو نہیں ہے۔ اور وہ بزرگ چپ کھڑے ہیں۔ آدمی کی ذہنیت بھی طرفہ معجون ہے۔ مجھ کو امام وقت کے غائب ہونے کا سو میں ایک درجہ بھی یقین نہیں ہے بلکہ سوا سیکڑہ اس کے برخلاف یقین ہے اور یہ میں بھی سمجھتا ہوں کہ توریہ جس کے معنی ایسا

سچ ہے جس سے جھوٹ کا فائدہ نکلے، امام زماں کے شایان شان ہرگز نہیں ہوسکتا۔ مگر پھر بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ ان بزرگ کا ہاتھ نہیں چھوڑتا۔ جب ہر طرف سے مایوس ہوگیا تو مجبوراً چھوڑ دیا۔ اب مکہ معظمہ کا حال ختم ہوا۔

عرفات میں جہاں تک مجھ کو یاد ہے میری حالت اچھی رہی، الحمدللہ رب العالمین۔ راستہ کا ایک واقعہ خالی از دلچسپی نہیں۔ دھوپ بڑی تیز تھی، ہم لوگ منیٰ سے عرفات جارہے تھے۔ ایک بوڑھے میاں بی بی بھی لبیک پکارتے ہوئے قافلہ کے ساتھ تھے۔ بی بی اونٹ پر اور میاں پیدل۔ بی بی سے کسی بات پر بگڑ گئے۔ ایک دم ٹھنک گئے، کہنے لگے ''بس ہم واپس جاتے ہیں، تمھارے اوپر ہم نے چھوڑا حج۔ اس کا عذاب تمھاری گردن پر، بوڑھیا منہ پر ہاتھ رکھے کھسیانی مسکراہٹ، الگ مسکرا رہی ہے۔ قافلہ والے الگ ہنس رہے ہیں اور بڑے میاں ہیں کہ منیٰ کی طرف چلے جارہے ہیں، لوگوں نے بہت خوش آمدیں کیں، تب بڑی مشکل سے من گئے۔ معلوم نہیں دوسرے اسے کیا کہیں گے، مگر مجھ کو تو یہ ادا بڑی اچھی لگی۔

عرفات میں جائے ضرور کے لیے ایک قنات میں نے الگ لگوائی تھی۔ مگر کون مانتا ہے گھڑی بھر میں بم پولیس ہوگئی۔ ایک صاحب کا خدمت گار جارہا تھا۔ میں نے روکا، شاید میری آواز میں خفیف سی سختی تھی، اس نے بھی سختی سے جواب دیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوگیا۔ بعد کو مجھے خیال آیا ارے کمبخت عرفات میں بھی یہ غضب تو نے کیا۔ دوڑا گیا اور بڑی لجاجت سے اس آدمی سے معافی مانگی۔ اس بندۂ خدا نے بڑی فراخ دلی سے معاف کردیا۔ اس کے مالک نے بھی معاف کیا۔ اللہ میاں غفورالرحیم ہیں۔ میں نے دل سے معافی مانگی تھی، مگر وہاں کا حال تو وہیں پہنچ کر معلوم ہوگا۔ عرفات سے منیٰ کی واپسی میں دل بہت خوش تھا۔ پانی برس جانے سے موسم بھی خوشگوار ہوگیا تھا۔ اتنی بڑی نعمت حاصل ہونے سے اطمینان سا تھا اپنے اعمال تو جیسے ہیں ظاہر ہی ہیں۔ مگر اس وقت خدا کے رحم کا خیال اس کے انتقام اور اس کے قہر کے خیال پر بہت غالب ہورہا تھا۔ ہم لوگ اونٹوں پر منیٰ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک ایک اونٹ پر دو دو سعف ہیں۔ سعف میں ایک طرف میری بی بی مرحومہ اور دوسری طرف میں۔ ان کی طرف تھوڑا سا اسباب رکھ کر وزن برابر کرلیا گیا

تھا کہ کجاوئ ایک طرف جھک نہ جائے۔ جنھوں نے سعف نہ دیکھا ہو ان کے لیے عرض ہے کہ سعف دو چھوٹے چھوٹے بے پایوں کے کھٹولے اونٹ کی پیٹھ پر ادھر ادھر لٹکتے ہوتے ہیں۔ اب یہ لٹکے ہوئے کھٹولے برابر کیسے ہوں کہ آدمی ان پر بیٹھ سکے۔ اس کی ترکیب حسب ذیل ہے۔ یہ سمجھ لیجیے جیسے ایک کھانچی یا بڑے ٹوکرے کو بیچ سے کاٹ لیجیے اور ان اڈھوں کو کھٹولے کے باہری پایوں سے باندھ دیجیے۔ اب کھٹولے اونٹ کی پیٹھ پر ہیں اور یہ ادھے باہری کی پٹیوں سے بندھے ہیں۔ لٹکے ہوئے کھٹولوں کو برابر کیجیے اور کھانچیوں کے باہری حصوں کو ایک رسی سے آپس میں اونٹ کے پیٹ کے آر پار باندھ دیجیے۔ اب جب تک یہ رسی ٹوٹ نہ جائے آپ آرام سے بیٹھے چلے جائیے۔ اگر خدانکردہ رسی ٹوٹ گئی تو خدائے عزوجل کا قاعدۂ ثقل وکشش عمل پیرا ہوگا۔ اور ایک طرف دونوں کھٹولے گر پڑیں گے۔ امید تو یہ ہے کہ انشاء اللہ چوٹ کم آئے گی مگر گر پڑیں گے ضرور۔ اونٹوں کی قطار میلوں تک گئی ہے۔ رات ہوگئی ہے جو اونٹ ہمارے آگے تھا اس سے کچھ اردو میں بات چیت کی آواز سنائی دی۔ میں نے اونچی آواز کر کے ان کو مخاطب کیا۔

میں: آپ تو ہمارے دیس کے معلوم ہوتے ہیں۔

وہ: جی ہاں آپ کہاں رہتے ہیں؟

میں: لکھنؤ کے جوار کا رہنے والا ہوں۔

وہ: میں بھی لکھنؤ میں رہتا ہوں، مولوی گنج میں۔

میں: میں ردولی کا رہنے والا ہوں۔

وہ: خوش ہوکر اہا، آپ ردولی کے رہنے والے ہیں وہاں عرس میں ہمیشہ حاضر ہوتا ہوں۔

میں: جی! سجادے صاحب بھی تو تشریف لائے ہیں۔

وہ: (خوش ہوکر) حیات میاں صاحب۔

میں: جی نہیں، افتخار احمد صاحب۔

وہ: (بے پروائی سے) ہوں، ہوں۔

میں: (اپنے دل میں) سجادہ نشین تو دونوں ہیں۔ خالی امیری اور غریبی کا فرق ہے۔

یہ محبت تو حضرت احمد عبدالحق قدس سرہ سے نہ ہوئی۔

وہ صاحب: اور میں تمام آستانوں پر حاضر ہو چکا ہوں۔ کلیر شریف، ....

جیسے ہی ان صاحب نے کلیر شریف کہا اوپر والی رسی ٹوٹ گئی، سعف اڑا اڑا دھڑام۔ دونوں بزرگوار غٹ پٹ۔ میرا مارے ہنسی کے یہ حال کہ اتنی سانس نہیں جو جمال کو پکاروں، صف الٹی پلٹی جاتی ہے، پیچھے کے اونٹ آگے اور آگے کے پیچھے اور میں ہنسی کے مارے بے بس۔ بی بی مرحومہ پریشان کہہ رہی ہیں "ہائیں! ہائیں! وہ بیچارے گر پڑے ہیں اور تم غضب خدا کا ہنس رہے ہو"۔ میں جمال کو پکارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر ہر بار جما! ہی ہی! ہی ہی! جما! ہی ہی! ہوکر رہ جاتا ہے۔ پیٹ میں سانس سمائے تو آواز بھی نکلے۔ وہاں یہ حال کہ ٹاپابند دونوں لڑ رہے ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں اماں اپنے بل پر رہو کہاں لدے پڑتے ہو۔ دوسرے صاحب فرما رہے ہیں، "ارے یار کیا کریں ذری سنبھلنے دو" اور ہم ہی ہی ہی کے دریائے ناپیدا کنار میں سے چلے جا رہے ہیں۔ خیر خدا خدا کرکے منہ سے آواز نکلی۔ جمال بھی آیا۔ ٹاپا کھولا گیا دونوں لڑنے والے علیحدہ کیے گئے۔ جوش عقیدت میں حاجی صاحب گرد جھاڑ جھاڑ کر فرمانے لگے "دیکھو بزرگوں کے نام کی برکت دیکھو، اتنے اونچے سے گرے اور چوٹ بالکل نہ لگی۔ ہم نے ہی ہی کے دریا میں پھر ڈبکی کھائی۔ یہ واقعہ میں نے یوں ہی نہیں عرض کیا ہے۔ اس سے ایک سبق بھی حاصل ہوجاتا ہے۔ بچپن کی عادت "جل ران علی قلوبھم ما کانو یکسبون۔"[1] ہم شیعہ آدمی ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوگئے کہ منیٰ اور مزدلفہ کے بیچ میں بھی خدا اور رسول کے بجائے صرف بزرگوں کا نام مدد کو پہنچا۔ اور ہماری بی بی کی نظر صرف دو انسانوں کی تکلیف پر گئی۔ منیٰ کے صرف دو واقعات جن کا اثر مجھ پر ہوا بیان کرتا ہوں۔

ایک قربانی۔ قربانی کے عظیم مسئلہ پر میں کوئی رائے نہیں رکھتا۔ گوشت خور ہوں، اس لیے شاید میں صحیح آدمی بھی نہیں جو اس پر رائے رکھتا ہو، اکیس برس ہوئے جب میں گیا تھا، اس وقت کھالوں اور گوشت وغیرہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ایک حاجی نے کچھ گوشت اپنے واسطے لیا، اس کو ایک ران مع کھال کے کاٹ کر دے دی گئی۔

---

[1] ترجمہ: لیکن ان کے دلوں پر زنگ لگ گئے جو انھوں نے حاصل کیا تھا۔

دوسری بات رمی جمرات ہے۔ مجھ کو اس کی ظاہری حکمت نہیں معلوم خود میری موٹی عقل میں یہ آتا ہے کہ یہ بھی ایک طرح کا تبرا ہی ہوگا۔ تین پیل پائے ہیں، ان کو کنکریاں ماری جاتی ہیں، جہلا کی زبان میں یہ بڑا شیطان، منجھلا شیطان اور چھوٹا شیطان کہلاتے ہیں۔ شیطان سے برئیت چاہنا اور اس برئیت سے جو نفرت پیدا ہوگی وہ اس نفرت سے بالکل علیحدہ ہے جو کسی انسان سے نفرت کرنے سے ہوگی۔ نفرت یا رغبت کا اچھا یا برا اثر جو ہوسکتا ہے وہ خود مادی جسم رکھنے والے سے نفرت یا رغبت کرنے سے پیدا ہوگا۔ شیطان جس کا وجود ہمارے لیے غیر مادی وجود سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اس سے نفرت کرنے یا برئیت چاہنے سے کوئی کینہ یا بغض ایسا نہیں پیدا ہوسکتا جو کسی دوسرے مادی انسان یا حیوان کو نقصان پہنچائے اور اس طرح خود ہمارے نفس کو نقصان پہنچا سکے۔ اگر بجائے شیطان کے یہ کنکریاں مثلاً اگر ابولہب، نمرود یا فرعون کے نام سے ماری جائیں تو چونکہ وہ لوگ بھی انسان ہی تھے اس لیے ہمارے دل پر ایک دوسری طرح کا اثر مترتب ہوتا جس میں اپنے ہم جنس سے نفرت پیدا ہونے کا امکان تھا۔ نفرت آدمی کے فعل سے ہونی چاہیے۔ انسان سے نہ ہونی چاہیے۔ اگر برے آدمی سے ہی نفرت کرنے کی عادت ڈالی گئی ہے تو یہی خود ہمارے دل پر ایسا اثر ڈال سکتی ہے جو ممکن ہے ہمارے نفس کو نقصان پہنچائے۔ نفرت خدا نے پیدا کی ہے اور اس کا بھی کچھ صحیح مصرف ہے۔ جیسے قاضی کو جرائم سے ہوتی ہے، اس نفرت سے قاضی کا نفس سزا دے کر اور زیادہ شریف ہوجاتا ہے لیکن اگر قاضی سزا کا حکم دینے کے بعد اسی حکم کو وظیفہ بنا لے تو قاضی کا نفس بجائے شریف ہونے کے سیاہ ہوجائے۔

مولانا روم علیہ الرحمہ نے ''او خیو انداخت بر روئے.......... علیؑ'' والی نظم میں جو ارشاد فرمایا ہے وہ اس مسئلہ پر بھی ایک پہلو سے روشنی ڈالتا ہے۔ واضح رہے کہ میں تحقیقی مسائل نہیں بیان کر رہا ہوں بلکہ اپنے احساسات لکھ رہا ہوں کہ مختلف چیزیں جو دنیا میں میرے ایسے کم عقل و کم فہم کے سامنے آئیں ان کا کیا اثر اس گنہگار، معرفت کے خواستگار پر ہوا اور کیا وجہ ہوئی کہ اس عاصی کا رویہ تمام راستوں سے کچھ ہٹ سا گیا۔

منیٰ کی واپسی کے بعد مکہ معظمہ پہنچ کر طواف اور سعی کے علاوہ شیعوں کے یہاں

ایک طواف نساء اور کرنا ہوتا ہے یعنی آخری طواف کے بعد آدمی احرام سے باہر ہو جاتا ہے۔ مگر بی بی حلال نہیں ہوتی۔ جب تک طواف نساء نہ کرلیا جائے۔ گو بہت سی باتوں میں اختلاف تھا مگر تھا تو میں شیعہ ہی اس لیے ایک شیعہ معلم ڈھونڈھ نکالا کہ طواف نساء مع تمام شرائط کے کرلوں تاکہ میری شریک زندگی پر کسی طرح کا حرف میرے شیعہ برادران کی طرف سے نہ آسکے۔ ان بزرگوار نے طواف کرایا۔ اس کے بعد سعی کی ٹھہری، اس میں ذرا لمبی دوڑ ہے اور معلم صاحب ادھیڑ عمر کے کچھ موٹے تھے۔ وہ تو اکثر دیکھتے ہی تھے کہ میں سنّی معلم کے ساتھ بھی طواف وغیرہ کیا کرتا ہوں۔ نماز بھی انھیں کی جماعت میں پڑھا کرتا ہوں اس لیے کہنے لگے ''میں تمھاری نیت ٹھیک کرائے دیتا ہوں، تم سعی سنیوں کے ساتھ کرو'' مجھ کو اس میں کوئی ہرج نہ معلوم ہوا۔ اب جو وہ نیت کروا رہے ہیں تو کیا سنتا ہوں کہ بجائے عربی کے صرف فارسی میں کروا رہے ہیں اور کوئی فرق نہیں میں نے ان سے کہا ''سنیئے صاحب نیت ارادۂ دلی ہے جس کا اعادہ زبان سے نہ ہو۔ تب بھی کوئی ہرج نہیں۔ نیت میں عربی میں کروں گا جو میرے پیغمبر کی زبان ہے یا پھر اردو میں کروں گا، جو میری ماں کی زبان ہے۔ یہ فارسی میں کس رشتہ سے کروں۔'' بیچارے شرمندہ ہوئے اور کچھ نہ کہہ سکے۔ اس بات پر میری نظر بہت دنوں سے جایا کرتی تھی کہ شیعہ سنی کے اختلاف اسی طرح کے لاطائل ہوا کرتے ہیں۔ جہاں اُٹنگی ازار یا عمامہ وکفش، یا پائجامہ ٹونٹی دار آگیا بس خدا کے واسطے کو شیعہ سنی لنگوٹ کس کے کھڑے ہوگئے۔ نماز روزہ نکاح وغیرہ میں کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔ مگر جہاں ان حضرات علماء کا قدم درمیان میں آگیا، بس حالی مرحوم کی آواز کانوں میں گونج گئی ؎

اسلام مولویو ممنون ہے تمھارا　　مذہب کو توڑ ڈالا کافر بنا بنا کر

اب ہم لوگ بیت اللہ سے رخصت ہوئے اور دربار رسول کی تیاری کی۔ مکہ معظمہ میں اپنے اوپر دو تین بار میں نے اچھا اثر محسوس کیا۔ جس دن پہلے حرم محترم میں نے دیکھا، جب خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوا حجر اسود کے بوسہ دیئے کہ جس کا اثر اشارتاً پہلے بیان کرچکا ہوں۔

○

تیسرا باب

اب مدینہ کا سفر شروع ہوا

سعد یا عبث احرام طوف مردہ می بندی

روئے یار ما نگر کعبہ صفا این است

اختلاج کہیے یا مراق یا اپنے گناہوں کا خیال۔ وہ دھڑکا کہ مجھے روضۂ مقدس رسول صلعم کی زیارت نہ ہوگی برابر قائم ہے۔ قریب شام شہر پناہ پر پہنچا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ مجھے بخار ہے۔ یقین کامل ہوگیا کہ وہی بات جو دل میں شروع سے جاگزیں تھی پوری ہونے والی ہے یعنی بخار بڑھ جائے گا اور میں زیارت سے محروم رہ جاؤں گا۔ جس مکان میں ٹھہرایا گیا تھا وہ حرم رسول اللہ سے قریب ہی تھا۔ بعد مغرب خیال آیا کہ ابھی بخار تو زیادہ نہیں ہے۔ چلو اسی وقت زیارت کر آؤ گو میں طاہر تھا اور نماز پڑھتا تھا مگر دل یہ چاہتا تھا کہ نہا دھوکر حاضر ہوں دربار کے لیے ایک انگرکھا جامدانی کا مسلمان دھوبی کا دھویا ہوا گھر ہی سے لے کر چلا تھا۔ بس میں اسی بخار میں اٹھا۔ اندر تو نہیں گیا مگر باب السلام سے روضۂ مبارک کا سامنا تھا۔ دروازے کے باہر ہی سے سلام کیا۔ مختصر سی زیارت اپنے جی سے گڑھ کر پڑھی اور پھر گھر آگیا۔ وہ مارا۔

عاشق زار من بیابر دربار گاہ من   حد تو نیست ایں ولے من بکرم بخوانست

اس وقت تھوڑی دیر کے لیے بیماری اور موت سب بھول گیا۔ دوسرے دن گو حرارت تھی مگر حمام کر کے حرم میں حاضر ہوگیا۔

"یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"

زیارت پڑھی اور جٹ گیا نماز پڑھنے پر۔ کتابوں میں کچھ طریقے اور کچھ قاعدے سنت نمازوں کے اور کچھ نوافل کے دیکھے تھے۔ سفر میں اکثر وہ کتابیں دیکھتا گیا تھا۔ مگر

وہاں پہنچ کر کیسا قاعدہ اور کس کا طریقہ۔ دو دو رکعتیں اوٹنی شروع کر دیں، اسطوانہ حرث پر، اسطوانۂ ابولبابا پر، اسطوانہ حنانہ پر۔ ؎

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

اسطوانہ عائشہؓ پر، روضہ ریاض الجنہ، یہاں وہاں سب کہیں، ہر جگہ نمازیں پڑھنا شروع کر دیں۔ آج تک جب کبھی نماز پڑھی تھی تو رکعتیں ہی گنا کیا تھا کہ اب ایک ختم ہوئی۔ اب دوسری ختم ہوئی، مگر حرم محترم میں پہنچ کر نمازیں پڑھنے میں لطف آ گیا۔ آپ سے وہ مزہ کیسے بیان کروں اگر آپ جانتے ہیں تو جانتے ہیں اور اگر نہیں جانتے تو کیسے سمجھاؤں، بس یہ سمجھ لیجیے کہ

پڑ گیا لوٹ میں سرکار کا مہماں ہو کر

ایک دن اسطوانۂ عائشہ پر نماز پڑھ رہا تھا۔ ہمارے جوار کے پڑھے لکھے مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی میرے قریب آئے اور مزاحاً کہنے لگے ''آپ یہاں کیوں نماز پڑھ رہے ہیں۔'' میں نے کہا '' وہ جیسی بھی رہی ہوں، جن کی چہیتی بی بی تھیں وہ پاس ہی تشریف رکھتے ہیں۔ میرے باپ کی بھی مجال ہے کہ اس مقام کی سعادت نہ حاصل کروں۔'' یہ واقعہ انھوں نے بھی اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے۔ مفہوم یہی ہے، گو سلیقہ سے لکھا ہے میں وہ لکھ رہا ہوں جو مجھے یاد ہے۔ ایسی جذباتی باتیں ذرا بھولتی کم ہیں۔ اکثر حضرات عقیدت اور محبت کے جوش میں بعض واقعات جو ان کو مدینہ میں پیش آئے ہیں ان میں معجزات اور کرامات دیکھ لیتے ہیں۔ اگر میں چاہوں تو دو واقعے اس قسم کے بیان کر سکتا ہوں، مگر نہ ایسے واقعات پر میرے مذہب کا دارومدار ہے نہ خود وہ واقعات ایسے ہیں کہ فلسفی اور علم نفسیات کا ماہران کے دوسرے معنی نہ بیان کر سکے۔ میں تو اس چیز کے مزے لے رہا ہوں جو باوجود میری سیاہ کاری کے اور بداعمالی کے مجھ کو نصیب ہوئی۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ ؎

''یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے''

شیعوں کو جماعت کی نمازیں کم نصیب ہوتی ہیں۔ ہر جگہ پر امام نہیں ہوتے اور

نصیب بھی ہوگئیں تو کمیاب ہونے کی وجہ سے ان کا اہتمام کچھ ایسا ہوجاتا ہے جیسے عید کی سوئیاں، وہ روز والی مساوات جس کو آدمی اپنا حق سمجھتا ہے وہ بات نہیں رہ جاتی۔ پیش نمازی کا مسئلہ شیعوں کے یہاں اتنی احتیاط کے ساتھ کہاں سے آگیا۔ مجھ کو نہیں معلوم، دیکھا یہ جاتا ہے کہ جس کو مجتہد اجازت دے وہی نماز پڑھا سکتا ہے شرط شاید یہ ہے کہ جو گناہ کبیرہ نہ کرتا ہو اور گناہ صغیرہ پر اصرار نہ کرتا ہو وہ پڑھائے۔ یہ تو شیوہ ہر مسلمان کا ہونا چاہیے اور ہم کو بھی یہی رائے رکھنا چاہیے کہ یہ حضرات زیادہ تر ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ لیکن مجتہد صاحب کو یہ اختیارات کہاں سے ملے، یہ سمجھ میں نہیں آتا، اسی ذیل میں تقلید کا مسئلہ بھی آجاتا ہے۔

تقلید عالم کی کرنی چاہیے۔ اگر کوئی شخص کسی عالم کا مقلد نہیں ہے تو اس کی عبادت ہی بیکار ہے (واضح ہو کہ یہ گنہگار بہت دن ہوئے تقلید چھوڑ چکا ہے) اس میں دِقت یہ آن پڑتی ہے کہ خدا کی راہ ڈھونڈھنے سے بھی مشکل عالم کی تلاش ہوگئی۔ ہم تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جس نے امام ابو یوسف[1] کی وردی پہن لی وہ پیش نماز ہوگیا۔ ترقی کی تو مجتہد ہوگیا اور اگر ان کے یہاں عاقبتی جوڑے زیادہ آنے لگے تو اعلم کہلایا۔ کیونکہ علاوہ علمی استعداد کے مرجع خلائق ہونا بھی تقدس کی ایک نشانی ہے۔ اور ایک حد تک بجا بھی ہے لیکن اعلم کا مسئلہ پھر بھی حل نہ ہوسکا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ چند خاندان مخصوص ہوگئے ہیں جن میں ہمیشہ مجتہد اور پیش نماز ہوتے چلے آتے ہیں۔ میرے خیال میں تو تقلید کا مسئلہ پیری مریدی سے کم نہیں ہے۔ اکثروں کو یہ گنہگار جانتا ہے کہ وہ نمازیں پڑھاتے ہیں، مگر ویسے ہی دوسرے ہیں جن کے پاس اجارہ نہیں ہے اسی لیے وہ نہیں پڑھا سکتے۔ اعلم کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ جو اکثر پڑھے لکھے شیعوں کے دل میں کھٹکا کرتا ہے۔ مگر میں اس پر زیادہ لکھنا نہیں چاہتا، لیکن اس کا بڑا افسوس ہے۔ شیعہ اکثر جماعت کی نماز سے محروم رہ جاتے ہیں۔ میرا دل تو یہ چاہتا تھا کہ ''ظن المومنین خیراً عمل کرکے جس کا فسق و فجور نہ معلوم ہو اور جو ضروری مسائل سے واقف ہو اس کے پیچھے پیچھے نماز پڑھ لی جائے۔ اس جگہ ایک قصہ جملہ معترضہ کی طرح عرض کردوں۔

---

[1] واضح ہو کہ سیاہ عمامہ اور عبا علماء کے لیے حضرت امام ابو یوسف ہی نے تجویز کیا تھا۔ ملاحظہ ہو ابن خلکان وغیرہ۔

مغرب کی نماز میں ایک سنی دوست کے ساتھ پڑھنے لگا۔ انھوں نے تلاوت شروع کی۔ یاک نابدویاک نستعین .... ولدالین وغیرہ وغیرہ ولا الضالین کی مَد وَد سب غائب۔ میں نے نماز پھر سے پڑھ لی۔

اس بارے میں شیعوں کا مسئلہ جو مجھ کو بتایا گیا تھا حسب ذیل ہے۔

نماز سنی امام کے پیچھے پڑھو، قرأت کی ضرورت نہیں ہے۔ رکوع و سجود اور تمام ارکان نماز ساتھ ادا کرو مگر نیت فرادہ کی کرو' میرا دل اس رویہ سے ہمیشہ کراہت کرتا رہا۔ اور جہاں تک یاد ہے میں نے حج کے پہلے بھی ہمیشہ نیت جماعت ہی کی۔ اکثر شیعہ پڑھے لکھوں سے بحث بھی کی مگر کشتی ہمیشہ برابر پر چھوٹی، ممکن ہے وہ حضرات سمجھا کیے ہوں کہ میرا کندھا لگ گیا مگر میں اپنے چت ہونے کا قائل نہ ہوا۔

مطاف میں پھر یہ مسئلہ میرے دماغ میں زور و شور سے آیا تھا۔ میرے دل نے مجھ سے کہا ''اگر تمھاری فرادہ نیت کا حال دوسروں کو معلوم ہوجائے تو وہ تم کو گردن میں ہاتھ دے کر نکال دیں۔ جب تم سب ارکان تو ان کے ساتھ ادا کر رہے ہو تو یہ فرادہ کی نیت دھوکہ بازی کے سوا اور کیا ٹھہری اور پھر اللہ میاں کے گھر میں یہ حرکت۔'' میں کانپ گیا، اور وثوق سے امام کے پیچھے نیت کی اور آج بھی کرتا ہوں، بیت اللہ میں اور نیز اس دربار میں بار بار خیال آتا تھا کہ ہر کام قاعدے کے موافق ہوجائے لہٰذا وہی خیال فرادہ نیت کا یہاں بھی دماغ میں آیا کیا۔ میں نے کہا ''لاحول و لاقوۃ الا باللہ'' اور اپنی اسی رائے پر قائم رہا۔ صرف فرق اتنا تھا کہ اگر وہاں جھوٹ خوف سے ترک ہوا تھا تو یہاں سچ ناز سے قائم رہا۔ ہم نے کہا ہم اصدق الصادقین کے امتی اور ہم دربار میں جھوٹ بولیں گے۔

گوہر اول کہ فرزندم زیبا کی نوشت — آں زماں سبحہ عیار گوہر یکتائے من
کز جہاں در یثرب آرام روی در گوش آیدش — مرحبا اے امتی از مرقد مولائے من
لذیذ بود حکایت در از تر گفتم — چنانکہ لفظ عصا گفت موسیٰ اندر طور

جی تو چاہتا ہے ابھی اور لکھوں مگر ڈرتا ہوں۔ کوئی ایسی بات نہ عرض کرسکوں گا جو ضروری ہو۔ اس لیے نگاہ خراشی سے کیا فائدہ۔ وہاں چلتے وقت اتنا اور عرض کر آیا ہوں کہ

''آپ نے فرمایا ہے کہ "زرمن زارک" یعنی جو تمھاری زیارت کو آئے تم بھی اس کی زیارت کو جاؤ۔ ''یا رسول اللہ میں تو حاضر ہو چکا آپ ذری ہمارے مرتے دم خیال رکھیے گا۔'' **اللھم صل علی محمد و آل محمد۔**

جنت البقیع کی زیارت اکثر کی۔ قبور مطہرہ کی حالت دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ ممکن ہے اس کی وجہ سے میرے دل میں کچھ وہابیوں کے خلاف سختی پیدا ہوگئی ہو۔ شاید کوئی حدیث ہے جس میں یمن کو روانہ کرتے وقت آنحضرت صلعم نے جناب امیر علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ کوئی اونچی قبر نہ دیکھنا مگر اس کو برابر کر دینا اور کوئی کتا نہ دیکھنا مگر اس کو مار ڈالنا اور اسی طرح کی کوئی تیسری چیز کے لیے حکم تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم، فرزند اور جناب سیدہ صلوٰۃ اللہ علیہا بضعۃ الرسول اور دوسرے اہلبیت علیہم السلام کے مزار مطہرات کھد گئے۔

قرآن میں تاویلیں ہوں۔ بہتر فرقے پیدا ہو جائیں مگر اس حدیث کے سمجھنے میں نری کی غلطی کیسے ہو سکتی تھی ؎

کس نیا موخت حلم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

O

چوتھا باب

ناظرین آپ کو خیال ہوگا کہ مجلس کا ذکر کرتے کرتے میں نے حج کا قصہ چھیڑ دیا۔ اب پھر وہی مجالس کے ذکر کی طرف عود کرتا ہوں۔ یہ الٹ پھیر تقریر میں نبھ جائے مگر تحریر کے لیے زیادہ مناسب نہیں ہے مگر چونکہ میں نے وہی باتیں کرنے والا طرز تحریر میں بھی اختیار کیا ہے لہٰذا میری خاطر اس انداز کو برداشت کیجیے اور ذہن میں وہی مجالس والا سلسلہ قائم کر لیجیے۔ یہاں تک تو اسباب کا تذکرہ تھا جن کی وجہ سے میرے خیالات بدلے آئندہ یہ ذکر ہے کہ کیونکر بدلے اور جب بدلے تو خیالات نے کیا صورت اختیار کی۔

شیعوں سے زیادہ کوئی فرقہ مسلمانوں میں اپنے مذہب سے آگاہ نہیں ہوتا ہے، کیونکہ ان کے یہاں مجالس عزا کا سلسلہ تعلیم کا ایسا ذریعہ ہے جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدقسمتی ہے کہ ذاکرین کمزور روایتیں ضعیف روایتیں پڑھتے رہتے ہیں۔ میرے بچپن میں تو یہ حال تھا کہ لوگ گڑھی روایتیں تک پڑھ جاتے تھے۔ خیر اب تو ایسا کم سنائی دیتا ہے۔ مگر پھر بھی بعض ذاکرین کا رجحان اس طرف دکھائی دیتا ہے۔ اس زمانہ میں اگر غلط روایتیں پڑھی جاتی تھیں تو اب منطق کا ہیر پھیر۔ صغریٰ اور کبریٰ کا جھمیلا عقل کو چکرا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر عرض ہے۔ آیت "بلغ ما انزل الیدی" الخ۔ کی تفسیر بیان کرتے وقت تمام ذاکرین بے دھڑک پڑھ جاتے ہیں کہ امام فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ یہ آیت جناب امیر علیہ السلام کی خلافت کے بارے میں آئی ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس آیۃ کی دس شان نزول لکھی ہیں ان میں سے آخری یہ بھی ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے کسی ذاکر سے مندرجہ بالا دعوے کے سوا کوئی تفصیل سنی نہیں۔

منطق کے مغالطوں کا کھیل ملاحظہ ہو کہ ذاکر صاحب اپنے زعم ناقص میں طے کیے ہوئے بیٹھے ہیں کہ کوئی ہم کو غلط ثابت نہیں کرسکتا۔ مگر اس پر بالکل نظر نہیں ہے کہ بغیر یہ

فرمائے کہ تفسیر کبیر میں دس شان نزول ہیں اور ان میں خود ان کی بیان کی ہوئی شان نزول صرف ایک ہے۔ سامعین کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں۔ ایک دوسری مثال دوسرے قسم کی ہے۔ احد کی لڑائی میں جن لوگوں کے پاؤں اٹھ گئے تھے ان میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ[1] کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ جن ذاکر صاحب کو سنئے پہاڑ پر جنگلی بکری کے بھاگنے کا ذکر فرما رہے ہیں اور اس پر بالکل نظر نہیں ہے کہ جن لوگوں کے پاؤں اٹھ گئے تھے ان کو خدائے تعالیٰ نے صریحی آیت بھیج کر معاف فرمایا ہے۔ منطق کے نزدیک بھی اس کا ذکر لاطائل ہے مگر سب سے بڑی خرابی اس ذکر میں یہ ہے کہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قرآن کے احکام اور منشاء کی وقعت اور اس سے محبت کم ہے۔ اور دوسروں کی برائی میں مزہ زیادہ ہے۔ اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ باوجود معافی کی آیت کے بھاگنے والوں کی جگہ دل میں اس قدر نہیں ہوسکتی جتنی نہ بھاگنے والوں کی ہوگی مگر زیادہ سے زیادہ آدمی اس پر عبرت کرلے۔ اعتراضات یا ہنسی اڑانے کا موقع حکم خدا کے بعد نہیں رہ جاتا۔

محرم کی مجلسیں شیعوں کے ہاتھ میں ایسا آلہ کار تھیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا ذکر نہیں۔ غیروں کا دل ہاتھ میں لے لیتے۔ امام حسین علیہ السلام کی کہانی اتنی بڑی قربانی کا ذکر اس طرح فرمایا جا رہا ہے کہ بجائے اغیار کے دل میں جگہ ہونے کے شیعوں سے بیگانگی اور شکایت دلوں میں جگہ کرتی جاتی ہے۔

مردوں کے آنسو جو بہت بڑی چیز ہیں ریوڑی کے دو دو نہیں بلکہ دس دس بیس بیس تک بک رہے ہیں۔ ایک بار میں علاج کی غرض سے لکھنؤ میں ٹھہرا ہوا تھا، گرمیوں کے دن تھے، چاندنی رات تھی میں قریب ہی ایک دوست کے یہاں جا رہا تھا، راستہ میں ایک مسجد پڑتی ہے، اس کے صحن کی دیوار اس قدر چھوٹی ہے کہ سڑک کی پٹری پر کھڑے ہوکر

---

1. ابن اثیر جزری تاریخ کامل، بحوالہ تاریخ احمد صفحہ ۴۲۔۴۳

2. سورۂ آل عمران۔ ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان انما ستنزلھم والشیطن ببعض ما کسبرو لقد عفا اللہ عنھم ان اللہ غفور رحیم۔

ترجمہ: دونوں جماعتوں کے مقابلہ کے وقت جنھوں نے منھ پھیرا تھا ان کو ان کے گناہوں کی شامت سے شیطان نے بہکا دیا۔ اللہ نے ان کو معاف کردیا۔ بیشک اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔۱۲

آدمی صحن کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔ مسجد کے صحن میں منبر رکھا ہوا تھا اور مجلس ہو رہی تھی میں بھی کھڑا ہو گیا۔ میں خود مجلس کرنے والا اور رونے والا مگر میرے اوپر ایک عجیب طرح کا اثر ہوا۔ اس اثر کو بیان کرنا مشکل ہے جیسے آپ کا خوب پیٹ بھرا ہو اور آپ کسی دوسرے کھانے والے کے قریب سے گذریئے تو وہی خوشبو جو تھوڑی دیر پہلے بھلی لگتی تھی اس وقت بری لگے گی۔ وہی حال میرا ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جملہ پر درود کے نعرے ہیں اور مسرت کا مظاہرہ ہے اور دوسرے ہی جملے پر نالے ہیں اور گریہ و بکا کا شور۔ تھوڑی دیر میں یہ دھوپ چھاؤں کئی بار ہوئی۔ اس دلی تکلیف کو ظاہر کرنے کے لیے میرے دل میں الفاظ نہیں آرہے تھے کہ اتنے میں پاس ہی کھڑے ہوئے دو پنجابی سنیوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا ''لکھنؤ کو انھیں باتوں نے تباہ کیا ہے۔''

مظلومی کا لفظ جیسا اہلبیت نبیؐ پر عموماً اور کربلا والوں پر خصوصاً صادق آتا ہے اس کی مثال کم ملے گی۔ مگر اس لفظ کا استعمال کربلا کے واقعات پر اس قدر عام اور سستا کر دیا گیا ہے کہ جس کے بے موقع استعمال کی وجہ سے ہر شیعہ اور خصوصاً اودھ کا، ہر چھوٹی سے چھوٹی مصیبت پر خود اپنے کو اس کا مصداق سمجھنے لگتا ہے۔ مختلف موقعوں پر شیعوں کے منہ سے یہ الفاظ سن کر افسوس ہوا کہ ''ہم مظلوم کے ماننے والے ہیں اور خود مظلوم تو ہیں ہی'' ذرا غور کرنے کی بات ہے۔ کربلا کا ایسا ظلم کہاں ہوا ہوگا۔ مگر اس ایمانی ڈرامہ کے افراد میں ہیرو (روحی لہ الفداء) میں کچھ اور صفات بھی تو تھے۔ مومنین کو چاہیے تھا کہ ذری وہ صفات بھی اپنے میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ خالی مظلوم جاننے سے تو دنیاوی اور عقباوی معاملات میں زیادہ فائدہ مترتب ہوتے دکھائی نہیں دیتا۔ اس جگہ ایک قصہ عرض کر دوں میرے ایک دوست زیارت کربلائے معلّٰی کو مع عیال و ملازمین جارہے تھے۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ان کے سب ساتھی کراچی ہی میں رہ گئے اور وہ تنہا چلے گئے۔ ان کو روانگی کا وقت نہیں معلوم تھا۔ وہ گئے تھے اپنی جگہوں کا معائنہ کرنے کہ جہاز چل پڑا ان کے پاس روپیہ تو تھا مگر اور کوئی چیز نہ تھی۔ بیچارے طہارت اور صوم وصلوٰۃ کے بہت پابند تھے۔ بہت پریشان ہوئے۔ اس نیک سفر کے جانے والوں کے دلوں میں بڑی نیکی ہوتی ہے۔ ہر شخص نے ہمدردی کی کسی نے جانماز عاریتاً دی، کسی نے لوٹا دیا، کسی نے کمبل دیا،

بہتوں نے تسکین دی۔ جن صاحب نے لوٹا یا کمبل دیا تھا ان کے منہ سے نکل گیا "آپ محتاج ہیں آپ کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے" ہمارے دوست نے سب چیزیں اٹھا کر پھینک دیں اور کہا کہ محتاج تو وہ ہے جو تکلیف نہ اٹھا سکے ہم تکلیف اٹھائیں گے مگر یہ چیزیں اب بغیر دام دیے نہ لیں گے۔ تعز من تشاء باالقناعت و تذل من تشاء باالاحسان"

میری ناچیز رائے میں اس ادنیٰ ترین غلام سیدالشہداء نے کچھ ایسا کام کیا کہ پتہ چلانے والے پتہ چلا لیں کہ کس کا غلام تھا۔ بجائے اس کے صرف رونے میں تو تاسی کم دکھائی دیتی ہے۔ رونے کو مومنین مآل مجلس کہتے ہیں۔ میرے زعم ناقص میں رونا مآل ذاکر کہا جاتا تو بہتر تھا۔ میں رونے کا منکر نہیں ہوں۔ مگر جیسا کہ عرض کیا کہ یہ موتی اتنے سستے نہ بیچے جاتے تو اچھا ہوتا۔ مشہور ہے کہ جنگ احد کے بعد گھروں سے رونے کی آوازیں آتی تھیں اور رسول صلعم نے فرمایا کہ ہمارے چچا پر رونے والا کوئی نہیں۔ اس کے بعد اصحاب نے اپنی عورتوں کو بھیج دیا کہ وہ روئیں۔ یہ روایت [1] صحیح ہو یا غلط ہو، لیکن اگر صحیح بھی ہو تو دو باتوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلعم میں انسانی نرمیاں بدرجہ اتم موجود تھیں اور دوسرے یہ کہ وہ اسی وقت ہوا تھا ہمیشہ کی رسم نہیں قائم ہوگئی تھی۔ بہرحال کربلا کے واقعات پر جس کا دل نہ ابھرے وہ اپنے دل میں پتھر رکھتا ہوگا۔

رونے سے دل کی سلیٹ صاف ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد جو نقش بیٹھے گا وہ روشن ہوگا۔ مگر یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب تاسی اصل چیز سمجھی جائے اور مآل مجلس صرف رونا ہی نہ سمجھا جائے۔

غم سے عبرت کا ذوق حاصل ہے
غم نہایت مجلّی دل ہے
غم سے مطلب وہ غم جو داغ بنے
نہ کہ جو رسم کا چراغ بنے

یہ دو شعر اکبر الہ آبادی مرحوم کے ہیں جو تصوف کی بڑی بلندی پر پہنچے ہوئے تھے۔ ایک شعر نجم صاحب اکبرآبادی کا بھی عرض کردوں۔

1　ابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے

شربت کی طرح پیتا ہوں آب دم شمشیر　　دنیا میری محنت کو تماشا نہ بنا دے

یہی تصنع کی ذہنیت مجھے بد قسمتی سے عزاداری کی ہر چیز میں دکھائی دیتی ہے۔ برسہا برس غور کیا کہ کیا کروں۔ یہ طاقت اپنے میں پائی نہیں کہ اصلاحیں کروں۔ نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنے گا۔ نہ اتنا بڑا مقرر نہ اتنا بڑا منشی کہ کتابیں لکھوں۔ زبان یا قلم سے کچھ کہا بھی تو کسی نے اعتنا نہ کی۔ بادشاہ کا نقارہ چوہے کی کھال سے کہاں منڈھا جاسکتا ہے۔ یہ بھی خیال آیا کہ ہر چیز اپنے پہلے مقصد سے اس قدر دور جا پڑی ہے کہ جب تک پوری عمارت ڈھا کر پھر سے نہ بنے کوشش سودمند ہوتے دکھائی نہیں دیتی۔ ایک چھوٹا آدمی یہ کام کیسے کرسکتا ہے۔ دل نے کہا ''تم اپنا کام کر جاؤ اس کی فکر مت کرو کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں۔

دنیا کی طوالت بے حد ہے خلقت کا تو لنبا قصہ ہے
ہر شخص فقط یہ غور کرے اس کل میں میرا کیا حصہ ہے

اس کے بعد جس چیز کو میں کرنا چاہتا تھا کر گذرا۔ یعنی محرم، مجلس، جلوس، تعزیہ، مہندی اور محرم کے تمام مناسک چھوڑ دیے۔ اسی کے ساتھ محفل میلاد، مردہ اعزا کا فاتحہ، خاندان کے بزرگوں کی قبروں پر مزدوری دے کر قرآن خوانی سب ترک کردی، ان تمام چیزوں میں بعض ایسی بھی تھیں کہ ان میں دوسروں کے ناز بھی اٹھانا پڑتے تھے۔ یہ بھی۔ تکلیف دل کو رہتی تھی۔ اب چھوڑنے کے بعد اس سے بھی چھٹی ملی۔

کتنا حصہ میرے اس فعل میں ناز برداری کے ڈر سے نفس کا تھا اور کتنا واقعی پختہ خیالی کا۔ یہ دوسرے طے کریں۔ میں نے اپنے دل کو بہت تولا۔ ناز برداری والا جزو گو موجود پایا مگر کم پایا۔ اور عقیدہ والا جزو بہت پایا اصل حقیقت خدا کو معلوم ہے۔ میں نے اپنے دل سے کہا ''محمد علی تمھاری نیت نیک ہے اگر تم غلطی پر بھی ہو تو تمھاری نیت کی وجہ سے خدا تم کو انشاء اللہ معاف کردے گا۔ تم اپنے دل میں یہ سمجھتے ہو کہ لوگ امام حسین علیہ السلام کی محنت اور قربانی کو روزی کا ٹھیکرا بنا رہے ہیں یا علاوہ خدا کی رضا حاصل کرنے کے کسی دوسری غرض سے بھی کر رہے ہیں۔ اس لیے تم اس کو ترک کر رہے ہو لہٰذا تم سے نہ رسالت مآب ناراض ہوں گے نہ ان کے اہل بیت علیہم السلام۔ تمھارے اس فعل کو

تمھارے ہی ہم چشم بُرا کہیں گے لیکن شاید ہزاروں ہزاروں میں ایک آدمی ایسا بھی نکل آوے جو بجائے یکبارگی غصہ کرنے کے یہ بھی سوچے کہ باوجود ادعائے محبت کے پھر بھی یہ کام اس کمبخت نے کیوں کیا اور اس طرح سے شاید وہ بھی تمھارا ہم خیال ہوجائے یا کم سے کم اس پہلو سے غور تو کرے۔'' یہ میرا معاملہ ہے جو میرا پیدا کرنے والا بہتر جانتا ہے پھر بھی یہ کھٹک باقی رہ جاتی ہے کہ تم بذات خود امام حسین علیہ السلام کے احسان کا کیا بدلہ کر رہے ہو۔ میرا جواب یہ ہے کہ جو دوسرے کر رہے ہیں وہ احسان کا تشکر نہیں ہے اور میں سوائے اس کے کچھ نہیں کرسکتا کہ برادران ملت کو اس غلطی سے آگاہ کر دوں۔'' یہ میری بدقسمتی ہے۔ شومیِ قسمت ہے کہ مجھ سے اظہار تشکر میں اور کچھ نہیں ہوسکتا خدا کا حکم، رسول کا حکم مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح امام حسین علیہ السلام کے احسانات پر اظہار تشکر بھی ہے جو مجھ سے نہیں ہوسکتا۔

خدا مجھ کو معاف کرے اور توفیق دے کہ کچھ مجھ سے نیکی ہوجائے مگر جس چیز کو میں غلط جانتا ہوں اس کو اس دلیل سے اختیار نہیں کرسکتا کہ چونکہ صحیح بات مجھ کو نہیں معلوم ہے اس لیے میں غلط ہی کیا کروں گا۔ میرا خدا میری نیت سے واقف ہے۔ میری بداعمالیوں سے نواہی اور اوامر کی عدول حکمیوں سے واقف ہے وہ چاہے گا مجھ پر رحم کرے گا، نہیں تو اس گنہگار کو کیفر دار کو پہنچائے گا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔ میرے اس اقدام سے لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید اس نے مذہب تبدیل کیا ہے۔ ایک دوست نے پوچھ بھی لیا کہ تم سنّی ہوگئے ہو، میں نے جواب دیا کہ ''اگر مجھے سنّی ہی ہونا ہوتا تو شیعہ ہی کیوں نہ رہتا۔'' اکثر حضرات نے میرا مذہب دریافت کیا اور جب میں نے کہا کہ اپنے کو مسلمان کہتا ہوں اور خدا مجھے مسلمانوں میں شمار کرے تو سننے والوں کو تسکین نہ ہوئی۔ عبرت کا مقام ہے۔ خدا کا بھیجا ہوا نام۔ رسول کا لایا ہوا نام ''مسلمان'' مجہول المعنی ہوگیا۔ جب تک شیعہ، سنّی، وہابی کی ٹھیک نہ لگاؤ لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کہنے والا مذہباً کیا ہے۔

اے خاصۂ خاصان رُسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

مجھ ناچیز کی سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ یہ افتراق بیجا جو رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام پر پڑا۔ اس سے بڑی بدقسمتی مسلمانوں کی اور کوئی نہیں۔

اس گنہگار کے مذہبی خیالات حسب ذیل ہیں۔ کل کیا خیالات ہوں گے، اس کو اللہ ہی جانتا ہے۔

○

...... ہمارے بھائی راحت حسین...... جوانی میں اخبار میں مضامین وغیرہ لکھتے تھے۔ آخر میں ایک سوانح عمری لکھ رہے تھے۔ کس کی سوانح عمری۔ جی، اس حقیر کی...... چند اوراق میں نے دیکھے (تھے)...... میرے حواس باختہ ہوگئے، حضرت یوسف کی خوبصورتی اکبر اعظم کا حوصلہ نعمت خاں عالی کی بذلہ سنجی، حاتم کی سخاوت، رستم کی طاقت، سب ہی کچھ تو مجھے میں تھیں۔ میں گھبرا گیا، ہاتھ چھڑا کر کھڑا ہوگیا، نہ معلوم کتنی منت ساجت کتنی لجاجت کی کئی قسمیں دلائیں، تب وہ مانے نہیں تو میری رسوائی کا سامان مکمل ہوگیا تھا۔ اسی کتاب کا ایک جملہ سن لیجیے......

''ریل پر کوئی صاحب بھائی راحت حسین کو ملے۔ انھوں نے پوچھا کہ رودولی میں قابلِ زیارت کوئی چیز ہے۔ بھائی صاحب مرحوم فرمانے لگے دو چیزیں ہیں۔ ایک مخدوم عبدالحق قدس سرہٗ کا مزار اور دوسرے چودھری محمد علی......''

(''غریبی میں امیری'' کشکول)

پانچواں باب

''خدا کے وجود کا قائل وجدانی دلائل سے ہوں جس میں "عرفت ربی بسفخ العزائم" سب سے روشن دلیل ہے۔ رسالت کا قائل ہوں کہ جناب رسالت مآبؐ خاتم النبیین تھے اور بذریعۂ وحی تبلیغ فرماتے تھے اور جہاں تک خدا کے احکام پہنچانے کا تعلق ہے معصوم تھے۔ اس کے علاوہ ایسی عصمت کا قائل نہیں ہوں کہ کوئی بشر ایسا پیدا کیا گیا ہے کہ گناہ کر ہی نہ سکتا ہو، قرآن شریف میں کئی آیتیں ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آدمی غلطی سے بری نہیں۔ سورہ توبہ کے رکوع سات میں ہے ''اے محمدؐ اللہ تجھے معاف کرے سچوں کی حالت ظاہر ہوئے بغیر اور جھوٹوں کو سمجھے بغیر تو نے ان کو لڑائی میں نہ جانے کی اجازت کیوں دی۔ سورۂ مومنون کے رکوع چھ میں ہے ''اے محمدؐ تو کہہ۔ میرے رب! میں شیطانی وسوسوں سے تیری پناہ ڈھونڈھتا ہوں اور میرے رب! اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ شیاطین میرے پاس آئیں۔''

سورۂ انعام کے رکوع آٹھ میں ہے ''اے محمدؐ جب تو ایسے لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیتوں سے تمسخر کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کرجا۔ یہاں تک کہ وہ دوسری باتوں میں مشغول ہوجائیں اور اگر شیطان یہ ممانعت تجھے بھلا دے تو یاد آنے کے بعد بے انصافوں کے ساتھ نہ بیٹھنا۔''

سورۂ عبس کے شروع میں ہے ''ایک اندھے کے آنے سے محمدؐ ترشرو ہوا اور منہ پھیر لیا۔ اے محمدؐ تو کیا جانے، شاید وہ تیری تعلیم سے پاک ہوجاتا۔''

میں اس مقام پر اس آیت کا ذکر نہیں کرنا چاہتا ہوں جہاں سورۂ نجم میں لات و عزیٰ اور منات کا ذکر ہے جس کی تفسیر میں بڑے بڑے مفسرین ہفوات بک گئے ہیں اور جس کا ہونا اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ سورۂ حج کے رکوع سات میں یہ آیت آئی ہے ''اے محمدؐ تیرے پہلے جو رسول اور نبی ہم نے بھیجے تھے انھیں بھی یہ معاملات پیش آئے کہ

ان کی تمنا میں شیطان نے وسوسے ڈالے۔ لیکن اللہ نے شیطانی وسوسے مٹا دیے اور اپنی آیتیں مضبوط کیں۔ اللہ علیم اور حکیم ہے۔ ان معاملات میں اللہ کو یہ منظور رہا کہ وسوسۂ شیطانی سے مریض القلوب اور سخت دلوں کو آزمائے، بیشک یہ ظالم کفار مخالفت بعید میں ہیں۔" جب دو سو برس کے بعد پیغمبر اور صحابہ کے اقوال خالی حافظہ کے بھروسہ پر لکھے جائیں گے۔ جب ان کی صحت پر تلواریں کھنچ جایا کریں گی تب تو پیغمبر صاحب پر تہمتیں لگیں ہی۔ واضح ہو کہ جو آیتیں میں نے رسول اللہ صلعم کی بشریت کے بارے میں عرض کی ہیں اور وہ آخری آیت جس کی تفسیر میں یہ ہے کہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلعم نے لات و عزیٰ[1] اور منات کی تعریفیں کی ہیں کہ ان سے معاذ اللہ شفاعت کی امید ہے، زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ رسول اللہ پر تہمت ہے اور میرا بیان تو یہ معنی آئینہ کرتا ہے کہ ۔

تقدیر بہ یک ناقہ نشانید دو محمل
سلمیٰ حدوث تو و لیلیٰ قدم را

یا تو ان تفسیر کرنے والوں کو لغو اور بیہودہ کہیے یا "ماینطق عن الھوا" کو قرآن سے نکال ڈالیے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رسول صلعم نعوذ باللہ من ذالک احکام خدا کے خلاف کوئی بات کرتے تھے۔ یا ائمہ اثناعشر کوئی بات خلاف حکم خدا و رسول کرتے تھے یا توبہ توبہ گناہ کے مرتکب ہوتے تھے۔ جب آج بہت سے آدمی موجود ہیں جن کے لیے تعزیرات ہند بیکار سی چیز ہے تو ان پاک ہستیوں کے اوپر کوئی ایسا گمان کیسے کرسکتا ہے، لیکن قرآن شریف میں آیتیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بشر سے غلطیاں ہوسکتی ہیں۔ جب جناب رسالت مآب صلعم کے لیے یہ کہا جاسکے تو تیرہ باقی ائمہ علیہم السلام کے لیے بھی یہی رائے ہوگی۔ مگر نسل کہیے، تربیت کہیے یا خدا کی خاص عنایات کہیے ان بزرگواروں کا برا کہنے والا بہتر فرقوں میں سے کسی کو نہیں سنا۔ خوارج سے میں واقف نہیں ہوں نہ ان کی کوئی کتاب پڑھی ہے لیکن جہاں تک سنا ہے وہ لوگ بھی حضرت عثمانؓ اور

---

1. ملاحظہ ہو، "جارج سیل" اور دوسرے عیسائیوں کا ترجمہ قرآن جہاں سورۂ النجم میں لات و عزیٰ کا ذکر ہے۔ اور سورۂ حج رکوع سات، ریل وغیرہ۔ اس واقعہ کے متعلق بیضاوی، جلال الدین اور یحییٰ وغیرہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ امیر علی نے اسپرٹ آف اسلام یا اپنی تاریخ میں اس پر بحث کی ہے۔۱۲

حضرت علیؓ کی نسبت صرف یہی کہتے ہیں کہ ان حضرات کے وقت میں خانہ جنگیاں ہوئیں۔ اس لیے یہ حضرات رسول پاک صلعمؐ کے نعوذ باللہ خلیفہ برحق نہیں تھے۔ ائمہ اہلبیت علیہم السلام میں ایک بات وجد کرنے کی ہے۔ اکثر حضرات ان میں کے دنیاوی آرام سے کم و بیش محروم رہے۔ مگر ان میں کا ہر فرد صلوٰۃ اللہ علیکم و علی وحد و ابیہ جس حال میں رہا ہمیشہ معلم دین ہی رہا۔ ہادی راہ خدا ہی رہا، اور ان کی وقعت اپنے پرایوں کے دلوں پر سکہ جمائے رہی چاہے تخت خلافت پر ہوں۔ چاہے کربلا کے میدان میں تڑپ رہے ہوں۔ چاہے قید میں ہوں چاہے خانہ نشین ہوں، چاہے حجر اسود کا بوسہ دینے جا رہے ہوں، ولی عہدی ہو کہ وزارت ہو، نظر بندی ہو کہ آزادی ہو، یہاں تک کہ سن رُشد کو بھی نہ پہنچے ہوں ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا تھا ''یہ تو عوام کے گروہ کا فرد نہیں'' اللھم صل علی محمد و آل محمد و بارك وسلم كما صليت و باركت و سلمت علی ابراهيم و علی آل ابراهيم۔ انك حميد مجيد برحمتك يا ارحم الراحمين۔

ایشیا کی تاریخ سے لوگ واقف ہیں۔ دنیا کی تاریخ جانتے ہیں۔ کوئی مثال نہیں ملتی کہ تیرہ پشتوں تک کسی خاندان کے ایسے افراد ہوئے ہوں کہ باوجود زمانہ کی ناسازگاری کے اور باوجود بادِ مخالف کے ان کا وقار یگانے بیگانے اپنے پرائے سب کے دلوں میں رہا ہو۔ گو میں چاہتا تھا کہ دوسروں کے اقوال کو کم لکھوں، مگر اس جگہ مجبور ہو گیا ہوں۔ مرزا محمد سعید صاحب دہلوی کی کتاب ''مذہب و باطنی تعلیم'' سے کچھ نقل کرنا چاہتا ہوں، نقل کرنے کے پہلے اتنا اور عرض کردوں کہ یہ کتاب ایک پڑھے لکھے آدمی کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ دو حضرات کی رائے جو اس کتاب کے متعلق ہے لکھے دیتا ہوں، و ہو ہذا۔

ایک شیعہ فاضل کا قول ہے۔ اس نے تو مذہب شیعہ کی جڑ ہی کاٹ دی۔''

ایک سنی فاضل کا قول ہے ''کتاب تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے اور مصنف نے منصفانہ نظریہ رکھنے کی کوشش کی ہے مگر بعض جگہ کھل گیا ہے کہ مصنف شیعہ ہے'' اگر اور نہیں تو یہی دو رائیں اس کتاب کی راست بازی کی اچھی دلیل ہیں۔

''سیدنا امام جعفر صادق علیہ السلام کی ذات بابرکات اسلامی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اور سیدنا علی اور سیدنا حسین علیہم السلام کے بعد شیعہ تخیلات میں ان کا

تصرف شاید اور ائمہ سے زیادہ نظر آتا ہے امامیہ اثنا عشری ان کو اپنے مذہب کا مدون خیال کرتے ہیں۔ صوفی ان کو مشائخین طریقت میں اعلیٰ مرتبہ دیتے ہیں۔ ان کے تلامذہ کی فہرست میں اہلسنت کے فقہ کے ائما میں ابوحنیفہ اور مالک بن انس معتزلہ کے پیشوا۔ واصل ابن عطا تصوف اور کیمیا کے شہرۂ آفاق عالم جابر ابن حیان جیسے اشخاص کو شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ واقعات کے اعتبار سے ان میں سے بعض اشخاص کی نسبت تلمذ صحیح یا غلط ہو لیکن ایسے روایات اس امر کے شاہد ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کا اپنے معاصرین کے خیالات پر بہت قوی اثر ہوا ہے۔ شیخ فریدالدین عطارؒ نے اپنے تذکرۂ الاولیاء کو تبرکاً اُن کے ذکر سے آغاز کیا ہے اور ان کے کمالات باطنی کے بہت سے شواہد نقل کیے ہیں۔ شہرستانی نے اپنی کتاب ''الملل والنحل'' میں ان کے علمی اکتسابات اور زہد و تقویٰ کا بہت زور و شور سے اور شد و مد سے اقرار کیا ہے۔ غرض کہ مسلمانوں کے تقریباً سب فرقوں کا اس قول پر اتفاق ہے کہ علاوہ نسبی فضیلت کے وہ ایک زبردست شخصیت کے حامل تھے۔ اکثر مقتدیان مذاہب مرنے کے بعد مبالغہ آمیز روایات اور غالی معتقدات کا محور و مرکز بن جاتے ہیں لیکن خطابیہ کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے کہ سیدنا جعفر صادق علیہ السلام اپنی حیات ہی میں الوہیت سے متجلیٰ کر دیے گئے تھے۔ بہت سے معرکۃ الآرا مسائل مثلاً نور رسالت کا مسئلہ ان کی شہادت پر نقل کیے جاتے ہیں۔ شیعہ امامیہ اپنے شرعی معاملات میں ان سے استناد کرتے ہیں اور باطنہ اپنے عجائبات کو ان سے منسوب کرتے ہیں۔ جابر ابن حیان، حضرت ذوالنون مصری اور بہت سے صوفی بزرگ ان کو اسرار خفی و جلی کا معلم قرار دیتے ہیں۔ منجملہ اور علوم غریبہ کے قرآن مجید کی باطنی تاویل جس کا اسمٰعیلی اور صوفی روایات میں ذکر آتا ہے حروف و اعداد سے مستقبل کے حالات معلوم کرنے کا وہ طریقہ جس کو عرف عام میں علم جعفر کہتے ہیں دونوں کا ماخذ سیدنا جعفر صادقؑ کی تعلیم کو تصور کیا جاتا ہے۔

میرے یہ خیالات تو ائمہ معصومین علیہم السلام کے لیے ہیں اور خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے بارے میں برخلاف شیعوں کے سب کو صاحبان ایمان اور خدائے رسول صلعم اور نیک نیت جانتا ہوں۔ جناب امیر علیہ السلام کو اس حیثیت سے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کی گود کے پالے تھے اور شاگرد سعید تھے جن کے بارے میں رسول اللہ نے ایسی ایسی باتیں کہیں

ہیں کہ کسی کے لیے نہیں فرمائیں۔ انھیں سب سے افضل جانتا ہوں مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صفات و فضائل کا بھی دل سے قائل ہوں جو محبت کا درجہ حضرت ابوبکر کو رسول اللہ سے حاصل تھا اور جو عقیدت کی یکسوئی حضرت خلیفۂ اول کو ذات پاک محمدی سے تھی اس کی مثال ذرا ملنا مشکل ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت ہر شخص پریشان تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ پوچھتے تھے ''کیا آپ نبی برحق نہیں ہیں رسول کے گود کے پالے حضرت علیؓ کی کیا مجال تھی کہ اختلاف کرتے مگر انھوں نے بھی عرض کر ہی دیا کہ ''رسول اللہ'' کا لفظ صلح نامہ میں سے میں اپنے ہاتھ سے نہ کاٹوں گا۔ صرف یہی یارِ عتیق تھے جو پوری طرح ساتھ رہے اور بحیثیت ایک وفادار خادم کے یہی فرمایا کیے ''میاں جو کچھ کہتے ہو وہی سچ ہے'' یہ جملہ کسی کتاب کا نہیں ہے بلکہ خود میرے دل کا گڑھا ہوا ہے مگر مجھ کو اس میں کچھ ایسی وفاداری کی تصویر دکھائی دیتی ہے کہ بغیر کہے نہیں رہا گیا۔ ابھی ایک کتاب میں پڑھ رہا تھا کہ احد میں جب رسول کی غلط شہادت کی خبر مشہور ہوگئی تو حضرت عمر کے منہ سے بہ تقاضائے محبت نکل گیا اب ''کیا کریں گے لڑ کر۔'' حضرت ابوبکرؓ نے کہا ''اب کیا کریں گے جی کر۔''[1] جو شخص حضرت علیؓ سے یہ کہہ دے کہ اگر مجھ کو یہ معلوم[2] ہوتا کہ یا علی آپ کو اختلاف ہوگا تو میں خلافت قبول ہی نہ کرتا۔'' جو شخص یہ کہے کہ جب[3] تک سیدہ اس گھر میں موجود ہیں مجھ سے نہ ہوگا کہ علی سے زبردستی کر کے بیعت لوں، اس کی نیت پر کون حملہ کرسکتا ہے۔

ایک بڑے سنی عالم تبحر کی بیٹی خود بھی پڑھی لکھی اور آزاد خیال خاتون ہیں اور تشیع کا ادعا نہیں کرتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے قول پر کہنے لگیں ''اگر ان کا واقعی خیال یہی تھا تو خلافت چھوڑ کیوں نہ دی۔'' میں نے جواب دیا کہ انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ ہر معاملہ میں وہ یہی خیال کرتا ہے کہ جو کام درپیش ہے اس کو میں دوسرے سے اچھا کر لیتا اگر حضرت ابوبکرؓ کے دل میں بھی یہی خیال رہا تو کیا تعجب ہے۔ علاوہ اس کے خلافت قبول کرنے کے بعد اور بیعت لینے کے بعد انتظام کو پھر سے بے انتظام کرنا حکمت عملی، معاہدہ ہر چیز کے خلاف ہوتا۔'' میرے جواب سے وہ خاتون چپ ہوگئیں۔ اس جگہ دل

1. تاریخ اسلام کامل جلد اول صفحہ ۵۸ مصنفہ عبدالقیوم ندوی ۱۲
2. '' روضۃ الاحباب، بحوالہ تاریخ احمدی صفحہ ۱۱۳
3. تاریخ سنی الثعالب شمس الدین بخاری، ابن قتیبہ، ملاحظہ ہو تاریخ احمدی صفحہ ۱۱۶

چاہتا ہے کہ وہ گفتگو بھی نقل کردوں جو میرے اور میرے مرشد مولانا کرامت حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ کے درمیان میں آئی۔ میں نے سوال کیا کہ خلافت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ فرمانے لگے ''میرے خیال میں رسول اللہ صلعم کا دلی منشاء تو یہی تھا کہ میرے بعد علیؓ خلیفہ ہوں مگر چونکہ کوئی صریحی حکم خداوندی اس بارے میں نہیں آیا تھا اس لیے انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ اس کے بعد اپنی طرف سے کہنے لگے۔ میرے خیال میں تو اچھا ہی ہوا کیونکہ حضرت علیؓ سے وہ سب کچھ نہ ہوسکتا جو ہوا'' میرے خیال میں جب انھوں نے یہ کہا تھا تو وہ فتح ایران اور فتح مصر وغیرہ کا خیال کر رہے تھے۔ تاریخ اسلام اور فلسفہ مغربی کے عالم متبحر تھے۔ یہی باتیں مختلف پیراؤں مختلف مباحث کے سلسلے میں ان سے میں اکثر سن چکا تھا۔ اس لیے میرا کلی یقین ہے کہ جب انھوں نے یہ کہا تھا تو دوسری تیسری اور چوتھی خلافتیں ان کے ذہن میں تھیں۔ میری ناچیز رائے میں خود جناب امیر علیہ السلام نے بھی کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ رسول اللہ صلعم ان کو اپنا خلیفہ بنا چکے ہیں۔

حضرت عثمان کے خلیفہ منتخب ہوتے وقت انھوں نے جو دلائل اپنے لیے پیش فرمائے تھے اس کے اوپر حضرات شیعہ بھی اس تیرہ سو برس سے اوپر میں کچھ اضافہ نہ کرسکے۔ مگر ان میں بھی کہیں یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ نے ان کو اپنی حیات ہی میں خلیفہ بنا دیا تھا۔ جو دلائل حضرت علی نے اپنے استحقاق انتخاب پر دیے تھے حسب ذیل ہیں۔

(۱) سابق الایمان

(۲) یا علی انت بمنزلہ ہارون من موسیٰ

(۳) مدینۃ العلم

(۴) قرابت قریبہ

(۵) سورۃ برأت لے کر مکہ جانا

(۶) ہر موقع پر رفاقت

(۷) مواخات

(۸) کسی کو میرے اوپر کبھی امیر بنا کر لڑائی میں نہیں بھیجا

(۹) من کنت مولا فہذا علی مولا

(۱۰) دعوت عشیرہ

(۱۱) ان سب سے بڑھ کر آیت مباہلہ[1] ہے جہاں ''انفسنا و انفسکم'' آیا ہے۔ ان سب دلائل میں کہیں بھی نہیں ہے کہ آنحضرتؐ اپنی زندگی ہی میں جناب امیر کو خلافت عطا کر چکے تھے۔ دعوت عشیرہ سب سے زیادہ مضبوط دلیل ہے۔ لیکن بائیس تیئس سال میں پھر اس واقعہ کی تصدیق نہیں فرمائی گئی۔ اور باوجود دعوت عشیرہ والی روایت کے بھی جناب امیر علیہ السلام نے کبھی نہیں فرمایا کہ ہم کو آنحضرتؐ خلیفہ بنا چکے ہیں۔ رہا اخلاقی ثبوت وہ تو ہر جگہ شروع ہی سے موجود ہے۔ سوائے اس کے کہ رسالت مآب نے امت کا حق انتخاب باقی رکھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے صفات میرے دماغ میں حسب ذیل ہیں۔ ایمان کی مضبوطی، ارادہ کا استقلال، خود اپنے نفس سے بے پروائی، دولت سے استغنٰی، مساوات کے اصول پر اٹل رہنا، اسلام سے محبت، جس دن حضرت عمر اسلام لائے اس دن سے کھلم کھلا مکہ میں اسلام برتا جانے لگا، جتنے خدمات اسلام کے فتوحات وغیرہ کے پہلو سے حضرت عمر کے ہیں اور کسی کے نہیں۔ یروشلم کی فتح کے بعد فاتح کا شہر کے اندر اس طرح سے داخل ہونا کہ غلام سوار ہو اور خلیفہ پیدل ہو مساوات کی بہترین مثال ہے۔ لیکن حضرات! وہ یار عتیق والی بات نہیں تھی۔ گو حضرت ابوبکرؓ بھی زیادہ سن میں مسلمان ہوئے مگر ان کی خصوصیتوں کا کیا کہنا۔

حضرت عمرؓ کے دل پر عرب کی قدیم نملی حکومت کا بہت گہرا اثر تھا اور جس کی تطبیق وہ اسلامی اصول سے ہمیشہ کیا کیے۔ عرب میں قحطان، عدنان اور حضرت اسمٰعیل کے وقت سے جمہوری طرز حکومت چلا آتا تھا۔ یہ لوگ اس پر فخر کرتے تھے کہ ہمارے اشعار ہمارے قوانین ہیں یعنی جو شعر جمہور کو پسند آ گیا وہی ہمارا قانون ہو گیا اور ہماری پگڑیاں ہمارے تاج ہیں۔ یعنی ہمارے ملک میں بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ خدا کا کرنا ایسا کہ اسی ملک میں ایسا انسان فوق الانسان پیدا کر دیا گیا جس نے نہ صرف جسموں پر بلکہ دلوں پر بھی حکومت کی

---

[1] فمن حاجك فيه من بعد جاء ك من العلم فقل تعالوندع ابنائنا و ابناء كم و نساء نا و نساء كم و انفسنا و انفسكم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله على الكذبين۔ ۶۱۔ (سورۂ آل عمران)

اور اس کے سامنے سبھی نے خوشی سے سر جھکائے مگر جن لوگوں کو قربِ رسالت نصیب ہوا تھا ان میں بھی گو نورِ ایمان کی روشنی جاہلیت کے اندھیرے کو دور کیے ہوئے تھی مگر شعور باطنی تو اسلامی مساوات کی تطبیق قدیم مساوات سے کیا ہی کرتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کسی خاندان کی دوامی حکومت عرب کو فطرتاً ناگوار تھی۔ باغ فدک جو حضرت ابوبکر صدیقؓ جناب سیدہ صلوٰت اللہ علیہا کو دے رہے تھے مگر حضرت عمرؓ[1] نے روک دیا۔خود اپنے بیٹے کو باوجود اہل ہونے کے خلیفہ نہ مقرر کرنا، اپنے ایک دوسرے بیٹے پر حد جاری کرنا، یہ سب اسی نملی حکومت کے ذیل میں آتا ہے۔ حضرت علیؓ[2] سے بیعت لیے جانے پر اصرار اور حضرت ابوبکرؓ کا رکنا یہ سب میرے خیال کی تائید کرتے ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ انسان ہی تھے۔ معصوم تو تھے نہیں، پھر باوجود اچھے آدمی ہونے کے طبائع کا اختلاف اپنا اثر دکھاتا ہی رہتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو کیا وہ انھیں کی افتادِ طبیعت کا نتیجہ تھا۔ امام حسن علیہ السلام نے جو کیا وہ وہی کر سکتے تھے، امام حسین علیہ السلام نے جو کربلا میں دکھایا وہ انھیں کا حصہ تھا۔ اسی طرح حضرت عمر کو بھی سمجھ لیجیے کہ ان کے دل میں بھی ملک کی محبت، رسول کی محبت اسلام کی محبت ہر چیز اسی طرح بروئے کار آئی جیسی افتاد طبیعت تھی، ان سب چیزوں پر غور کرنے کے بعد ''میں'' (''جس کی تربیت شیعہ ہوئی ہے'') اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہوں کہ اہلبیت سے حضرت عمر فاروقؓ کو ایک طرح کی کدسی ہوگئی تھی۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ مجھ کو اپنی طبیعت کے خلاف ایسی بات لکھنی پڑی جو زیادہ مسلمانوں کو بری لگے گی۔ مگر میں بھی اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہوں۔ جو مکالمہ حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عمر کے درمیان میں آیا وہ میرے خیال کی صرف تائید ہی نہیں کرتا بلکہ نقش اور گہرا کر دیتا ہے۔ یہ واقعہ طبری میں ہے اور تاریخ کامل ابن اثر جذری میں ہے۔ میں مولانا شبلی کی الفاروق سے ایک جزو نقل کر رہا ہوں مفصل روایت طبری میں پڑھ لیجیے۔ مفصل نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مبحث کچھ خوشگوار نہیں بعض سخت جملہ ہیں جو مولانا شبلی چھوڑ گئے ہیں۔ مثلاً حضرت عمر کا کراہت کا لفظ استعمال کرنا اور حضرت عبداللہ

---

1. تاریخ احمدی صفحہ ۱۱۸ برہان الدین حلبی نے سیر الحلبی بحوالہ کلام سید ابن جوزی سے نقل کیا ہے۔۱۲

2. مورخ ابن قتیبہ۔ ملاحظہ ہو تاریخ احمدی صفحہ ۱۱۷

ابن عباس کا "ذالك بانهم كرهوا ما انزل الله فاحبط اعمالهم"۔ پڑھنا اور حضرت عمرؓ کا ''حسد'' کا لفظ بنی ہاشم کے لیے استعمال کرنے پر حضرت عبداللہ ابن عباس کا آیۂ تطہیر پڑھنا اگر پوری روایت تاریخ طبری اور تاریخ کامل ابن اثیر جزری میں پڑھیے تو میرے خیال کا پتہ چلتا ہے۔ اور نیز یہ بھی کہ مساوات کا جو جذبہ حضرت عمر میں ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ اب مکالمہ ملاحظہ ہو۔

حضرت عمر: کیوں عبداللہ ابن عباس، علی تمھارے ساتھ کیوں نہیں شریک ہوئے؟

عبداللہ ابن عباس: میں نہیں جانتا۔

حضرت عمر: تمھارے باپ رسول اللہ کے چچا اور تم رسول اللہ کے چچیرے بھائی ہو، پھر تمھاری قوم تمھاری طرف داری کیوں نہیں کرتی؟

حضرت عبداللہ ابن عباس: میں نہیں جانتا۔

حضرت عمرؓ: لیکن میں جانتا ہوں، تمھاری قوم تمھارا سردار ہونا گوارا نہیں کرتی۔

حضرت عبداللہ ابن عباس: کیوں؟

حضرت عمرؓ: وہ یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ ایک ہی خاندان میں نبوت اور خلافت دونوں آجائیں۔ شاید تم یہ کہو گے کہ حضرت ابوبکر نے تم کو خلافت سے محروم کردیا۔ لیکن خدا کی قسم یہ بات نہیں۔ ابوبکر نے وہ کیا جس سے زیادہ مناسب کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر وہ تم کو خلافت دینا بھی چاہتے تو ان کا ایسا کرنا تمھارے حق میں کچھ بھی مفید نہ ہوتا۔

دوسرا مکالمہ[1]

حضرت عمرؓ: کیوں عبداللہ ابن عباس تمھاری نسبت میں بعض بعض باتیں سنا کرتا تھا لیکن میں نے اس خیال سے اس کی تحقیق نہیں کی کہ تمھاری عزت میری نظروں میں کم نہ ہوجائے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس: وہ کیا باتیں ہیں؟

1۔ ملاحظہ ہو الفاروق حصہ اول صفحہ ۲۰۲۔۲۰۵ مطبوعہ نامی پریس کانپور ۱۸۹۹ بار دوم

حضرت عمرؓ: میں نے سنا ہے کہ تم کہتے ہو کہ لوگوں نے ہمارے خاندان سے خلافت حسداً اور ظلماً چھین لی۔

حضرت عبداللہ ابن عباس: ظلماً کی نسبت تو میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ یہ بات کسی پر مخفی نہیں لیکن حسداً تو اس کا تعجب کیا ہے۔ ابلیس نے آدم پر حسد کیا اور ہم لوگ آدم ہی کی اولاد ہیں۔ پھر محسود ہوں تو کیا تعجب ہے۔

حضرت عمرؓ: افسوس خاندان بنی ہاشم کے دلوں سے پرانے رنج اور کینے نہ جائیں گے۔

عبداللہ ابن عباس: ایسی بات نہ کہیے۔ رسول اللہ صلعم بھی ہاشمی ہی تھے۔

حضرت عمرؓ: اس تذکرہ کو جانے دو۔

عبداللہ ابن عباس: بہت مناسب۔

گو بہت سی باتوں میں پتہ چلتا ہے کہ وہ اہلبیت کا حفظ مراتب کرتے تھے۔ مگر پھر بھی میرا خیال جو عرض کیا گیا ہے وہ باقی ہی ہے۔ میرے خیالات مختلف کتب پڑھ کر پیدا ہوئے۔ جیسے تاریخ طبری، تاریخ کامل اور ابوالداء وغیرہ کے حوالہ جات ہیں۔ مگر میں اس سے زیادہ ان کے دلائل لکھنا نہیں چاہتا ہوں۔ میں تو صرف لوگوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میرے عقائد اس طرح کے ہیں۔ ہر شخص اپنی قبر میں جانے والا ہے اور ہر شخص رحم وعفو کا خواستگار اور محتاج ہے۔ خدا ہر شخص کو ہدایت دے اور مجھ کو بھی ہدایت دے۔ آمین

O

چھٹا باب

اپنے خیالات کی تائید میں ایک بات اور عرض کردوں۔ اس کے بعد آگے چلوں۔ وہ ابن عباس والی روایت جو ہر جگہ موجود ہے یعنی ''حدیث قرطاس'' وہ دل میں ایسی کھٹکتی ہے کہ میرے مخالف خیالات موافق نہیں ہونے پاتے۔ مولانا شبلی مرحوم نے زیادہ تر اس واقعہ کی تردید کرنی چاہی ہے۔ مگر تیرہ سو برس کے بعد عقلاً تردید کرنا جبکہ فرق اسلام کا مدار نقل کے اوپر ہو کچھ لگتی ہوئی بات نہیں۔ طبرانی میں یہ روایت حضرت عمرؓ سے مسلم میں، بخاری میں، مسند احمد بن حنبل میں، شرح شفائی قاضی عیاض میں جس کو شہاب الدین خفاجی نے لکھا ہے۔ علامہ شہرستانی کی ملل النحل میں جس تحقیقات سے ان حضرات نے لکھا ہے وہ شاید علامہ شبلی کی تحقیقات سے کم نہ رہی ہوں گی۔ زمانہ کی قربت کی وجہ سے ان لوگوں کو شاید کچھ آسانیاں بھی شبلی مرحوم سے زیادہ رہی ہوں گی۔ خود مولانا شبلی نے اس روایت پر نظر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ''حضرت عبداللہ ابن عباس کی عمر اس وقت تیرہ چودہ برس کی تھی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس اس جگہ موجود نہ تھے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ انھوں نے کس سے سنا تھا۔'' پھر حاشیہ پر ارشاد ہوتا ہے کہ ''بخاری میں جو حدیث مذکور ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس اس واقعہ میں موجود تھے۔ اس لیے محدثین نے اس پر بحث کی ہے اور بہ دلائل قطعیہ ثابت کیا ہے کہ وہ موجود نہ تھے۔'' اس کے بعد فرماتے ہیں کہ لوگوں نے درائت سے کام نہیں لیا۔'' خود درائت سے کام لیتے اور کہتے ہیں۔ ''گو صرف صحیح بخاری میں سات طریقوں سے مذکور ہے باینہہ بجز عبداللہ ابن عباس کے اور کسی صحابی سے اس واقعہ سے متعلق ایک حرف بھی منقول نہیں ہے۔'' میں عرض کرتا ہوں کہ یہی غنیمت ہے کہ عبداللہ ابن عباس ہی سے منقول ہے۔

رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی جس پارٹی کی حکومت جن کا اثر اور جن حضرات کا

اختیار ہوا ان میں سے اگر کسی اور صحابی نے نہیں لکھا تو کیا تعجب ہے۔ آیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ کسی صحابی نے اتنے بڑے اہم واقعہ کی، اتنی بڑی تہمت کی تردید بھی کی کہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے غلط کہا ہے۔ میں اصول درایت سے واقف نہیں ہوں لیکن معمولی عقل رکھتا ہوں، اتنے بڑے الزام کی تردید نہ ہونا اور خصوصاً اس وقت میں جبکہ خود اسی پارٹی کی حکومت ہو، اتنے بڑے فرد پر اتنا بڑا اعتراض عائد کیا جائے اور وہ نظری کردیا جائے، کہاں تک عرض کروں۔ مولانا شبلی نے بھی آخر میں لکھ دیا ''لیکن مشکل یہ ہے کہ صحیح بخاری وغیرہ میں اس قسم کی تصریحات موجود ہیں جو ہمارے اس قیاس سے مطابق نہیں ہوسکتیں۔'' میں تو کہوں گا کہ مولانا شبلی مرحوم نے اس بات میں ذری دیر کردی۔ اس لیے دل چاہتا ہے کہ مولانا کے بارے میں کچھ عرض کردوں۔

شبلی مرحوم کی تصانیف دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ ایک وہ جو مولانا کے سفر مصر و شام وغیرہ کے پہلے لکھی گئیں، جیسے المامون وغیرہ جس میں ہر مسئلہ کے دونوں پہلوؤں پر نظر کی گئی ہے اور دوسری وہ جو بعد کو شائع ہوئیں۔ سیاحت کے پہلے شبلی نعمانی صاحب ویسے ہی مولوی تھے جیسے ہوا کرتے ہیں۔ اس سفر نے مولانا کی آنکھیں کھول دیں۔ ابن خلدون نے تاریخ کا مقدمہ لکھ کر یورپ بھر کو تاریخ کی تعلیم دی تھی۔ ابن خلدون کی کتابیں تو ہر مولوی پڑھتا رہا تھا مگر اس فلسفہ کو یورپ نے ہم سے پہلے اختیار کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی تاریخ ملک کی تاریخ نہ رہی بلکہ اس پارٹی کی تاریخ ہوگئی جس پارٹی کے ممبر نے وہ تاریخ لکھی ہو۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے ایچ جی ویلس نے دنیا کی تاریخ لکھی ہے جوصرف سوشلسٹ کی عینک سے دیکھی جاسکتی ہے۔ بہت دن ہوئے میکالے نے انگلستان کی تاریخ لکھی تھی جو خود ان کے زمانہ میں ''وگ رسالہ'' کے نام سے طنزیہ مشہور ہوئی تھی۔ ابھی جواہر لال نہرو نے ''ڈسکوری آف انڈیا'' لکھی ہے جس نے قدیم ہندستانی تہذیب کو ان صفات سے آراستہ کیا ہے جو آج بھی ڈھونڈھے نہیں ملتے۔ سمجھانے کے لیے عرض کردوں، ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک مرثیہ جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کے قربانی وہی، حق پرستی وہی، آن بان وہی، ہر چیز وہی، مگر روس کی سوویت کو امام حسین علیہ السلام کے کارنامے بیان کرکے اور قوی کردیا

ہے۔ درائت کا کمال یہی ہے جس کے موجد ابن خلدون تھے۔ خود اللہ بخشے ابن خلدون جیسے تھے وہ ان کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ جعل انھوں نے بنایا۔ اغلام کی تہمت ان کو لگی، خودغرضی، بے وفائی، نمک حرامی، ابن الوقتی، تعصب، سلامتی سب ہی باتوں کا ذکر سوانح حیات[1] میں موجود ہے۔ دو برس جیل خانہ کو بھی جلوہ خانہ بنایا۔ گو آدمی کی تصانیف اور آدمی کے افعال دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں مگر پھر بھی برتن سے وہی رسے گا جو اس میں ہوگا۔ ان کے تقریباً سو برس بعد اٹلی میں میکاولی ہوئے۔ جن کا نام تاریخ سیاست میں آج تک موجود ہی نہیں بلکہ جو آدمی پولٹیکل چالوں سے آراستہ ہوتا ہے۔ اس کو لوگ آج بھی میکاوَلی کہتے ہیں۔ اس کے صرف دو اقوال ''مشتے نمونہ خروارے'' عرض کرتا ہوں۔ ''آدمی کو زبان اس لیے دی گئی ہے کہ اپنے راز کو چھپائے، نہ یہ کہ ظاہر کرے۔'' بادشاہ کو جو قید کرے اور مار نہ ڈالے وہ خود واجب القتل[2] ہے۔'' مورخین ان کا موازنہ ابن خلدون سے کرتے ہیں اور ہر جگہ الفضل للمتقدم کے قائل ہیں۔

مولانا شبلی مرحوم انگریزی تو جانتے نہ تھے۔ جب انھوں نے فلسفہ تاریخ ابن خلدون قسطنطنیہ اور مصر وغیرہ میں عملاً برتے جاتے دیکھا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور اسی رنگ میں رنگ گئے۔ اس کے پہلے سرسید مرحوم نے قرآن پاک کی تفسیر بالرائے کرنے میں بھی یہی کیا تھا۔ مگر مولانا شبلی نے جس پابندی اور خوبصورتی سے اس کو برتا وہ انھیں کا حصہ تھا۔[3] اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیرہ سو برس بعد حدیث قرطاس غلط ہوگئی اور حضرت علی شراب پی کر نماز میں کچھ کا کچھ پڑھا گئے گو پہلے بھی یہ ہو چکا تھا کہ حضرت علی نے ریشمی یا مخطط کرتا پہن لیا تھا اور ایک لڑائی میں کفار کو جلا دیا تھا، مگر پہلے یہ باتیں اس فلسفیانہ انداز میں کم تھیں۔ ہمارے بچپن میں ہر موقع پر پہلے حضرت ابوبکر صدیق کا نام آتا تھا تب حضرت عمرؓ کا۔ جب سے مولانا شبلی سفر سے آئے لوگ ہر معاملہ میں پہلے حضرت عمرؓ ہی کا نام لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب دل کے اندر کوئی برا ایسا کہنے لگتا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق کا بھی

---

1. ملاحظہ ہو ابن خلدون مرتبہ ایم اے، اینان، اسسٹنٹ ڈائرکٹر صیغۂ مطابع وزارت داخلہ قاہرہ، اول لکچرار صیغۂ ادب۔ فواد یونیورسٹی مصر، صفحہ ۲۹۔۱۷۔۴۷۔۱۰۹ وغیرہ نیز انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔
2. میکاولی کی کتاب ''دی پرنس......''
3. سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۱۱۳

نام آجاتا ہے۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ سب خلفاء رضوان اللہ علیہم کا۔ اب مولوی شبلی اور ابن خلدون کی برکت سے ہر جگہ ہر بات میں حضرت عمر ہی کا نام پہلے آتا ہے۔ واقعی حضرت خلیفہ ثانی کے کارنامہ ایسے ہی ہیں۔ مولانا شبلی کے سفر کے پہلے کی کتابیں جیسے المامون اور بعد کی کتابیں جیسے الفاروق پڑھ کر ان کے فرق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے میرے خیال کی غلطی یا صحت کا حال معلوم ہوجائے۔ مولانا نے سیرۃ میں ''وانذر عشیرتک الاقربین[3]'' کے ذکر میں جس خوبصورتی کے ساتھ اختصار سے کام لیا ہے وہ قابل غور ہے۔ ممکن ہے قابل تاسف بھی ہو، اسلام کی تاریخ میں روایتوں کا توڑ کبھی نہیں رہا جس طرح کی خبر چاہیں مہیا کرلیں۔ بقول اکبرالہ آبادی مرحوم ؎

مرے قرآن پڑھنے سے نہ ہوں یوں بدگماں حضرت
مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے

جس مزاج کا لکھنے والا ہوا اسی طرح کا مواد موجود ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ حضرت علی کی شراب پینے والی روایت سیدھی سیدھی لکھ دی گئی اور حدیث قرطاس جس کو سب نے لکھا ہے اس میں تمام اصول درائت پیش ہوگئے۔ راقم ایک کم علم آدمی ہے اور مولانا شبلی پر تنقید کر رہا ہے مگر شرط انصاف یہ ہے کہ خالی اس دلیل پر میری بات رد نہ کردی جائے۔ خود الفاروق کے دیباچہ میں مولانا نے جن جن باتوں کی رد کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اصول درائت کی توضیح کے سلسلہ میں جن تفصیلات کا ذکر کیا ہے جو تاریخ میں در آئے ہیں اور جن کا درست کرنا یا سدھارنا راوی کا فرض بتایا گیا ہے۔ اس کو ناظرین صرف یہی نہیں کہ عبارت ہی پڑھ لیں بلکہ بین السطور جہاں معنی لکھے ہوتے ہیں ان پر بھی غور کریں اور یہ دیکھیں کہ مولانا نے کن باتوں کے رد کرنے کا تہیہ کیا ہے تو تعجب کیا ہے کہ میرا خیال چادر ہوا نہ معلوم ہو۔ اکبرالہ آبادی مرحوم کا قطعہ ملاحظہ ہو ؎

سب واقعات دہر کہاں ہسٹری میں ہیں — فوٹو ہے صرف سطح پیش نگاہ کا
وہ بھی فقط خیال مصنف بقید خود — کیا بن سکے چراغ ہدایت کی راہ کا

---

3 سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۲۶۳۔۲۶۳

4 یہ واقعہ اتنی تاریخوں میں مذکور ہے کہ سب کے نام لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ابوالفداء، طبری، تاریخ کامل وغیرہ۔

میرے پڑھنے والے کہتے ہوں گے کہ لکھنے والا تشیع کی عصبیت سے یہ کچھ لکھ رہا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ میری تربیت شیعہ ہوئی ہے۔ مگر میری آرزو ہمیشہ یہ رہی کہ بجائے شیعہ سنی ہونے کے مجھ کو خدا توفیق دیتا کہ میں مسلمان ہوتا۔ میں حضرت عمرؓ کا بڑا معترف ہوں گو حضرت ابوبکر صدیقؓ کا زیادہ معترف ہوں، حضرت عمرؓ کے بارے میں صرف دو باتیں ہیں جو میرے دل میں کھٹکا کرتی ہیں۔ ایک تو وہی جو میں عرض کر چکا ہوں یعنی خلیفہ ثانی کی اہلِ بیت اور بنی ہاشم سے ایک طرح کی کد تھی۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان حضرات میں مذہب کے معاملات میں تعاون نہ تھا۔ لیکن میرا عقیدہ یہ ضرور ہے کہ حضرت عمرؓ ان حضرات کے صاحب اختیار ہونے کے خلاف ضرور تھے۔ دوسری بات یہ کھٹکتی ہے کہ اگر آنحضرت صلعم دس بارہ برس اور جی جاتے آیا تب بھی اسی قدر فتوحات ہوتیں؟ اتنی فتوحات اور اسلام کی اتنی ترقی جو حضرت خلیفہ ثانی کے عہد میں ہوئی شاید ہی کسی تاریخ میں اس کی مثال ملتی ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا یہ سب فتوحات ہمیشہ دفاع کی صورت میں حاصل کی گئیں؟ میں تاریخ سے زیادہ واقف نہیں ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ جب دوسری قومیں بانی اسلام پر اعتراض کرتی ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا تو یہی جواب دیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ دفاع کی لڑائیاں لڑے، جب نہاوند کی عظیم الشان مہم کے لیے مجلس شوریٰ کا عام اجلاس ہوا تو حضرت عمرؓ نے کہا ''اگر آپ لوگ ہماری مدد نہ کریں گے تو کون کرے گا'' حضرت ابوہریرہؓ نے کہا ''ہم آپ کی مدد کریں گے۔'' مگر حضرت ابوعبیدہ نے کہا ''اے عمر! تم رسول کے اصحاب کو دنیا میں آلودہ کرنا چاہتے ہو اور حضرت عمرؓ نے صرف یہ جواب دیا ''میں ان بزرگوں سے نہ مدد لوں تو کس سے لوں۔''[1]

ہم شیعہ تربیت کے آدمی آرام کرسی پر بیٹھے جسارت کی باتیں منہ سے نکال رہے ہیں۔ جس پر پڑے وہی جانے۔ اگر بفرض محال ہم صحیح بھی ہوں تو تمام فتوحات میں صرف خطاء اجتہادی ہی ٹھہرے گی۔ اللہ مجھ کو معاف کرے اور حضرت عمر کو بھی معاف کریں۔ میرے دل میں جو تھا وہ اگر نہ لکھتا تو میرا دل مجھ کو برا کہتا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ حضرت عمر ہمیشہ ہر مسلمان کو آزادی سے اظہار خیال کی اجازت دیا کرتے تھے اور ٹھنڈے کلیجہ سن

1۔ الفاروق جلد دوم، صفحہ ۲۸۔۲۹

لینے کی کوشش کرتے تھے۔ ایران کے سلسلہ میں انھوں نے خود فرمایا ہے کہ "ہمارے اور فارس کے بیچ میں آتشیں پہاڑ حائل ہوتا تو اچھا ہوتا"[1] اس کے آگے مولانا شبلی لکھتے ہیں "لیکن فارس سے ایک اتفاقی طور پر جنگ چھڑ گئی۔" ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ اگر وہی آتشیں پہاڑ حائل رہتا تو آج مسلمانوں میں تشیع اور تصوف کا زور نہ ہوتا جس نے اسلام کو بہت کچھ بدل دیا۔ سب کہنے کے بعد اتنا اور عرض کردوں کہ اسلام کی عظمت و جبروت کے بارے میں جو حضرت عمرؓ کا احسان نہ مانے وہ ہٹ دھرم ہے۔

اب ابن خلدون کی برکت سے ہر پہلو سے بات ٹھیک ہوگئی۔ کچھ عجیب قصہ ہے۔ جناب امیر علیہ السلام رسول اللہ صلعم کی گود میں پلے، سعید ازلی تھے۔ خاکم بدہن کوئی پسر نوح کا انداز نہ تھا کہ تعلیم کا اثر نہ قبول کریں۔ مگر جب اس طرح کی لغزشیں ہوتی تھیں تو انھیں سے ہوتی تھیں لیکن جو کفر کی زندگیاں بسر کرچکے تھے وہ ان لغزشوں سے پاک تھے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ حضرت علی معصوم تھے۔ اگر اس قسم کی لغزشیں بیان کی جائیں جیسے حضرت ابوذر غفاری کو رخصت کرتے جاتے ہوئے عمر عاص کی سواری کو کوڑا مار دینا تو میری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی تعجب نہیں جو ایسا ہوا ہو لیکن جس وقت عرب[2] میں بھی نیک لوگ تھے جو شراب چھوڑ چکے تھے اور جب حضرت عمر[3] تین بار شراب کے بارے میں پوچھیں اور ہر بار آیۃ اترے اور باوجود پہلا حکم آنے کے رسولؐ کے شاگرد خاص حضرت علی[4] ہی شراب پی کر نماز میں کچھ کا کچھ پڑھا جائیں تو اس کو چاہے امام بخاری یقین کریں چاہے مولوی شبلی یقین کریں، چاہے ابن خلدون میں تو نہیں یقین کرسکتا۔

مولانا نے سیرۃ النبی میں "وانذر عشیرتك الاقربین" کا ذکر صفحہ ۱۸۷ حصہ اول پر کیا ہے مگر جس خوبصورتی کے ساتھ اختصار سے کام لیا ہے وہ قابل غور ہے۔ حالانکہ یہ اہم واقعہ تاریخ احمدی کی رو سے تفسیر معالم التنزیل میں منقول ہے اور دوسری کتابوں میں بھی اور میرے خیال کو مضبوط کرتا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم وہی ابن خلدون والی سنت برتتے

---

1. الفاروق حصہ اول صفحہ ۱۸۶
2. سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۱۱۲
3. سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۱۱۲
4. الفاروق جلد اول صفحہ ۴۲

ہیں اور حضرت علیؓ کے مناقب بچا جاتے ہیں، ابن خلدون کی سنت سے میرا مطلب یہ ہے کہ اصول درائت جو ابن خلدون نے سکھائے ہیں۔ دعوت عشیرہ والی روایت میں یہ اختصار اور حدیث قرطاس میں یہ پھیلاؤ ہی ابن خلدون کے تتبع کے خیال کو اور مضبوط کرتا ہے۔ پھر سب سے زیادہ کمال تو یہ کردیا ہے کہ شروع بحث میں عبداللہ ابن عباس کا کمسن ہونا اور اس موقع پر موجود نہ ہونا ثابت کرکے پوری روایت کو ختم کردیا ہے اور آخر میں یہ فرما دیا ہے ''لیکن مشکل یہ ہے کہ صحیح بخاری وغیرہ میں اس قسم کی تصریحات موجود ہیں جو ہمارے اس خیال سے مطابق نہیں ہوسکتیں۔''[1]

میرے پڑھنے والے!! خدا کے لیے یہ غور فرمائیں۔ حدیث قرطاس دفن کرچکے مگر صحیح بخاری کو باوجود اس تردید کے جو صحیح بخاری کی فرمائی گئی ہے، مسلم رکھا تاکہ آئندہ جب ضرورت پڑے تو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ صحیح بخاری ''اصح الکتب'' بعد کلام باری نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ درائت کی یہ نازک خیالیاں اور باریکیاں اب آپ کی سمجھ میں آگئی ہوں گی۔ ''جے ابن خلدون کی۔'' ابن خلدون نے درائت کو مستقل علم تو بنا دیا مگر یہ خیال نہ کیجیے گا کہ یہ فن بھونڈے طریقہ سے تاریخ اسلام میں نہیں برتا جاتا تھا۔ یہی درائت کی مشقیں تھیں جن سے "والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم۔ الخ کی آیت سے چاروں خلافتوں کا علی الترتیب قرآن میں پہلے سے آچکنا ثابت کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس آیت سے خلافتوں کی پیشین گوئی نکالنا شاعری برتنے والوں کی بزرگی ہے اور کیا کہوں۔ اگر یہ پیشین گوئی مان بھی لی جائے تو یہ آیت جن حضرات کے لیے آئی ہوگی ان کو اس کی تفسیر کی خبر آنحضرت صلعم ہی سے معلوم ہوچکی ہوگی مگر یہ دلیل ان حضرات نے کہیں پیش نہیں کی کہیں ارتداد کے پھیلنے کا ڈر بیان کیا گیا، کہیں طوائف الملوکی سے حفظ ماتقدم کی دلیل دی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہاں تک فرمایا کہ ''یا علی اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ تم اس کے خلاف ہوگے تو میں اس کو قبول ہی نہ کرتا۔'' یہ بھی فرمایا گیا کہ تمھاری قوم تمھارا سردار ہونا گوارا نہیں کرتی تھی اور یہ پسند نہیں کرتی تھی کہ نبوت اور خلافت ایک ہی خاندان میں آجائے۔ مگر خدا کا حکم بہ نص صریح کی مسکت دلیل کسی صاحب نے نہ پیش کی۔ پھر بھی

---

1. الفاروق حصہ اول صفحہ ۶۵

آج اسی آیت سے استدلال کیا جاتا ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ شیعہ حضرات سنیوں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ انھوں نے بھی قرآن شریف کا معتد بہ حصہ حضرت علی کے مناقب کے لیے وقف کردیا ہے۔ انما ولی کم الله و رسوله" الخ میں بیان کرتے ہیں کہ نماز پڑھنے میں سائل کو انگوٹھی دے دی۔ اس پر یہ آیت اتری۔ جس شخص کے پاؤں سے تیر نکال لیا جائے اور اس کو خبر نہ ہو وہی شخص نماز میں انگوٹھی دینے کا کثیر کام کر بیٹھے۔ میری سمجھ سے تو باہر ہے۔ عبداللہ ابن یوسف علی کے ایسے لوگ تو ایسی آیتوں کو ہر ایسے مسلمان کے حق میں تصور کرتے ہیں جس کو اللہ ان نیکیوں کی توفیق دے۔ مگر حضرات شیعہ اور حضرات اہلِ سنت سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ ہم بن پڑھے لکھے آدمی چپ ہیں۔ حالانکہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس کو معمولی عقل والا بھی سمجھ لیتا ہے۔ افسوس ہے کہ میں اس رسالہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں مجمل ہی ہے۔ اگر کوئی صاحب چاہیں تو تاریخ کی کتابیں پڑھ کر وضاحت کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ میں تو اپنے دلی معیار کا اظہار کر رہا ہوں۔ لوگوں کو شیعہ سنّی یا صوفی نہیں بنا رہا ہوں۔ مولانا نے ایک جگہ ہم کو مرعوب کرنے کے لیے فرمایا ہے ''جو علم الرجال سے واقف ہیں'' الخ۔ علم الرجال کا ایسا مہتم بالشان نام ہم ایسے جاہلوں کا منھ بند کردینے کو کافی ہے۔ مگر جو حضرات جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ علم الرجال میں بڑے بڑوں کے نام ہیں جن کو دوسروں نے ناقابل اعتبار مانا ہے۔ مگر پھر بھی امید رکھتا ہوں کہ اگر پیچ و تاب کھا کر زیادتی کر گیا ہوں تو مولانا شبلی مجھے معاف کریں۔ اللہ مجھے معاف کرے اور آپ بھی درگذر کی کوشش کیجیے۔

خیر بھائی ہوگا۔ کسی کی خامیوں سے اس کی نیکی پر پانی نہیں پھر سکتا۔ ہر شخص کو پیش خدا اپنا حساب دینا ہے۔ ''تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو'' کوئی نص صریح تو تھی نہیں کہ حضرت علی خلیفہ کردیے گئے۔ ہم خود اس وقت موجود نہ تھے۔ لیکن اگر حدیث قرطاس والی بات صحیح ہے تو ہم تو اس کو اچھا کہہ نہیں سکتے۔ رسول اللہ بیمار ہوں، سلیقہ کی بات فرمائیں، اور کہا جائے کہ بیماری کی شدت میں فرما رہے ہیں۔ تو ہم تو یقین کر سکتے نہیں۔ چاہے گلا ہی کٹ جائے۔ بات ناگوار قسم کی ہے۔ اس لیے ختم کرتا ہوں۔ اتنا اور عرض کرنے کو دل چاہتا ہے کہ مولانا شبلی مورخ تو اچھے تھے ہی اگر وکیل ہوتے تو اور اچھے ہوتے۔

حضرت عثمان کی نیکی، نیک دلی، سخاوت، رسول مقبول سے محبت ایسی چیزیں ہیں جن کی تعریف جتنی کی جائے کم ہے۔ انتظام ان کے وقت میں اچھا نہ ہوا۔ اس سے خود ان کو جو تکلیف ہوئی ظاہر ہے۔ مروان اور دوسرے بنی امیہ کے اختیارات وسیع ہو گئے۔ جن کو رسول خدا صلعم شہر سے نکال چکے تھے وہ واپس آ گئے۔ جن کو رسول صلعم قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یعنی ابوذر غفاری جیسے لوگ باہر بھیج دیے گئے۔ ملک میں طوائف الملوکی ہوگئی۔ میں تو بس یہ کہوں گا کہ شوریٰ میں آدمی ہی ایسے رکھے گئے تھے کہ یہی ہو کے رہتا۔ اگر ان آدمیوں میں مقداد، جابر یا دوسرے جو تجہیز و تکفین رسول اللہ صلعم میں شریک تھے ہوتے یا عمار رضوان اللہ علیہم کے ایسے لوگ رکھے جاتے تو خلیفہ رسول کی شہادت نہ ہوتی۔ نہ ضعیف العمری میں رسول کا ایک چاہنے والا دنیا میں یہ تکلیفیں اٹھا کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہوتا۔ حضرت عثمان غنیؓ کے ذمہ جتنے الزامات لگائے جاتے ہیں ان میں اخلاقی ذمہ داری ان کی رہی ہو مگر عملی ذمہ داری کا کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے جس کے ذریعہ سے ان کے خلاف ڈگری عقل سلیم کی عدالت سے حاصل کی جا سکے۔ اسی کے مقابلہ میں ان کی خیرات ان کی نیکیاں، رسول صلعم سے ان کی محبت ایسی چیزیں ہیں جو خود ان کی اور انھیں کی ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جناب! امیر علیہ السلام کی خلافت ایک پہلو سے کامیاب کہی جا سکتی ہے اور ایک پہلو سے ناکامیاب۔ ناکامیاب تو اس پہلو سے کہی جا سکتی ہے کہ اس میں سلطنت اور مقبوضات کی وسعت کم ہوئی اور اس نظر سے کامیاب کہی جا سکتی ہے کہ نائب (علیہ السلام) منیب (صلعم) کے قدم بہ قدم چلا۔ رسول اللہ ہمیشہ دفاع کی لڑائیاں لڑا کیے۔ اور جناب امیر علیہ السلام نے بھی ہمیشہ یہی کیا۔ "نعم المنیب و نعم النائب" اور پھر مملکت محروسہ سے کوئی مقبوضات کم بھی نہیں ہوئے۔ جتنے دن جیے رسول کی پیروی کی۔ اس کے بعد ملک و مال روحانی امانتیں اور پیغمبر کی خاندانی خوبیاں وارث جائز کے سپرد کر کے اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے سرخرو حاضر ہو گئے۔ بعض لوگ دبی زبان سے قرآن کی تحریف کا ذکر کرتے ہیں۔ میرا عقیدہ بحمد للہ یہ نہیں ہے کہ حضرت علیؓ ناقص قرآن کی ذمہ داری اپنے سر اوڑھ لیتے اور خلافت ظاہری کے لیے ناقص قرآن کی ترویج دینے پر تیار ہو جاتے۔ میرے

علی یعنی اس جاہل کے دل میں جناب امیر علیہ السلام کا جو نظریہ ہے اس کی رو سے یہ ناممکن تھا کہ وہ کسی ایسے قرآن کو ظاہری حکومت حاصل کرنے کے لیے قبول کر لیتے جو بحیثیت مجموعی تمام احکام اور منشاء رسول سے کچھ بھی الگ ہوتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وقت میں جب قرآن جمع کیا گیا تو ممکن ہے کچھ ادھر کا ادھر ہو گیا ہو مگر یہ میرا ایمان ہے۔ ایمان ہے کہ بین الدفتین قرآن وہی ہے جو خدا کے یہاں سے آیا ہے اور اس میں کوئی ضروری بات چھوٹی نہیں ہے۔

شیعوں کے ہاں امامت من اللہ پر زور دیا جاتا ہے۔ خلافت کے سلسلہ میں عرض کر چکا ہوں کہ جناب امیر نے کبھی نہیں فرمایا کہ ''ہم کو آنحضرت صلعم خلیفہ بنا چکے ہیں۔ (دیکھو صفحہ ۴۱) پھر دوسری جگہ حضرت عمرؓ کے حال میں عرض کر دوں ''کوئی نص صریح تو تھی نہیں کہ حضرت علی خلیفہ کر دیے گئے'' (دیکھو صفحہ ۵۲) میرے خیالات کا پتہ تو ان جملوں ہی سے چل گیا لیکن جن وجوہ سے میری سمجھ میں امامت من اللہ نہیں آتی وہ نہیں عرض کیا۔ حضرات شیعہ نہ معلوم کتنی آیتیں میں امامت من اللہ کے ثبوت میں پیش فرماتے ہیں مگر سب وہی آیتیں ہیں جن کے معنی میں اختلاف ہے۔ اتنا ضروری مسئلہ جو اصول دین میں شمار ہو اور ایک آیت بھی ایسی نہ پیش کی جاسکے جس میں تاویل کی ضرورت نہ پڑے۔ وحدانیت نبوت، قیامت کے بہت سے احکام ہر جگہ موجود ہیں جن کے معنی میں کوئی فرقہ بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔ فروع دین جن کا درجہ اصول دین سے کم ہے ان کے احکام بھی اسی طرح کے صریحی ہیں جن میں اختلاف کی گنجائش نہیں مگر امامت من اللہ کے لیے ایک آیت بھی ایسی نہیں پیش کی جاسکتی جس کے معنی میں دوسرے مفہوم کا احتمال نہ ہو اور دوسرے فرقے اس کے دوسرے معنی نہ بیان کرتے ہوں۔ امامت من اللہ کے دلائل جو پیش کیے جاتے ہیں ان کو دیکھ کر وہی آیت ابتغاء الفتنة و ابتغاء تاویله والی پیش نظر ہو جاتی ہے جو اس کتاب میں موجود ہے۔

محکم آیت جیسے وما محمد الا رسول کی ایسی ایک آیت بھی نہیں جس کے بعد چوں چرا کی گنجائش نہ رہ جائے۔ مولوی فرمان علی صاحب مرحوم مترجم قرآن پاک نے اپنے ترجمے کے حاشیہ پر سات آیتیں لکھی ہیں جن سے امامت من اللہ کو ثابت کرنا چاہتے

ہیں۔ مجھ کو تو ایک آیت بھی صریحی نہیں معلوم ہوتی۔ اتنا ضروری، اتنا اہم مسئلہ اور اس میں صرف تشبیہوں، استعاروں سے تاویل کی جائے کچھ دل پر بیٹھتی ہوئی بات نہیں ہے۔ وہ آیتیں بھی لکھے دیتا ہوں آپ بھی غور فرمائیں۔ ان کے علاوہ حضرات ذاکرین اور آیتیں بھی پڑھتے ہیں مگر ان میں بھی بغیر تاویل کے کام نہیں چلتا۔ اب وہ آیتیں پیش کرتا ہو جو مولانا فرمان علی صاحب علی اللہ مقامہ نے اپنے ترجمہ کے حاشیہ پر لکھی ہیں۔

بسم الله الرحمن الرحيم

آیات در ثبوت امامت من اللہ

ماخوذ از قرآن مرتبہ مولانا فرمان علی صاحب

و اذا ابتلى ابراهيم ربه بكلمت فاتمهن ط قال انى جاعلك الناس اماما قال و من ذرميتى ط قال لا ينال عهد الظالمين۔

اے رسول بنی اسرائیل کو وہ وقت بھی یاد دلاؤ جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور انھوں نے پورا کر دیا تو خدا نے فرمایا میں تم کو (لوگوں کا) پیشوا بنانے والا ہوں۔ حضرت ابراہیم نے، عرض کی اور دوسری اولاد، میں سے فرمایا (ہاں مگر) میرے اس عہدہ پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہوسکتا۔

و قال لهم بينهم ان الله قد بعث لكم طالوت ملكا ط قالوا انى يكون له الملك علينا و نحن احق بالملك منه ولم يوت سعة من المال قال ان الله اصطفه عليكم و زاده بسطتة فى العلم و الجسم ط والله يوتى ملكه

اور ان کے نبی نے ان سے یہ بھی کہا کہ بیشک خدا نے تمھاری درخواست کے مطابق طالوت کو تمھارا بادشاہ مقرر کیا (تب) کہنے لگا اس کی حکومت ہم پر کیوں کر ہوسکتی ہے۔ حالانکہ سلطنت کے حق دار اس سے زیادہ تو ہم ہیں کیونکہ اسے تو مال کے

من یشاء ط والله سمیع علیم ۔

(اعتبار سے) بھی فارغ البالی (تک) نصیب نہیں (نبی نے) کہا خدا نے اسے تم پر فضیلت دی ہے اور مال میں نہ سہی مگر علم اور جسم کا پھیلاؤ تو اسی کا خدا نے زیادہ فرمایا ہے اور خدا اپنا ملک جسے چاہے دے اور خدا بڑی گنجائش والا اور واقف کار ہے۔

فوجد عبد امن عبادنا اٰتینه رحمة من عندنا و علمنه من لدنا علما

تو (جہاں مچھلی چھوڑی تھی) دونوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک (خاص) بندہ (خضر) کو پایا جس کو ہم نے اپنی بارگاہ سے رحمت (ولایت) کا حصہ عطا کیا تھا اور ہم نے اسے علم لدنی (اپنے خاص علم) میں سے کچھ سکھایا۔

و جعهلم ائمة لیهدون بامرنار و اوحینا الیهم فعل الخیرات و اقام ایتاء الذکوٰة و کانو النا عبدین۔

اور ان سب کو (لوگوں) کا پیشوا بنایا کہ ہمارے حکم سے (ان کی) ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کے پاس نیک کام کرنے اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی بھیجی تھی اور یہ سب کے سب ہماری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔

و لقد اٰتینا موسی الکتب و جعلنا معه اخاه هرون وزیرا۔

اور البتہ ہم نے موسیٰ کو کتاب (توریت) عطا کی اور ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو (ان کا) وزیر بنایا۔

فاما من تاب و امن و عمل صالحا فعسیٰ ان یکون من المفلحین۔

مگر ہاں جس شخص نے توبہ کرلی اور ایمان لایا اور اچھے اچھے کام کیے تو قریب ہے کہ یہ لوگ اپنی مرادیں پانے والوں سے ہوں گے۔

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحاً والذین اوحینا الیك و ما وصینا بہ ابراھیم و موسیٰ و عیسیٰ ان اقیموالدین و لاتتفرقوا فیہ کبر علی المشرکین ماندعوھم الیہ ط اللہ یجتبی الیہ من یشاء و یھدی الیہ من ینیب۔

تمھارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس پر (چلنے) کا نوح کو حکم دیا تھا اور اے رسول اسی کی ہم نے تمھارے پاس وحی بھیجی ہے اور اسی کا ابراہیم اور عیسیٰ کو بھی حکم دیا تھا وہ یہ ہے کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا جس دین کی طرف تم مشرکین کو بلاتے ہو وہ ان پر بہت شاق گزرتا ہے خدا جس کو چاہتا ہے اپنی بارگاہ کا برگزیدہ کرلیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرے (اسے اپنی طرف پہنچنے) کا رستہ دکھا دیتا ہے۔

ایک بات جسارت کی اور عرض کردوں۔ جناب امیر علیہ السلام سپاہی تھے، بہادر تھے، نوری نے کیا خوب کہا ہے ۔

ختم شد بر تو سخاوت بر من مسکیں کلام
جوں شجاعت بر علی بر مصطفیٰ پیغمبری

آج تک فنون جنگ کے مشق کرنے والے لوگ ''یا علی استاذ'' کہہ کر اپنا حربہ اٹھاتے ہیں مگر جنرل (جن معنوں میں یہ لفظ سمجھا جاتا ہے) نہیں تھے یعنی ہر مزاج والے

کا دل یکساں طور سے اپنے ہاتھ میں نہیں لیے رہ سکتے تھے۔ جو بیت المال کی چیزوں کے لیے اپنے سگے بھائی کو خفا کر دے۔ جو شخص لڑائی کے پہلے چراغ گل کر کے اپنے مددگاروں سے کہہ دے کہ دشمن صرف میرے خون کا پیاسا ہے۔ تم لوگ اگر چاہو تو اندھیرے میں بغیر مروت توڑے جا سکتے ہو۔ وہ حضرات جنرل کیسے ہو سکتے ہیں۔ صفین میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ نیزوں پر قرآن شریف دیکھ کر خود اپنی فوج کے خیالات بدل گئے اور جناب امیر مجبور ہو گئے۔

O

''............ شاید آپ نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ کہیں تیرے حالات لکھے ہوں تو ان کا پتہ بتا۔ حضرت! فالج کی وجہ سے دماغ بکھر گیا ہے۔ ایک بڑھیا ایک ٹوکرے میں دھان کوٹنے کو لے جاتی تھی، اس پر بندر کود پڑا ٹوکرا گر پڑا دھان بکھر گئے اس عورت نے کہا ''لیو اب کا کری؟'' یہی حال ہوا ہے۔ ایک صاحب ہیں عسکری صاحب ادیب۔ ایک بار انھوں نے 'میرا بہترین افسانہ' ایڈٹ کیا تھا۔ دوسرے مصنفین کے ساتھ میرا بھی ایک افسانہ ''تیسری جنس'' چھاپا تھا۔ اس میں ان کے اصرار سے کچھ اپنا حال میں نے لکھ دیا تھا۔ اگر وہ آپ ڈھونڈھ نکالیں تو کچھ حال میرا مل جائیگا......''

(ڈاکٹر نورالحسن کے نام خط)

ساتواں باب

بعض فلسفیوں کے نزدیک جناب باری تعالیٰ تھوڑے دنوں کے بعد ایک انسان پیدا کرتا ہے جس کو سمجھنے کے لیے انسان فوق الانسان کہہ لیجیے۔ یہ انسان جسموں پر حکومت کرلیتا ہے اور دلوں پر بھی حکومت کرلیتا ہے اور ہر بات میں اس کو دوسرے انسانوں پر فوقیت ہوتی ہے۔ آنحضرت صلعم ایسے ہی انسان تھے۔ شیعہ حضرات گو منہ سے صاف صاف نہیں کہتے مگر اپنے انداز سے یہ چاہتے ہیں کہ قرابت قریبیہ کی وجہ سے جناب امیر علیہ السلام کو رسول صلعم کے برابر یا کچھ ویسا ہی مان لیا جائے۔ حضرات اہل سنت اس درجہ تک تو نہیں جاتے مگر وہ بھی حضرت عمرؓ کو کچھ انسان فوق الانسان ہی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ صحیح بخاری ایسی کتاب میں اکثر روایتیں ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ اور حضرت عمرؓ میں اختلاف ہوا اور وحی حضرت عمر ہی کے خیال کے مطابق اتری۔ میرا عقیدہ ان باتوں سے بہت دور ہے۔ اور میں اپنے عقیدہ پر شرمندہ نہیں ہوں۔ اس ذات پاک رسالت سے کسی کو نسبت نہیں تھی اور نہ ہوسکتی ہے۔ یہ تو لوگوں کے منہ کی باتیں ہیں۔ دنیا حاصل کرنے کو یا اپنے فرقہ کو فوق دینے کے لیے تو وہ کچھ کہا گیا ہے کہ مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔

قرآن کا تو یہ دعویٰ ہے کہ ایک آیت بھی کہہ لاؤ۔ فصحا تو اعتراض کرلیں کہ "لا ھذا کلام البشر" اور راویان یہ فرمائیں۔ نہ ہوئے حضرت عمرؓ اس وقت نہیں تو راویوں کو بتاتے۔

امام حسن علیہ السلام کا ذکر اہل بیت کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ میرے لیے تو یہی کافی ہے کہ سنا ہے کہ امام ہمام علیہ السلام کی صورت اپنے نانا سے بہت ملتی تھی۔ "اللھم صل علی محمد و ال محمد" جناب امام حسن علیہ السلام اور جناب امام حسین علیہ السلام کی افتادِ طبع میں فرق تھا۔"

---

1. حدیث نمبر ۶۱۲ بخاری شریف صفحہ ۱۴۹۔ روایت از ابن عمرؓ مرتبہ شیخ مبارک۔ ۱۲

"الکاظمین الغیظ و العالین علی الناس۔ واللہ یحب المحسنین۔ کا واقعہ امام حسن علیہ السلام کے مزاج کا آئینہ ہے۔ (شہید انسانیت میں یہ روایت امام حسین علیہ السلام کے لیے لکھی ہے) امام حسین علیہ السلام کی افتادطبع کربلا کے میدان میں ظاہر ہی ہوچکی ہے۔ اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اب امیر معاویہ کے بارے میں میرے خیالات سنیے۔ وہ حکمت عملی کے بادشاہ تھے، ذہین تھے، فریس تھے، خوبیوں سے کوئی شخص خالی نہیں ہوتا۔ کوئی دبی ہوئی اچھائی ہمارے ایسے آدمی میں پڑی ہوتو تعجب نہیں مگر حضرت ان کے بارے میں میری زبان نہ کھلوایئے۔ نہ ان حضرات کے بارے میں میری رائے پوچھیے۔ جو ان کو اچھا کہتے ہیں، یہ جلیل القدر صحابی کہلاتے ہیں۔ ''صحابی کا النجوم'' والی حدیث میرے گلے سے نہیں اترتی اور شاعر کی تیرابازی ان کے ذکر پر پہنچ کر مجھ کو وہ تکلیف نہیں پہنچاتی جو ہر دوسرے موقع پر ؎

صحابی گرچہ جملہ کا النجوم آمد
ولے بعضے کواکب نحس وشوم اند

صحابی کی تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ جس کو رسول اللہ صلعم کی زیارت نصیب ہوئی ہو اور وہ مسلمان ہو ممکن ہے صحابی کی کوئی تعریف اور بھی ہو جو مجھ کو نہ معلوم ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ ہر حالت میں اصحاب رسول اللہ رضوان اللہ علیہم کی تعداد بہت ٹھہرے گی۔ پڑھے لکھے حضرات کو وہ اخبار معلوم ہیں جن میں پیشین گوئی تھی کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ میں ہمیشہ تلوار کھینچی رہے گی۔ سورۂ جمعہ میں "واذا نودی لصلوٰۃ من یوم الجمعۃ" اور سورۂ برأت میں منافقین کا ذکر موجود ہے۔ خدا نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اپنے کو مسلمان کہو مومن نہ کہو۔ "ولقد علمن المتقدمین منکم و لقد علم المستاخرین" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ نماز میں کوئی عورت آگئی تھی، کچھ نمازی پیچھے سے آگے چلے گئے اور کچھ آگے سے پیچھے چلے گئے جو آگے تھے وہ رکوع میں اس عورت کو بغل سے جھانکتے تھے اور جو پیچھے تھے وہ تو دیکھتے ہی تھے اسی وقت یہ آیت اتری۔

منافق مسلمان کے کوئی دُم سینگ تو لگی نہیں ہوتی صرف خدا "علیم ما فی الصدور" ہے ایسی صورت میں کاالنجوم والی روایت کو ماننا میرے تو امکان سے باہر ہے۔

ان کے والد نے رسول اللہؐ کے دانت توڑے۔ ان کی والدہ ماجدہ نے رسول اللہؐ کے چچا کا کلیجہ چبایا۔ یہ خود جناب امیر علیہ السلام سے لڑے اور غصب کیا کیے۔ ان کے برخوردار کے ہاتھوں کربلا کے میدان میں جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کے لیے روایت ہے کہ یزید علیہ اللعن کو نماز غفیلہ بتائی جس سے اس کے گناہ معاف ہوجائیں۔ اب آپ ہی بنی امیہ اور بنی ہاشم کے درمیان فیصلہ کیجیے۔ یہ کہہ دینا کہ ہم اپنی زبان سے کسی کو برا نہ کہیں گے تو کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا۔ آپ منھ سے نہ کہیے۔ مگر دل تو آپ کا دو آدمیوں کے افعال کے بارے میں رائے قائم کرتا ہی رہے گا۔ اگر کوئی پھر بھی مرجیت بگھارے تو اس کی مثال اس جولاہے کی سی ہوگی جس کے پاؤں میں تیر لگا تھا خون بہہ رہا تھا اور وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔" تبرا کے کڑکے اور کبت کہنا حماقت اور سخت گناہ ہے بلکہ خود امیر معاویہ کی پیروی ہے لیکن رائے کوئی کیسے قائم نہ کرے گا۔ حضرت عثمان اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو چھوڑ کر وہ وہ آٹھوں گانٹھ کمیت اس خاندان نے پیدا کیے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

لیکن اس اختلاف کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اتنی امہات المومنین رضوان اللہ علیہن تھیں مگر بقول حکیم سنائی کے خال المومنین امیر معاویہ ہی کہلائے۔ حکیم سنائی کہتے ہیں کہ اتنے بڑے جلیل القدر صحابی تھے جن کی بہنیں امہات المومنین تھیں۔ مگر سوائے امیر معاویہ کے یہ لقب اور کسی کو نہ ملا۔ جو حضرات اس خطاب کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں یا جن کتابوں میں یہ لقب پسندیدگی سے آیا ہے۔ اگر دوسرے لوگ یا فرقہ ان حضرات اور ان کتابوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھیں تو کیا تعجب ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس حدیقہ حکیم سنائی جس سے مجھ کو بڑی ہدایت ملی ہے موجود نہیں۔ ورنہ خال المومنین کے ذکر کو وسعت دیتا یہ وہی حکیم سنائی ہیں جن کے لیے مولانا کہتے ہیں۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او
ما از پے سنائی و عطار آمدیم

اور مثنوی میں فرماتے ہیں۔

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام
از حکیم غزنوی بشنو تمام

اس کے لکھنے کے بعد ایک نسخہ حدیقہ کا ہاتھ آ گیا۔ تفریح قلوب مومنین کے لیے کچھ اشعار خال المومنین کی مدح میں پیش ہیں:

خال مشکیں نہ بود بر خورشید   خال بر دیدہ بود لیک سپید
آنکہ مردود ہاؤ تلبیس است   آں نہ خال و نہ عم کہ ابلیس است
وانکہ خوانی کنوں معاویہ اش   وانکہ درہایہ است زاویہ اش

اس کے بعد امہات المومنین رضوان اللہ علیہن کے اسماء گرامی گنوا کر فرماتے ہیں۔

ایں ہمہ جفت مصطفیٰ بودند   جملگی مادران ما بودند
ہر یک را براداراں بودند   مصطفیٰ را بسان جاں بودند
از چہ مخصوص شد بخائی ما   ابن سفیان زیان حالی ما

وجہ یہ ہوئی کہ احادیث کی تدوین آنحضرت صلعم کے بہت دنوں بعد شروع ہوئی۔ سب سے پہلی کتاب موطا (ابن مالک) ہے۔ جو تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد لکھی گئی۔ اس کے بعد امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ نے دوسری کتاب جس کو مسند کہتے ہیں لکھی۔ پہلی صدی کے شروع میں حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے بھی حدیثوں کے لکھوانے کا سامان کیا تھا۔ اس زمانہ تک تو پتہ چلتا ہے کہ لوگ اپنے اعمال صحیح کرنے کے لیے احادیث کا خیال کرتے تھے تاکہ رسول اللہ صلعم کی سنت کے ذریعہ سے مسلمانوں کی زندگی قرآن کے موافق ہو جائے۔ ۱۹۰ھ میں حضرت اسماعیل بخاری پیدا ہوئے۔ ۲۰۹ھ میں انھوں نے صحیح بخاری کی بنیاد ڈالی۔ جو انھوں نے اٹھارہ سال کی محنت میں تیار کی۔ اب حدیث بنانے میں وہ مستقل رنگ اختیار کیا گیا جو آج تک چلا آتا ہے۔ حضرت بخاری کی کتاب کے لیے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اصح الکتب بعد کلام الباری الصحیح بخاری۔

میں نے تجرید البخاری مولفہ علامہ حسین ابن مبارک زبیدیؒ کے دو مختلف نسخے دیکھے

ہیں۔ حضرت بخاری مرحوم کے لیے کہا جاتا ہے کہ آپ ہر جگہ گھومتے تھے اور جہاں جہاں آپ کو کوئی معتبر راوی ملا اس سے حدیثیں سنتے تھے۔ حافظہ کا یہ حال بیان کیا جاتا ہے کہ احمد ابن جعفر والئی خراسان روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے ایک دن امام بخاری نے فرمایا کہ اکثر احادیث ایسی ہیں کہ میں نے بصرہ میں سنیں اور شام میں لکھی ہیں جو شام میں سنیں وہ بصرہ میں آکر لکھیں۔ علی ابن الحسین البہکندی کا بیان ہے کہ حضرت امام بخاری ایک دن ہمارے یہاں تشریف لائے کسی نے ہماری مجلس میں کہا کہ میں نے حضرت اسحٰق بن راہویہ کو فرماتے سنا ہے کہ مجھے اپنی کتاب میں سے ستر ہزار حدیثیں تو اس وقت یاد ہیں۔ حضرت امام نے یہ سن کر فرمایا تم لوگ اس پر تعجب کرتے ہو۔ بھلا جو شخص دس لاکھ حدیثیں یاد رکھتا ہو (گویا یہ اشارہ اپنی طرف تھا) اسی طرح یہ بھی دعویٰ ہے کہ حضرت بخاری کو چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ ہشام کے زمانے میں زہری اور دوسرے حضرات جنھوں نے حدیثیں جمع کیں۔ حافظ حجر عسقلانی نے مقدمہ فتح الباری میں لکھا ہے کہ شروع اسلام میں لوگ احادیث جمع کرتے ہوئے اس لیے ڈرتے تھے کہ کہیں حدیث قرآن شریف سے مخلوط نہ ہوجائے۔ مگر پھر تابعین کے زمانہ میں تدوین حدیث شروع ہوگئی۔ اکثر فقہا اور محدثین مختلف ممالک میں منتشر ہوگئے اور روافض و خوارج اور قدریہ نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ اس لیے جمع و تدوین فقہ کی طرف فقہا و محدثین کا خیال رجوع ہوگیا۔

یہ تمام باتیں اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں ایک منطقی کے لیے صحیح ہوں مگر مجھ کو تو پروپیگنڈا سی معلوم ہوتی ہیں۔ میں کوئی علم حدیث یا تاریخ پر تو کتاب لکھ نہیں رہا ہوں۔ میں تو اپنے خیالات کا اعتراف کر رہا ہوں اس لیے بحث کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ احادیث جمع کرنے میں یہ احتیاط یہ دیانت اور زیادہ تر روایات کا رجحان کچھ ایسا ہے جس سے صرف فرقہ اہل سنت والجماعت کی تقویت ہوتی ہے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ صحاح ستہ میں سب روایتیں ایسی ہی ہیں۔ جب اسلامی تاریخ کا مداران پر ہو تو کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے۔ مگر یہ تو ضرور کہوں گا کہ بہت سی روایتیں ایسی بھی ہیں جو نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ امیر معاویہ کے وقت میں صبید ابن شریح کی کتاب ''کتاب الملوک والاخبار'' اور وہب ابن بنیہ کی کہانیاں اور کعب الاخبار کے قصہ ہیں۔ یہی چڑیا چڑنگڑ کی کہانیاں تھیں جنھوں نے بعد کو

بعید از قیاس معجزات اور قرآن کے برخلاف خرق عادات کی بنیاد ڈالی تھی۔ ابن ندیم کی "الفہرست" ابن خلکان اورنوادی وغیرہ کے بیانات [1] پڑھ لیجیے۔

بخاری میں خیبر کے متعلق پندرہ حدیثیں ہیں اس میں صرف ایک جگہ حضرت علیؓ کا نام آیا ہے وہ بھی اس طرح کہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے مروی ہے کہ خیبر کے دن رسول اللہ صلعم نے نکاح متعہ اور گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ ایک دوسری جگہ ایک دوسری سرخی کے تحت میں یہ بھی ہے کہ خیبر حضرت علیؓ نے فتح کیا۔ میں اب اپنے دل کی بات کہہ دوں۔ خیبر کی لڑائی کا ذکر اور حضرت علیؓ کا نام صرف سرسری طور سے آجانا، میں تو اسی سے بھڑک گیا۔ کچھ اسی پر نہیں موقوف ہر جگہ یہی بات دکھائی دیتی ہے۔ امام حسنؓ کا نام کئی جگہ ہے کہ رسول صلعم کو ان سے بڑی محبت تھی اور صرف ایک جگہ ضمناً امام حسینؓ کا ذکر ہے کہ حسنین میری دنیا کی زینت ہیں۔ ایک دوسری جگہ ہے کہ حضرت عمرؓ منبر پر تھے اور حضرت امام حسینؓ بچہ تھے۔ آپ نے کہا "ہمارے باپ کے منبر پر سے اترو۔" حضرت عمرؓ نے کہا "سچ کہتے ہو، منبر تمھارے باپ کا ہے" اس پر حضرت علیؓ نے کہا "میں نے بچہ کو یہ نہیں سکھایا ہے" ممکن ہے کہیں اور بھی ہو مگر اس پر میری نظر نہیں پڑی۔ میں نے ہمیشہ اللہ میاں سے یہ دعا مانگی کہ شیعہ سنی سے مجھ کو چھٹکارا دے کر اس مذہب کی ہدایت کر جو آنحضرتؐ کے وقت میں تھا۔ جب ہر شخص مسلمان تھا اور ہر شخص اہل سنت تھا۔ الجماعت [2] کا ٹکڑا شاید امیر معاویہ کے وقت میں نکلا ہو کیونکہ انھوں نے اپنی حکومت کے پہلے سال کا نام "الجماعت" رکھا تھا۔

حضرت علیؓ کا نام کئی جگہ ہے مگر کہیں اس طرح ہے کہ حضرت علیؓ نے کفار کو آگ میں جلوا دیا اور کہیں ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا جس سے رسول کو بھی تکلیف ہوئی، (خیر بعد کو رک گئے) امام حسن علیہ السلام کی منقبت میں ایک حدیث ہے۔ حضرت

---

1. ملاحظہ ہو حتی کی تاریخ عرب کا اکیسواں باب جہاں بنی امیہ کے زمانہ میں علمی ترقیوں کا ذکر ہے۔ نیز ملاحظہ ہو کتاب "مذہب اور باطنی تعلیم"

2. تاریخ خمیس و تاریخ الخلفاء سیوطی و عقد الفرید ابن عبدربہ۔ کامل ابن اثیر و استیعاب ابن عبدالبر۔ بحوالہ تاریخ احمدی صفحہ ۲۲۵۔ ۲ تجرید البخاری کتاب الصلح حدیث نمبر ۱۱۳۹۔ ۳ تجرید البخاری فضائل صحابہ حدیث نمبر ۱۴۸۵

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو (ایک مرتبہ) منبر پر دیکھا کہ حسن علیہ السلام ان کے پہلو میں تھے۔ آپ کبھی لوگوں سے کبھی ان کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور فرماتے تھے۔ ''میرا یہ بیٹا سید ہے اور امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ سے دو بڑے گروہوں کے درمیان میں صلح کرا دے گا۔''

ایک دوسری جگہ ہے حضرت اسامہ بن زید نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ''آپ اسامہ اور امام حسنؑ کو لیتے تھے اور فرماتے تھے۔ اللہ ان دونوں کو دوست رکھے کیونکہ میں ان دونوں کو دوست رکھتا ہوں۔ اتفاق دیکھیے کہ یہاں بھی بیچارے امام حسین علیہ السلام کا ذکر نہ آیا۔ اس طرح کی حدیثیں میں تو صاف کہوں گا میرے دل پر بیٹھتی نہیں۔ میرے دل کو تو وہی بات دکھائی دیتی ہے جس سے میں ہمیشہ بھاگتا رہا۔ یعنی امام حسنؑ کی صلح سے امیر معاویہ کی ریشہ دوانیاں چھپ جاتی ہیں اور امام حسین علیہ السلام کی افتادِ طبیعت سے یزید باپ بیٹے کے ہتھکنڈے کھل جاتے ہیں۔ علاوہ اس کے پیشین گوئیاں اگر ایسی ہوئیں جیسی سورۂ روم کے شروع میں ہے ''غلبت الروم'' یا قرآن شریف میں اور آئندہ کے اخبار میں وہ میرا ایمان ہے۔ مگر ایسی پیشین گوئیاں جو احادیث میں مذکور ہیں اور جن کا واسطہ قرآن سے کچھ نہیں ہے۔ یا بہ متقضائے اسباب وعلل ان کا ظاہر ہونا عقل میں نہیں آتا اور صرف پولٹیکل فائدہ کے لیے بیان ہوسکتی ہیں جیسے امام حسنؑ کا دو گروہوں میں صلح کروانا تو ان کے ماننے میں مجھ کو تامل ہے۔ قرآن شریف میں حسب ذیل آیتیں جو معجزات، کرامات اور متذکرۂ بالا قسم کی چیزوں کے برخلاف پڑتی ہیں ملاحظہ ہوں۔

اے محمدؐ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ''قیامت کب قائم ہوگی'' تو کہہ اس کا علم میرے رب ہی کو ہے۔ اس کے وقت پر وہی اس کو ظاہر کرے گا۔ اے محمد کہہ ''میں اپنے ذاتی نفع ونقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔'' اگر میں غیب داں ہوتا تو بہت سا فائدہ اپنا کرلیتا اور مجھے کبھی گزند نہ پہنچتا۔'' سورۃ اعراف ع ۲۲

کفار تیرے بارے میں کہتے ہیں ''اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی تو محض ڈرانے والا ہے۔ سورۃ رعد ع ۱

اے محمد کفار کہتے ہیں کہ "اس پیغمبر پر کوئی نشانی (از قسم معجزہ) اس کے رب کی طرف سے کیوں نہیں اتری۔" .... اگر قرآن ایسا نازل ہوتا کہ اس کے ذریعہ سے پہاڑ چلنے لگتے یا اس سے ارضی مسافتیں طے ہو جایا کرتیں یا اس کی برکت سے مردے بولنے لگتے، جب بھی یہ لوگ رحمٰن سے انکار ہی کرتے۔　　سورۃ رعد ع ۴

اے محمد ہم جانتے ہیں کہ ان لوگوں کی باتیں تجھے رنج دیتی ہیں۔ یہ تجھے نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔ تیرے پہلے بھی رسول جھٹلائے گئے تھے۔ وہ لوگوں کے جھٹلانے پر اور ان کی ایذا پر صبر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہماری مدد ان کے پاس پہنچی...... اگر ان منکروں کی سرکشی تجھے گراں گذرتی ہے تو تجھ سے ہو سکے تو زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان کا کوئی کونہ ڈھونڈھ نکال اور پھر ان کو کوئی معجزہ لا دکھا۔

سورۃ انعام ۱۴

کفار بتاکید اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی (معجزہ) ان کے سامنے آئے تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔ اے محمد تو مسلمانوں سے کہہ دے کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں لیکن مسلمانو تمھیں کیا خبر ہے؟ یہ لوگ نشانیاں آنے پر بھی ایمان نہ لائیں گے۔　　سورۃ انعام ع ۱۳

اے محمد........... اور یہ بھی کہہ میں تمھیں ضرر یا نفع نہیں پہنچا سکتا یہ بھی کہہ مجھے اللہ کے غضب سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ اور نہ میں اس کے سوا کوئی ٹھکانا پاتا ہوں۔ میں صرف اللہ کا پیغام پہنچاتا ہوں اور اس کی پیغام رسانی کرتا ہوں۔ اے محمد تو کہہ دے مجھے معلوم نہیں کہ عذاب موعود قریب ہے یا میرا رب اسے ملتوی رکھے گا۔ وہی غیب کا جاننے والا ہے۔ اپنے غیب پر وہ کسی کو اطلاع نہیں دیتا۔ مگر برگزیدہ پیغمبروں کو اور وہ بھی اس طرح کہ ان کے آگے اور ان کے پیچھے دو فرشتوں کا پہرہ رکھتا ہے تاکہ اسے معلوم ہوتا رہے کہ پیغمبروں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے۔　　سورۃ جن ع ۲

جو لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے کہہ رکھا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی نہ کرے جسے آگ آکر جلا دے۔ اے محمد تو ان سے کہہ کہ

مجھ سے پہلے بہت سے رسول تمھارے پاس کھلی کھلی نشانیاں اور یہ نشانی جو تم بیان کرتے ہو لے کر آئے تھے۔ تم سچے تھے تو تم نے انھیں کیوں قتل کیا؟ اے محمد اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو تو برا نہ مان۔ تجھ سے پہلے بھی بہت سے رسول نشانیاں صحیفہ اور نورانی کتاب لے کر آئے تھے اور جھٹلائے گئے تھے۔　　سورۃ آل عمران ع ۱۹

اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے لیے طرح طرح کی مثالیں بیان کی ہیں مگر اکثر آدمی انکار کیے بغیر نہ رہے اور تجھ سے کہنے لگے۔ ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے کہ تو ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ نکالے یا تیرے پاس کوئی باغ کھجوروں یا انگوروں کا ایسا ہو کہ اس کے بیچ بیچ میں تو نہریں جاری کردے یا تو جیسا کہتا ہے آسمان کے ٹکڑے ہی ہم پر گرائے۔ یا اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لائے۔ یا تیرا گھر سونے کا ہو یا آسمان پر چڑھ جائے اور آسمان پر تیرا چڑھنا ہم باور نہ کریں گے جب تک تو کوئی ایسی کتاب ہم پر نازل نہ کرے جسے ہم پڑھ سکیں۔ تو کہہ سبحان اللہ میں کیا ہوں، ایک بشر ہوں اللہ کا بھیجا ہوا۔　　سورۃ بنی اسرائیل ۱۰۴

اہل مکہ کہتے ہیں محمد پر کوئی نشانی اس کے رب کے پاس سے کیوں نہیں آئی۔ اے محمد تو کہہ غیب اللہ ہی جانتا ہے تم منتظر رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ منتظر ہوں۔

سورۃ یونس ع ۲

اگر یہ پیغمبر ہے تو جس طرح اگلے پیغمبروں کے ساتھ معجزے آئے تھے یہ بھی ویسا ہی معجزہ دکھائے ہم نے اس کے پہلے جن بستیوں کو ہلاک کیا ان کے باشندے معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے تھے۔ تو کیا یہ ایمان لائیں گے؟ اے محمد ہم نے تیرے قبل بھی آدمی رسول بنا کر بھیجے تھے اور ان کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔ لوگو اگر تمھیں معلوم نہیں ہے تو اہل کتاب سے پوچھو۔ ان رسولوں کے جسم ایسے نہ تھے کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور ہمیشہ زندہ رہیں۔　　سورۃ انبیاء ع ۱

○

آٹھواں باب

میں معجزوں کا کلیۃً منکر نہیں ہوں۔ مثلاً دل سے قائل ہوں کہ قرآن شریف خود معجزہ ہے۔ یا جو پیشین گوئیاں بر بنائے عقل و دور اندیشی عاقل ترین بشر (صلعم) نے فرمائیں۔ اگر آپ کا دل چاہے ان کو بھی معجزہ کہہ لیجیے۔ مگر جب قرآن شریف کی مختلف آیتوں میں وہ کہا جائے جو گزشتہ آیتوں میں یہ ناچیز نقل کر چکا ہے تو پھر تو میری سمجھ میں وہ معجزات نہیں آسکتے جو صرف احادیث میں مذکور ہیں اور جن کا پتہ قرآن شریف میں نہیں۔ نہ معلوم کتنے معجزات پانی کے متعلق کھانے کے متعلق احادیث میں مذکور ہیں جن کا قرآن میں کہیں حوالہ نہیں۔ قرآن شریف میں کفار کو جناب باری نے سمجھایا ہے مگر باوجود اس کے کفار معجزہ مانگا ہی کیے۔ جناب باری نے کفار کو قائل کرنے کے لیے ان معجزات کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے جو احادیث میں مذکور ہیں جن سے سنی شیعہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جب دوسرے انبیاء علیہم السلام کے معجزے قرآن شریف میں مذکور ہیں تو آنحضرت صلعم کے معجزے کیونکر نہ مانے جائیں۔ میری تردید کے لیے صرف یہ دلیل تو کافی نہ ہوگی۔ انبیاء ماسبق کے معجزے قانونی نظیر کی صورت میں ہرگز نہیں پیش کیے جاسکتے۔ نظیر اسی وقت مانی جائے گی جب قانون موجود ہو۔ اگر خود قانون ہی نہیں موجود ہے تو نظیر کیا کام دے سکتی ہے۔ خالی خوش عقیدگی سے تو کام نہ چلے گا اور اس کے بعد بھی ہر معجزے کے لیے ویسا ہی ثبوت بہم پہنچ جائے جیسا مثلاً قرآن شریف کے لیے ہے یا معجزہ غلبۃ الروم کے لیے ہے۔ میں صرف ان معجزوں پر اعتراض کر رہا ہوں جو احادیث میں ہیں اور خود قرآن میں نہیں ہیں، اگر کوئی ناواقف وہی قرآن شریف کے مانے ہوئے معجزے میری تردید میں پیش کرے تو وہ ازروئے منطق مصادرہ کے مغالطہ میں پڑ جائے گا۔ شق القمر اور معراج کے معجزے ایسے ہیں جن میں بڑے بڑے علماء ہمیشہ شک کرتے آئے ہیں۔ وہ بھی میری دلیل کے خلاف پیش نہیں کیے جاسکتے۔ شق القمر کے لیے دو تین رائیں ہیں۔

ایک تو یہ کہ چاند دو ٹکڑے ہوگیا۔ دوسرا مذہب یہ کہتا ہے کہ قیامت کے قریب ہوگا اور ماضی کا صیغہ خطابت کے قاعدے کے موافق مستقبل کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یہ طریقہ خطابت ایک دوسری سورہ "اقترب للناس حسابهم و هم في غفلت معرضون" میں بھی موجود ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ قرآن کا جو دعویٰ ہے وہ آئینہ کی طرح صاف ہوگیا۔ یعنی قرآن کے الفاظ استعارۃً استعمال ہوئے ہیں جو لوگ دوسرے معنی کے قائل ہیں وہ سورۂ قیامت کی آٹھویں اور نویں آیتیں اپنے خیال کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

و خسف القمر۔ و جع الشمس والقمر۔ يقول الانسان يومَئِذٍ اين المفر۔

ترجمہ: (اور) چاند بے نور ہوجائے گا اور آفتاب اور ماہتاب یکجا کیے جائیں گے۔ اس دن انسان پوچھے گا ''آج کہیں جائے گریز ہے؟''

زمانۂ جاہلیت کا ایک مصرع بھی یہاں کہا جاتا ہے۔ شاید امراء القیس کا سمجھا جاتا ہے "دنت الساعة و انشق القمر" (قمر کے پہلے الف لام ہے یا نہیں مجھ کو نہیں معلوم) اس کے رو سے تو تیسرے ہی معنی ٹھیک بیٹھتے ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ امرالقیس کی پوتی نے "اقترب" کی داد دی تھی۔

معراج کے مسئلہ میں بھی جسمانی اور روحانی معراج کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے۔ ہم ایسے کم علم مغرب زدہ لوگ حسب منشاء قرآن پیغمبر اسلام کے لیے معجزے کی ضرورت متصور نہیں کرتے۔ نہ صرف احادیث مروجہ کی بنا پر ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور مزے کی بات ہے۔ سنی شیعہ ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں۔ اور ان کے علماء نفرت کے مختلف جذبہ ایک دوسرے کے لیے ابھارتے ہیں۔ مگر ایک دوسرے کے تسلیم شدہ معجزوں پر اعتراض کم کرتے ہیں۔ میرے خیال میں صرف اسی وجہ سے کہ اس معاملہ میں دونوں کی کور دَبی ہے۔ مناظرہ کی کتابیں دیکھ لیجیے۔ سخت سے سخت باتیں ایک دوسرے کو کہیں گے۔ اور ایک دوسرے کو جہنم میں ڈھکیل کر خود بہشت میں ''علی الارائک'' حوروں کو پہلو میں لے کر بیٹھ جائیں گے۔ مگر ایک دوسروں کے بیان کردہ معجزوں کو کم جھٹلائیں گے۔ جاہلوں کے لیے ایک اور ترکیب ایجاد کی ہے۔ یعنی پیغمبر سے

معجزہ ہوتا ہے اور دوسروں سے کرامتیں عمل میں آتی ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہوا کہ مقلدین بھڑک نہ جائیں اور اسی دھوکہ میں رہیں کہ معجزہ بڑی چیز ہے اور کرامت کا تو درجہ کم ہے۔ پوچھو جب خرق عادت دونوں ہیں تو بڑا سا نام یا چھوٹا رکھنے سے اصل چیز یعنی خرق عادت میں کیسے فرق پڑ جائے گا۔ ایک مثل ہے جو لوگ شیشوں کے مکانوں میں رہتے ہیں وہ ڈھیلے نہ پھینکا کریں۔ اگر یہ حضرات ایک دوسرے پر اعتراض سے اسی بنا پر دور رہتے ہیں تو واقعی بڑی فراست اور سمجھ داری کی بات کرتے ہیں۔

بچپن سے بالس عزا میں نہ معلوم کتنے معجزات سنتا چلا آیا ہوں۔ آخرکار اتنا پریشان ہوگیا کہ بھاگ نکلا۔ بخاری کا نام خصوصاً اور صحاح ستہ کا نام عموماً سنا کرتا تھا۔ انھیں دنوں ان کی طرف رجوع کیا۔ تقریباً وہی حدیثیں ہیں جو تمام کتابوں میں مذکور ہیں۔ بخاری میں بھی ہیں، لہٰذا میں نے ان کتابوں میں نمبر اول کتاب لی اور اس کو بار بار پڑھا مگر میری بدقسمتی کہ جو کچھ میں ڈھونڈھتا ہوں وہ نہ ملا۔ اس میں سیکڑوں احادیث ہیں جو سنی، شیعہ، وہابی کی پولٹیکل چالوں کی ایسی معلوم ہوتی ہیں۔ ہارون الرشید کے زمانہ میں امام بخاری پیدا ہوئے۔ انھوں نے کئی اور بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ رسول صلعم کے زمانہ سے اس وقت تک اگر فیصدی تین پشتیں رکھی جائیں تو کم سے کم پانچ پشتیں ہوچکتی ہیں۔ گو حدیثوں کے لکھنے کا سلسلہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے وقت سے شروع ہو چکا تھا۔ مگر امام بخاری نے اٹھارہ برس سخت محنت کر کے حدیثیں جمع کیں جس میں سُنا کا لفظ ہر جگہ استعمال ہوا ہے۔ دنیا بہت بدل چکی تھی رسول اللہ صلعم اور خلفاء اربعہ کے زمانہ کے دیکھنے والے نہ معلوم کب ختم ہو چکے تھے۔ نبیذ خالی اس بات پر پی جاتی تھی کہ کبھی لوگوں نے کسی لڑائی میں پانی کے بہت کھاری ہونے کی شکایت کی تھی اور آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا کہ اس میں کھجوریں ڈال دو، بنی امیہ ختم ہو چکے تھے۔ شیعہ بھی دبے دبائے پڑے تھے۔ بنی عباس کا زمانہ تھا بڑی بڑی کتابیں رومۃ الکبریٰ سے آ کر ترجمہ ہوئی تھیں۔ پرانے عرب خیالات کے برتنوں پر یونان اور ایران کی قلعیاں چڑھ رہی تھیں۔ ایسی حالت میں کسی کتاب کا بغیر ان چیزوں سے متاثر ہوئے لکھا جانا بہت مشکل تھا۔ بنی امیہ ہی کے وقت میں حدیثوں کی بھرمار ہوچکی تھی اور اب زیادہ ہوگئی۔ میرے استاد پروفیسر نواب علی مشہور مصنف جنھوں

نے بہت سی کتابیں حدیث پر لکھی ہیں، پہلے شیعہ تھے، بعد کو سنی ہوگئے۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ہشام اموی نے امام زہری کو لکھا کہ جتنی روایتیں حضرت علی کی منقصت میں اور جتنی روایتیں حضرت عثمان کی منقبت میں ہوں فراہم کردو۔ ان کو اتنا برا معلوم ہوا کہ خلیفہ کا رقعہ انھوں نے بکری کے منھ میں ٹھونس دیا جو پاس بندھی تھی۔ مگر خلیفہ کو جواب لکھنا ہی پڑا۔ انھوں نے لکھا کہ ''خلیفہ کو معلوم ہو کہ حضرت علی کی منقصت سے ان کو کوئی نقصان نہ ہوگا اور حضرت عثمان کی منقبت سے ان کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔'' کتاب اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ میں اپنی یاد پر لکھ رہا ہوں۔ گو اس بڑھاپے میں بھی لوگ کہتے ہیں کہ میرا حافظہ غنیمت ہے۔ پھر بھی اگر میں غلط کہہ گیا ہوں تو میرے استاد اور مسلمان اور میرا خدا مجھ کو معاف کرے۔

پانچ پانچ[1] پشتوں تک ہر راوی کا حافظہ کہیں غلطی نہ کرے، یہ بات صرف حضرت امام بخاری کو اور ان کے راویوں ہی کو مبارک ہو۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ابھی ایک بات ہم دوسرے سے کہتے ہیں۔ دوسرا تیسرے سے کہتا ہے تیسرا ہم سے تصدیق کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں ''بالکل ٹھیک ہے۔ صرف ذرا سا فرق ہوگیا ہے، میرا مفہوم یہ تھا۔'' اس قول پر ہم تینوں میں سے کوئی کسی کی نیت پر شک نہیں کرتا اور بات سلجھ جاتی ہے۔ اب آپ ہی خدا لگتی فرمائیے کہ پانچ پانچ پشتوں تک یہی ہوا کرے اور کوئی راوی کہیں غلطی نہ کرے۔ کیسی بات ہے رسول اللہ صلعم سے تو اللہ میاں فرمائیں۔ اگر شیطان تجھ کو یہ حکم بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ان ناانصافیوں کے پاس نہ بیٹھ'' اور حضرت امام بخاری کے راوی کہیں غلطی نہ کریں۔ جن لوگوں کو لکھنے کی عادت نہیں ہوتی جیسے عربوں کا حال تھا کیونکہ کاغذ اس وقت تک چین سے نہ آیا تھا۔ ان کا حافظہ اور لوگوں سے قوی ہوتا ہے۔ مگر جب تک انسان معصوم عن الخطاء نہ پیدا کیا گیا ہو اس وقت تک اس پر اتنا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا کہ آدمی ان اقوال پر اپنا راستہ خدا کے سامنے جانے کا تیار کرلے۔ پھر یہ بھی لحاظ کرنے کی بات ہے کہ بنی امیہ کا زمانہ اسی اکھاڑ پچھاڑ میں گزر چکا تھا۔ بنی عباس کی رد و قدح عزت الکمال کو پہنچ چکی تھی۔ اور ہر شخص انھیں احادیث کی بنا پر اپنا راستہ اگر عقبیٰ کے لیے نہیں تو

---

[1] بخاری میں زیادہ تر تین ہی تین راوی دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں کہیں چار بھی ہیں۔ سورۃ انعام ع ۸

دنیا کے لیے ضرور ڈھونڈھ رہا تھا۔ اس جگہ تھوڑی سی عبارت حتی کی تاریخ عرب سے نقل کرتا ہوں۔ حتی نے زمانہ موجودہ میں تاریخ عرب انگریزی میں لکھی ہے جس کو پڑھے لکھے لوگ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، یہ مورخ عرب ہے اور مذہبا عیسائی ہے اور بیروت کی یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہے۔ ''رحلت رسولؐ کے ڈھائی سو برس کے اندر آنحضرتؐ کے اقوال اور افعال کی فہرست چہ از روئے بُعد زمانہ و چہ از روئے طریق برابر بڑھتی گئیں۔ جب کوئی مسئلہ مذہبی، سیاسی یا معاشرتی پیش آیا تو ہر دو فریق معاملہ نے یہ کوشش کی کہ کوئی کلام یا حکم رسول صلعم کا اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں لاوے۔ واقعی ہو یا وضعی۔ اس سے مطلب نہیں حضرت علی اور حضرت ابوبکرؓ کا سیاسی معاملہ، امیر معاویہ اور حضرت علیؓ کے درمیانی جھگڑے، اموی اور عباسی عناد، عرب اور عجم کی برتری کا مسئلہ، یہ اور اسی طرح کی دوسری ضرورتوں کی وجہ سے حدیثیں گڑھنے اور ان کی اشاعت کی ضرورت پڑی۔ اس کے علاوہ حدیثیں تیار کرنا منفعت کی رو سے بھی تھا۔ بہت سے علماء حدیث لکھنے کے ذریعہ سے آرام کی زندگیاں بسر کرتے تھے،۷۷۲ھ میں جب ابن ابی العوجا کو سزائے موت دی گئی تو انھوں نے اعتراف کیا کہ ''میں نے[1] چار ہزار خود اپنی موضوعہ احادیث کی اشاعت کی ہے۔ عموماً مدنی احادیث کو کوفی احادیث پر ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن یہاں بھی سب شک سے بالاتر نہیں ہیں۔ مثلاً ابوہریرہ صحابی رسول کے اقوال اور افعال کے بڑی پرجوش اشاعت کرنے والے ہیں۔ ان کی بابت شہرہ ہے کہ انھوں نے پانچ ہزار تین سو روایتیں بیان کیں۔ بہت سی احادیث ان میں مانی ہوئی ایسی تھیں جو حضرت ابوہریرہ کے بعد ان کے ذمہ ڈال دی گئیں۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ نے دو ہزار دو سو دس حدیثیں بیان کیں۔ انس ابن مالک نے دو ہزار دو سو چھیاسی احادیث بیان کیں۔ حضرت عبداللہ[2] ابن عمر سے ایک ہزار چھ سو تیس احادیث مروی ہیں۔

سب سے زیادہ متحیر کرنے والی بات صحیح بخاری وغیرہ میں ایک اور بھی ہے۔ یعنی

1　طبری بحوالہ ابن الاثیر۔

2　بحوالہ نودی

اکثر آیات قرآنی حضرت عمر کے خیال کے مطابق نازل ہوئیں جب کبھی رسول اللہ صلعم اور حضرت عمر کے درمیان اختلاف رائے ہوا تو حکم خدا حضرت عمر کے خیال کے موافق آیا۔ حضرت عمر کے بہت بڑے آدمی ہونے میں اور رسول اللہ صلعم کو چھوڑ کر اسلام کے سب سے بڑے عالی دماغ سب سے بڑے مدبر اور سب سے بڑے سیاست داں ہونے میں شک کی گنجائش نہیں۔ اسلام کے ساتھ آپ کی دل سوزی بھی مانی ہوئی بات ہے۔ مگر اختلاف کے وقت وحی کا ان کے خیال کے موافق نازل ہونا ایک عجیب بات ہے۔ اس میں شک نہیں، جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلعم انسان فوق الانسان تھے۔ ان کا مقابلہ کسی سے نہیں کیا جاسکتا۔ پھر اس طرح کی باتیں مان لینے کے بعد قرآن کا درجہ عیاذاً باللہ کیا رہ جاتا ہے) عبداللہ ابن ابی مرگیا تو اس کے بیٹے نے نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ مجھ کو اپنا کرتا دیجیے جس سے اسے کفن دیا جائے اور اس کی نماز پڑھیے اور اس کے لیے بخشش کی دعا مانگیے۔ آپ نے اپنا کرتہ دے دیا اور فرمایا کہ جب جنازہ تیار ہوجائے تو مجھے اطلاع دینا۔ میں اس کی نماز پڑھ دوں گا۔ چنانچہ اس نے آپ کو اطلاع دی، مگر جب آپ نے چاہا کہ اس کی نماز پڑھیں تو حضرت عمر نے روک دیا اور کہا کہ کیا منافقین پر نماز (جنازہ) پڑھنے سے اللہ نے آپ کو منع نہیں کیا ہے جس پر آپ نے فرمایا "مجھے دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا اور اللہ کا ارشاد ہے۔

استغفر[1] لهم اولا تستغفرهم ان اتستغفرلَهُم سبعين مرتاً لن يغفرالله لهم

پس آپ نے اس کی نماز پڑھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

و لا تصل على احد منهم مات ابداً

اور اس طرح کی اور روایتیں بھی ہیں۔ دل کے اوپر اور عقل کے اوپر کسی کا اختیار نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس طرح کی روایات قرآن کو اور دین کو کمزور کرتی ہیں اور فرقوں کو مضبوط کرتی ہیں۔ اور کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔

---

1. بخاری، حصہ اول، حدیث نمبر ۳۰۷، صفحہ ۲۵۴ میں ملاحظہ ہو، ترجمہ: تم ان کے لیے طلب مغفرت کرو یا نہ کرو، دونوں برابر ہیں۔ اگر ستر بار ان گناہوں کی معافی چاہو گے تو خدا ہرگز معاف نہیں کرے گا۔

2. صحیح بخاری، حصہ اول، باب البدع اذان۔ حدیث نمبر ۳۳۹

اذان کے معاملہ میں بھی حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ آدمی کے ذریعہ سے اعلان حضرت عمر کی رائے کے موافق طے ہوا۔ اس میں کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس کے متعلق ایک روایت ہے جس کو لکھتے اچھا نہیں معلوم ہوگا مگر لکھنا پڑے گی۔ ابن عمر کہتے ہیں کہ مسلمان جب مدینہ آئے تو نماز کے وقت کا اندازہ کر کے لوگ نماز کے لیے جمع ہوجایا کرتے تھے، کیونکہ نماز کے لیے اعلان نہ ہوتا تھا۔ پس ایک دن مسلمانوں نے اس بارے میں گفتگو کی۔ چنانچہ بعض نے کہا کہ نصاریٰ کے ناقوس کی طرح ناقوس بنالو۔ بعض نے یہود کے سنکھ کی طرح سنکھ بنانے کی رائے دی۔ حضرت عمر نے فرمایا، کوئی آدمی کیوں نہیں مقرر کردیتے کہ وہ صلوٰۃ پکار دیا کرے۔ پس رسول اللہ صلعم نے فرمایا ''بلال اٹھو، نماز کی اطلاع کردو'' اس کے بعد ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا جب نماز کی اذان کہی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے اور خوف کے مارے اسے گوز ہوجاتا ہے (لاحول و لاقوۃ الا باللہ العلی العظیم) تاکہ اذان کی آواز نہ سنے۔ پھر جب اذان کی آواز ختم ہوجاتی ہے تو سامنے آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب نماز کی اقامت کہی جاتی ہے تو پیٹھ دے کر بھاگتا ہے۔ اور ختم امامت پر پھر آ موجود ہوتا ہے تاکہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان وسوسہ ڈالے اور کہتا ہے فلاں بات یاد کرو، فلاں بات یاد کرو، یعنی وہ باتیں جو اس کو یاد نہ تھیں۔ حتیٰ کہ انسان بھول جاتا ہے کہ اس نے کس قدر نماز پڑھی۔

غور فرمایئے کہ احمد کی بھیجی ہوئی نماز، رسول کی لائی ہوئی نماز میں شیطان جیسا کہ اس کو قیامت تک کی مہلت دی گئی ہے وسوسہ ڈالے مگر اذان میں وہ مہلت ملتوی ہوجائے۔

واضح ہو کہ میں اذان میں نہ "اشھدان امیرالمومنین امام المتقین علی ولی اللہ وصی رسولہ و خلیفۃ بلا فصل" کہتا ہوں نہ "الصلوٰۃ خیر من النوم"

نواں باب

ارے صاحب کہاں تک اس کا رونا رویا جائے، علاوہ اثناعشری کے نہ معلوم کتنے فرقہ گذرے ہیں جو اس سے بھی آگے گئے ہیں اور غضب تو یہ ہے کہ پیسہ کمانے کے شوق میں اثناعشری واعظین اپنے ادپردہ باتیں اوڑھ لیتے ہیں جو ان کے مذہب میں کہیں داخل نہیں۔ نصیریوں کے عقائد اگر صاف نہیں تو اشارۃً کنایتاً کہہ گذرتے ہیں۔ کسی فرانسیسی نے کہا ہے ''حماقت کی باتیں جو یوں نہیں کہی جاسکتیں گا کر کہہ سکتے ہو۔'' یعنی نظم میں کہہ سکتے ہیں نہ معلوم کتنے اشعار پڑھے جاتے ہیں جو انھیں غلاۃ کے عقائد سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ حضرات مجلس کی واہ واہ میں یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ اپنے ساتھ شیعوں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ نصیریوں کے یہاں بہت سی ایسی ہی باتیں داخل مذہب ہیں۔ یہ لوگ اپنے مذہب کے اصول راز بھی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ تقریباً تین لاکھ ہوں گے جو شمالی اور وسطی شام کے پہاڑوں کے سلسلے میں پھیلے ہوئے ہیں اور پہلی عالمگیر لڑائی کے بعد سے فرانسیسیوں کے تحت میں تھے۔ اب خود شام والوں کی آزاد حکومت ہے۔ یہ مذہب بقول چند مصنفین عیسائیوں سے نکلا ہے کیونکہ ان لوگوں کے نام بھی اکثر انجیل کے ناموں پر ہوتے ہیں۔ اور عید غدیر وغیرہ منانے کے ساتھ ساتھ کرسمس، ایسٹر اور دوسرے عیسائی تہوار بھی مناتے ہیں۔ تثلیث کی کھال کھینچ اسمعیلیہ فرقہ کے عقائد کے ساتھ ایک نئے رنگ سے کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ، رسول اللہ صلعم اور جناب سلمان، چاند، سورج، ستارہ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی مذہبی کتاب کا نام المجموع ہے۔ ترکی اور اناطولیہ میں ایک اور فرقہ ہے جن کو حروفی کہتے ہیں اور بیکتاشی بھی کہتے ہیں۔ ایک اور فرقہ ہے جو نصیریوں سے علیحدہ ہے اور ان کو علی اللّٰہی کہتے ہیں۔ یہ فرقہ بھی اناطولیہ اور ترکستان کے قریب موجود ہے۔ یہ فرقہ بیکتاشی اور نصیریوں سے عقائدی تعلقات رکھتا ہے۔ اور مذہبی عقائد کو راز رکھنا ان لوگوں میں بھی عام ہے۔ ان کے یہاں ایک اور رسم کہی جاتی ہے یعنی چراغ گل کر کے افعال

شیغہ میں بے تکلف حصہ لیتے ہیں۔ انھیں مضافات یعنی روس اور ترکستان کی قدیم تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے ان لوگوں میں اندھیرے میں ناچنے کا رواج تھا۔ یہ اکثر مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی اسی طرح کی ایک پوجا ہوتی تھی جس کو شاکتی پوجا کہتے تھے۔ جو از روئے انسائیکلوپیڈیا چھپا کر ہوتی تھی۔ اب شاید نہیں ہوتی۔ ایک پڑھے لکھے ہندو دوست اس کا فلسفہ مجھ کو اس طرح سمجھا رہے تھے کہ جس سے شک ہوتا تھا کہ شاید اب بھی ہوتا ہو تو تعجب نہیں۔ خیر ہندوؤں کا حال تو جملہ معترضہ کے طور پر آ گیا تھا۔ ذکر تو چراغ کشاں کا تھا۔ اسلام میں حال و قال کا سلسلہ بھی قونیہ سے شروع ہوا۔ انسائیکلوپیڈیا میں اس کا حال بھی اور تصویر بھی ہے۔ ہیولاکس ایلس کی مشہور و معروف کتاب نفسیات جنسی میں اس کا ذکر ہے۔

اسلام میں حال و قال کا سلسلہ مولانا روم کے وقت سے شروع ہوا۔ آیا یہ حال و قال جزو اسلام ہے یا نہیں، یہ غور کرنے کی بات ہے ایک مقام پر آگے یا پیچھے میں نے عرض کیا ہے کہ حکیم سنائی تک تصوف میری سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے آگے نہیں آتا۔ میرے اس قول کی یہی وجہ تھی۔ اگر کہیں یہ ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ صلعم یا حضرت علیؓ یا حضرت ابوبکرؓ نے یہ کیا ہے تو میں ماننے کو تیار ہوں نہیں تو حضرت مجھ کو تو معاف ہی رکھیے۔ حال ... کی محفل میں جو لوجی لطف آیا ہے اور ان تقریبات میں بہت حصہ لیتا رہا اور لطف اندوز ہوتا رہا، لیکن غور کرنے سے پتہ چلا کہ لطف روحانی پہلو کا نہ تھا بلکہ عارض وگل و شراب محبت، عشق و وصال کے اذکار سے تھا۔

روزہا رفت کہ دست من مسکیں نہ گرفت
ساقیِ شمشاد قدے ساعدِ سیم اندامے

اگر آپ کو بھی حافظ کا یہ شعر مزہ دے گیا ہو تو میں آگاہ کیے دیتا ہوں کہ ذرا سنبھل کر مزے لیجیے گا۔ اور ایک بارگی یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ خالی زمانِ قبض کی شکایت ہے اور حالت بست کی آرزو ہے۔ اس کی پہچان بھی بتا دوں، اگر مجامعت کی تمام اصطلاحیں ترک کرنے کے بعد بھی قبض و بست کا خیال باقی رہے تو تو ٹھیک ہے، نہیں تو نہیں۔ اس جگہ تفریح قلوب مومنین کے لیے ایک واقعہ عرض کردوں۔ ایک بزرگ جن کے مریدوں کی

تعداد لاکھوں بتائی جاتی تھی ان کے آستانہ پر خود ان کے عرس کی رات کو محفل سماع تھی۔ میں بھی حاضر تھا اور سجادہ نشیں صاحب کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ دو دیہاتی رنڈیاں دبلی پتلی سیاہ فام سی کریہہ الصورت مجہول الفن اس شعر کی تکرار کر رہی تھیں ۔

لغزش مستانہ در رفتار و جام مے بکف
رخصت اے تقویٰ کہ یار آمد بسامان دگر

شعر مزہ داری کا تھا۔ مگر جو لطف چاہیے تھا وہ نہ اٹھ رہا تھا۔ اتنے میں حکم ہوا کہ فلاں رنڈی حاضر ہو۔ حضرات، رات کی مدھم روشنی میں محفل کے دوسرے سرے پر ایک رنڈی بڑھی، جوانی، خوبصورتی، چھپ تختی، گات گولائی، رنگ ڈھنگ، سرخ پارسی ساڑی، بڑے بڑے سفید بوٹے غضب ڈھا رہے تھے۔ وہ رنڈی تو گا رہی تھی میں نے صرف تحت اللفظ میں کہا ''رخصت اے تقویٰ کہ یار آمد بسامان دگر'' نہ مزامیر، نہ لے نہ سر نہ مرکی نہ بیڈار، نہ سوت یقین مانئے گا میرے اردگرد حضرات مع سجادہ نشین صاحب کے جھوم ہی تو گئے۔

میرے پڑھنے والو، باوجود میری سیاہ کاریوں کے یہ نہ سمجھیے گا کہ قربۃً الی اللہ کے لیے میں نے تصوف کا در نہیں کھٹکھٹایا۔ حلقہ میں بھی بیٹھا ہوں۔ بزرگوں سے عرض حال بھی کیا ہے مگر جو راہ دل ڈھونڈھتا تھا وہ نہ ملی۔ حکیم سنائی تک تو تصوف سمجھ میں آیا۔ اس سے مدد بھی ملی۔ مگر اس کے آگے نہ چلا۔ اگر تصوف سے مراد قرآن کے احکام کے اندر رہ کر وہ طریق زندگی ہے جو حضرت ابو ذر غفاریؓ صحابی رسول اللہ کا تھا جن کا ذکر مختلف کتب تاریخ اسلامی میں ملتا ہے۔ یا جناب ابودرداؓ کی زندگی تھی یا حضرت سلمان کی تھی یا خود جناب امیر علیہ السلام کی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تھی۔ تو پھر تو تصوف وہی ہے جو قرآن میں ہے۔ جہاں روایات اور بعض تاویل آیات پر آگے چلتے ہیں وہاں سے میری راہ ختم ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے مولانا روم کو نہ سمجھ سکا۔

مثنوی　مولوی　معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

اگر ان اشعار کے لیے کہا جائے جو بر بنائے آیات ہیں تو خیر۔ مگر جہاں ان روایات کی بنا پر وہ حکایتیں ہیں جن کی تدوین تیسری صدی کے شروع میں ہوئی ہے اور جن کی بابت میں اپنے ناچیز خیالات ظاہر کر چکا ہوں تو مجھ کو متذکرۂ بالا شعر اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

میرے پڑھنے والو مجھ کو معاف کرنا۔ اس جگہ رسول خدا صلعم کے اصحاب خاص کے اسماء گرامی آگئے ہیں۔ سلسلۂ کلام کو ترک کر کے آپ ہی آپ دل چاہتا ہے کہ ان حضرات کے بارے میں ایک ایک بات عرض کردوں۔ تب آگے چلوں، رشتہ کلام تو چھوٹا مگر عروۃ الوثقائے محبت میں ہمارے آپ کے دل اگر گندھ جائیں تو کیا برا ہے۔ حضرت ابو دردؓ اور حضرت سلمان کے درمیان میں ان کے آقا و مولیٰ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغۂ اخوت پڑھا تھا۔ ایک دن حضرت سلمان اپنے بھائی کو دیکھنے گئے۔ غریبی اور عسرت حضرت سلمان کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ مگر حضرت ابو دردؓ کی بی بی کے پھٹے میلے کپڑے دیکھ کر رنج ہوا۔ استفسار پر حضرت ابو دردؓ کی بی بی نے کہا کہ تمھارے بھائی کو سوائے عبادت خدا کے اور کسی چیز سے واسطہ ہی نہیں ہے۔ رات کو حضرت ابو دردا سے حضرت سلمان نے کہا کہ بی بی کا حق تم پر ہے اور اپنے نفس کا بھی اور خدا کا بھی، بعد کو جناب رسالت مآب صلعم نے اس کی تصدیق فرمائی۔ جناب سلمان فارسی کو حضرت علی نے بصرے کا والی مقرر کیا تھا۔ راستہ میں سواری کا گدھا مر گیا تھا، خود اپنی پیٹھ پر زین لادے ہوئے اپنی حکومت کے شہر میں داخل ہوئے۔ حضرت اویس قرنی بکریاں چراتے تھے اور دنیا کو بکریوں سے کم جانتے تھے۔ صفین میں جناب امیر کی طرف سے لڑے اور جناب خال المومنین کی فوج نے شہید کیا۔ رسول اللہ کی زیارت نہیں ہوئی تھی مگر آنحضرت صلعم فرماتے تھے کہ یمن کی طرف سے مجھ کو بوئے محبت آتی ہے۔ جناب امیرؑ فرمایا کرتے تھے کہ اے دنیا میں نے تیری مہار تیری گردن پر ڈال دی ہے۔ مجھ کو تو تیری پروا نہیں، چلی جا جدھر دل چاہے۔ حضرت ابو ذر غفاری نے ہمیشہ اعلان کلمۃ الحق کیا۔ شروع میں اسی پر زد و کوب کی گئی اور آخر میں اسی پر اپنے حبیب کے دیار سے نکالے گئے، مگر کیا پروا، مارے گئے قرب خدا حاصل ہوا۔ نکالے گئے اپنے حبیب کے پاس جنت میں پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ تھے مگر

اپنی ذمہ داریوں کا خیال کر کے کہتے تھے ''کاش میں درخت ہوتا کہ جانور مجھے چر جاتے۔ ان باتوں کے اسناد لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے پوری پوری روایتیں بھی نہیں لکھی ہیں۔ ان میں نہ معجزے ہیں نہ کرامتیں، یہ تو ''جمال ہم نشیں در من اثر کرد'' والی بات ہے اور کچھ نہیں۔ خیر اب پھر سلسلہ کلام شروع ہوتا ہے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ وہ تصوف تو میری سمجھ میں آتا ہے جو قرآن میں ہے۔ جہاں روایات اور بعض تاویل آیات پر آگے چلتے ہیں وہاں سے میری راہ ختم ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے معتد بہ حصہ مولانا روم کا نہ سمجھ سکا۔ مثلاً مثنوی کے دوسرے دفتر میں امیر معاویہ کو شیطان کا صبح کی نماز کے لیے جگا دینا اور بڑی مشکل سے بتانا کہ اگر میں نہ جگاتا تو ۔

گر نمازت فوت می شد آماں زماں
می زدے از دردِ دل آہ و فغاں
آں تاسف واں فغاں و آں نیاز
در گذشتے از دو صد رکعت نماز

اس حکایت سے جہاں تک میں سمجھا ہوں مدعا یہ ہے کہ انفعال تواب الرحیم کو بہت پسند ہے اور نفس امارہ آدمی کو ہمیشہ دھوکا دیتا ہے۔ لیکن اس تعلیم کے لیے جو حکایت اختیار کی گئی ہے وہ اور دوسرے دُود و دام کی حکایتوں کی طرح کی نہیں ہے بلکہ اس سے کچھ فرقہ بندی کے فوائد بھی نکلتے ہیں، اسی طرح کی اور مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں مگر کیا کروں لکھ کر، اس کے بعد ذیل کا شعر مجھ کو تو جسارت ہی جسارت معلوم ہوتا ہے ۔

من ز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پیش سگاں انداختم

قرآن کا ایک ایک حرف چاہے محکم ہو چاہے متشابہ ہر مسلمان کا ایمان ہے اور یہاں یہ ارشاد ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مثنوی مولانا روم میری سمجھ سے باہر ہے۔

مورخین کا کہنا ہے کہ تصوف شروع تو ہوا عرب سے مگر پھر اس میں تو افلاطونی فلسفہ عیسائیت ویدانت سب ہی شامل ہو گئے۔ ایرانی عنصر بہت غالب ہو گیا۔ صوف کے معنی اگر اون کے لیے جائیں تو عیسائی پادریوں کا موٹے اون کا لبادہ پہلے سے موجود تھا۔

شادی نہ کرنا اسلام کے برخلاف عیسائی راہبوں کا شیوہ تھا۔ پیری مریدی بھی عیسائیوں کے یہاں تھی، ذکر کو عیسائیت میں لٹنی کہتے ہیں۔ سب سے پہلے صوفی کا لفظ جابر ابن حیان ماہر کیمیا کے لیے استعمال ہوا۔ حضرت ابراہیم ادھم کا طریقۂ زہد بدھ مذہب میں موجود تھا۔ حضرت ابو داؤد اور حضرت سلمان اور حضرت اویس قرنی وغیرہ رضوان اللہ علیہم کا انداز دوسرا تھا۔ یہ حضرات رسول اللہ کے زمانہ میں تھے۔ جہاں غلطیاں کرتے رہے ہوں گے فوراً ٹھیک کر دیے جاتے رہے ہوں گے۔ حضرت اویس قرنی نے زیارت نہ کی ہو مگر عاشق رسول صلعم تھے اور اس وقت تک یونانی فلسفہ رائج نہیں ہوا تھا اور کم سے کم حضرت علی علیہ السلام میں رسول اللہ کے کچھ انداز پائے ہی جاتے رہے ہوں گے، مگر سلطنت چھوڑ کر فقیری لے لینا بالکل گوتم بدھ کا انداز تھا۔

حضرت بایزید بسطامی کی تعلیم فنا بھی بدھ کی نروان سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے۔ رفاعیہ طریقہ جس میں خود اپنے کو اذیت دینے میں بھی اسلامی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ہمہ اوست ہندوؤں کے ویدانت میں دکھائی دیتا ہے۔ گیارہویں صدی میں حضرت ابوحامد غزالی نے کوئی راستہ ایسا نہ تھا جس کی تحقیقات نہ کی ہو۔ ان کی کتابیں یورپ میں ترجمہ ہوئیں اور صدیوں تک عیسائیوں کو متاثر کیا کیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ فقہ کا درجہ اسلام میں علم الکلام کے مقابلہ میں ضرور کم ہوگیا ہے۔ تصوف اور مضبوط ہوگیا ہے۔ میری تحریر سے بھی ظاہر ہوتا ہوگا اور خود میں بھی اعتراف کرتا ہوں کہ ان حضرات کی کتابیں پڑھنا مجھ کو کہاں نصیب ہوئیں لیکن عمر بھر پڑھا ہی کیا۔ مختلف تاریخیں، مختلف سوانح جو میں نے پڑھی ہیں ان سے یہ باتیں میرے جی میں جاگزیں ہوئی ہیں۔ اگر کوئی صاحب چاہیں تو وہی کتابیں پڑھ کر مجھ سے بہتر رائے قائم کرلیں۔ میں تصوف کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں، مگر چار پیر چودہ خانوادے جن میں گو ایسی ایسی ہستیوں کا نام بھی شامل کیا جاتا ہے۔ جیسے امام حسن علیہ السلام۔ مگر مجھ کو تو یہی معلوم ہوتا ہے جیسے لوگوں نے اسلامی آسمان کے نیچے ایک اور آسمان تیار کیا ہے اور جب ان سے کہو کہ یہ آسمان تو وہ نہیں ہے جو اسلام کہلاتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وہ آسمان تو اس کے اوپر موجود ہے۔ خالی یہاں سے دکھائی نہیں دیتا۔ جب اس طریقہ میں رہو گے اور اندرونی آنکھیں کھل جائیں گی تو وہ اصلی

آسمان بھی دیکھ لو گے۔ اس کے بعد پھر جذب اور پیر پرستی آجاتی ہے۔ جہاں اکثر نہ نماز کی ضرورت نہ روزہ کی ضرورت، بھنگ شراب، گانجا، امرد پرستی، سب کچھ دکھائی دیتی ہے۔ معجزے کرامات گلی گلی مارے مارے پھرتے ہیں۔ تب تو حضرت ہم استغفراللہ ربی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہتے۔

تصوف میں جو چیز سب سے زیادہ میرے دل پر اثر کرتی ہے وہ محبت کا ادعا اور خیالات کی نرمی اور بے ضرر ہونے کی کوشش ہے۔ کسی سے کینہ نہ رکھنے کی اصول پر تصوف کو جو ناز ہو صوفی کو درگذر سے کام لینے پر جو مباہات ہو وہ صرف بجا ہی نہیں بلکہ عش عش کرنے کی بات ہے۔ اگر کوئی کہے اس میں صوفی کی کیا خصوصیت ہے یہ دعویٰ تو ہر مسلمان کرسکتا ہے اور کرتا ہے۔ میں عرض کروں گا بالکل درست ہے لیکن سب طبایع ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ جس کی افتاد طبع جس طرح ہوئی وہ تعلیم سے اسی طرح کا فائدہ حاصل کرلیتا ہے۔ طبیعات کے ماہرین کہتے ہیں کہ زمین کے اندر ایک دھات ہے جس سے حدت نکلا کرتی ہے اور اس کے اردگرد کی ہر چیز اپنی فطری قابلیت کے موافق اسی حدت سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ میں سائنس نہیں جانتا، مگر سنی سنائی بات عرض کردوں اس دھات کا نام ریڈیم ہے۔ فرض کیجیے کہ جو پتھر اس ریڈیم کے قریب ہے وہ اپنی ماہیت کے موافق رنگ شفافی اور وزن قبول کر لیتے ہوں۔ اسی طرح ذات بابرکات رسالت صلعم کو سمجھ لیجیے کہ آنحضرتؐ کی صحبت سے ہر شخص اپنی استعداد کے موافق متاثر ہوا۔ اب قرآن کے احکام کو لیجیے۔ جو دانت توڑے اس کا بدلہ دانت ہے اور آنکھ پھوڑے اس کا بدلہ آنکھ ہے اور ہر زخم کا بدلہ زخم ہے اور اگر معاف کردو تو بہتر ہے۔ قصاص کے لیے قرض کے لیے مہر وغیرہ کے لیے عورتوں سے سلوک کے لیے اسی قسم کے احکام ہیں کہ تم اپنا حق لے سکتے ہو، لیکن اگر درگذر کردو تو بہتر ہے۔ اب ان احکام سے ہر شخص مستفید ہوا۔ کسی نے بدلہ لینا اپنا حق سمجھا اور کسی نے درگذر کرنا اپنی طبیعت کے موافق پایا جن لوگوں کو بجائے بدلہ لینے کے درگذر کرنا زیادہ پسند ہوا وہی صوفی کہلائے۔ ایران کے تمدن سے دنیائے اسلام بہت متاثر ہوئی۔ وہاں کی شاعری میں تصوف کا رنگ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ تصوف سے واسطہ رکھتے تھے وہ متاثر ہوئے اور جو واسطہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی اسی رنگ میں

رنگ گئے۔ سچے صوفی شعراء اور نام نہاد صوفی شعراء سب کے کلام میں وہی نرمی ظاہر ہونے لگی۔ کچھ مثالیں بھی آگے چل کر لکھ دوں گا۔

اصحاب صفہ وہ لوگ تھے جن کا کھانا رسول اللہ صلعم سے متعلق تھا۔ کبھی آنحضرت ان کے لیے کھانا مانگ لاتے تھے۔ کبھی لوگ خود دے جاتے تھے، یہ لوگ سوائے عبادت کے اور جہاد کے اور چیزوں میں کم دلچسپی لیتے تھے۔ لفظ صوفی اسی لفظ سے نکلا یا کسی دوسرے لفظ سے مطلب ہے۔ یعنی ان حضرات میں ایک نرمی تھی جو ہر حال میں قابل رشک اور غبطہ ہے۔ لیجیے کچھ اشعار سن لیجیے۔

نہ دل میں بدی ہو نہ کینہ نہ بیر　　یہ گھر صاف ہو ہو کے دکھلائے سیر

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم　　انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است　　باد دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

کفر است در طریقۂ ما کینہ داشتن　　آئینِ ماست سینہ چو آئینہ داشتن

بہ یمن عشق ز کونین صلح کل کردیم　　تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا　　اور درویش کی صدا کیا ہے

جی میں جو آئے کیجیو پیارے　　ایک ہونا نہ در پئے آزار

ٹھیک ہے مصرع کا مضموں قافیہ گو سخت ہے
اہل دل نالاں ہوں جس سے وہ بڑا کمبخت ہے

ادائے حقِ محبت عنایت است ز دوست
وگر نہ خاطر عاشق بہ ہیچ خور سند است

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
یہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

با خلق خدا سخن بشیرینی کن
اظہار نیاز و عجز و مسکینی کن
تا بر سر دیدہ جا دہندت مردم
چوں مردمِ دیدہ ترک خود بینی کن

نماز میں جہاں تک فرائض کا تعلق ہے میں سنیوں کی نماز اور شیعوں کی نماز میں کوئی ایسا فرق نہیں پاتا کہ ساتھ پڑھنے میں نماز ہی نہ ہو، حنفی مسائل اور شیعوں کے مسائل میں فرق ضرور ہے۔ مثلاً حنفیوں کے یہاں یہ ہے کہ اگر ایک سجدہ چھوٹ جائے تو نماز فاسد نہ ہوگی بلکہ ناقص ہو جائے گی۔ شیعوں کے یہاں سجدہ رکن نماز ہے۔ اگر وہ چھوٹ گیا تو نماز ہی گئی۔

میں اس مسئلہ میں شیعوں کے مسئلہ کا قائل ہوں۔ سنیوں کے ساتھ نماز پڑھنے میں جس دن امام سے ایک سجدہ چھوٹ جائے گا اس دن وہ نماز میں پھر سے پڑھ لوں گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) دوسری رکعت میں شیعہ ہاتھ اٹھا کر قنوت پڑھتے ہیں۔ میں جب سنیوں کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں تو قنوت نہیں پڑھتا کیونکہ میرے خیال میں قنوت نہ پڑھنے سے صرف ایک مستحب چھوٹ جاتا ہے نماز باطل نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے پہلی اور تیسری رکعت میں سجدہ سے اٹھ کر بیٹھے بغیر سیدھا کھڑا بھی ہو جاتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ قعود کا حکم دوسری اور چوتھی رکعت میں بیٹھنے سے پورا ہو گیا۔ حالانکہ ان دونوں معاملات میں شیعوں کے موافق احادیث صحیح بخاری تک میں موجود ہیں۔ مگر خیر۔ یہ کتاب مناظرہ کے اوپر نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں تو اسلام میں افتراق کا ماتم کر رہا ہوں۔ "وعتصموا بحبل الله جميعاً و لا تفرقوا" کی آیت پڑھ پڑھ کر اپنے دل کو تقویت بہم پہنچا رہا ہوں۔

سنیئے حضرات نماز وغیرہ کے مسائل میں جہاں سنی شیعہ کا اختلاف ہے وہاں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی بات کے مقابلہ میں جناب سیدہ، علی اور حسنین روحی لہم الفداء ہی کی باتوں پر عمل کروں گا۔ ان حضرات کے اچھے ہونے میں شک نہیں، مگر یہ لوگ الطہر الطاہر البحر الذاخر العلم الظاہر المنصور المؤید، مولانا و سیدنا محمدا بن عبداللہ رسول اللہ خیر خلقہ و اشرف بریہ روحی لہم الفداء صلی اللہ علیہ و الہ الاطہار و علی اصحابہ الاخیار کے گود کے پالے نہیں تھے۔ جب میں یہاں تک کہنے پر تیار ہوں تو اس شرع پر کہاں چل سکتا ہوں جس کی تدوین حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ نے کی ہو۔

دسواں باب

میرے پڑھنے والو! ایک تھے ہارون موسیٰ اور ایک تھے ہارون محمدؐ، ہارون موسیٰ نے تفرقہ بچایا اور ہارون محمدؐ نے بھی مدۃ العمر تفرقہ بچایا اور گو دفاع کی لڑائیاں ان کو بھی لڑنا پڑیں مگر کوئی دشمن بھی یہ نہ کہہ سکا کہ علی نے کبھی آگ کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ایک ہونے کی آرزو رکھتا ہوں اور جہاں تک ہوسکا ہے عملاً بھی اسی پر کاربند رہا ہوں۔ مگر عبرت کی بات ہے کہ آج تیرہ سو اکسٹھ برس سے ہزاروں ہزاروں کتابیں افتراق کا خلیج بڑھانے کے لیے لکھی گئیں مگر ایک بھی تحریر ایسی نہ دیکھی نہ سنی جس میں مختلف فرق اسلام کو قریب لانے کی کوشش کی گئی ہو۔ مہد سے لے کر لحد تک کچھ اس طرح کی تعلیم ہوتی ہے کہ سڑک پر چلتا ہوا مسلمان اکثر پہچان لیا جاتا ہے کہ اپنے فرقہ کا ہے یا غیر کا فاعتبروا یا اولی الابصار۔ آیتوں کی تاویل اور راویوں کی بھرمار نے قرآن کو اگر صورتاً نہیں تو معناً ضرور بدلنے کی کوشش ہے مگر "انا له لحافظون فرمانے والا حفاظت کر ہی لے گا۔ هوالذی انزل علیك الكتاب، سورۂ آل عمران کے پہلے رکوع میں ہے۔''اے محمد اس نے تجھ پر یہ کتاب (قرآن) اتاری ہے جس میں محکم آیتیں ہیں۔ جو اصل کتاب ہیں اور دوسری مبہم محتمل المعنیٰ بھی ہیں لیکن جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ بڑھاتے اور تاویل کرنے کو مبہم آیتوں کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ اس کی تاویل اللہ کے سوا دوسرے کو معلوم نہیں ہے۔ اور بڑے پکے علم والے کہتے ہیں ''ہم اس پر ایمان لائے ہیں یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے'' اور سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں جن کو دانش ہے۔'' اس آیۃ میں اگر وقف ''اللہ'' پر رکھیے جیسا کہ قرآن میں ہے یا وقف "راسخون فی العلم" پر کریے جیسا کہ مجاہد[1] وغیرہ اور شیعہ مفسرین کہتے ہیں تو خفیف سے معنی بدل جاتے ہیں۔ اگر وقف ''فی العلم'' پر کرو تو معنی حسب ذیل ہو جائیں گے۔'' حالانکہ اس کی تاویل اللہ اور

---

[1] دیکھو قرآن عبد اللہ بن یوسف علی کا حاشیہ

بڑے پکے علم والے (ائمہ) کے سوا دوسرے کو معلوم نہیں۔''

اس آیۃ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے لیے صرف آیات محکمات ہی خدا کے سامنے بہ اسلوب نیک پہنچانے کو کافی ہیں۔ متشابہات کے معنی سے جو واقف ہوں وہ ان کے لیے ہے۔ متشابہات اگر صرف حروف مقطعات ہی ٹھہرائے جائیں تب تو غنیمت ہے۔ مگر متحمل المعنی آیات میں علاوہ حروف مقطعات کے اور آیتیں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ جیسے وضو میں پاؤں دھونے یا پاؤں پر مسح کرنے کی آیت ہے یا جس طرح اسی آیۃ میں وقف اللہ کے بعد کرنے پر یا وقف راسخون فی العلم کے بعد کرنے سے یا ''اوحی ما اوحیٰ''

نحو کی ان گہرائیوں تک میں نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اتنا دیکھتا ہوں کہ اگر آیات محکمات پر ہی نظر رکھی جائے تو فرقہ بندی معدوم ہوجائے۔ کسی ایک فرقہ کو مورد الزام ٹھہرانا بھی برا معلوم ہوتا ہے کیونکہ جتنے فرق ہیں ''وابتغاء الفتنہ میں آلودہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر فرقہ وارانہ مناظرہ پر مدار رکھا جائے تو بجائے طے ہونے کے ڈر ہے کہ دو ایک فرقہ اور بڑھ جائیں تو تعجب نہیں۔ سیدھے سیدھے احکام جو کلام پاک میں ہیں وہی ہماری زندگی کو بہ اسلوب نیک پار کردینے کو کافی ہیں۔ بشرطیکہ توفیق خدا شامل حال ہو، جیسا کہ میں ایک دوسری جگہ عرض کرچکا ہوں۔ تولنے میں ڈنڈی نہ مارو، جھوٹی گواہی نہ دو، کافر اور مسلمان کے درمیان بھی فیصلہ کرنے میں انصاف کو ہاتھ سے نہ چھوڑو، پڑوسی کے حقوق برقرار رکھو، لڑو، صلح کرو، معاف کردو، سخاوت کرو اور اصراف نہ کرو، نماز پڑھو، روزہ رکھو، ہر بڑے گناہ سے بچتے رہو، چھوٹی چھوٹی غلطیاں انشاء اللہ تعالیٰ خدا معاف کردے گا وغیرہ وغیرہ۔ قرآن شریف کی گہرائیوں کا پا جانا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ آپ محکمات پر عمل پیرا رہیں۔ قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھتے رہیں تو کچھ گہرائیاں بھی معلوم ہوجائیں تو تعجب نہیں۔ آپ نے گلستان بچپن میں پڑھی تھی۔ آج دنیا کے تجربہ کے بعد پھر اسی کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اب سمجھ میں زیادہ آتا ہے۔ اسی طرح قرآن شریف کو پڑھتے رہیے، دیکھیے پردے کے بعد پردے اٹھتے جاتے ہیں کہ نہیں۔ قرآن شریف کے لفظوں سے ممکن ہے یہی مطلب ہو جیسا کہ عبداللہ ابن یوسف علی وغیرہ کہتے ہیں۔ اگر اس کے علاوہ اور کچھ بھی ہو جیسا کہ مولانا روم کہتے ہیں۔ یعنی قرآن کے سات بطون ہیں۔ اور جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے لیے یا ان کے شاگردان، اجل صوفیہ کے لیے دعویٰ کیا جاتا ہے (اللہ جس کو چاہتا ہے

عطا فرماتا ہے) تو ہم اس سے انکار نہیں کرتے۔ مگر ہم ایسے دنیا داروں کے لیے یہی کافی ہے جو محکمات میں ہے۔ ہمارے ایسے جاہل کا مشورہ کیا مگر ہزار بات کی ایک بات عرض کردوں۔ قرآن پڑھتے جائیے سب مسائل آپ ہی حل ہوتے چلے جائیں گے۔ صرف ایک بات اور عرض کردینے کو دل چاہتا ہے۔ اگر کوئی آپ سے کہے کہ ہم ''بطون'' والی بات سمجھ گئے ہیں یا فلاں بزرگ سمجھ گئے ہیں اور ہم کو بتا گئے ہیں تو آپ ذیل کی آیۃ کی فوراً تلاوت[1] شروع کردیجیے۔ اپنے غیب پر وہ کسی کو اطلاع نہیں دیتا۔ مگر ہمارے علماء تو کھلی کھلی آیتوں کے وہ معنی بیان فرماتے ہیں کہ آنکھیں کھل جاتی ہیں اور آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
گر چاہیں تو قرآں کو بنا دیں ابھی پا ژند

"والذین معه اشداء علی الکفار" کی مزے دار تفسیر کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔ ارے مجھ سے تو دبی زبان میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ "بلغ ما انزل علیك" کے آخر میں "فی علی" تھا جس قرآن کے لیے کہا گیا ہو "انا له لحافظون" جس قرآن کی ذمہ داری اپنی خلافت ظاہری میں جناب امیر علیہ السلام نے قبول کرلی ہو اس میں ''فی علی'' جوڑنا یہ منطق داں ہی کرسکتا ہے۔ یہ دلیل کہ ان کے خود کے معاملہ میں ''فی علی''[2] اترا تھا اس لیے وہ طرح دے گئے یعنی امامت کو جو اصول دین میں شمار ہوتی ہے اور جو خدا کے یہاں سے جزو ایمان مقرر ہو چکا ہے اس میں جناب امیر علیہ السلام نے نعوذ باللہ کمی کی اور دین خدا کو از راہ انکسار ناقص چھوڑ دیا تو یہ تو ایسی بات ہوئی کہ نبی صلعم درود کا حکم جس میں ان کا نام ہے از راہ انکسار چھوڑ جاتے۔ یہ وارث علوم نبوی کے لیے میرے وہم میں بھی نہیں آسکتا۔ میرے علی تو یہ نہ کرسکتے تھے۔ جس علی کو آیۃ مباہلہ میں انفسنا کا لقب عنایت ہو۔ جو روزہ رکھ کر اللہ کی محبت میں مسکین یتیم اور اسیر کو اپنا کھانا دے دے

---

1. سورہ جن آیۃ ۲۶، ۲۷ علم الغیب فلا یظهر علی غیبه احده۔ الامن مرتضیٰ من رسول فانه یسئلك بین یدیه و من خلفه رحلا۔۲۷
2. تجرید البخاری حصہ دوم، روایت ۵۵۵

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبی اور روحانی بھائی قرار دیا جائے، جو فقراء کا بادشاہ تسلیم کیا جائے۔ وہ قرآن کو مصلحتاً ناقص چھوڑ جائے۔ میری سمجھ سے تو باہر ہے۔ شیخ صدوق[1] علیہ الرحمہ جیسا تبحر عالم، وہ بھی اس کا دعویٰ نہیں کرتے ہیں کہ فلاں چیز موجودہ قرآن پاک سے نکال ڈالی گئی ہے۔

تعزیہ داری کے اوپر میں افراط گریہ کے دیباچہ میں لکھ چکا ہوں۔ یہاں صرف اس قدر پھر سے عرض کردوں کہ تعزیہ رکھنا صرف ہندستان ہی میں رواج پایا۔ حالانکہ عزائے حسین سب ملکوں میں رائج ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا بتائی جائے کہ ہماری نانیاں دادیاں جو ہندو طینت کی بیویاں تھیں ان کی طبیعت کو اس سے مناسبت تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بت پرستی ہے اور نہ کوئی مسلمان تعزیہ کو پوجتا ہے۔ لیکن جو اہتمام اور احترام تعزیہ کا ہوتا ہے اس میں شاید کچھ جھوں سی اس کی آجاتی ہے میرے بچپن میں عام طور سے دیکھا جاتا تھا کہ مجتہدین کے گھروں میں تعزیہ داری کا رواج کم تھا۔ انھیں شرعی احتیاطوں کی وجہ سے علماء سوز بھی نہیں سنتے تھے جو کم و بیش آج تک باقی ہے۔

O

---

[1] ترجمہ: خصال شیخ صدوقؒ صفحہ ۱۰۲، جلد ۳۔ انچہ بے تردید میتواں گفت انیست کہ قرآنے را کہ علی جمع و تنظیم کرد۔ ہماروش درست پیغمبر را دارا بود و لے در اثر اختلاف مردم و کنار کردن آنحضرت از مقام خلافت مورد عمل مسلمانان واقع نہ شد و چوں مردم از قبول آں رد برتافتند آنرا در خاندان خود بہ امانت سپرد تا قائم آل محمد آں را ظاہر بر سازد۔ و آیا اختلاف آں با قرآن کہ بہ نظر خلفائے وقت جمع اوری گردید و بخط عثمانؓ تحریر شد تا چہ اندازہ است درست معلوم نیست۔

گیارہواں باب

جو کچھ مجھ کو اپنے بارے میں اعترافات کرنے تھے کر چکا۔ سب سوئیاں نکل گئیں۔ صرف آنکھوں کی رہ گئیں۔ یعنی متعہ کا مسئلہ، یہ مسئلہ جیسا ہو لیکن اغیار نے اپنی دشمنی اور ماننے والوں نے اپنی دوستی میں اس کو بدنام ضرور کر دیا ہے۔ صحاح ستہ میں اکثر لڑائیوں میں اس کی اجازت اور اکثر روک دیے جانے کا ذکر ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ جہاد میں آنحضرت صلعم نے روکا اور پھر ہم کو کسی عورت سے کپڑے وغیرہ کے عوض ایک مدت معینہ تک متعہ کرنے کی اجازت دے دی۔[1] جابر ابن عبداللہ انصاری اور مسلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہ ہم ایک لشکر میں تھے کہ رسول اللہ صلعم نے ہمارے پاس آکر ارشاد فرمایا تمھیں متعہ کرنے کی اجازت دے دی گئی تم متعہ کرلو۔ پھر حضرت علی سے روایت ہے کہ خیبر کے دن رسول خدا نے نکاح متعہ اور گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ سعید الحزری سے مروی ہے کہ ہم رسول خداؐ کے ہمراہ جنگ بنی مصطلق (غزوہ مرلیع میں) نکلے تو ہم کو عرب کی لونڈیاں ہاتھ لگیں اور ہمیں عورتوں کی خواہش ہوئی۔ مجرد رہنا ناگوار گذرا۔ تو ہم نے عزل کرنا اچھا جانا اور عزل کا ارادہ کرلیا۔ پھر ہم نے سوچا۔ جب رسول خداؐ موجود ہیں تو پھر بے آپ سے پوچھے کیوں عزل کریں۔ چنانچہ ہم نے آپ سے سوال کیا۔ تو آپ نے فرمایا عزل کرنے میں (صرف مباشرت کے لیے) تم پر کچھ خوف نہیں ہے۔ کوئی جان پیدا ہونے والی قیامت تک بن پیدا ہوئے نہ رہے گی۔

حضرت عمرؓ نے اس کو ہمیشہ کے لیے روک دیا ہے۔ میرے سوال پر میرے مرشد

---

1. تجرید البخاری، حصہ دوم روایت صفحہ ۵۵۵
2. تجرید البخاری، حصہ دوم صفحہ ۲۵۹
3. بخاری حصہ دوم روایت نمبر ۱۷۴
4. بخاری حصہ دوم روایت نمبر ۱۵۴
5. حج الکرامہ، صدیق حسن خاں صاحب (حضرت عمر) اول کسے است کہ امر بہ نماز تراویح کرد و حرام کرد متعہ!

مولانا کرامت حسین اعلی اللہ مقامہ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر کسی شخص کی حالت لام پر کے سپاہی کی سی ہو یعنی وہ گھر سے دور ہو تو وہ متعہ کرسکتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہ گھر بیٹھے کھنگالا کرے۔ میرے غریب خانہ پر ایک شیعہ مولوی صاحب اس کے اوپر بحث کر رہے تھے۔ صحبت کچھ گرم نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے بڑی ترکیبوں سے ایک سنی مولوی صاحب کو ہم لوگ گھیر لائے۔ دونوں حضرات ایک ہی آیۃ "فما استمتعتم به منهن اجورهن فريضة" (شروع الحصات) اور (جن عورتوں سے لطف اٹھا چکے ہو ان کے مہر مقررہ دے ڈالو۔'') سے جواز اور ناجوازی کی بحث فرما رہے تھے۔ علاوہ ان دو حضرات کے صحبت میں دو تین ہمارے ایسے مغرب زدہ لوگ بھی تھے جو درمیان درمیان بحث کو سیدھی راہ پر رکھنے کے لیے مباحثہ میں پھاند پڑتے تھے۔ آخر کار دونوں حضرات کو مان لینا پڑا کہ اس آیت سے متعہ کا جواز اور ناجوازی کچھ نہیں نکلتی اور بحث اس پر ملتوی ہوئی کہ آئندہ یہ دیکھا جائے گا کہ جو چیزیں پہلے سے چلی آتی تھیں وہ اسلام میں بلاحکم تحریم جائز رہیں یا ناجائز ہوگئیں۔ پھر دوسری صحبت کی نوبت ہی نہ آئی لیکن صبح ہی سے پھر وہ دونوں حضرات اپنے اپنے پرانے عقیدے پر جم گئے۔ میں بھی اپنے استاد اعلی اللہ مقامہ کی رائے پر مستقل رہا اور آج تک ہوں۔ یورپ اور امریکہ کے ممالک جو عقل و تحقیق پر نازاں ہیں ان کو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ملک اپنے قانون نکاح و طلاق روز بدلا کرتا ہے۔ تقریباً امریکہ کے ہر صوبہ میں نکاح اور طلاق کا قانون مختلف ہے۔ یورپ میں بھی روز بروز بدلا جاتا ہے اور کوشش سب کی یہی ہے کہ کچھ ایسی چول بیٹھ جائے کہ یہ قانون اس قدر فطرت کے موافق ہو جائے جیسا اسلامی قانون ہے۔ گو منھ سے نہیں کہتے مگر مطلب یہی نکلتا ہے۔

یہ مسلمات میں سے ہے کہ دنیا میں اکثر لوگ فطرۃً ایک شریک زندگی سے زیادہ کے خواہش مند ہوتے ہیں اور فطرت سے بغاوت کرکے کوئی آج تک کامیاب نہیں ہوا ہے پھر اس سے کیا فائدہ کہ قانون نکاح کو ایک تک محدود کردو اور اپنے اختیارات وسیع کردو۔ قانون ایسا کیوں نہ بنے جس کے برتنے میں زیادہ لطف ہو اور توڑنے میں کم۔ متعہ میں یہی بات ہے۔ اگر نیک نیتی کے ساتھ متعہ کا رواج ہو، اور یہ تحقیر کی نظر سے نہ دیکھا جائے تو آپ جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہو! آشنائیاں کم ہو جائیں، اخلاق بہتر ہو جائیں، یہ میرا کہا نہیں ہے یہ بڑے بڑوں کا قول ہے۔

عارضی اور دوامی عقد میں گو فرق ہے۔ مگر پھر بھی یورپ اور امریکہ کے اقدام اصول متعہ کو ممکن ہے مضبوط ہی کرتے ہوں۔ متعہ کے لیے عفت کے ویسے ہی شرائط ہیں جو نکاح کے ہیں یعنی فاحشہ یا پیشہ ور کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ سورۂ نور[1] کی تیسری آیت صاف حکم دیتی ہے۔ متعہ میں عدت کی بھی شرط ہے۔ گو عدت کی مدت کم ہے۔ متعہ کی اولاد ترکہ کی ویسی ہی حقدار ہے جیسے نکاح کی اولاد۔ اگر مسلمان برخلاف اور اختلافی مسائل کے اسی مسئلہ میں اعتدال سے کام لیتے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ حرام اور حرامی لڑکے کم ہوجاتے۔ نکاح کے اصول ہر ملک میں مختلف ہیں اور جو لڑکے ان قاعدوں کے اندر پیدا ہوتے ہیں ان کو ذلت اور تحقیر کی نگاہ سے کوئی دوسرے ملک والے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ حرامی لڑکا ویسے ہی پیدا ہوتا ہے۔ جیسے حلالی، صرف ملکی قواعد کے باہر جو لڑکے پیدا ہوتے ہیں ان کے ماں باپ کے نفسیاتی اثرات اور خود بچہ کے نفسیاتی اثرات لڑکے کو تباہ کردیتے ہیں۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ مگر میں آپ کی نظر خراشی کرنا نہیں چاہتا۔ موضوع اتنا دلچسپ ہے کہ جس کے ذکر سے چہرے بحال اور دانت چمک دکھانے لگتے ہیں اُسے اس قدر مختصر کردیا جائے ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' مگر میں تو صرف اپنے عقائد لکھ رہا ہوں۔ آج کی آزاد خیالی، آج کی آزمائشی شادی کا نظریہ آج کے ضبط تولید کے مسائل پر نظر کرتے ہوئے میں تو کہتا ہوں کہ قیاس سے کام لے کر یہ مسئلہ اگر نہ بھی ہوتا تو کچھ قیود لگا کر جائز کردیا جاتا تو اچھا تھا۔ جو فرقہ متعہ پر اعتراض فرماتے ہیں ان کو ذری لونڈیوں کے مسئلہ پر بھی غور کرلینا چاہیے۔ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز تو کچھ ٹھیک نہیں۔

ضبط تولید کے لیے آلات استعمال کرنے میں اگر کسی کو احتیاط ہو تو اس سے حفاظت کی فطری دریافتیں بھی موجود ہیں جس میں مواخذہ یا مظلمہ کا شائبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ مگر کون کہے، ہم کو اختلاف میں مزہ زیادہ آتا ہے اور دو دلوں کے ملانے میں کم۔

○

---

[1] الزانی لا ینکح الا زانیۃ اومشرکۃ والزانیۃ لا ینکحھا الا زان اومشرک وحرم ذالک علی المومنین۔ سورۂ نور

بارہواں باب

اب صرف ایک بات اور رہ گئی ہے۔ یعنی بارہویں امام علیہ السلام کی غیبت۔ مسئلہ امامت تو شیعوں میں اصول دین کہہ کر سکھایا جاتا ہے لیکن اس کے اصول مذہب ہونے میں کسی شیعہ کو کلام نہیں ہے۔ مجھ کو بدقسمتی سے اس سے اتفاق نہیں۔ میرے شیعہ بھائیوں کو میری اس تحریر سے تکلیف ہوگی مگر کیا کروں، بغیر کہے بھی چارہ نہیں۔ ۲۶۰ھ میں جناب امام حسن عسکری علیہ السلام نے رحلت فرمائی اور امام مہدی آخرالزماں کا سن اس وقت چار پانچ برس کا بتایا جاتا ہے۔ ۲۶۴ھ میں غیبت ہوئی، شیعوں کا عقیدہ ہے کہ کچھ دن غیبت صغریٰ رہی اور اس کے بعد غیبت کبریٰ ہوئی جو آج تک ہے اور جناب صاحب الامر علیہ السلام قیامت کے قریب ظہور فرمائیں گے۔ اس طرح کے عقیدے اکثر مذاہب میں پائے جاتے ہیں۔ سامی اور آریائی دونوں قسم کے مذاہب میں جس طرح خدا کو ماننا فطرت ہے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں کلام پاک میں ہے۔[1] اسی طرح دنیا بہ امید قائم ہے۔ ایک ایسے شخص کے آنے کی امید جو دنیا کو بہتر بنا دے انسانی تقاضا ہے۔ یہاں تک کہ جو خدا کو نہیں مانتے وہ بھی کہتے ہیں کہ ایک زمانہ آئے گا کہ ہر شخص جو اچھا کام کرے گا وہ خوش رہے گا اور جو گناہ کرے گا تکلیف میں ہو جائے گا۔ اس زمانہ کو وہ لوگ ملینیم (millennium) کہتے ہیں۔ اس عقیدہ کو رکھنے میں دل کو ایک تسکین سی ہوتی ہے اور ظاہراً کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا۔ مگر قرآن شریف میں کوئی نص صریح غیبت کی بابت نہیں ملتی، تاویلیں کر کے تو بقول اقبالؔ کے قرآن کو عیاذاً باللہ پاژند بنا سکتے ہیں۔ (جملہ معترضہ کے طور پر عرض کردوں کہ قرآن پاک کی تاویل کا میں منکر نہیں ہوں) لیکن صرف حدود کے اندر رہ کر ورنہ تاویل جس سے بہتر ٹکڑے مذہب کے ہو گئے ہیں وہ ظاہر ہی ہے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے بارہویں امام علیہ السلام سامرہ کے ایک غار میں

---

[1] ستارے اور چاند سورج سے خدا کی طرف یقین۔

چلے گئے اور پھر ان کی زیارت نہیں ہوئی۔ یا صرف خاص آدمیوں کے علاوہ کسی کو نہیں ہوئی۔ شیعوں کو رسول اللہؐ کے بعد کچھ زیادہ آرام نہیں ملا۔ جناب امیر علیہ السلام کی خلافت ظاہری اور امام حسن علیہ السلام کا مختصر زمانہ خلافت بھی لڑائیوں کی بے اطمینانیوں ہی میں کٹا۔ اس کے بعد کربلا نے ہر امید کا خاتمہ کردیا۔ سوائے خدا کی ذات کے اور عقیدت ایمان کے تقریباً کچھ نہ رہ گیا۔ امام رضا علیہ السلام کے زمانہ میں کچھ سانس لینے کا وقفہ ملا ہوگا۔ مگر وہ گئے دن لیکن ان لوگوں نے اپنا عقیدہ برقرار رکھا، ان ائمہ کا علم و فضل البتہ باقی رہا جب لوگ مختلف مباحث کرتے تھے اور کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے تھے تب بھی دل کو تسکین نہ ہوتی تھی جب تک علمائے اہلِ بیت سے بھی پوچھ نہ لیتے تھے۔ امام علی نقی علیہ السلام کے وقت میں زمین کربلا پر زراعت کرنے اور انہدام کا حکم ہوگیا۔ ہر طرح کے مصائب شیعوں نے جھیلے مگر اپنے ائمہ کا دامن نہ چھوڑا، آخرکار وہ وقت بھی سر پر آیا، جب امام حسن عسکری علیہ السلام نے رحلت فرمائی۔ بعض روایات کے موافق ایک پانچ برس کا بچہ رہ گیا۔ بڑے گھروں کا قاعدہ ہے کہ بچہ بھی ہمیشہ سے باتیں سن سن کر دیکھ دیکھ کر وہی انداز اختیار کر لیتے ہیں جو ان کے بزرگوں کا ہوتا ہے۔ خصوصاً مصیبت میں اکثر بیمار بچوں کو دیکھ لیجیے پیاس وغیرہ کے چیخنے میں تکلیف کی وجہ سے تین مہینہ کا بچہ آنکھیں چار کرنے لگتا ہے۔ چہ جائیکہ رسالت کے گھرانے کا بچہ۔ امیر علی مرحوم نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس گھر کے عقیدت مندوں کو یہ بچہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا جس کے آگے یا جس کی موجودگی میں یہ لوگ اپنے بے والی وارث ہونے کا اور اپنے مصائب کا ذکر کرتے رہے ہوں گے اور وہ بچہ قدرۃً متاثر ہوتا رہا ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ قصہ بھی ختم ہوگیا۔ (واضح ہو کہ میں نے امیر علی کی کتاب نہ معلوم کب پڑھی تھی۔ لہٰذا اس بیان کو میرا بیان تصور کیجیے، بہتر رائے قائم کرنے کے لیے۔ آپ پڑھ لیجیے۔

ڈھونڈھنے والوں نے اتنا پتہ بتایا ہے کہ اس غار کے قریب تک دیکھے گئے تھے۔ اصلیت کیا تھی، یہ خدا ہی جانتا ہے، دنیا میں یہ ہوتا چلا آیا ہے، آج بھی مختلف ممالک میں ہوا ہے کہ لوگ اپنے سردار کو کھو کر بھی یہ نہیں کہنا چاہتے تھے کہ وہ بے آسرا ہوگئے۔ دنیا بہ امید قائم، وہ اپنے دل کو بھی اطمینان دلایا کرتے ہیں کہ ہمارا سردار ہمارے سر پر ہے کوئی

کہتا ہے کہ وہ لڑائی میں مارا نہیں گیا بلکہ یروشلم کی زیارت کو گیا ہے، کوئی کہتا ہے کہ جہاز ڈوب گیا مگر وہ بچ گیا، خود عرب میں اگر عقیدہ کی بنا پر نہیں تو پالٹکس کی بنا پر یہ بات اسلام میں بہت بار آچکی تھی۔ ۱۹۳۱ میں ایک جرمن مستشرق جن کا نام ایچ دان ہیلمٹ ریٹر ہے انھوں نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے ''فرق الشیعہ'' اس کتاب کے مؤلف ہیں ابی محمد حسن ابن موسیٰ النوبختی، یہ موسیٰ النوبختی آخر تیسری صدی ہجری میں تھے۔ یعنی ممکن ہے انھوں نے امام حسن عسکری کا زمانہ دیکھا ہو، اس پر دیباچہ لکھا ہے مولانا ہبت الدین سہرستانی الحسینی نے۔ یہ بزرگ یقیناً حیات ہیں اور حکومت عراق میں سابق وزیر تعلیم بھی رہ چکے ہیں اور چیف جسٹس بھی۔ یہ شیعہ ہیں اور مجتہد بھی، موسیٰ النوبختی کا ذکر ابن ندیم کی الفہرست اور دوسری کتابوں میں بھی ہے۔ ایک جزو کا ترجمہ میں نے ایک ایسے آدمی سے کروایا ہے جس کے اوپر مجھ کو پورا بھروسہ ہے۔ یہ صاحب بچپن میں میرے شاگرد تھے اور اب ماشاء اللہ میرے استاد ہیں اور مجتہد ہیں۔ ترجمہ لفظی بالکل نہیں ہے بلکہ عبارت کا خلاصہ ہے۔ میں عربی نہیں جانتا مگر تھوڑی بہت سمجھ لیتا ہوں اس لیے خود مجھ کو اس خلاصہ پر پورا وثوق ہے و ہو ہٰذا۔

(۱) پہلا فرقہ: عبداللہ ابن سبا کا ہے جس نے کہا ہے کہ علی مرے نہیں بلکہ غائب ہیں، کیونکہ وہ مر نہیں سکتے۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ پھر وہ ظاہر ہو کر حکومت کریں گے۔

(۲) دوسرا فرقہ کیسانیہ ہے جس نے محمد ابن حنیفہ کے لیے یہی کہا اور کہا کہ وہ مکہ اور مدینہ کے درمیان جبل رضویٰ پر مقیم ہیں اور ان کے دونوں طرف دو شیر محافظ ہیں۔ بعض نے کہا ہے داہنی طرف شیر، بائیں طرف چیتا ہے اور یہی وہ مہدی ہیں جن کی بشارت نبی صلعم نے دی تھی۔

(۳) تیسرا فرقہ وہ جس نے محمد حنیفہ کے بیٹے عبداللہ کو قرار دیا ہے اور قائل ہوئے کہ مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔

(۴) ایک فرقہ نے عبداللہ ابن معاویہ کے لیے مہدویت کا دعویٰ کیا یہ عبداللہ ابن معاویہ ابن جعفر طیار ہیں۔ ان کو ابومسلم نے قتل کر دیا تب دعویٰ شروع ہوا۔

کیسانیہ وہی فرقہ تھا جن میں سے اور فرقہ نکلے۔ جنھوں نے غلو شروع کیا۔ کسی نے

ائمہ کو خدا کہا کسی نے مَلَک کہا اور بعض ان میں تناسخ کے بھی قائل رہے، ایک فرقہ منصوریہ ہے جو اس کا قائل تھا کہ منصور آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ یہ منصور کوفی تھے، اور بنی عبدقیس سے تھے۔ انھوں نے امامت کا دعویٰ امام محمد باقرؑ کے بعد کہا کہ انھوں نے اپنے کام کی تفویض مجھ کو کی ہے اور کہا کہ علی ابن ابی طالب رسول تھے اور اسی طرح امام محمد باقر تک سب ائمہ بھی تھے اور آپنے لیے بھی یہی دعویٰ تھا جو ان کی اولاد میں چھ پشتوں تک چلے گا اور اس کے آخر میں قائم ہوں گے۔ یہ گمان کرتا تھا کہ جبرئیل ان کو وحی لے کر آتے ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔ ابوالخطاب اسدی نے دعویٰ کیا کہ امام جعفر صادقؑ نے ان کو اپنا وصی مقرر کیا ہے اور اسم اعظم سکھایا ہے اور پھر بڑھ کر نبوت رسالت اور مَلَک ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ چار فرقے تھے جن میں سے ایک فرقہ نے کہا کہ امام جعفر صادق بھی خدا ہیں اور ابوالخطاب ان کے بنی مرسل ہیں اور انھوں نے زنا، چوری اور شراب خوری کو حلال قرار دیا تھا اور نماز، روزہ اور حج سب چھوڑ دیا تھا۔ بذیغ کی نسبت بھی ایک فرقہ نے کہا ہے کہ وہ نبی اور رسول ہیں اور ان کو بھی امام جعفر صادق نے مقرر کیا ہے لیکن ابوالخطاب نے اس سے انکار کیا۔ سرّی کے لیے بھی متذکرۂ بالا دعویٰ کیا ہے۔ ایک فرقہ نے کہا کہ جعفر صادقؑ خدا ہیں وہی نور ہیں یہ اپنے اوصیا کے جسموں میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ نور جعفر میں تھا، پھر ان سے نکل کر ابوالخطاب میں داخل ہوا اور جعفر ملائکہ میں ہوگئے پھر یہ نور ابوالخطاب سے نکل کر معمر میں داخل ہوا۔ ابوالخطاب مَلَک ہوگئے اور معمر خدا ہوگئے۔ ابن لبان نے لوگوں کو معمر کی طرف بلایا اور کہا انھیں کے لیے نماز اور روزہ ہے اور ان لوگوں کے نزدیک کوئی چیز حرام نہیں تھی کیونکہ خدا نے ہمارے ہی لیے ہر چیز کو خلق کیا ہے۔ ابولبان سے کہا گیا کہ جعفر اور ابوالخطاب تم سے برأت کرتے ہیں اور تمھارے قول سے اور تم کو کافر اور شیطان کہتے ہیں تو اس نے کہا کہ جس کو تم دیکھتے ہو اور جعفر اور ابوالخطاب سمجھتے ہو وہ اصل میں شیطان ہیں۔ جنھوں نے جعفر اور ابوالخطاب کی صورت اختیار کی ہے۔ وہ لوگ تو بڑے مَلَک ہوگئے اور آسمان میں خدا کے پاس ہیں اور معمر زمین کا خدا ہے اور وہ مطیع ہے آسمان کے خدا کا۔ خیر یہ مزدکیہ، زندیقہ، دہریہ، یہ سب خدا کی ربوبیت سے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا ایک نور یا روح ہے اور بدن اس کا مسکن ہے۔ شیعہ عباسیہ جن کو روندیہ بھی کہتے ہیں ان میں سے ایک فرقہ ابومسلم کو امام قرار دیتا ہے اور کہتا

ہے کہ ابومسلم مرے نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ اور ہر چیز کو انھوں نے مباح کیا ہے اور تمام فرائض کو چھوڑ دیا ہے اور ایمان کو معرفت امام پر منحصر سمجھتے ہیں۔ امام علی نقی کا جب انتقال ہوا تو ایک فرقہ نے کہا کہ ان کے بیٹے محمد جو پہلے انتقال کر چکے ہیں وہ امام ہیں اور زندہ ہیں اور نہیں مرے ہیں، اور دلیل یہ تھی کہ امام علی نقی نے اس کو امام بنایا تھا اور امام کا قول غلط نہیں ہوسکتا اور وہی قائم مہدی ہیں اور بقیہ لوگوں نے امام حسن عسکری کو امام قرار دیا اور کچھ نے ان کے بھائی جعفر کو۔ امام حسن عسکری علیہ السلام کا انتقال ۲۶۰ھ میں ہوا اور ان کے (جنازہ) اوپر ابوموسیٰ متوکل نے نماز پڑھائی۔ ان کی امامت پانچ برس آٹھ مہینہ پانچ دن رہی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا کوئی اثر باقی نہ رہا تھا اور ان کا کوئی لڑکا معلوم نہ تھا اور ان کی میراث ان کے بھائی جعفر اور ان کی ماں نے بانٹی اور یہ کنیز تھیں اور ان کا نام عسفان تھا۔ اس کے بعد چودہ فرقے ہوگئے (جس کتاب سے یہ عبارت نقل ہو رہی ہے اس کے متن میں تیرہ ہی فرقے ہیں) ایک فرقے نے کہا کہ امام حسن عسکری مرے نہیں بلکہ غائب ہوگئے اور وہی قائم ہیں کیونکہ ان کی اولاد نہیں ہے اور زمین امام سے خالی نہیں رہ سکتی۔ دوسرے فرقے نے کہا کہ حسن ابن علی مر گئے اور مرنے کے بعد زندہ ہوگئے۔ اور وہی مہدی ہیں اور قائم کے یہی معنی ہیں کہ مرنے کے بعد جی اٹھے۔ تیسرے فرقہ نے کہا کہ حسن عسکری کے بعد جعفر ان کے بھائی امام ہیں اور انھیں کے لیے حسن عسکری نے وصیت کی تھی، ایک فرقہ نے کہا کہ امام حسن عسکری کے ایک بیٹا تھا محمد اور انھوں نے جتلا دیا تھا کہ وہی امام ہیں اور وہ لاولد نہیں تھے اور کہتے تھے کہ وہ پوشیدہ ہیں اور جعفر اور اپنے دشمنوں کے خوف سے باہر نہیں آتے۔ بعض نے کہا کہ امام حسن عسکری کے ایک بیٹا پیدا ہوا ان کی وفات کے آٹھ مہینے کے بعد وہی امام ہے اور ان کی زندگی میں کوئی ان کے بیٹا نہ تھا جو اس کے دعویدار ہیں وہ جھوٹے ہیں۔ اس لیے اگر ہوتا تو پوشیدہ نہ رہتا۔ اس دعویٰ کی ایک دلیل بھی دی۔ یعنی امام رضاؑ سے روایت ہے کہ عنقریب تم مبتلا کیے جاؤ گے ساتھ ایک جنین کے جو اپنی ماں کے پیٹ میں ہوگا اور شیر خوار۔ آٹھویں فرقہ نے کہا کہ امام حسن عسکری کے ہرگز کوئی بیٹا نہ تھا کیونکہ ہم نے اس کا امتحان کیا اور ہر طرح کی جستجو کی مگر نہیں پایا، پس اگر امام حسن عسکری کے لیے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے تو ہر غیبت کے لیے ایسا ہی دعویٰ ہوسکتا ہے جس کے کوئی ظاہر بیٹا نہ ہو اور نبی کے لیے بھی ایسا ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہ

فرقہ یہ کہتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ دو اماموں کے درمیان میں فاصلہ نہ ہو۔ لہٰذا امام بعد کو پیدا ہوگا۔

نویں فرقے نے کہا ہے کہ امام حسن عسکری کا مرنا متیقن ہے اور یہ بھی متیقن ہے کہ ان کے بعد کوئی امام نہیں ہوا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ جو زمانہ امام اور رسول سے خالی ہو اس کو فترت کہتے ہیں اور ایسے زمانے ہو چکے ہیں اور آج کل کوئی حجت نہیں ہے اور خدا قائم کو آل محمد میں سے بھیجے گا۔

گیارھواں فرقہ مشتبہ ہے وہ کہتا ہے کہ معلوم نہیں کہ بعد امام حسن عسکری کون امام ہیں۔

بارھواں فرقہ امامیہ ہے جو کہتے ہیں کہ دنیا امام سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اگر صرف دو آدمی دنیا میں ہوں تو ایک امام ہوگا۔

ان[1] واقعات کے بعد غیبت کا عقیدہ میرا نہیں ہو سکتا۔ سب سے بڑی دلیل اس معاملہ میں یہ دی جاتی ہے کہ ہر زمانہ میں امام نہ ہو تو قرآن پاک کے صحیح معنی کیسے معلوم ہوں گے اور کہا جاتا ہے کہ ''جس نے امام زمانہ کو نہ پہچانا اس کی موت جاہلیت کی ہوئی۔''

اب غور فرمایئے کہ دو سو چونسٹھ سال تو ائمہ علیہم السلام رہے اور گیارہ سو ساٹھ برس سے امام غائب ہیں۔ اتنے زمانہ میں اگر بجائے غائب ہونے کے امام واقعی نہ ہوتے تو کیا فرق ہو جاتا۔ غیبت اور فقدان میں صرف نام کا فرق ہے۔ ورنہ نفع و نقصان تو ایک ہی ہے۔

○

---

[1] واضح ہو کہ نقل کرنے میں بعض فرقوں کا بیان چھوڑ دیا گیا ہے۔

تیرہواں باب

حضرات کیا کروں۔ جن چیزوں پر یقین صرف اکیاون سیکڑا ہے اس کو سو سیکڑا یقین کے نام سے ظاہر کرتا ہوں جن چیزوں کا یقین اُنچاس اسکڑا ہے ان کو اس طرح ظاہر کرتا ہوں گویا سو سیکڑہ بے یقینی ہے۔ خود اپنے عقیدے کا یہ حال ہے اور دوسروں کو یقین کا سبق پڑھانے چلا ہوں خدا مجھ پر رحم کرے مگر کیا کروں جس گروپ میں پیدا ہوا جس گروہ میں پروان چڑھا ہوں اس کی محبت دل سے نہیں نکلتی ہے۔ اس کملی کو چھوڑتا ہوں مگر یہ کملی مجھ کو نہیں چھوڑتی۔ اس طرح کی باتیں جب سنتا ہوں دل پر ایک اذیت کی عجیب کیفیت گذرتی ہے۔ خلافت کے معاملہ میں شیعوں کا مقدمہ ایسا اچھا تھا مگر خود شیعہ حضرات نے اس کو خراب کردیا۔ اگر خلافت من اللہ تبرا اور غیبت امام کو نکال ڈالتے تو آج بھی شیعوں کا مقدمہ عدالت عقل و انصاف کے سامنے کمزور نہیں ہے۔ اگر حضرات شیعہ عزاداری کو حدود کے اندر رکھیں تو آج بھی "واعتصموا بحبل الله" تمام اہل اسلام کو طاقتور کردے۔

بے دولتی از نفاق خیزد
قوت ہمہ ز اتفاق خیزد

اس میں کلام نہیں کہ واقعہ کربلا وہ عظیم مصیبت ہے جس کا اثر نہ مٹ سکتا ہے اور نہ مٹانا چاہیے۔ یہ وہ مصیبت ہے جس کو سن کر انسان کیا پتھر پسیج جائے۔ بزرگوں کے کارنامے بھی نہ بھولنا چاہیے کیونکہ انسان تاریخ ہی پڑھ کر انسان ہوتا ہے یہ بھی مسلم ہے کہ۔

''غم بڑا مدرک حقائق ہے''

مگر اس کو اس طرح کرنا کہ اس سے کینہ بڑھے۔ امام ہمام کی تاسی تو نہ ہوئی جس نے کربلا اور شام کے سفر کے بعد ثغور بلاد اسلامیہ کی حفاظت کی دعا مانگی۔ اس پیغمبر کی

تاسی تو نہ ہوئی جس نے ابوسفیان اور ہندہ جگر خوار کا اسلام قبول فرمایا۔ "اللھم صل علی محمد و آل محمد"۔

مذہبی نقطہ نظر سے قطع نظر کر کے سیاسی پہلو سے بھی دیکھیے تو سیاست میں حکمت عملی ہوتی ہے اور سیاست نیک نیتی سے بھی ہو سکتی ہے جیسے رسول اللہ صلعم کی تھی۔ سیاست کے لیے کہا جاتا ہے کہ سیاست نہ دوست رکھتی ہے نہ دشمن بناتی ہے۔ اس کو اس طرح دیکھ لیجیے کہ ۱۹۴۷ میں جو کچھ ہوا اس کو نہ تاریخ کبھی بھولے گی نہ جن لوگوں نے وہ حالت دیکھی ہے تا زیست ان کے زخم بھریں گے مگر ہندستان اور پاکستان اگر اسی بہمیت کا خیال تازہ رکھیں گے تو آرام کی زندگی دونوں میں سے کسی کو نصیب نہ ہوگی۔

شہدائے مذہب اور فدایان امت کا نام زندہ رکھنا بھی ہمارا فرض ہے۔ ہمارا حق ہے، ان کا ذکر کر کے، ان کے کارناموں کو سراہ کے اپنے پیشواؤں پر ناز کر کے اپنی انسانیت کو بلند کیجیے۔

سر دے دیا پہ بیعتِ فاسق نہ کی قبول
کیا بات ہے حسین تری آن بان کی

اس طرح مجلسیں منعقد کیجیے۔ اس طرح سے دین کی اشاعت کیجیے اس طرح سے حسینؑ کی تاسی کیجیے کہ دیکھنے والا پھٹ سے کہہ دے کہ کس کا غلام ہے۔ ان کی قربانیاں بیان کر کے سنّی کو شیعہ کر لیجیے، وہابی کو شیعہ کر لیجیے، صوفی تو آدھا شیعہ پہلے ہی سے ہے۔ عیسائی کو شیعہ کر لیجیے، ہندو کو شیعہ کر لیجیے اور پھر سب کو روحانی طواف کروا کے مسلمان کر لیجیے۔ ایسا کر دکھائیے کہ جنت میں رسول اللہؐ امام حسینؑ سے فرمائیں۔ بیٹا تیری سعی مشکور ہوئی اور جناب احدیت میں فتح مکہ والی دعا پھر سے پڑھیں۔

لا اله الا الله وحده وحده و انجز وعده و نصر عبده اعزجنده و هزم الا حزاب عنده فله الملك و له الحمد يحيى و يميت و هو على كل شئ قدير۔

صفر ۱۳ھ فقط نومبر ۱۹۵۱

سوانح

گار

مرتبہ

محمد علی رُدَولوی

منوہر لال بھارگو ... اے ... کے

... پریس ... چھپی

یادگار

مولانا سید کرامت حسین مرحوم

مرتبہ

محمد علی رُدولوی

منوہر لال بھارگو بی اے سپرنٹنڈنٹ کے اہتمام سے

نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپی

۱۹۱۸ء

فہرست

پیش لفظ

چودھری محمد علی صاحب کے جادو نگار قلم نے جناب مولانا سید کرامت حسین صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کے حالات زندگی مختصراً ایک پمفلٹ کی صورت میں رقم کر کے ایک بڑی خدمت قومی انجام دی ہے۔ مولانا مرحوم کی فلسفیانہ اور سادہ زندگی کی تصویر کھینچنے میں کمال حسن انشاء سے کام لیا ہے اس دلچسپ اور پُر مغز تحریر پر تقریظ لکھنے کے لیے اسی قسم کے سلیقہ کی ضرورت ہے جس طرح کا سلیقہ اس پمفلٹ کے قابل مصنف نے مدِ نظر رکھا ہے اور جو کم از کم میری تحریر کو حاصل نہیں ہوسکتا۔

درحقیقت یہ واقعہ ہے کہ مولانائے مرحوم کا سا بحرالعلوم اور ہمہ داں مشرق میں شاید ہی موجود ہو۔ کسی ایسے شخص کے صفات اور خصائل کا بیان ایسی معمولی شئے نہیں ہے جو چند صفحات میں رقم ہوں گے۔ اس عجز کی بدولت عین صرف ایک صفت کو حتی الامکان جس طرح پر میں محسوس کرسکا ہوں اس تحریر میں عرض کرتا ہوں جب سے مجھے مولانا سے تعارف کی عزت حاصل ہوئی میں نے ان کو تعلیم نسواں کا بہت بڑا معاون پایا۔ اس خیال میں ان کی جو اہمیت اخلاقی، سیاسی اور فلسفیانہ پہلو سے ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ مگر جس چیز سے کہ پرانے خیال کے حضرات اس قدر متنفر ہیں اس کا مردانہ وار اختیار کرنا اور تنہا ایثار نفس اس مدت کے لیے فرمانا کہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ہندستان کی دنیا کے لیے سبق آموز اور قابل تقلید ہے۔ حقیقی حق گوئی کے یہی معنی ہیں کہ جس وقت باطل کا عروج ہو اس وقت حق گو خاموش نہ رہے اور اسے دنیا کے تلخ تجربے کسی طرح پر حق پسندی سے جدا نہ کریں۔ اس حصۂ ہندستان میں میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس قسم کا ایثار اور حق پسندی کچھ کم پائے جاتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے رہبروں کو حق پسندی اور حق گوئی کے دشوار گزار راستہ میں بڑے بڑے مصائب اٹھانا پڑے ہیں۔ مولانائے مرحوم کے

جدامجد جنھوں نے حق گوئی اور حق پسندی کی بدولت گالیاں کھائیں، نشانۂ طعن و تشنیع اتہام و الزام بنے، مگر ایک سیکنڈ کے واسطے حق گوئی کے صحیح جادہ کو نہ ترک فرمایا۔ انھیں کے صفات کی تقلید کا یہ نتیجہ تھا کہ جناب مرحوم نے سب وشتم طعن و تشنیع کی اسی طرح سے پروا نہ کی اور ہمیشہ حافظ کے اس شعر کے مطلب کے موافق اپنے ارادہ پر مستقل رہے ؎

گرچہ بدنامی است نزد عاقلان ما نمی خواہیم ننگ و نام را

اگر اجل ہندستان کی حالت پر رحم کھا کر ان کو کچھ عرصہ تک اور مہلت دیتی کہ ان کا سا شیفتہ قوم اپنے استقلال اور جانکاہی سے ہندستان میں تعلیم نسواں کی تحریک کو ایک حد تک قابل عمل اور مکمل بناجاتا تو ان کی اس سعی کی آئندہ نسلیں نہایت مشکور ہوتیں۔ مگر افسوس ہے کہ ناسازی زمانہ اور اس ملک کی غفلت نے جناب مرحوم کا ساتھ نہ دیا۔ مگر اس پر بھی انھوں نے ایک اسکول اپنے ذاتی سرمایہ سے قائم فرمایا اور یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور یہ اسی نیک نیتی کا پھل ہے کہ وہ اسکول اپنی نوعیت کا ہندستان بھر میں ایک ہی اسکول ہے۔ اس اسکول کو سب سے بڑی ضرورت جو اس وقت اس کی بقا کے لیے ہے وہ ایک عمارت کا تعمیر ہونا ہے۔ اگر جناب مرحوم دو تین برس اور زندہ رہتے تو یقیناً اس اسکول کے لیے عمارت تیار ہوجاتی۔ حامیان تعلیم نسواں کا اب یہ فرض ہے کہ وہ اس اسکول کو ترقی دیں اور اس کے لیے تعمیر عمارت اور اس قدر سرمایہ مستقل جمع کرنے میں کوشش فرمائیں جس سے اس اسکول کی حیثیت ایک ہائی اسکول سے بڑھ کر کالج کی ہوجائے۔ ہم سب کو یہ امر کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ آئندہ قومی زندگی اور ترقی ملکی کا انحصار ہر تحریک سے پیش پیش تعلیم نسواں ہی پر ہے۔ اگر ہم ہندستان میں فرزندان صالح مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم ہندستان کی کشتی سیاسی کے ناخدا پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ ہماری آئندہ نسلوں کو حریت کا سبق صحیح معنوں میں حاصل ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم تعلیم نسواں کو ہر تحریک پر تفوق دیں اور اس کے ذریعہ سے وہ افراد قومی مہیا کریں جو اس ملک کے مردہ دلوں میں تازہ روح پھونکیں جن کے دست و بازو فرائض قومی اور ملکی کے بار عظیم کو پھول کے برابر سمجھیں۔ جن میں سچا ایثار، سچی شجاعت، اصلی استقلال، اصلی ہمت، صحیح قابلیت اور صحیح لیاقت موجود ہو، جن کی عورات ان کی اس

تعلیم ہمت و شجاعت کا سبق دیں جن کا تذکرہ صدر اسلام کی تاریخ میں سونے کے حرفوں سے لکھا جاچکا ہے اور جنھوں نے اعلاے کلمۃ الحق کے مقابل میں اپنی جانوں کی پروانہیں کی ہے۔ چودھری محمد علی صاحب نے اس امر کی کوشش نہیں کی ہے کہ وہ اس پمفلٹ کے ذریعہ سے مولانا کے ساتھ جو ان کو خلوص اور عقیدت حاصل تھا اس کا اظہار فرمادیں بلکہ ان کی نیک نیت کا رجحان دوسری جانب ہے۔ یعنی چودھری صاحب نے یہ پمفلٹ اس نیت سے تحریر فرمایا ہے کہ یہ عام طور سے مفت لوگوں کو تقسیم کیا جائے اور اس کے نتیجہ میں آپ حضرات سے اس بات کی درخواست کی جائے کہ آپ مسلم گرلز اسکول کی عمارت میں امداد فرمائیں۔ اس پمفلٹ کی قیمت نہ ہونا اس کو اور بیش بہا بناتا ہے ؎

سرمۂ مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

اس اسکول کی امداد کرنا ہر مسلمان کا فرض ایمان ہے۔ اس پر مزید یہ امر ہے کہ اس اسکول کی عمارت شیداے قوم جناب مولانا کرامت حسین صاحب مرحوم اعلی اللہ مقامہ کی یادگار میں بنائی جائے گی۔ گوکہ جناب مرحوم کی ذات عالی ہر یادگار سے مستغنی ہے اور اس نام کو صدیاں فراموش نہیں کرسکتیں۔ ان کا سازندہ جاوید محتاجِ نام ونشان نہیں ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

محمد علی محمد

(آنریبل راجہ سر محمد علی محمد خاں، خان بہادر کے سی ای آئی آف محمودآباد)

○

یادگار مولانا سیّد کرامت حسین مرحوم

باب اوّل

مرحوم مغفور مولانا سید کرامت حسین صاحب کی سوانح عمری ضرور لکھی جائے گی اور واقف کار لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ ایسے واقعات سے مملو ہوگی جس سے مرنے والے کی قوم کو اس کے بعد بھی فائدہ پہنچتا رہے گا۔ یہ سچے خدمات کا صلہ ہے جو دل سے کیے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کے نشیب و فراز، گرم و سرد عالم، کمتر لوگوں نے دیکھے ہوں گے اور کم لوگوں کی سعی اس قدر مشکور ہوئی ہوگی۔ مولوی کرامت حسین صاحب کی موت بلحاظ مدت حیات و نیز بلحاظ ''رقبۂ حیات'' ناگہانی نہیں کہی جاسکتی لیکن یہ کہ انھوں نے کوئی کام کرنے والا جانشین نہیں چھوڑا۔ ان کی موت قوم کے لیے بہت بڑی مصیبت ہے۔ یورپ میں اگر ایک صاحب کمال اٹھ گیا تو یقیناً اس کے وارث علم و کمال موجود ہیں اور اس کا ماتم صرف بنظر احسان مندی ہوتا ہے نہ بنظر ہرج کار۔ ہمارے ملک میں یہ صورت حال ہے کہ جو کام ہورہا ہے وہ صرف ایک ذات تک ہے اور جو گذر گیا اس کی جگہ خالی ہے۔ مولانا نے اپنے واقعات زندگی خود لکھے ہیں اور فرماتے تھے کہ ''میں نے لکھ کر حامد کو دے دیا ہے'' واقعی حامد علی خان صاحب بیرسٹرایٹ لا سے مرحوم کو روحی تعلق تھا جس کا اظہار اکثر ہوا کرتا تھا۔ حامد علی خان صاحب کا شوق تصنیف و تالیف نیز وہ عقیدت و محبت جو موصوف کو مولانائے مرحوم کے ساتھ تھی ضرور اس کا یقین دلاتی ہے کہ سوانح عمری عنقریب دنیا کے سامنے پیش ہوگی۔ میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ اواخر عمر کے چند واقعات ہیں جو متذکرۂ بالا کتاب میں نہیں ہوسکتے۔ راقم کو مرحوم کی خدمت میں ان کے قیام لکھنؤ کے زمانے میں اکثر رہنے کا اتفاق ہوا اور مغفور کی موثر اور پُرمغز تقریریں سن کر اکثر لہر اٹھی کہ ایک کاپی پر نوٹ کرتا جاؤں اور مولانا کے ملاحظہ پیش

کر کے دستخط لے لوں مگر فطرتی سہل انکاری نے بہت سے مواقع خدمت عام اور کامیابی ذات کے کھو دیے انھیں میں سے یہ بھی تھا۔ بہرحال چونکہ یہ خیال دل میں اکثر آیا کرتا تھا اسی لیے، کچھ باتیں تحویل حافظہ میں رہ گئیں۔ اکثر ایسی ہیں جن کی شہادتیں موجود ہیں۔ بعض ایسی ہیں جو صرف مجھ کو معلوم ہیں۔ میں جو کچھ بیان کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ مبالغہ سے خالی ہوگا۔ جو واقعہ بیان کروں گا بے کم و کاست بیان کروں گا۔ ہاں بعض واقعات بالکل نہ بیان کروں گا۔ نحیف کو شرف ملازمت پہلے پہل اس وقت حاصل ہوا جبکہ میری لڑکیاں 11-1910 میں الہ آباد کے گرلز اسکول میں تعلیم پاتی تھیں اور میں ایک ضرورت سے الہ آباد گیا تھا۔ ایک عزیز دوست کی ہمراہی میں اسکول بھی گیا۔ جج صاحب بحثیت کارکن ایک معزز ہندستانی بزرگ کو اسکول کے معائنہ کے لیے لائے تھے۔ میرے دوست اس مدرسہ نسواں کو بر بنائے روایات بنظر استحسان نہیں دیکھتے تھے۔ جب ہم لوگ بیرونی احاطہ کے اندر پہنچے تو چھوٹی لڑکیاں جن میں کوئی مسلمان چھ سات برس سے زیادہ کی نہ ہوگی ڈرل کر رہی تھیں۔ میرے دوست باوجود اپنے خیالات کے لڑکیوں کی تہذیب وغیرہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مولانا کے سامنے دس روپیہ اس غرض سے پیش کیے کہ لڑکیوں کو مٹھائی تقسیم کر دی جائے اور یہ بھی ظاہر کیا کہ جیب میں اگر کچھ اور ہوتا تو وہ بھی اسی نیک کام میں صرف ہوتا۔ اس کے بعد مولانا نے میری اخلاقی جرأت (لڑکیوں کو اسکول بھیجنے) کی تعریف کی اور میرے دوست اور مجھ کو صبح کی چائے کے واسطے مدعو فرمایا۔ ہم لوگ حاضر ہوئے مولانا دروازے سے ہم لوگوں کو لے گئے۔ تجربہ کاروں کا قول ہے کہ آدمی کے خیالات کا پتہ اس کی چیزوں سے چلتا ہے۔ اس دعوے کی دلیل میرے لیے وہ دفتر کا کمرہ تھا جس میں ہم لوگ پہلے داخل ہوئے۔ وسط میں ایک ٹیک کا میز لگا ہوا تھا جس پر باقاعدہ ضروری چیزیں چنی ہوئی تھیں اور اردگرد کتابوں کی الماریاں تھیں۔ چاندنی کا فرش بادامی صاف بے شکن لگا ہوا تھا جس سے نفاست مذاق کا پتہ چلتا تھا۔ کمرے کی دیواروں کا رنگ یاد نہیں مگر یہ خیال ہے کہ ہر چیز نگاہوں میں کھبی جاتی تھی۔ اگر کمرے کا رنگ فرش و فرنیچر سے نامناسب ہوتا تو وہ کیفیت لطف نہ اس وقت پیدا ہوتی اور نہ اس وقت تک دماغ میں باقی رہتی۔ میرے خیال میں اگر رسکن[1] بھی ضروریات کا لحاظ کر کے دفتر کا

---

[1] مشہور انگریزی نقاد فنون لطیفہ ۱۲

کمرہ سجتے تو وہ بھی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ اس کمرہ میں نظام الوان، سادگی اور ضروریات صفائی کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ ہر چیز نہایت صاف نہایت اجلی اور فوق البھڑک ہونے کے عیب سے مبرّا، مجھ کو اس خوش مذاقی کا ثبوت بعد کو ہر چیز میں ملتا رہا۔ اپنے قیام لکھنؤ کے زمانے میں جبکہ میں ممدوح کی خدمت میں گستاخ ہو چکا تھا میں نے مولانا سے ان کی خوش مذاقی کی تعریف کی۔ میں نے عرض کیا کہ اگر تربیت اعلیٰ ترین ہو تو مغرب و مشرق کی نفاست پسندی قریب قریب یکساں ہو جاتی ہے مثلاً جناب کی تربیت ٹھیٹھ مشرقی طرز کی ہوئی اور ولایت وسط عمر میں تشریف لے گئے جبکہ ہر چیز کی بابت خیالات پختہ ہو چکے تھے مگر مذاق پسند بہترین مغربی کا ایسا ہے۔ میری نگاہوں میں اس وقت وہ منظر پھر رہا ہے جو دائرہ خدمات قلم سے باہر ہے اور جس میں موقلم کی ضرورت ہے۔ مولانا کے چہرے سے تعریف کے بے سود ہونے کا پتہ بھی چلتا تھا اور اپنی نفاست طبع کی داد پانے کا بھی اثر محسوس ہوتا تھا اس کے علاوہ ایک انداز افتخار بھی پایا جاتا تھا جو بغیر مولانا کے الفاظ سنے ہوئے سمجھ میں نہ آسکتا تھا۔ ایسے موقعوں پر مولانا ہمیشہ فرمایا کرتے تھے ''جی ہاں جو کچھ ہے مولانا حامد حسین صاحب کی فیض صحبت کا اثر ہے۔'' جب ہم لوگ چائے پی کر رخصت ہونے لگے تو مولانا تابہ دروازہ رخصت کرنے کو آئے۔ برآمدے میں ایک صاحب موجود تھے جن کی وضع قطع سے لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ کا ہر باشندہ مانوس ہے یعنی ایک چھٹی سیاہ عبا اور تمام لوازم پوشش ایسی ہی۔ یہ بزرگوار یقیناً مولانا کے قدیم زمانے کے ملاقاتیوں میں رہے ہوں گے۔ ایک معمولی ظرف کا آدمی شاید ایسے موقعوں پر جھجکتا مگر مولانا نے اس تپاک سے معانقہ کیا کہ ہم دونوں آدمیوں کو ان کی عالی ظرفی کا پتہ چلا۔ اس وقت تک مولانا کراستھ ویٹ گرلز اسکول کی کامیابی سے ناامید نہیں ہوئے تھے۔ دوسری بار جب میں گیا تو اسکول کی حالت انتظامیہ بہت ناگوار ہو چکی تھی جس کی وضاحت سے کوئی فائدہ نہیں۔ قصہ مختصر مولانا کا ایک مدت العمر کا خواب غلط ثابت ہو چکا تھا۔ یعنی ہندو مسلمان لڑکیاں ایسی صورتوں میں ساتھ ساتھ نہیں پڑھ سکتی ہیں اور کراستھ ویٹ گرلز اسکول کی انتظامیہ کمیٹی میں کرامت حسین ایسے دھن کے پکے کی قدر نہیں۔

O

باب دوم

ہائی کورٹ سے واپسی کے بعد کراستھ ویٹ گرلز اسکول سے قطع تعلق کے جو وجوہ ہوئے وہ میرے ذاتی علم سے باہر ہیں۔ اس کو بیان کرنے والے اپنے موقع پر مجھ سے بہتر بیان کریں گے۔ مولانا کی زیارت مجھ کو ایک روز حامد علی خان صاحب کے یہاں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مسلم گرلز اسکول قیصر باغ میں جاری ہو چکا ہے اور خود مولانا قیصر باغ کے ایک دوسرے مکان میں مقیم ہیں۔ دو سطریں عذر خواہی کی لکھنا چاہتا ہوں۔ کسی بڑے شخص کے تذکرہ میں اپنا حقیر تذکرہ چھیڑنا مانا ہوا اوچھا پن ہے مگر کیا کیا جائے کہ ربط کے لیے جامدانی میں ٹاٹ کا پیوند لگانا پڑتا ہے۔ عندالذکر میں نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ مجھے کام کرنے کی تمنا ہے۔ مگر یہ چاہتا ہوں کہ کسی بڑی ذات سے اپنے کو وابستہ کرکے کام کرنے کا طریقہ سیکھوں۔ مولانا نے فوراً فرمایا کہ بسم اللہ آپ تشریف لائیے اور میرے ساتھ رہیے۔ مجھ کو یہ موقع غنیمت معلوم ہوا اور دوسرے روز میں پھر حاضر ہوا۔ آج مولانا نے فرمایا میں عنقریب کوئی کوٹھی لینے والا ہوں اس وقت آپ میرے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ جب مولانا نے شاہ نجف کے پاس ایک پھوس کا بنگلہ لیا میں 1914 میں مولانا کے پاس حسب وعدہ بہ ارادہ قیام آ گیا۔ مولانا نے سب سے پہلے مجھے اپنی اردو تصانیف جو میرے پڑھنے کے قابل تھیں عنایت کیں اور دو تین انگریزی کتابیں بھی پڑھنے کو بتائیں۔ اردو کتابوں میں مرحوم کی کتاب اخلاق میری سمجھ میں کہیں کہیں اچھی طرح سے نہ آتی تھی۔ ہر مرتبہ بچوں کی طرح پوچھنے دوڑا جانا اچھا نہ معلوم ہوتا تھا لہٰذا میں نے عرض کیا کہ علم الاخلاق کی جلدیں باقی نہیں رہی ہیں۔ اگر اس کی طبع ثانی ہو جائے تو بہتر ہے۔ مولانا تیار ہو گئے میں نے ایک پرانی جلد میں درمیان درمیان اوراق لگائے اور ضروری اضافوں کے لیے سامان درست کیا۔ ہر روز کھانے کے بعد گیارہ بجے دن میں کتاب سے پڑھتا جاتا تھا اور مولانا ضروری نوٹ و عبارت کا اضافہ لکھواتے جاتے تھے۔ وہ کتاب میرے قلم کی مولانا کے کتب خانہ میں اس وقت بھی موجود ہوگی بلکہ ایک مقام پر خود میرا مجوزہ اضافہ بھی نئی طبع میں موجود ہے جس کو مولانا نے میری خواہش پر کتاب میں داخل کر دیا تھا۔ میں نے

یہ اضافہ ایک کاغذ پر علیحدہ لکھا تھا مگر مولانا نے فرمایا کہ اس کو میں اپنی عبارت میں لکھوائے دیتا ہوں۔ یقیناً میری عبارت اس قدر جامع و مانع نہ رہی ہوگی یہ عبارت صفحہ 155-154 میں عقاید اور عبادت کا حق" کے ذکر میں موجود ہے دوران تحریر میں حاشیہ بھی جابجا زیادہ کیا جاتا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ جس لفظ کے معنی مجھے نہ معلوم ہوتے تھے وہ قابل ترجمہ جان کر داخل حاشیہ کر دیا جاتا تھا۔ مولانا کو دوپہر کے وقت ایک ذرا دیر آرام کرنے کی عادت تھی اور اکثر فرش ہی پر کمل کا تکیہ بنا کر لیٹ رہتے تھے۔ کبھی کبھی پلنگ پر بھی لیٹ جاتے تھے مگر دن کو بچھونا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ متذکرہ بالا کتاب کی تیاری کے زمانہ میں آرام کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور اکثر یہ ہوتا تھا کہ مولانا کسل کی وجہ سے آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ میں تھوڑی تھوڑی عبارت پڑھتا تھا او وہ جواب دیتے جاتے تھے۔ ایک روز میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا جس کا اظہار میں نے کیا۔

میں: ممکن ہے کہ بعض الفاظ جن کے معنی مجھ کو تو معلوم ہوں دوسرے نہ جانتے ہوں۔ اس لیے قریب قریب ہر عربی لفظ کے معنی لکھ دیے جائیں۔

مولانا: جی نہیں یہی معیار بہت اچھا ہے۔

ممکن ہے مولانا نے یہ جواب نیند کے کسل میں یوں ہی دے دیا ہو مگر میرے اوپر یہ مزاح ضائع نہیں گئی۔

جب کتاب تقریباً دو مہینوں میں ختم ہوگئی۔ مولانا نے فرمایا تین شخصوں نے اس کتاب کو اچھی طرح پڑھا ہے۔ ایک رشید الدین صاحب سکریٹری میونسپلٹی مرزاپور، دوسرے حکیم میر مصطفیٰ حسین اور تیسرا میں۔

دوران تحریر میں جب دوسرے مصنفین کا ذکر آجاتا تھا اس وقت مولانا کے حافظہ کا ثبوت ملتا تھا۔ علم الاخلاق میں بہت کچھ ہربرٹ اسپنسر سے ماخوذ ہے اس لیے اس کا ذکر اکثر آتا تھا اور مولانا صفحہ کے صفحہ زبانی پڑھتے چلے جاتے تھے۔ بڑھاپے میں بھی حافظہ کی یہ قوت تھی کہ جنگ شروع ہونے کے بعد سر جیمس مسٹن نے ایک اسپیچ نینی تال میں دی تھی۔ ایک روز اسی جنگ کے تذکرہ پر مولانا نے ایک بڑا حصہ اسپیچ کا زبانی سنا دیا مجھ کو تعجب ہوا۔ فرمانے لگے جی ہاں یہ حصہ مجھ کو پسند آیا۔ لہٰذا میں نے یاد کر لیا۔ افسوس کہ اس وقت وہ اسپیچ میرے پاس موجود نہیں ہے ورنہ ان مقامات کے پتے ضرور لکھتا۔

○

باب سوم

ہربرٹ اسپنسر ونیز دوسرے حکماء کی شروع کی کتابیں مولانا چاہتے تھے کہ ہر شخص پڑھ لے اور مجھ کو بھی مشورہ دیا تھا۔ ان کتابوں کے پڑھنے میں وجود باری تعالیٰ کا مسئلہ اکثر چھڑ جاتا تھا اور مولانا فرمایا کرتے تھے کہ عقلی دلیل کوئی نہیں ہے۔ مگر وجود باری کی وجدانی دلیلیں بہت ہیں۔ ایک جملہ جو مولانا کی زبان سے بارہا سنا گیا ہے یہ ہے "اگر ہے تو بڑا تعجب ہے اور اگر نہیں ہے تو بڑا تعجب ہے۔" مولانا کے دانت مصنوعی تھے اور نیچے کا چوکا بعض الفاظ کے ادا کرنے میں کبھی کبھی اٹھ جاتا تھا۔ جس کو اوپر کے دانتوں سے دبانا پڑتا تھا اس کی وجہ سے گفتگو میں ایک عجیب انداز پیدا ہوجاتا تھا جو بدنما نہیں ہوتا تھا بلکہ تلفظ میں اہمیت زیادہ کردیتا تھا۔ متذکرۂ بالا جملہ میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ فروعی معاملات میں مولانا کے مذہبی خیالات اکثر لوگوں سے مختلف تھے مگر اصولی باتوں میں کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ مولانا کے کمرہ میں جانماز رکھی رہتی تھی ایک سرخ تھیلی میں خاک تیمم بھی موجود تھی۔ جب وہ رودولی تشریف لائے تھے مجھ سے سمت قبلہ بھی دریافت کیا تھا اور ہم لوگوں نے ان کو نماز پڑھتے بھی دیکھا تھا۔ ایک روز میں نے عصمت ائمہ کے متعلق پوچھا فرمانے لگے یہ مسئلہ اسی طرح کا ہے جیسے انگریزی میں A king can do no wrong ہے اس جواب کی خوبی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی طرح ایک روز متعہ کا مسئلہ چھیڑا۔

میں: متعہ کے مسئلہ میں جناب کا کیا خیال ہے۔

مولانا: متعہ کا مسئلہ ضرورتاً جاری کیا گیا تھا۔ جنگ میں لوگ گھروں سے مہینوں دور رہتے تھے۔ یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ بلاوجہ لوگ دن رات متعہ کیا کریں۔ ہاں اگر اب بھی سپاہی کی سی حالت ہو تو کیا ہرج ہے جیسے آپ کی حالت اس وقت سپاہی کی سی ہے۔ میں آج تک نہ سمجھ سکا کہ آخری جملہ مزاحاً کہا گیا تھا یا واقعی یہی مطلب تھا۔

معجزات، خرق عادات، معراج، وحی وغیرہ وغیرہ کے مسائل کا ذکر ان کو از خود کرتے میں نے کبھی نہیں سنا بلکہ اگر کوئی سوال کرتا تھا تو وہ اسی طرح روایت کرتے تھے جیسے دیگر علماء۔ جس چیز کا ذکر مولانا خود بڑے ذوق وشوق سے کرتے تھے وہ مشاہیر اسلام کے ایسے کام تھے جن کا تعلق امور دنیا سے تھا میں نے مولانا کو جناب رسالت مآب کے واقعات بیان کر کے جھومتے دیکھا ہے۔ اسی طرح جناب امیر علیہ السلام امام حسین علیہ السلام، خالد بن ولیدؓ کے واقعات بڑے جوش سے بیان کرتے تھے۔ ایک روز حامد علی خان صاحب کے یہاں تشریف رکھتے تھے۔ برآمدہ کے ایک کونے میں ایک طالب علم منحنی کچھ لکھ رہے تھے جب وہ لکھ چکے اور مولانا کے برابر سے گذرے آپ نے نہایت تاسف سے فرمایا۔ ہم لوگ کیا خاک ترقی کریں گے۔ یہ سِن اور یہ کیفیت۔ (واقعی وہ صاحب بالکل طالب علم ہی تھے) ترقی اس وقت تھی جبکہ خالدؓ نے فلاں لڑائی میں ایک قلیل جماعت سے لاکھوں کو بھگا دیا اور اسی جگہ ایک عورت سے مجامعت کی۔

کوئی صاحب یہ نہ خیال فرمائیں کہ مولانا کا یہ جملہ ان کی شیعہ تربیت کا نتیجہ تھا بلکہ اس حکایت سے ان کا مطلب صرف اس جوش حیات کا ثابت کرنا تھا جو عربوں میں موجود تھا اور جو ہر ترقی کرنے والی قوم کے لوازم ضروریہ میں سے ہے۔

ایک روز ایک صاحب جو کربلائے معلّیٰ سے تشریف لائے تھے مجھ سے استفہاماً پوچھنے لگے کہ آیا آپ نے امام حسین علیہ السلام کے بارے میں کچھ کلمات گستاخانہ استعمال کیے ہیں؟ (مجھ کو ان صاحب کے ٹھیک الفاظ یاد نہیں ہیں مگر مطلب یہی تھا) میں نے کہا کہ میں نے اس قدر ضرور کہا تھا کہ جو صفات اور جو کمزوریاں عورت کے شائق مرد میں پیدا ہوجاتی ہیں وہ امام حسین علیہ السلام میں بھی تھیں۔ وہ صاحب بحث پر آمادہ ہوگئے تھے مگر خیریت ہوئی کہ مولانا نے میری طرف داری میں ایک قول جناب امیر علیہ السلام کا نقل کر دیا اور وہ صاحب خاموش ہوگئے۔ بحمداللہ کہ آج وہ صاحب مولانا کے ماتمیوں میں ہیں۔

خالد بن ولید کا ایک واقعہ اور بیان کرتے تھے اور وہ واقعہ ان کی معزولی کا تھا۔ خالدؓ لڑائی کو جارہے تھے کہ خلیفہ ثانیؓ کا حکم معزولی پہنچا آپ سمجھ گئے تھے مگر لفافہ بعد فتح جنگ کھولا۔ لوگوں نے تعریف کی کہ باوجود برطرفی کے علم کے اس تندہی سے لڑے۔

خالدؓ نے جواب دیا کہ میں خدا کے لیے لڑ رہا تھا۔ اگر خلیفہؓ کے لیے لڑتا ہوتا تو بیشک اس جانفشانی سے نہ لڑ سکتا تھا۔ میرا خدا مجھ سے خفا نہ ہو اور جو چاہے خفا ہو جائے۔ اگر مولانا کے مذہب کے بارے میں کوئی بات تیقن کے ساتھ کہی جا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مولوی کرامت حسین صاحب اس حصہ مذہب میں جن کا تعلق عمل سے ہے بہتر مسلمانوں میں تھے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ذرا ذرا سے کام بھی بہ اتباع سنت کیا کرتے تھے اور وہ اتباع اتباع ذی فہم ہوتی تھی۔ جو وقعت اسلام و صاحب اسلام کی مولانا کی نظر میں تھی اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

ایک مرتبہ رودولی میں جناب اپنا بچھونا باندھ رہے تھے۔ میں اور میرے ایک مہربان مدد دینے لگے۔ مولانا نے فرمایا آپ زحمت نہ کریں۔ میں علیحدہ ہو گیا۔ مگر میرے دوست مشغول رہے یہاں تک کہ میں نے ان کو توجہ دلائی کہ جس قدر وہ لپیٹ رہے ہیں مولانا اس کو پھر سے درست کر رہے ہیں۔ جب وہ نہایت سلیقہ مندی اور محنت سے بندھ چکا میں نے تعریف کی کہ ہم لوگوں سے دراصل اس طرح نہ بندھتا۔

مولانا: جی ہاں جناب رسالت مآبؐ اپنا خوگیر خود سیتے تھے اور اگر نہ سیتے تو جہاد پر جاتے وقت راستہ میں گر پڑتے۔''

اکثر فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص مجھ سے آکر کہتا ہے کہ میں سید ہوں تو میں دل میں خیال کرتا ہوں کہ اگر تو سید ہے تو اپنے جد کی ایک صفت بھی اپنے میں دکھا دے ورنہ ناخلف ہے۔ اسی طرح بعض اوقات جب اہل عالم کے برتاؤ کو ناپسند فرماتے تھے تو کہتے تھے کہ سب اپنے کو حضرت علیؓ کا پیرو بتاتے ہیں مگر سب معاویہ کے پیرو ہیں۔ رودولی میں جناب نے ایک محفل میلاد میں آنحضرت صلعم کے واقعات زندگی بیان کیے تھے خود بھی برابر روتے رہے اور تمام سامعین بھی متاثر رہے۔ لکھنؤ میں واقعات کربلا پر مولانا کی ایک مشہور تقریر رفاہ عام میں ہوئی تھی۔ میں موجود نہ تھا مگر اس کے متعلق ایک واقعہ خود مولوی کرامت حسین صاحب بیان کیا کرتے تھے۔

مولانا: مجھے مولوی نظام الدین حسین صاحب کی طبیعت بہت پسند ہے بہت ہی صاف اور عمدہ آدمی ہیں۔ مجھ سے ایک روز پوچھنے لگے کہ فلاں دن آپ ذکر واقعہ کربلا پر

اس قدر رو کیوں رہے تھے میرے دل میں تو ایک بہادری کا جوش پیدا ہوتا تھا اور خوش ہوتا تھا کہ سیدنا امام حسینؑ کو یہ مدارج عطا ہوئے۔

بندۂ مولف: پھر آپ نے کیا جواب دیا۔

مولانا: میں نے کہا کہ درست ہے مگر میری عادت بچپن سے یہی پڑی ہے اس لیے اختیار نہیں تھا۔

○

"......... تمھارے باپ کے پاس ایک تصویر ہے جس میں ایک جوان عورت اور ایک بڈھے کی تصویر ساتھ ساتھ ہے۔ عورت اپنی جوانی کے گھمنڈ میں متانت اور خودداری سے بیٹھی ہے، اور مرد اپنے بڑھاپے پر کھسیانی ہنسی ہنس رہا ہے۔ یہ عورت تمھاری دادی قیصر جہاں بیگم صاحبہ ہیں اور بڈھا تمھارا محمد علی شاہ فقیر....."

(ضیاء کے نام خط)

باب چہارم

بستر بند کا واقعہ اتباع سنت کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں اس میں جو پہلو سلیقہ مندی اور احتیاط کا نکلتا ہے وہ بھی قابل لحاظ ہے۔ میں نے اکثر مولوی صاحب کو دیکھا ہے کہ نوکر جوتا صاف کر کے رکھ گیا ہے اس کے بعد مولانا ڈوریاں نکال کر شکنیں دور کر رہے ہیں۔ کچھ اسباب ججی کے زمانہ کا لکھنؤ تک باقی تھا۔ چونکہ وہ چیزیں عمدہ لکڑی کی تھیں اس وجہ سے ان کی صفائی کا اہتمام دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ ایک چھوٹا میز اسی میں تھا جس کی پالش خراب ہوگئی تھی۔ بہت تلاش کے بعد ایک ہوشیار وارنش کرنے والا آیا۔ لکھنؤ کا آدمی، طہار کمال میں پل باندھ دیے۔ اس کے بعد کام شروع کیا۔ مولانا نے اعتراضات شروع کیے اور بنظر انصاف مجھ کو حَکَم مقرر کیا۔ کاریگر کہتا تھا اس کی لکڑی ناقص ہے۔ مولانا فرماتے تھے بندۂ خدا اگر بہتر نہیں تو ریگ مال کے پہلے جیسی تھی ویسی ہی بنا دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین چار کوٹ دینے کے بعد وہ شخص بھاگ گیا اور کئی روز کے بعد مزدوری لینے آیا۔ میرے خیال میں میز کے معاملہ میں مولانا کی زیادتی تھی کیونکہ دراصل اس لکڑی کا ریشہ اتنا عمدہ نہ تھا جتنا کہ ان چیزوں کا جس سے اس کا مقابلہ کیا جاتا تھا۔

مولوی صاحب کے پاس خدمت گار نہیں رہتا تھا وجہ یہ تھی کہ اوپر کی آمدنی بالکل مفقود تھی۔ نوکر کا دل کیوں کر لگتا۔ مولانا کی معمولی غذا یہ تھی چار انڈے کچے کچھ خوبانیاں، کچھ بادام علی الصباح، ابلی ہوئی مچھلی چوکر کی روٹی تقریباً ایک چھٹانک ابلی ہوئی ترکاریاں اور دہی قریب گیارہ بجے دن کے۔ دہی اور ترکاریاں رات کو یہ وہ چیزیں تھیں جو سوا مولانا کے دوسرا شخص کا ہے کو کھاتا۔ نوکر دیکھ دیکھ کر جلتے تھے کہ گویا نوالہ میں ہمارا حصہ ہی نہیں۔ سوا خدمت گار کے اور نوکر نہیں بھاگتے تھے۔ میں نے خود مولانا اور نیز دوسروں سے سنا ہے کہ شروع زمانہ میں مولانا بہت خوش خور تھے اور پکاتے بھی خوب تھے۔ پھلوں کا شوق اس وقت تک تھا اور میرا گمان یہ ہے کہ مسوری نینی تال وغیرہ چھوڑ کر کوئٹہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ قلب کی کمزوری کی وجہ سے وہ اونچے پہاڑوں پر نہ

جا سکتے تھے۔

بدمزہ کھانے کا شوق اور لذیذ پھلوں کی تلاش پر نظر کر کے ایک روز میں نے کہا کہ میرے خیال میں جناب ان پھلوں کو شاید زبان کے مزے کے لیے نہیں نوش فرماتے ہیں کیونکہ اس حالت میں کھانا بھی مزہ کا کھاتے بلکہ آپ اس زیست کے دیو کو راضی رکھنا چاہتے ہیں تا کہ جب تک اس جسد خاکی میں ہے تکلیف نہ پہنچائے۔ میں نے یہ سوال آج کی ضرورت پر نظر کر کے کیا تھا مگر مولانا نے کوئی جواب بجز مسکرانے کے نہیں دیا۔ انبہ کی فصل میں جب تک دسہری مل سکتی تھی ضرور منگواتے تھے۔ ایک روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ مولانا کو ایک پھل والی جو قریب ہی ودیا نگرم کے بنگلہ میں باغ لیے ہوئے تھی پھل دے جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دوسری پھل والی نے آنا شروع کیا۔ یہ جوان اور خوبصورت تھی اور اپنے کو بنائے سنوارے بھی رکھتی تھی۔ ایک روز میں اس سے خربوزہ خرید رہا تھا کہ مولانا اسکول سے واپس تشریف لائے۔ میں نے انگریزی میں پوچھا کہ آپ بھی خریدیں گے۔ جواب ملا کہ نہیں پوروا کی وجہ سے میٹھے نہیں ہوتے۔ اس کے بعد وہ عورت دو خربوزہ لے کر اٹھی اور مولانا کے کمرہ کے دروازہ کے سامنے جا کر کہنے لگی ''حجور آج کھربوجے بہت میٹھے ہیں'' مولانا نے لے لیے۔ کھانے کے وقت میں نے کہا کہ آخر جناب نے لے ہی لیے۔

مولانا: (نہایت سنجیدگی سے) جی ہاں وہ عورت مسکراتی ہوئی آئی مجھے خیال ہوا کہ اس کو رنج ہوگا کہ میری دلآویزی کا اثر اس پر نہیں ہوا۔

جب کتاب اخلاق ختم ہوگئی اور میں مکان چلا آیا۔ چند روز کے بعد پھر گیا اور مولانا کا مہمان ہوا۔ میرے لیے خاص اہتمام سے بہت مزے کے کباب پکوائے گئے۔ میری شامت کہ دسترخوان پر میں نے دہی مانگا۔ گو کہ مولانا کی صحبت میں رہ کر میری عادت بھی بلگیرین دہی کی ہو چکی تھی اور اب بھی کسی نہ کسی صورت میں کھاتا ہوں، مگر ان چار چمچوں کا مزا اس وقت تک نہیں بھولا کھٹاس اور نمک دوسری چیزوں کے ساتھ ملا کر خوش ذائقہ ہو جاتی ہیں مگر صرف یہی دو چیزیں خدا نہ کھلائے۔ جب میں نے دہی شروع کیا۔ مولانا ایک روز دسترخوان پر فرمانے لگے۔ کیا بد چیز ہے صحبت آپ کا ایسا آدمی بھی دہی کھانے لگا۔

○

باب پنجم

مولوی کرامت حسین صاحب کی طبیعت ہمہ گیر تھی۔ مولوی رعایت حسین صاحب کے چھوٹے بھائی اکثر اوقات پرانے اذکار کیا کرتے تھے۔ میں اس خیال سے کہ شاید موصوف غلطی سے مبالغہ نہ کر گئے ہوں۔ مولانا سے تصدیق بھی کرلیا کرتا تھا۔ مولوی صاحب بیان کرتے ہیں کہ جوانی میں مولانا کو بلبل کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ بلبل جس کی مُد ہوچکی تھی چپ ہوگیا۔ مولانا نے اس کو دوا دی اور وہ ایسا بولا کہ بیت کو بند کردیا۔ مولانا سے میں نے اس کی تصدیق چاہی اور وہ ترکیب پوچھی۔ مولانا نے کوئی ترکیب گیرو سے نہلانے کی بتائی جو مجھ کو یاد نہیں رہی۔ بلبل کا ایک گونہ شوق اب بھی باقی تھا۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ امین آباد میں کسی حلوائی کے یہاں ہے اور مرحوم نے اس کو حامد علی خان صاحب کے وہاں منگوا کر سنا تھا۔ اسی طرح مولانا کے شکار اور شہسواری کے واقعات مشہور ہیں۔ ایک روز میں کچھ گھوڑوں کی باتیں کر رہا تھا۔ مولانا نے کہا کہ گھوڑے سے جیسی خدمت لی جائے اسی طرح اس کی خدمت بھی کی جائے تو گھوڑا بہت کام دیتا ہے۔ اس کے بعد فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ راستہ میں ڈاک کا گھوڑا نہ پہنچ سکا اور مجھ کو مجبوراً چالیس خواہ اس سے بھی زیادہ میل (تعداد مولف کو یاد نہیں رہی) ایک ہی گھوڑے پر جانا پڑا۔ منزل پر پہنچ کر میں سیدھا اصطبل کو گیا اور اپنے سامنے دو گھنٹہ تک اس کو ملوایا تب کپڑے اتارے صبح کو گھوڑا بالکل تازہ دم تھا۔ اس قصہ کے بیان کرنے میں مولانا نے راستہ کو ''اچھی'' کہا جس پر مجھ کو تعجب ہوا۔ شاید بندیل کھنڈ میں جہاں مرحوم کی عمر کا بڑا حصہ صرف ہوا تھا راستہ کو مونث ہی بولتے ہوں۔ جوانی میں مولانا حقہ بھی پیتے تھے اور تمباکو کا خمیرہ خود تیار کرتے تھے۔ ایک روزہ معلوم ہوا کہ مولانا عمادالملک نواب سید حسین صاحب کی فرائش پر تمباکو تیار کرنے والے ہیں۔ میں نے بھی خواہش ظاہر کی۔ مولانا نے وعدہ کیا بعد کو کھلا کہ خوشبودار نہ ہوگا۔ اس لیے پھر میں نے ذکر نہیں کیا۔ مولانا کرامت حسین

صاحب اضافی چیزوں کی پروا بالکل نہیں کرتے تھے بلکہ اصل شے پر نظر ہوتی تھی۔ تمباکو کے ذکر پر یاد آیا۔ ایک روز میں حضرت گنج جا رہا تھا مولانا نے فرمایا میرے لیے پنیر لیتے آیئے گا۔ میں بہترین ڈچ کریم چیز کا ڈبہ لے آیا۔ مولوی صاحب نے لے تو لیا مگر استفسار پر فرمایا کہ چڈر چیز مجھ کو زیادہ پسند ہے جو لوگ پنیر کا لطف رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ چڈر کس قیامت کی چیز ہے۔

○

''.......... اودھ کی بہت سی باتوں سے خفا رہے لیکن اسے چھوڑنے کے لیے کسی حالت تیار نہیں۔ لکھنؤ، رودولی اور سارے اودھ کے اجڑنے کی انھیں شدید ذہنی اور روحانی تکلیف ہے اور اس وقت بھی جب کہ ان کی ساری اولاد اور پوتے، نواسے پاکستان اور سمندر پار کے ملکوں میں سکونت پذیر ہیں، یہ گزرے ہوئے وقتوں کے سائے کی طرح اب بھی اپنے پرکھوں کے وطن رودولی میں رہتے ہیں..........''

(قرۃ العین حیدر: ''داستان طراز'' 'سویرا' لاہور ۱۹۵۵)

باب ششم

علم الحیات کے مسائل کے بیان میں عورت و مرد کے ذکر پر فرمایا کرتے تھے کہ اِس معاملہ میں انسان مجبور محض ہے اور اگر کسی کو سن لیتے تھے کہ اس کا پاؤں اس کٹھن راہ میں ڈگ گیا تو اسی طرح تاسف کیا کرتے تھے جیسے ہم آپ کسی نازک شیشے میں بال پڑ جانے پر کرتے ہیں۔ البتہ کوئی اگر کوئی گناہ مولانا کے نزدیک صعب ترین تھا تو وہ خودغرضی تھی۔ شاید یہ گناہ اور گناہوں سے سخت تر مانا ہی گیا ہو یا شدت کی وجہ یہ رہی ہو کہ یہ عیب ان سے بہت دور تھا اور خودغرضی کے مشکلات کا ان کو زیادہ اندازہ نہ رہا ہو۔ چند روز ہوئے ہوں گے کہ ایک قابل افسوس واقعہ پیش آیا جس میں ایک صاحب کی خودغرضی سے ایک عورت کی وجہ سے ایک گروہ کو نقصان پہنچ گیا۔ مولوی صاحب کا غصہ ان صاحب پر قابل دید تھا۔ میں نے کہا کوئی عینی ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے اس لیے وثوق کے ساتھ ملزم بھی نہیں ٹھہرا سکتے ہیں۔ مولوی صاحب نے ذرا گرمی سے فرمایا ''ہر حال میں اس شخص کا فعل نہایت نامردی اور کمینہ پن کا ہے اگر تعلق نہیں ہے تو اپنے ذاتی نفع کے لیے ایک عفیفہ کو بدنام کرنا کمینہ پن ہے اور اگر ہے تو شادی نہ کرلینا نہایت بزدلی ہے۔ اگر میرا معاملہ ہوتو میں صاف صاف کہہ دوں اوراس عورت کی ضروریات کا کفیل ہوجاؤں۔'' کتاب اخلاق نیز ان کی باتوں سے یہ پتہ چلتا تھا کہ کرامت حسین صاحب کے خیالات عورت کے معاملہ میں نہایت بانکپن کے تھے۔ اسی طرح ایک افواہ الہ آباد میں خود مولانا کی نسبت سے مشہور کی گئی تھی۔ گذشتہ واقعہ کے ذکر پر خود مولانا نے اس کا ذکر کیا کہ ایک بار کسی کمیٹی کے جلسہ میں ایک صاحب نے مولانا پر کنایتاً حملہ کیا تھا۔ کرامت حسین صاحب نے ان سے کہا کہ اگر آپ صاف صاف الفاظ میں اس عورت کی عفت کے بارے میں کہیں تو میں شرط کرتا ہوں کہ میں آپ کو جیل خانہ کا منہ دکھا دوں۔ وہ صاحب چپ ہوگئے۔ بعض لوگ مولانا سے تعصب بیجا یا بغض للہ کے سبب کاوش رکھتے تھے اور مختلف برائیاں کیا

کرتے تھے۔ ایک روز کسی خام کار افترا پرداز نے بجائے ان صاحب کے جن کی خود غرضی پر مولانا کو غصہ تھا۔ خود مولانا کا نام مشہور کرنے کی کوشش کی۔ شدہ شدہ خبر مولانا کو بھی پہنچی۔ ایک مرتبہ مولانا نے اس واقعہ کا ذکر کئی آدمیوں کے سامنے سنایا تھا بلکہ دوران تحریر میں مجھ سے کئی مرتبہ تذکرہ ہو چکا تھا۔ چونکہ میں اپنی رائے کا اظہار خود مولانا سے بھی کر چکا ہوں۔ لہٰذا اس کا ظاہر کر دینا گستاخی میں داخل نہیں ہوسکتا ہے۔ میری ناچیز رائے میں مولانا کی تصانیف میں یہ اضعف ترین تصنیف ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اس کام سے مولانا نے ہمیشہ اپنے کو علیحدہ رکھا تھا۔ آخر عمر میں نیا کام کرنا خالی از دشواری نہیں۔ آخر کتاب جو مولانا لکھ رہے تھے 'المراۃ' تھی اس میں عورت کی جنس پر تقریباً ہر پہلو سے نظر ڈالی گئی ہے اور اپنے طرز کی ایک جید تصنیف ہے۔ امید ہے کہ قدردانان مولانا اس کو جلد چھپوا دیں گے۔ دو سال ہوئے ایک ایڈریس ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے بھی لکھا تھا۔ مگر اس کے پڑھے جانے کی نوبت نہ آئی۔ مولانا نے اپنے احباب کو دکھایا تھا۔ تعلیمی معاملات میں موصوف کو خاص درک تھا جس پر ایک عمر صرف ہوئی تھی۔ اس لیے اس کی بابت لوگوں کی رائے تھی کہ واقعی ان کی تصانیف میں بڑے پائے کی چیز ہے۔ 1914 میں ایک انجمن علمی مضامین پڑھنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ مولانا نے پہلے جلسہ میں ایک مضمون ''مسلمانوں کا سلوک اپنے مفتوحین کے ساتھ'' کی سرخی سے پڑھا تھا۔ اس کے بعد دو ایک جلسے اور ہوئے۔ اب شاید وہ انجمن ٹوٹ گئی۔ جس وقت مولانا آخری باب علم الاخلاق کا ختم کر چکے تو فرمانے لگے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ دنیا اپنے ماحول سے بالکل مناسب ہو جائے گی اور ہر نیک و بد عمل کا نقصان و فائدہ اسی وقت ظاہر ہو جائے گا۔ کوئی شخص نیکی کرے گا تو اسی وقت اس کو فائدہ مل جائے گا۔ اگر کوئی شخص جھوٹ بولے گا تو اسی وقت زبان کٹ کے گر پڑے گی۔

مجھ کو مولانا کے الفاظ یاد نہیں رہے مگر ان کے چہرے پر اس خیال سے بشاشی کا منظر اس وقت میری نگاہوں کے سامنے ہے۔

O

باب ہفتم

مولانا ان لوگوں میں تھے جو وعظ کے ساتھ عمل بھی کرتے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں توازن انصاف قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور ہرگز مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ بیشتر کامیاب ہوتے تھے۔ نوکروں کی دِقت میں عرض کر چکا ہوں۔ ایک مرتبہ مولانا بالکل بے نوکر کے ہوگئے۔ میں نے ایک لڑکا مکان سے بلاکر نوکر رکھ دیا۔ اسی روز مولانا کے دو روپیہ میز پر سے غائب ہوگئے۔ صاف بات تھی کہ اسی لڑکے نے چرائے تھے کیونکہ اتنی دیر میں اس کمرے میں کوئی اور نہ آیا نہ گیا۔ میں نے چاہا کہ مولوی صاحب اس کو جواب دے دیں۔ مولانا نے کہا کہ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ اسی نے لیے۔ میں چپ ہوگیا۔ مگر چونکہ وہ نوکر میرے قبضہ کا تھا میں نے اس کو کہا کہ گھر چلا جاوے اور اپنا ایک نوکر[1] جج صاحب کو عاریتاً دے دیا۔ مولانا کا برتاؤ ظاہر میں نوکروں کے ساتھ تبادلہ کی بنا پر ہوتا تھا نہ کوئی خاص رعایت نہ بے جاسختی۔ واقعاً انسانی ہمدردی کی وجہ سے نوکروں کے ساتھ رعایت اور اپنے نفس کے ساتھ سختی کرتے تھے۔ گوکہ پنکھا قلی ہمیشہ گرمیوں میں نوکر ہوتا تھا اور جب کوئی آتا جاتا تھا تو پنکھا جھلتا تھا مگر خود اپنی ذات کے لیے انھوں نے کبھی گوارا نہ کیا کہ پنکھے کے نیچے بیٹھیں اور ایک دوسرا انسان ڈوری کھینچے۔ اسی طرح یہ انسان دوست دن بھر خود کام کیا کرتا تھا اور نوکر کے ذمہ صرف بندھے ٹکے کام تھے۔ کبھی کبھی جب بہت پریشان ہوتے تھے تو کہہ دیتے تھے ''خدا تمھارا منھ بھی کالا نہیں کرتا'' مگر اس انداز سے کہتے تھے کہ میں نے کسی نوکر کو ناگوار مانتے نہیں دیکھا۔ کرامت حسین صاحب کی سب سے بڑی صفت ایثار کی تھی۔ جاگتے سوتے اسی کا خیال رہتا تھا اور ہر بے تکلف دوست سے فرمایا کرتے تھے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی خدمت خلق دنیا میں کچھ کرنا چاہیے۔

---

1 اس کا نام بقریدی تھا، مولانا نے اس کا نام قربان علی رکھا تھا۔

ایک روز مجھ کو میری کاہلی پر وعظ و نصائح کر رہے تھے۔ ایک شاعر صاحب بیٹھے تھے جن کا نام مجھے یاد نہیں انھوں نے ایک شعر پڑھا ؎

پیر نہیں میر تم کاہلی اللہ رے   نام خدا ہو جوان کچھ تو کیا چاہیے

شعر شاید مولانا کو یاد تھا مگر پھر بھی بہت محظوظ ہوئے۔ خود ان کے کام کرنے کی یہ حالت تھی کہ میں نے کبھی ان کو بیکار نہیں پایا۔ سوا اس کے جبکہ وہ کام کرتے کرتے تھک جاتے تھے تو آنکھیں بند کر کے چپ چاپ بیٹھ جاتے تھے۔ شاید یہ ترکیب دماغ کا کسل دور کرنے کے لیے کی جاتی تھی اور یقیناً فائدہ مند بھی تھی کیونکہ اس کے بعد پھر کام شروع ہو جاتا تھا اور ظاہر ہے کہ ان کی ذاتی ضرورتیں بہت محدود تھیں جو کام ہوتا تھا یقیناً اکثر دن کا ہوتا تھا۔ مولوی صاحب کا مکان ایک بے کرایہ کی سرا تھا جس کا دل چاہے آئے۔ پھوس والے بنگلے میں پانچ کمرے، دو غسل خانے، برآمدے اور دالان تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ مولانا کے حصہ میں اندر باہر ملا کر صرف ایک غسل خانہ رہ گیا ہے جس شخص کی عمر ایثار میں کٹی ہو جس کی ایک مثال اپنی کل دولت کو وقف کر دینا ہو اس کے لیے متذکرہ بالا مثال کوئی بڑی مثال نہیں۔ میں نے اس کو صرف دو وجہوں سے بیان کیا۔ اول یہ کہ بڑی بڑی مثالوں سے دُنیا آگاہ ہے۔ دوم یہ کہ اس واقعہ کا اثر مجھ پر بہت ہوا تھا اور میرا چشم دید ہے۔ مجھے یاد نہیں کوئی موقع تھا دوسروں کے لیے تکلیف برداشت کرنے کا ذکر آگیا۔ مولانا نے فرمایا سب طرح کٹ ہی جاتی ہے ہاں خدمت خلق کا لطف باقی رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد مولانا نے اپنی سرگذشت شروع کی جو میرے دل پر نقش سنگ ہے۔ فرمایا کہ بچپن میں آرام میں پالا گیا۔ اس کے بعد ایک وقت آیا کہ ڈیڑھ روپیہ مہینہ کی آمدنی پر رمضان کاٹے اور اسی میں ایک مہمان بھی تھے۔ مہمان کا نام بھی بتایا کہ میرے وطن کے فلاں شخص تھے۔ کودّوں سے روزہ افطار ہوتا تھا اور سبق چاندنی میں یاد کرتا تھا جب منھ کا مزہ بدلنے کو جی چاہتا تھا اسی کودّوں کو بدلا کر شلجم کے پتے لے آتا تھا۔ اس کے بعد نوکر ہوا پھر ولایت گیا۔ بیرسٹر ہو کر واپس آیا۔ علی گڑھ میں رہا۔ الہ آباد آیا، پھر ہائی کورٹ کا جج ہوا، آج پھر فقیر ہوں ؎

اکنوں منم کہ رنگ بہ رویم نمی رسد   تا رخ بخونِ دیدہ نشویم ہزار بار

مرحوم بہ اتباع سنت جدنہ اپنے خدمات کا بدلہ چاہتے تھے نہ شکرگزاری۔ ایک بار کسی مقام پر لکچر دینے والے تھے۔ جن صاحب نے مدعو کیا تھا انھوں نے کہا کہ ہم لوگ آپ کی گاڑی اسٹیشن سے کھینچ کر لے چلیں گے۔ مولانا نے فرمایا اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں اپنے لیکچر میں بہت سی مفید باتیں عرض کروں گا ان میں سے اگر آپ ایک کو بھی اختیار کرلیں گے تو مجھ کو یہ معلوم ہوگا کہ گویا آپ نے میری نگہداشت کے لیے میرا اسٹیچو نصب کردیا ہے۔ یہ واقعہ کوئٹہ یا کوئٹہ کی راہ میں کسی مقام کا ہے۔

ڈاکٹر جانسن کی بذلہ سنجی کے ذکر میں کسی کا قول ہے کہ ان کے ہر جاننے والے کو ان کے لطائف میں سے کچھ نہ کچھ یاد ہے۔ جس کی مثال ایسی ہے جیسے ہندستان کا ہر سیاح ایک مٹھی جواہرات دکھلاکر سلاطین مغلیہ کی دولت کا پتہ دیتا ہے۔ مولانا کے ایثار کا یہی حال تھا۔ جس ان کے جاننے والے سے پوچھ لیجیے آپ کو ایک آدھ نئی مثال ہاتھ آجائے گی۔ حکیم مہدی صاحب مولانا کے شاگرد جو اسکول کا کام کرتے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی سے بعد انتقال مولانا کی ملاقات ہوئی۔ فرمانے لگے کہ ہم تینوں بھائیوں کو مولانا نے اولاد کی طرح جانا اور ایسے گاڑھے وقتوں میں کام آئے کہ اگر باپ بھی ہوتا تو اس قدر نہیں کرسکتا تھا۔ ان کے جلسۂ تعزیت میں ہر شخص کو کوئی نہ کوئی واقعہ ان کی قربانیوں کا یاد تھا۔ اس فقیری کے عالم میں بھی کئی لڑکیوں کو اپنے پاس سے پڑھواتے تھے اور ان کی ضرورتوں کے کفیل تھے۔

○

".......... ۱۹۲۱ سے ۱۹۳۰ تک کانگریس سے بہت دل چسپی رہی، جواہر لال جی سے دوستانہ تعلقات رہے۔ ایک پہیے والا چرخا ایجاد کیا تھا۔ مجھے بھی تحفے میں دیا تھا اور اس کا نام "جَمر و چرخا" رکھا تھا.........."

(انیس قدوائی: اب جن کے دیکھنے کو......صفحہ ۵۹)

باب ہشتم

مولانا کرامت حسین صاحب کو جس قدر دوسروں کی خدمت کرنے میں لطف آتا تھا اسی قدر احسان سے گھبراتے تھے۔ زمانہ ججی کے پہلے کسی وقت میں مولانا کے گھر میں آگ لگی تھی اور چونکہ وہ بنگلہ بھی پھوس کا تھا صرف بدن پر کے کپڑے اور ان کا قرآن محفوظ رہے تھے۔ قرآن شریف کیونکر بچا۔ اس کا قصہ الہ آباد میں اکثر اور لکھنؤ میں خاص خاص احباب کو معلوم ہے۔ یعنی جس وقت آگ لگی اور صاحب مکان کو یاد آیا کہ اس مکان میں میرا قرآن شریف بھی ہے۔ یہ مولویوں کا دہریہ بلاخوف جان گھس گیا اور کلام اللہ کی ظاہری حرمت کو نہ ضائع ہونے دیا۔ آگ لگنے کے بعد مولانا کے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک نواب صاحب مولانا کے احباب میں تھے۔ ان کے پاس نقد کچھ نہ تھا مگر وہ نیک بندہ گھر بھر کا زیور جمع کر کے مولوی صاحب کے پاس لایا کہ فی الحال اس سے ضروری چیزیں بہم پہنچا لیجیے۔ مولانا نے شکریہ کے ساتھ واپس کیا مگر مرتے دم تک ان کی محبت و خلوص کے قائل رہے۔ ایک دوسرے مولوی صاحب جو بہت غریب آدمی تھے اور باوجود بڑھاپے کے مولانا سے پڑھنے تشریف لاتے تھے۔ انھوں نے تو غضب ہی کر دیا یعنی مبلغ دس روپیہ لے کر آئے اور فرمانے لگے کہ میں نے اپنے مرنے کے لیے رکھا تھا مگر اب میری خوشی ہے کہ اس کو آپ کام میں لائیں۔ مولوی صاحب کی جواں مردی سے کرامت حسین صاحب بھی مرعوب ہوگئے اور وہ روپیہ لے کر رکھ لیے اور کچھ دنوں کے بعد بجنسہ واپس دے دیے۔

مولانا فرماتے تھے کہ الہ آباد میں بھی میری آمدنی چھ سات سو سے زیادہ کبھی نہیں ہوئی۔ لکھنؤ میں تو تقریباً مفقود ہی تھی اس کی وجہ صاف ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب اخلاق میں لکھا ہے ''ایسا ہی بڑے بڑے ماہران طب و قانون وغیرہ کو اپنی اجرت کو اونچا کر کے اپنے مستفیدوں کے حلقے کو تنگ کرنا چاہیے تا کہ ہر مستفید کی طرف کافی توجہ کا وقت ملے

اور تندرستی قائم رہے اور باقی اہل پیشہ بھوکے نہ مریں۔ اسی بنا پر مولانا نے اپنے مشورہ کی فیس پانچ سو روپے رکھی تھی اور صرف احباب کی خاطر سے کبھی کبھی کم کر دیا کرتے تھے۔ شک نہیں کہ مولانا سے بہتر شرع محمدی کا جاننے والا دوسرا نہ تھا۔ اور اگر فیس کم ہوتی تو بہت سے لوگ آتے۔ مگر خلاف اصول بات کیونکر ہوتی۔ میرے ایک دوست نے مجھ کو تار دے کر بلوایا اور کہا کہ مولانا سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ تمھاری وجہ سے تین سو لیں تو مجھے مشورہ درکار ہے۔ میں نے عرض کیا۔ جواب مِلا جی نہیں یہ کیونکر ہوسکتا ہے ہاں اگر وہ صاحب غریب ہوتے تو یہ ممکن تھا کہ میں پوری رقم ان کو واپس دے دیتا۔

روپیہ کی کمی کی وجہ سے مولانا گاڑی گھوڑا نہ رکھ سکتے تھے۔ گوکہ ان کا دل بہت چاہتا تھا۔ معمولاً تانگے پر چڑھتے تھے میرے زمانہ قیام میں میری گاڑی اسی مکان میں تھی۔ میں نے چاہا کہ مولانا اس کو استعمال کریں مگر انھوں نے کبھی اس پر قدم نہ رکھا۔ جس روز 1914 میں اسلامیہ اسکول کا جلسہ تھا جہاں مولانا ایک مختصر لکچر دینے والے تھے۔ اس روز کوئی یکہ یا گاڑی نہ ملتی تھی۔ مجبوراً جناب میری گاڑی پر تشریف لے چلنے کو تیار ہوئے۔ سوئے اتفاق سے ایک تانگہ کہیں سے آگیا۔ مولانا کا چہرہ بشاش ہوگیا اور پھر تانگے ہی پر تشریف لے گئے۔ میں بھی اسی تانگے پر گیا۔

○

باب نہم

کرامت حسین صاحب نے مجھ کو بہت گستاخ کر دیا تھا۔ایک روز اسکول کی غریبی ....[1]مولوی حامد صاحب قبلہ کے واقعہ کا ذکر طولانی ہے اور گو خالی از لطف نہیں ہے۔ مگر میں مختصر بیان کروں گا۔ سلطان العلماء جناب سید محمد صاحب قبلہ مرحوم سے ایک عربی پروفیسر کینگ کالج کے لیے مانگا گیا۔ مرحوم و مغفور نے سید علی نقی صاحب کی سفارش کی۔ بعد کو مولوی اعجاز حسین صاحب قبلہ مرحوم نے دوستانہ شکایت کی کہ جب زمانہ غدر میں مصیبت کا وقت ہو تب تو میں بلایا جاؤں کہ عجلت کرو عجلت کرو اس کے پیشتر کہ اجل آوے اور جب عہدے تقسیم ہوں تو ہم فراموش کر دیے جاویں۔ سلطان العلماء نے فرمایا کہ آپ کے یہاں کون ایسا شخص تھا جس کی میں سفارش کرتا۔ مولوی اعجاز حسین صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی حامد حسین صاحب قبلہ کی طرف اشارہ کیا مگر سلطان العلماء ان کی قابلیت سے آگاہ نہ تھے ۔ حالانکہ ان کی کتاب جو انھوں نے مولوی اعجاز حسین صاحب قبلہ کو دیکھنے کو دی تھی وہ واقعاً حامد حسین صاحب قبلہ ہی نے دیکھی تھی۔ میں ان مثالوں سے قائل نہ ہوا اور عرض کی کہ یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ مولانا نے بحث کرنا نہ چاہا اور کوئی دوسرا ذکر شروع کر دیا۔

ایک روز میں نے عرض کیا کہ آپ کو ایک ریوالور رکھنا چاہیے۔ فرمایا کہ معلوم نہیں میں رکھ بھی سکتا ہوں کہ نہیں۔ مجھے بڑی ہنسی آئی اور میں نے عرض کی ہائی کورٹ کے جج کو لائسنس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مولانا: مگر میں تو ریٹائرڈ ہوں۔

قصہ مختصر میں نے عرض کیا کہ آرمس ایکٹ دیکھ لیا جائے۔ فرمایا کہ آپ ہی دیکھیے میں نے خود ان کی مدد سے کتاب ڈھونڈھی اور ان کے سامنے رکھ دی۔ مولانا نے مجھ کو

---

[1] یہاں کچھ عبارت غائب ہے۔ (مرتب)

شریک کر کے پھر سے ڈھونڈھا۔ واقعی ایسی حالت کے جج کے لیے کہیں پر اوژن نہ پایا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ مولانا اس مسئلہ کو خوب جانچ چکے تھے مگر میرے مقابلہ میں بھی اپنی تفتیش کو قابل وثوق نہ جانتے تھے۔ اپنے کو دوسرے سے کمتر جاننے کی اس سے بہتر مثال مجھ کو نہیں ملتی اور اس سے بہتر مثال اعلیٰ ترتیب کی کیا ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ کسی ڈپٹی کمشنر وغیرہ سے مشورہ کیجیے۔ مولانا بہت زور سے ہنسے اور فرمایا کہ وہ کہے گا کہ تم نے ججی کیا کی ہے۔

O

''............تمھارے نذیر حسین بابا کے یہاں ایک آدمی نوکر تھے ان کا نام زبیر خاں تھا...... ایک سال برسات بہت ہوئی، علاوہ اور مکانوں کے مولوی امام علی کے گھر کی وہ دیوار گرگئی جو مکان کے اُتر کی طرف گلی میں ہے۔ وہ دیوار گلی میں ڈھیر ہوگئی۔ راستہ بند ہوگیا۔ لوگ اسی دیوار کے ڈھیر پر چڑھ کر حاجی نیب کی طرف جاتے تھے۔ میاں زبیر خاں جو اس جگہ پہنچے تو دیکھا دو چارپائیاں دو طرف کھڑی ہیں اور ان پر پرانی رضائی توشک وغیرہ ڈال دی گئی ہیں، اس کی آڑ میں مولوی امام علی کی ماں بے چاری پردہ برقرار رکھے ہیں۔ مولوی امام علی انگنائی میں کھڑے ہیں، آنے جانے والوں سے از راہ انسانیت امید رکھتے ہیں کہ ہر جانے والا ہمدردی کرے گا۔ چنانچہ زبیر خاں دیوار کے ڈھیر پر سب سے اونچی جگہ کھڑے ہوگئے۔ لٹھیا ٹیک کر کمر سیدھی کی، گھر کی وسعت کا نگاہ سے جائزہ لیا اور کہنے لگے ''واہ اب بڑی فِجا (فضا) ہوگئی۔''

(سید اخلاق حسین کے نام خط)

باب دہم

مولانا کی بردباری کا ایک واقعہ ہے جس کا سبب راقم کمبخت ہوا تھا۔ میں اپنے ایک تعلیم یافتہ دوست کو مولانا سے ملانے لے گیا۔ راستے میں کچھ ایسے اذکار چھڑے جس میں ہم اور وہ مختلف رائیں رکھتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ مولانا میرے ہم رائے ہیں لہذا میں نے اپنی سفاہت سے ان صاحب کا مقابلہ کروا دیا۔ میرے دوست جب قائل ہونے لگے تو نامعقولیت پر تیار ہوگئے۔ ان کو حرارت آگئی اور کھلے کھلے حملے ذاتیات پر کرنے لگے۔ مولانا اسی سنجیدگی اور بردباری سے جواب دیتے رہے۔ آخر میں انھوں نے نہایت بے تمیزی کا سوال کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ میں سب کو برابر جانتا ہوں۔ آیا ایک مہتر کو اپنے برابر تصور کرتے ہیں؟ مولانا نے جواب دیا کہ بعد نماز عیدین مہتروں سے عید ملتا ہوں۔ دوسرا الزام مولانا پر انگریز پرستی اور ضمناً خوشامد کا لگایا۔ مولانا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا مگر مسکراتے رہے۔ انگریز پرستی اور قدامت پرستی کا الزام مولانا پر بعض ناواقف کار لگاتے تھے۔ اس بحث کے لیے ایک الگ کتاب چاہیے جس میں نیشنلسٹ لبرل سوشلسٹ، کنزرویٹیو وغیرہ وغیرہ تمام مدارس پولٹیکس کا موازنہ ایک دوسرے سے کیا جائے۔ مطلب عرض کرنے کا یہ ہے کہ مولانا رفتہ رفتہ ترقی کے حامی اور ہندو مسلمانوں کے میل سے بحالت موجودہ ناامید ہو چکے تھے۔ مگر خوشامدی ہونے کا الزام ان کی نسبت نہیں سنا تھا۔ خود فرماتے تھے کہ مسٹر بھپندرناتھ باسو کے بل کے موافق سوا میرے اور کسی جج نے رائے نہیں دی تھی۔ وہ شخص جو طبیعتاً ایک خوشامدی ہوتا شاید ایسا نہ کرتا۔ میں ایک دوست سے مسلم گرلز اسکول کا تذکرہ کر رہا تھا۔ انھوں نے کہا کہ فلاں انگریز سے (جو ایک جلیل القدر عہدے پر ممتاز ہے) مولوی صاحب کو ملنا چاہیے۔ امید ہے کہ کچھ نفع کی بات نکل آوے۔ میں نے وہ پیغام مولانا کو دیا۔ مولانا نے جواب دیا میں کیوں جاؤں میں جانتا ہوں کہ وہ میرے یہاں بازدید کو نہ آئیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد جب میں پھر لکھنؤ گیا تو

مجھ کو معلوم ہوا کہ میرے دوست نے مولانا سے بلاواسطہ کہا تھا اور اپنی لسانی اور قابلیت سے مولانا کو ملاقات کے لیے آمادہ کردیا تھا اور مولانا کارڈ چھوڑ بھی آئے تھے مگر وہ صاحب بازدید کو نہ آئے۔ میرے مہربان ایک روز مولوی صاحب کی خدمت میں پھر آئے اور خواہش کی کہ مولانا فلاں جلسہ میں ایک مختصر لکچر تعلیم پر دے دیں۔ مولانا نے صدر نشین کو پوچھا۔ معلوم ہوا وہی صاحب ہیں۔ مولانا نے جواب دیا۔ لاحول ولا قوۃ میں ہرگز ایسے مقام پر نہ جاؤں گا جہاں وہ صدر نشین ہوں۔ یہ خبر سلیقہ مندی کے ساتھ ان صاحب تک پہنچائی گئی۔ انھوں نے اپنی وسعتِ اخلاق اور مساوات پسندی کی شہرت کو برقرار رکھا۔ یعنی پہلے ایک معذرت نامہ لکھا اور بعد کو خود آئے۔ جس روز وہ آنے والے تھے تھوڑی دیر پیشتر میں مولانا کی خدمت میں موجود تھا۔ ایک دن میں مولانا کی ہمراہی میں تانگے پر آرہا تھا راستہ میں ایک بڑی شاندار کوٹھی غالباً زمانۂ شاہی کی اور ایک کامیاب انگریز بیرسٹر کی ہے۔ میں نے اس مکان کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا اور مولانا کی توجہ دلائی۔

مولانا: جی ہاں۔ چشم نگران است کہ ملک باد گراں است۔ اس واقعہ کے پہلے اسکول کے مکان کی نسبت گفتگو ہو رہی تھی اور مکان کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مطلب تھا کہ یہ مکان باہمہ و بے ہمہ گویا زنانہ اسکول کے لیے بنوایا گیا ہے۔ مگر مولانا نہ معلوم کس خیال میں تھے اور نہ معلوم کیا سمجھے۔

○

باب یازدہم

شعر کا مذاق مولانا کا لاجواب تھا جس کی ایک وجہ حافظہ کی قوت بھی رہی ہوگی۔ میر انیسؔ، غالبؔ، سعدیؔ اور حافظؔ خصوصاً حافظؔ بہت پسند تھے۔ یہ شعر حافظ

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید ✦ کہ ز انفاس خوشش بوے کسے می آید

بڑے لطف سے پڑھتے تھے۔ اس شعر پر ایک واقعہ یاد آیا۔ جس روز سید وزیر حسن صاحب کے یہاں راجہ صاحب محمود آباد پڑھنے کو تھے۔ کرامت حسین صاحب کی ہمراہی میں میں بھی گیا تھا۔ واپسی میں کسی واقعہ پر میں نے کہا دنیا ایک پہاڑ کی چڑھائی ہے (جس کی چوٹی پر نہ معلوم کیا ہے) مولانا نے ایک جملہ انگریزی کا اسی مضمون کا پڑھا جس کا ترجمہ تقریباً یہ ہوگا۔ حیات ایک تلاطم بے جا ہے جو عدم کے پر از تمکین و سکوت سمندر میں پیدا کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا کو ایک شعر حافظ کا یاد آگیا جس کو سنانے کو بڑے اثر سے پڑھا۔

یار دارد سر صید دل حافظ یاران ✦ شاہبازے بشکارے مگسے می آید

اس میں شک نہیں کہ اس انگریزی جملہ کے بعد اس شعر کے معنی آئینہ ہوگئے اور شاعر کا مفہوم ظاہر ہوگیا جو نظر میں نہ تھا۔ اس شعر نے کچھ ایسا مزہ دیا کہ مولانا نے اپنے عزیز دوست اور قابل قدر بزرگ کو جو ان کے برابر بیٹھے تھے مخاطب کر کے پھر پڑھنا چاہا۔

مولانا: سنیے گا کیا خوب فرماتا ہے حافظ علیہ الرحمہ یار دارد سر..........

ان بزرگوار کے صفات ان کی کمزوریوں سے واقعی کہیں زیادہ ہیں اور اگر عمدہ لوگ چھانٹے جائیں تو مولانا کے یہ دوست ہر پہلو سے انتخاب میں آئیں گے۔ مگر شاید کیف شعر ان کو نہیں ہے کیونکہ درمیان میں انھوں نے تانگے والے سے باتیں شروع کر دیں اور باوجود مولانا کی مکرر کوشش کے شعر کا لطف اور مولانا کا وجدانی مزہ خاک میں مل گیا۔ اسی

طرح جب مولانا کو نہایت خستہ و مضمحل پایا میں نے عرض کیا جناب اس قدر محنت نہ کیا کریں کیونکہ خود جناب کا قول ہے کہ اس قدر محنت جس سے تندرستی خراب ہوجائے خراب چیز ہے۔

مولانا: میں کیا کروں، اگر کوئی کام مجھ کو کرنا ہوتا ہے تو اگر میں اس کو ملتوی بھی کردیتا ہوں تب بھی دماغ مصروف رہتا ہے جس سے لامحالہ کسل و ماندگی ہوتی ہے۔ اگر کہیں جنگل اور سبزہ ہوتا جہاں کوئی دوسرا نہ ہوتا اور میں چلا چلا کر حافظ کے اشعار پڑھتا تو پھر دماغ میں تازگی آجاتی اور کسل دور ہوجاتا۔

مولانا کے ایک پیارے دوست اور سچے ہمدرد جو تشریف رکھتے تھے فرمانے لگے میرے پچھواڑے فلاں سڑک پر رات کو بالکل سناٹا رہتا ہے آپ جس قدر جی چاہے چلا کر پڑھ لیا کیجیے۔ مولانا نے گردن جھکا کر سکوت اختیار کیا۔

ایک مرتبہ میں نے ایک بیت تعشق کی پڑھی جو مجھ کو بالکل نئی معلوم ہوتی تھی۔

نکلی دلہن بنی ہوئی سر خم کیے ہوئے　　جوہر کی زلف ہاتھوں پہ ناگن لیے ہوئے

مولانا نے کہا نئی نہیں ہے اور ایک بند میر انیس صاحب کے کسی قدیم مرثیہ کا پڑھا جس میں یہی مضمون تھا۔ افسوس کہ وہ بند مجھ کو یاد نہیں رہا۔

ایک مرتبہ میں نے اقبال کی غزل سنائی۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

مولانا نے تعریف کی مگر مجھ کو تعجب ہوا کہ زیادہ تعریف کیوں نہ کی۔ یقیناً اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ Super man یعنی انسان فوق الانسان کے خیال کی ترقی ہربرٹ اسپنسر کے بعد ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے دوسرا شعر پڑھا۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکست ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اس شعر پر مولانا کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ آنکھیں بند کرلیں اور مجھ سے کہا پھر پڑھیے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ یہ شعر خاص مولانا کے رنگ کا ہے یعنی شاعر نے خدمت کی قربانی کو سراہا ہے۔ مولانا کو گانا سننے کا بھی شوق تھا مگر نہ ایسا کہ اس کے لیے ہرج کار کریں۔ جب رودولی تشریف لانے کا ارادہ ہوا تو مجھ سے فرمایا۔

مولانا: کوئی قوال آپ کے یہاں عمدہ ہے۔

میں: جی ہاں۔

مولانا: تو اس سے حافظ کی غزل سنوائیے گا۔ مگر وہ خود بھی سمجھتا ہے؟

مجھ کو ہنسی آگئی اور عرض کیا کہ نہیں۔

مولانا: تو نہ سنوں گا۔

میں: میرے یہاں ایک قدیم طرز کے سوزخواں البتہ قابل سننے کے ہیں۔

مولانا: ان کو ضرور سنوں گا۔

جب مولانا تشریف لائے میں نے سنوایا۔ مولانا بہت محظوظ ہوئے یہ سوزخواں واقعی مغتنمات میں سے تھے کبھی کبھی یہ ہوتا تھا کہ جوش والا اور سُروں کے لطف کی وجہ سے مردِ خدا پر ایک بے خودی سی طاری ہوجاتی تھی اور اس وقت وہ اپنے کو اس موقع پر موجود سمجھنے لگتے تھے۔ ذاتی خوشی اور غم دل سے محو ہوجاتے تھے جس کا نتیجہ وہی ہوتا تھا جو دل سے نکلی ہوئی بات کا ہوتا ہے۔ میں نے یہ نکتہ مولانا سے بیان کیا اور انھوں نے بھی اس کی تصدیق کی اور فرمایا کہ جب تک گانے والے کی طبیعت پر خود مزہ نہ ہو اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرمانے لگے کہ مجھ کو حیدر جان کا گانا بہت پسند ہے۔ حامد علی خان نے مجھ کو کئی بار سنوایا تھا۔ مگر وہ عورت نہایت لطیف طبیعت رکھتی تھی اور میں مجرد تھا اس لیے میں نے اس سے رسم بڑھانا مناسب نہ جانا۔ مولانا اکثر کہا کرتے تھے کہ عورت اور مرد میں اتحادِ خیال ہمیشہ اتحادِ جسمانی پر ختم ہوتا ہے۔

○

باب دوازدہم

گرلز اسکول کا خیال کسی وقت فراموش نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ بیمار ہوئے۔ اپنی بیماری ظاہر نہیں کی۔ دوپہر کو میں نے دیکھا کہ بخار چڑھا ہوا ہے اور آپ بغیر بچھونے کے یوں ہی لیٹے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کچھ اوڑھ لیجیے۔ فرمایا سردی تو معلوم ہوتی ہے مگر کوئی ہلکی چیز اوڑھنے کو موجود نہیں ہے۔ میں نے اپنی دلائی لاکر باصرار اڑھا دی۔ جب میں ہٹ گیا آپ نے وہ دلائی تہہ کر کے رکھ دی۔ یقیناً ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ اپنے تن کی آسائش کے لیے وہ میرا احسان لیں۔ لاپروائی سے قریب چار بجے تک وہیں لیٹے رہے۔ اس کے بعد افاقہ ہوا۔ میں نے کہا مولانا آپ موت سے نہیں ڈرتے ہیں۔

مولانا: ذرا نہیں۔ البتہ ایڑیاں رگڑنے سے ڈرتا ہوں۔ میں موت کے لیے بالکل تیار ہوں۔ صرف یہ آرزو ہے کہ اسکول کا انتظام معقول ہوجائے اور دو ہزار روپیہ مہینہ آمدنی مستقل ہوجائے۔

گرلز اسکول کا خیال ہر وقت دماغ میں رہتا تھا اور بے تکلف صحبت میں تقریباً ہر موقع پر اظہار بھی ہوا کرتا تھا۔ تعلیم نسواں سے مولانا کا عشق بہت قدیم تھا۔ فرماتے تھے کہ ولایت میں میں اپنے ہندستانی ہم عصروں سے اس کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ وہ لوگ کہتے تھے بہت وقت ہے۔ ہندستان میں پہنچ کر دیکھا جائے گا۔ ان میں سے اکثروں نے ملک کی بڑی بڑی خدمتیں دوسرے میدانوں میں کیں اور کر رہے ہیں۔ (خدا ان لوگوں کو باقی رکھے) مگر اس خدمت کی دستار مولانا ہی کے سر پر بندھی۔ اسی تعلیم نسواں کی وجہ سے ایک دنیا مولانا کے خلاف ہوگئی اور ان کے اعزا اور ان کے درمیان میں ایک ظاہری تکلف ہوگیا اور گو ظاہراً کوئی اختلاف نہ تھا۔ مگر اغیار یہ دیکھ کر متعجب تھے کہ مراسم اس سے زیادہ کیوں نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ عید بقرعید مولانا کرامت حسین صاحب اپنی چچی صاحبہ مرحومہ مغفورہ کے سلام کو جاتے تھے اور یوں ہرج مرج میں ان کو تشریف لے جاتے میں

نے خود دیکھا ہے مگر وہاں سے کسی کو آتے کبھی نہیں دیکھا۔ اگر کوئی صاحب دیگر اعزا میں سے تشریف بھی لاتے تھے تو مقدمات وغیرہ میں مشورہ کی غرض سے یا شاید یوں بھی آتے رہے ہوں۔ آخر علالت میں جب مولانا راجہ صاحب محمود آباد کے یہاں اٹھ گئے تھے اور ایک خیمہ میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک روز تیسرے پہر کو مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ مدظلہ العالی تشریف لائے۔ میں اتفاق سے موجود تھا۔ بعد مزاج پرسی قبلہ وکعبہ نے فرمایا کہ نواب صاحب رام پور شیعہ کالج کے لکھنؤ میں ہونے کے خلاف ہیں۔ اگر آپ سے لیفٹیننٹ گورنر سے ملاقات ہو تو عندالذکر لکھنؤ کے لیے سفارش کیجیے گا۔ مولوی کرامت حسین صاحب نے فرمایا کہ مجھ سے کیوں ذکر آنے لگا۔ قبلہ وکعبہ نے فرمایا آپ خود ذکر چھیڑ کر فرمائیے۔ مولانا نے جواب دیا یہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد سوا رخصتی کے کلمات کے اور کوئی بات مجھ کو یاد نہیں ہے۔ جب قبلہ وکعبہ تشریف لے گئے میں نے کہا کہ تین مہینہ سے سلسلہ علالت ہے اور تعجب کی بات ہے کہ قبلہ وکعبہ آج تشریف لائے اور اس میں بھی شیعہ کالج کی ضرورت مشترک تھی۔

مولانا: (قدرے چیں بجبیں ہوکر جو شاید بیماری کا اثر ہو) ''یہ آپ کیوں کہتے ہیں کسی کی برائی کرنے سے فائدہ؟''[1]

میں نے خاندانی کشش کا ذکر کیا ہے حاشا وکلا میں نے خود ارکان خاندان میں سے کوئی بات ایک دوسرے کے خلاف نہیں سنی ہے بلکہ جہاں تک سنا ہے کہ ایک دوسرے کی تعریف ہی فرماتے رہے۔ البتہ حاشیہ نشینوں کی وہ باتیں سنی ہیں جن سے دل دُکھتا ہے۔ اب اس سے جو نتیجہ چاہے نکال لیجیے۔ مولانا کے اصل مذہبی خیالات سے شاید کوئی باخبر نہ رہا ہو لیکن جو باتیں لوگوں کو خفا کردیتی تھیں وہ ذیل کے قبیل کی ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ

---

1. اس کے لکھنے کے بعد حکیم صاحب نیز دوسرے ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ جناب مجتہدالعصر والزمان ایک مرتبہ علیل ہوئے تھے اور اس وقت کرامت حسین صاحب کے اصرار سے ان کے بنگلے میں قیام فرما ہوئے تھے۔ ان دنوں جج صاحب ضرورتاً الہ آباد تشریف لے گئے تھے اور بنگلہ خالی تھا۔ اسی طرح آخر دسمبر 1916 مولوی کرامت حسین صاحب بھی تقریباً ایک ہفتہ قبلہ وکعبہ کے مکان میں رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا صاحب کے مکان میں کانگریس اور لیگ کے مہمانوں کی کثرت تھی اور مرحوم مغفور علالت کی وجہ سے اپنے بنگلہ کو واپس نہیں جاسکتے تھے کیونکہ وہ بہت سرد تھا۔ بندۂ مولف

ایک مشہور مجلس مناقب میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جلیل القدر واعظ صاحب نے بمقتضائے محبت اہلِ بیت ایسے نکات بیان فرمائے جس میں شاعرانہ نزاکت اور غلو کی جھلک نظر آ جاتی تھی بعد کو میں نے مولانا سے عرض کیا سنا قبلہ و کعبہ آپ نے۔

مولانا: لاحول و لاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

ایک مرتبہ ایک صاحب تشریف لائے تو کہا کہ جناب شیعہ کالج کی سکریٹری شپ منظور کریں۔

مولانا: مگر وہ لوگ میرے شرائط کیوں منظور کریں گے۔

صاحب: مجھ سے بعض علمائے کرام سے گفتگو آ چکی ہے یقیناً کسی صاحب کو کوئی عذر نہ ہوگا۔

مولانا: کائستھ کی برات کا سا حال ہوگا۔ کائستھوں کے یہاں رسم ہوتی ہے کہ نوشاہ سے ثبوت قابلیت میں شعر پڑھوائے جاتے ہیں۔ اس نوشاہ نے شعر پڑھے سسرال والے بہت خوش ہوئے یہاں تک کہ ایک گنوار براتی نے کہا ارے ابھی کیا سنا ہے جب کھار منگیلاں (خار مغیلاں) آوے تب...........

اسی طرح جب میں یہ کہوں گا کہ تعلیم نسواں کی ضرورت کے متعلق ایک ریزولیوشن پاس کرو تب سب خفا ہو جائیں گے۔

O

باب سیزدھم

مولانا کا انتقال ہوگیا لیکن ان کی خیرات باقی ہے۔ اگر کسی روز ہمارے یہاں عورتوں کے پڑھائے جانے سے ہمارے آسائش زیادہ ہوئی اور ہمارے کام سنور گئے تو وہ مولانا کی جانفشانیوں کا نتیجہ ہوں گے۔ خدا کسی کی محنت رائگاں نہیں کرتا اور انشاء اللہ تعالیٰ مولانا کی عرق ریزی اپنا اثر دکھائے گی۔ مولانا نے اپنی عمر دوسروں کے کام میں صرف کردی اور اگر کچھ حصہ ان کے اپنے نفس کی پرورش میں صرف ہوا ہے تو وہ اس لیے ہوا ہوگا تاکہ بنی نوع انسان کی رفاقت زیادہ قوت سے زیادہ دن تک ہوسکے۔

آدمی ہوں خلق کی خدمت مرا ایمان ہے ہو مبارک اہل دیں کو پوجنا اللہ کا

دین ہے یہ زندگی ہو صاف سادہ سودمند اور سب جھگڑوں میں پڑنا کام ہے گمراہ کا

یہ مولانا کا ماٹو کہیے یا نقش نگین تصور فرمایئے۔ یہ ان کی سودمند زندگی کا خلاصہ تھا۔ ایک سرخی تھی جس کے تحت میں ان کی زندگی کی پوری کتاب لکھی گئی۔

بار الہا: مغفرت کر مرنے والے کی اور بدلہ دے اس کو اس کی جانفشانیوں کا حق الحنت عطا کر اس کو ان تکلیفوں کا جو اس نے تیری مخلوق کی راہ میں اٹھائیں اور حصہ دے اپنے لطف و عطا سے جو تیری ذات میں بدرجہ اتم ہے۔

صدقہ ان تمام نیک بندوں کا جن کے واقعات زندگی کو جان دینے والے نے اپنے لیے مشعل ہدایت بنایا تھا۔ وہ لوگ جو تیرا نام لے کر جیئے اور تیرا نام لے کر مرے۔

○

عرضِ مرتّب

میں نے اپنے والد کو، اپنے بچوں کو کبھی گود میں لیتے نہیں دیکھا۔ سنتا تھا کہ بڑوں کے سامنے اپنے بچوں کو گود میں لینا، اپنی بیوی سے باتیں کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جنس سے متعلق گفتگو بعید از قیاس تھی۔ لڑکیاں ہر کتاب نہیں پڑھ سکتی تھیں، بزرگ بھی گھر میں تہمد نہیں باندھ سکتے تھے۔ یہ صورت حال کسی ایک گھر، کسی ایک طبقے کی نہیں تھی، اس زمانے کے روایتی سماج میں، جنس اور اس سے متعلق ہر بات کو عموماً ذاتی اور انفرادی مسئلہ سمجھا جاتا تھا اور اس پر برملا گفتگو، بے تکلف تبادلۂ خیال بدتہذیبی تھی۔ اس رویّے کا پرتو آج بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

بہرحال حالات اب بدل رہے ہیں، جنس پر بات کرنا، اب ناقابل برداشت نہیں رہا۔ بیسویں صدی کے وسط کی بات ہوگی جب بے مُہار اضافۂ آزادی، خاندانی منصوبہ بندی، ضبط تولید کی ضرورت، مخلوط تعلیم کے عواقب اور ایڈس جیسے مہلک امراض نے جنس کی تعلیم کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی، مغرب کی ثقافتی یلغار سے، سماجی اور تہذیبی اقدار میں شکست و ریخت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے ہوش گم کردیے۔ 'ترقیوں' کے مثبت اور منفی اثرات نے جنس کی اہمیت کو بڑھا دیا اور اس پر غور و فکر کی ضرورت کے احساس کو شدید تر کردیا۔

روشن خیال، اور ترقی پسند لوگوں نے جنس کی باقاعدہ تعلیم کی وکالت کی۔ آج ان موضوعات پر ہمارے ماہرین تعلیم اور سماجی کام کرنے والوں کی خصوصی توجہ ہے۔ ویسے روایتی مخالفت کی آوازیں آج بھی اٹھتی رہتی ہیں۔

جنس کے مسائل سے ناواقفیت، ضبط تولید کی ضرورت اور اس کے اصولوں سے ناواقفیت، آزادہ روی اور ان سب کے جلو میں آنے والے امراض نے جنسی تعلیم کی اہمیت و افادیت کے احساس کے ساتھ یہ بھی واضح کردیا ہے کہ ایسے تمام مسائل کے پیچھے اصل

سبب اس میدان میں ہماری کم عملی یا لاعلمی ہے۔

چودھری محمد علی کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ انھوں نے ایک ایسے موضوع کی کہ جس کا زبان پر لانا بدتہذیبی میں شمار ہوتا تھا، اہمیت کو سمجھا اور پھر، ہزار طعن و تشنیع، سَب و شِتم اور مخالفتوں کے باوجود اس کے بارے میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے اس موضوع پر بات کرنے کو ضروری سمجھا۔ 'صلاح کار' انھوں نے غالباً 1928 میں لکھی تھی۔ پردے کی بات بعد کی ہے۔ ان کی یہ دونوں کتابیں فرد کی صحت و تندرستی اور ایک بہتر اور صحت مند سماج کی تشکیل میں جنس کی تعلیم کی اہمیت کو سمجھنے کا ثبوت ہیں۔

چودھری صاحب کی تحریروں کو پڑھ کر یہ تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ وہ اپنے زمانے سے بہت آگے تھے۔

○

[illegible]

صلاحِ کار

مصنفہ

محمد علی رودلوی عفی عنہ

مصنف اتالیق بی بی۔ یادگار مولوی کرامت حسین

نقادی کے نکتے وغیرہ وغیرہ

پبلشر و پرنٹر خواجہ اسد احمد

سرفراز قومی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ میں چھپا

قیمت مجلد عمہ/

طبع ثانی

فہرست

عنوان

عالی جناب آنریبل مہاراجہ سر محمد علی محمد خان بہادر کے۔سی۔ایس۔ آئی۔ کے۔ آئی۔اے، ہوم ممبر گورنمنٹ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ، والیٔ ریاست محمود آباد دام اقبالہ و ضاعف اللہ حشمتہ و فیوضہ۔

جناب والا، خطاب کی تہنیت میں آج تک نہ حاضر ہوا۔ خالی ہاتھ کیا آتا اب یہ ناچیز تصنیف پیش کرتا ہوں اور مبارک باد دیتا ہوں۔

جناب خطاب کے بھوکے نہیں، صفات ذاتی وصف اضافی سے مستغنی ہیں لیکن ہر چیز اپنے موقع پر خوشنما ہے۔

یہ خطاب آپ کے لیے موزوں اور آپ اس خطاب کے شائستہ جیسے جواہر نگار قبضہ کا جوڑ۔ جوہر دار تلوار سے مل جاتا ہے۔ حالانکہ لوہے کی اصالت ہیرے موتی سے بے پرواہ ہے۔

یہ ناچیز کتاب ایک نہایت ہی ضروری موضوع پر لکھی گئی ہے، ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ ہوگی جو مختلف وجوہ سے اس پر معترض ہوں گے لیکن خدمتِ خلق جس کے لیے جناب نے اپنی ذات کو مختص کرلیا ہے اس میں اعتراض کی کمی کب رہی ہے، لہٰذا التجا ہے کہ اس کتاب کو اپنے نام نامی سے معنون کرنے کی اجازت عطا کیجیے اور جس طرح اس گمنام نے اس کے لکھنے کی جسارت کی ہے جناب بھی اس کے عنوان دینے کی ذمہ داری قبول فرمائیں۔

محمد علی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

کردن صد عیب نہ کردن یک عیب۔ جنسی موضوع پر کتاب لکھنا اور نوجوانوں کے ہاتھ میں دینا ذمہ داری سے خالی نہیں ہے لیکن جن ڈھونڈیاں تن پائیاں گھر سے پانی پیٹھ جب تک کوئی شخص جرأت کرکے جوکھم نہ اٹھائے گا کام کیونکر چلے گا۔ یہی خیال تھا جس نے ہمت برقرار رکھی اور یہی خیال تھا جس سے عذر خواہی کی ضرورت نہیں سمجھتا ہوں۔ پھر بھی اگر کوئی پڑھنے والا مجھ کو خطاوار مان کر معاف کردے گا تو مجھ کو کوئی عذر نہ ہوگا۔

مغربی ممالک میں ہزاروں تصنیفیں اس موضوع پر ہیں جن میں جنسی تحقیقات از روئے فلسفہ کی گئی ہے۔ ایک کثیر تعداد ان کتابوں کی بھی ہے جن میں زندگی کے مختلف حصوں پر الگ الگ ہدایتیں ہیں۔ مثلاً کنواری کو کیا جاننا چاہیے، سہاگن کو کیا جاننا چاہیے، بال بچوں والی کو کیا علم ضروری ہے۔ سن الیاس کے متعلق ہدایتیں، جوان مرد کو ہدایتیں وغیرہ وغیرہ۔

زمانہ کا رنگ ہمارے ملک کی بھی حالت بدل رہا ہے اور ایسی ہی کتابوں کی ضرورت پیدا ہورہی ہے لیکن لکھنے والے پر یہ احتیاطاً فرض ہے کہ صرف اسی قدر باتیں معرض بیان میں لائے جس قدر ضروری ہیں۔ یورپ میں پچاسوں طریقے جنسی خواہشات پورا کرنے کے بتائے گئے ہیں جن میں سے اکثر خلاف فطرت ہیں لیکن بڑے بڑے علما اور ڈاکٹر ان کو بیماری کے ضمن میں شمار کرتے ہیں۔ یا افتاد طبع کے خصوصیات کو مان کر قابل معافی ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ ہماری آپ کی نظر میں اچھے خاصے جرائم ہیں اور اگر مبتذل محاورے کی اجازت ہو تو میں عرض کروں گا کہ ایسے ناشائستہ حرکات کا علاج نہ جیل خانہ ہونا چاہیے نہ پاگل خانہ بلکہ روز صبح پانچ جوتے اور حقہ کا پانی چار دن میں چنگا کردے گا۔

اسی قسم کی باتوں کو چھوڑ جانا مصلحت ہے کیونکہ ہم لوگوں کو پیش از وقت اس قدر پڑھانے سکھلانے کی ضرورت نہیں جس قدر یورپ والوں کو ہے۔ خصوصاً نسوانی طبقہ کو، وہاں کی دوڑ دھوپ افکار مشاغل ایسے ہیں کہ لوگ اعصابی مزاج ہوجاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں کا اثر ان پر زیادہ ہوتا ہے۔ ہندستان میں عورت اگر میاں بی بی کے رابطہ سے سہاگ کی رات تک بھی بے خبر ہے تو چنداں نقصان نہیں ایک رات میں واقف ہوجائے گی اور ایک دن میں اپنے فرائض کو گوارا کرلے گی۔ نہ یورپ کی بعض عورتوں کی طرح عمر بھر کے لیے متنفر ہوجائے گی۔ جیسا کہ ایک بڑی پڑھی لکھی انگریز معظمہ کی بابت مشہور ہے۔ نہ خداوند تعالیٰ پر جنسیں بنانے پر اعتراض جڑنا شروع کردے گی۔ لڑکوں میں بھی اس قدر ضرورت واقف کاری کی نہیں، معلوم ہوتی جس قدر یورپ کی کتابیں سکھلاتی ہیں۔ وہاں پردہ نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ علم کی ضرورت ہے۔ یہاں جب تک ہم لوگ پردے کا عیب برداشت کر رہے ہیں اس کے ہنر سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں یعنی لڑکوں کو پیش از وقت ضرورت سے زیادہ پختہ کار بنانے کی کوشش کیوں کریں۔ کیونکہ یہ بالکل خام خیالی ہے کہ اگر لڑکوں کو وقت سے پہلے سب کچھ پڑھا دیا جائے تو وہ برائیوں سے ایسا ڈر جائیں گے جیسا مولوی سے ڈرتے ہیں۔ کتاب میں ہزار لکھا ہو جب وہ اپنے بڑے ہم مکتبوں سے اس کا ذکر فخریہ سنیں گے تو وہ لکھی ہوئی باتوں کو دیکھی ہوئی باتوں پر ہرگز ترجیح نہ دیں گے بلکہ جو لڑکا ذرا سا بھی منچلا ہوا اس کا شوق دوگنا ہوجائے گا۔

اور اگر اپنے ہم مکتب کی قابل رشک حالت دیکھ کر اس کو بھی شوق نہ پیدا ہوا تو سمجھ لیجیے کہ وہ لڑکا نہیں بڈھا ہے۔ ہاں وہ تعلیم جو واقعی کارآمد ہے اور جس کا اثر مدت العمر رہتا ہے۔ عفیفہ ماں کی گود میں ہوتی ہے جس کا مقابلہ کوئی کتاب نہیں کرسکتی اور جس کے مؤثر ہونے پر مغربی اور مشرقی علماء ایک زبان ہیں پھر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت ہے ہی ؎

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

کوئی پسند کرے نہ کرے زمانہ کی چال جدھر لے جائے گی ادھر جانا ہی پڑے گا اور اگر انسان نے اسی زمانہ، زمانے کی چال کے مفہوم کو خوب ذہن نشیں نہ کرلیا تو کوئی بہت

بڑا روز بد دیکھنا نصیب ہوگا۔ اس اجمال کی تفصیل ضروری ہے مثلاً غدر کا شرم ناک واقعہ جس کی وجہ سے ہندستانی انگریزوں کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہا اسی زمانہ کی چال سے بے خبر ہونے کا نتیجہ تھا۔

وہ تجارت کا درخت جس کا بیج شاہ جہاں کی سلطنت میں بویا گیا انیسویں صدی میں اپنی شاخیں اچھی طرح پھیلا چکا تھا۔ یورپ کی دلآویز صنعتوں نے ملک میں رواج پاکر خیالات میں تبدیلی پیدا کردی تھی۔ منگل پانڈے اور دوسرے جاہل لوگ اپنے دماغوں میں نئی فکروں کی بھرمار پاتے تھے۔ افعال، طرز روش نیز اعتقادات میں ایک بڑا فرق دیکھتے تھے اپنے ہم جنسوں کو بھی انھیں اثرات کا شکار پاتے تھے جس طرح بچہ اپنی ماں کی گود میں دوسرا بچہ دیکھ کر فطرتاً پریشان ہوتا ہے یا معدہ غیرمناسب غذا کو نکال کر پھینک دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ لوگ بھی دماغ کے افکار سے پریشان تھے، مگر علم کی قلت اور خصوصاً علم النفس والقوی سے ناواقف کاری ان کو متحیر کیے ہوئے تھی۔ یہاں تک کہ کسی جاہل دماغ نے یہ بات کی کہ ہو نہ ہو یہ خیالات میں تبدیلی سب کارتوسوں کے اثر سے ہے جو دانت سے کھولے جاتے ہیں اور جن میں سور اور گائے کی چربی سب کے ایمان لے رہی ہے۔ دوسرے خود غرض لوگوں نے جن کی ضرورتیں طوائف الملوکی سے وابستہ تھیں اس خیال کو ترقی دی اور وہ ہوا جو خدا نہ کرے پھر ہو۔ کیونکہ لڑنا عیب نہیں مگر کمینے پن سے بڑا دوسرا عیب نہیں اگر لوگوں میں علم کی کمی اسی زمانہ کی ایسی ہوتی تو آج 1928 میں بھی اسی طرح کی باتیں ہوجانا ویسے ہی قرین قیاس تھا جیسا کہ 57ء میں اور موجودہ بے چینی میں اسی ناواقف کاری کا کچھ حصہ ہو بھی تو جائے تعجب نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے نوجوان عربی قول الناس علی دین ملکوھم (ترجمہ: لوگ ہمیشہ اپنے بادشاہ کے مذہب پر ہوتے ہیں) کے موافق اپنی ہر چیز سے متنفر اور ہر یورپین چیز کے مشتاق ہیں۔ یہ بات نہ ہندستان ہی کی طینت کو پسند ہے نہ خود فطرت کو، پھر اس مصنوعی کیفیت کا اثر کیا ہونے والا ہے۔ یا تو یہ ہوگا کہ ایک غدر سے بڑا غدر ظہور پذیر ہوگا۔ جو لوہے کے ہتھیاروں کے بجائے نفرت کے حربوں کا ہوگا یا ہر شخص کرسٹان ہوجائے گا جو انگریز ہندستانی سب کی نظروں میں خوار ہے۔ کیونکہ عیسائیت اپنے صحیح اور مبارک معنوں میں یورپ میں بھی مفقود

ہے۔ وہ میانہ روی جو بہترین حالت کہی جاسکتی ہے۔ اسی طرح بہم پہنچ سکتی ہے کہ آدمی زمانہ کی چال کا صحیح اندازہ کرلے اور دونوں پہلوؤں کو گھٹا بڑھا کر برابر کرلے۔ یعنی ترازو میں ایک طرف وطن کی محبت اور دوسری طرف ناگزیر نئی روشنی کو رکھے اور ایک پلہ میں دوسرے پلہ کا مواد اس طرح ڈالے کہ دونوں پلہ برابر رہیں۔ عشق ہی کو لیجیے۔ چالیس پچاس برس اُدھر ہندستان میں لیلیٰ مجنوں، نل دمن وغیرہ کے قصے اسی طرح پڑھے جاتے تھے جس طرح آدمی بادشاہوں بلکہ دیوپری کی کہانیاں سنتا ہے۔ آج یہ زمانہ لگا ہے کہ ہر نوجوان کے دل میں یہی خیال ہے کہ عشق میں ہمارا بھی حصہ ہونا چاہیے۔ ہم بھی اولادِ آدم ہیں جو ترکہ یورپ کے لاڈلے بیٹے کو ملا ہے ایشیا کے محروم الارث کو بھی ملنا چاہیے۔ وہ آدم کی اولاد ہی کیا جو سنگلدیب سے عرب کی سرزمین تک معشوقہ کی تلاش میں نہ جائے۔ وہ شادی ہی کیا جس میں بچھڑوں کی عرفات نہ ہو۔

یہ سب خیالات اسی بنا پر پیدا ہوئے ہیں کہ ہم ناولوں میں یہ مضامین پڑھتے ہیں اور ہر انگریز کو اسی کا دعویدار پاتے ہیں (آیا انگریزی قوم کا یہ دعویٰ ٹھیک بھی ہے آگے چل کر دیکھا جائے گا اس جگہ صرف اس بات سے غرض ہے جو ہم دیکھ کر سیکھتے ہیں) اسی کے مقابلہ میں بابو بنکم چندر چٹرجی کے ہندستانی ناولوں کو لے لیجیے۔ دیبی چودھرانی میں ایک خودغرض آدمی کا سپوت بیٹا باپ کے حکم سے اپنی بی بی کو چھوڑ دیتا ہے اور دل کی خواہش سے مجبور ہوکر حکم کی صرف اس قدر خلاف ورزی کرتا ہے کہ ایک بوسہ لے لیتا ہے جس کو تجربہ کار مصنف نے عبادت بتایا ہے اس کے بعد دوسری شادی کرلیتا ہے۔

بہت برسوں کے بعد باپ ہی کے حکم سے پھر اسی پہلی بی بی کو گلے لگاتا ہے اور خوشی کی زندگی بسر کرتا ہے۔

ناظرین واقعہ صرف آپ بیتی بیان کرتا ہے۔ قصہ اگر صحیح معنوں میں عمدہ ہوا تو جگ بیتی بیان کرتا ہے، بنگالہ کے جادوگر بنکم چندر کی کتابیں قوم کی قوم پر حاوی ہیں۔

اب ان دونوں اصولوں کی ناپ جوکھ پڑھنے والے کا کام ہے، ایک طرف انگریزی نام نہاد عشق کا دریا لیجیے اور دوسری طرف یہ مصنوعی بندھا پانی جس میں باپ کے حکم سے ایک بی بی کو چھوڑ کر دوسری کی اور پھر اس پہلی کو بھی بلا لیا۔ غور کرنا چاہیے کہ ان دونوں

حالتوں میں (یعنی ہندستانی اور انگریزی) کتنا جزو فطرت کا ہے اور کتنے دوسرے اجزا ملک، مذہب، ملت آب و ہوا اور زمانہ کی وجہ سے گھل مل گئے ہیں۔ تھوڑی سی فکر ظاہر کردے گی کہ چاہے انگریزی طریقہ ہو یا ہندستانی، دونوں میں صرف فطرت ہی کی پیروی نہیں ہے بلکہ ہندستانی خیال میں کچھ خاص ہندستانیت اور انگریزی خیال میں کچھ خاصی انگریزیت ہے۔ لیکن ہر قوم اپنے زعم ناقص میں اپنا ہی طریقہ فطرت کے موافق سمجھتی ہے اور دوسروں کا طریقہ اس کے خلاف بتاتی ہے۔ ملک، مذہب، ملت، آب و ہوا وغیرہ کے اثرات ہوکر رہیں گے ان سے انکار کرنا یا ان کو غیر ضروری سمجھنا حماقت ہے۔

لیکن جو نکتہ قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ اگر دوسرے ممالک کے طریقے اختیار کیے جائیں گے تو فطرت والا جزو تو صحیح ہوگا باقی حصہ غلط ہوجائے گا۔ ایک ذرا سے تصرف و تنزل کے ساتھ سعدیؒ کا شعر اس مفہوم کو آئینہ کرتا ہے۔

خلاف وطن ہر کسے رہ گزید که ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید

کاٹھیاواری گھوڑے کے صفات الگ ہیں۔ انگریزی تھارو برڈ کے صفات الگ ہیں۔ تازی کتا اپنے خصوصیات کی وجہ سے قابل قدر ہے۔ انگریزی بلڈاگ اپنی نرالی نوعیت میں سب سے علیحدہ ہے۔ آخر انسان اپنی قومی خصوصیات کیونکر چھوڑ دے گا۔ دماغ کے پیدا ہوجانے کی وجہ سے انسان کی خامیاں ضرور کم ہوگئی ہیں مگر یہ عالم پھر بھی ناقص ہے اور ناقص ہی رہے گا جیسا کہ ہر مادہ پرست اور نیز خدا پرست آپ کو بتا دے گا۔ جب یہ حال ہے تو انسان کمال کی تلاش میں تضیع اوقات کیوں کرے اور بجائے دوسروں کا طریقہ سیکھنے کے وہی راہ کیوں نہ چلے جو ملکی خصوصیات کی وجہ سے ہمارے مناسب حال اور موافق ہے جب شہنشاہ جاپان کا انتقال ہوا تو جنرل نوگی فاتح پورٹ آرتھر نے خودکشی کرلی جس کو جاپانی زبان میں ہاری کاری کہتے ہیں جو ہمیشہ کسی اعلیٰ غرض کے لیے کی جاتی ہے اور لکھ گیا کہ میں ہاری کاری اس واسطے کرتا ہوں کہ ہمارا شہنشاہ کہتے کہتے مرگیا مگر لوگوں نے یورپ کی عیش پسندی جو قومی خصوصیات کی دشمن ہے نہیں چھوڑی۔ جب جاپان ایسی اعلیٰ قوم اور صاحب اقتدار ملک اس عیب سے یوں بھاگے تو ہندستان کا کیا حشر ہوگا جو دوسروں کی ہر چیز کا دلدادہ اور اپنی باتوں سے کارہ ہے۔

میرے دوستو میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ یورپ یا کسی ملک یا فرد سے آدمی کینہ رکھے یا اس کو ذلیل سمجھے کیونکہ کینہ وہ چیز ہے جو دوسروں کو نقصان پہنچائے یا نہ پہنچائے کینہ پرور کو پہلے ہی کھا جائے گا اور ہم جب خود ذلیل ہیں تو دوسرے کو کیا ذلیل نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ مدعا صرف اس قدر ہے کہ جو باتیں صدی درصدی کے تجربہ کے بعد ہماری کہلاتی ہیں ان کی قدر پہچان لی جائے۔

میں نے محبت کے اوپر کوئی جداگانہ باب نہیں لکھا حالانکہ اس کتاب میں محبت کا باب نہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندر سبھا امانت میں سے گلفام شہزادہ کا نام نکال ڈالے۔

محبت کی وجہ سے دنیا بہشت ہوجاتی ہے اور عقبیٰ بھی بن جاتی ہے۔ جمال خدا کی مظہر محبت ہے لیکن یہاں جس محبت سے بحث ہے وہ دو انسان کے دل کا لگاؤ ہے جو مختلف جنسوں کے ہوں۔ اس کی شروع خواہش ترویج اور جذبات، ہمدردی و خودغرضی سے ہوتی ہے۔ جذبۂ ہمدردی خود وہ چیز ہے جو صرف انسان اور چند بہتر قسم کے جانوروں میں پایا جاتا ہے۔ نباتات اور نیز ادنیٰ قسم کے جانوروں میں اس کا پتہ نہیں چلتا اور صرف خودغرضی ہی دکھائی دیتی ہے، مکڑیاں وغیرہ نر کو اپنی غرض پوری ہونے کے بعد اکثر کھا جاتی ہیں۔ شہد کی مکھیاں جس وقت ان کا مطلب نکل گیا نر کو مار ڈالتی ہیں۔ شہد کے چھتے کے نیچے اکثر مکھیاں مری ہوئی ملتی ہیں یہ وہی قربانیاں ہیں جو توالد اور تناسل اور خودغرضی کے دیوتا کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ لٹارنو لکھتا ہے کہ دیکھا گیا ہے کہ جفتی میں مینڈک کی مادہ مرگئی ہے۔

برخلاف اس کے اعلیٰ قسم کے جانوروں میں اور انسانوں میں ہمدردی کا جذبہ اچھی طرح پایا جاتا ہے۔ اکثر بندر اس قسم کے سنے گئے ہیں کہ اگر ان کا جوڑا مرگیا ہے تو انھوں نے بھی کھانا پینا اپنے اوپر حرام کرلیا ہے اور اس طرح تھوڑے دنوں میں مر گئے ہیں۔ قُمری کی نسبت بھی اسی طرح کی روایتیں ہیں گو کسی کتاب میں نہیں دیکھا ہے کہ ایک مرتبہ رانڈ ہونے کے بعد وہ بھی پھر سے سہاگ نہیں چڑھاتی۔ سارس کی عادت ضرب المثل ہے۔ راقم خود اپنا تجربہ عرض کرتا ہے کہ ہم تین احباب بطوں کے شکار کو گئے مگر ایک پر بھی نہ ملا۔ واپسی میں ایک جوڑا سرخاب کا بیٹھا ہوا دیکھا وہ ہم لوگوں کو دیکھ کر اڑا، گو کہ شکاری

اس پرند کو مارنا پسند نہیں کرتے ہیں لیکن شکار خالی جانے کی وجہ سے ایک جھلاہٹ تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے ایک دوست نے ایک کو گرا لیا۔ یہ چڑیاں حسب عادت بولتی ہوئی چکر کاٹ رہی تھیں کہ ان میں سے ایک الٹتی پلٹتی زمین پر آرہی دوسری کی آواز میں فوراً ایک چوٹ سی پیدا ہوگئی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا درد کے بین کرتی ہے ہم لوگ برابر کئی دن اس کوشش میں رہے کہ اس کو بھی مار لیں مگر ہاتھ نہ آئی۔ حالانکہ اس نے نہ وہ جگہ چھوڑی نہ اس کی آواز سے وہ گداز گیا۔ مجھ کو بعد کو معلوم ہوا کہ میرے دوسرے دوست نے جو اس کے سبب سب سے زیادہ پریشان تھے اس کی مصیبت کا خاتمہ کردیا اور ان کا بیان ہے کہ اس کا سینہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا ؎

عشق زین بسیار کردست و کند

بہت دنوں کے ساتھ سے بھی ہمدردی مبدل بہ محبت ہوجاتی ہے۔ علمائے نفسیات یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمدردی بھی لذت کا جزو ہے اگر یہ صحیح ہے تو کڑی سے کڑی مل گئی اور سلسلہ محبت کا قائم ہوگیا۔ کیونکہ اگر غور کیجیے تو محبت عبارت ہے خواہش نفس اور ہمدردی سے جو نسلاً بعد نسلاً کی عادت سے ہماری طینت ہوگئی ہے۔ لیکن یہ ہمدردی اسی طرح شروع ہوئی ہوگی جس طرح میں نے ثابت کرنا چاہا ہے یعنی وہی خودغرضی کی بنا پر۔ اس قدر اور عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ میرے خیالات نہیں ہیں لیکن یہ بالکل ممکن ہے کہ میں بھی غلطی پر ہوں اور وہ لوگ بھی غلطی پر ہوں جن سے مضامین لے رہا ہوں۔

محبت خلق اللہ کو ایسی راس آئی جیسے کسی کو نیلم کا رنگ راس آتا ہے نہ معلوم کس قدر اقتصادی، معاشرتی، ملکی، جنگی اور مذہبی وغیرہ وغیرہ ضرورتیں اس سے دودھ کے گھونٹ کی طرح آسان ہوگئیں لیکن جس طرح رنگریز پہلے استر کا رنگ دے لیتے ہیں تب دوسرا رنگ چڑھاتے ہیں اسی طرح اس محبت کو جس کام میں جی چاہے لائیے لیکن پہلے مجازی کا رنگ دے دیجیے ورنہ رنگ چوکھا نہ آئے گا۔

یہ تو وہ محبت ہوئی جو تمام بنی نوع انسان میں عام ہے اب ملکی خصوصیات کی وجہ سے ہر قوم کے طریق میں جو اختلاف ہوگیا ہے اس کو لیجیے۔ شادی کے باب میں کچھ ذکر ان

لوگوں کی محبت کا آ گیا ہے جن سے ہم کو واسطہ ہے اس لیے انگریزوں کے انداز محبت کی تھوڑی وضاحت ضروری ہے۔

یورپ میں مشاطہ نہیں، دوست احباب از خود نسبتیں نہیں ٹھیراتے۔ نائی برہمن نہیں جو بر تلاش کر لائیں۔

ہر فرد خواہ مرد ہو خواہ عورت اپنی لڑائی لڑتا ہے اور اپنی زندگی کا سر انجام کرتا ہے۔ وہاں اکثر شادی کے پہلے عشق و محبت کا ٹھاٹھ نہ باندھا جائے تو بڑی خرابیاں پیش آئیں اور انسان جانور ہو کر رہ جائیں۔ حالانکہ ہر شادی میں محبت کی بے اختیاری کا درجہ بہم پہنچنا، نہ ممکن ہے نہ خدا کرے کہ ہر شخص کو محبت کا وہ روگ لگے جس میں شحنۂ عقل کشور دماغ سے شہر بدر کر دیا جائے لیکن یورپ کے نوعمروں کو متذکرۂ بالا مصلحتوں سے یہی سکھایا جاتا ہے کہ جب تک عشق کی بے اختیاری نہ محسوس کرو شادی کرنا ظلم ہے۔ اکثر طلاق وغیرہ کے مقدمات میں دل کی مجبوری کا عذر جو پیش کیا جاتا ہے وہ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے۔

ابھی حال ہی میں پائنیر میں ایک مقدمہ کی روداد چھپی ہے جس میں بیوی ایک شخص پر عاشق ہو کر چلی گئی تھی اور شوہر صاحب سے یہ خواہش کرتی تھی کہ وہ زنا کا مقدمہ اس پر چلا کر طلاق لے لے تاکہ وہ جس کے ساتھ نکل گئی تھی اس کے ساتھ نکاح کر لے۔

شوہر صاحب اس فضیحتے سے گھبراتے تھے اور تھالی کی جھنکار ہر شخص کو سنانا نہیں چاہتے تھے یہاں تک کہ خوش دامن صاحبہ بھی داماد کو سمجھانے آئیں۔ ٹھڈی میں ہاتھ لگا کر (یہ جملہ میرا ہے) فرمانے لگیں کہ بیٹا کیا کرو گے مجبوری ہے، لڑکی دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی ہے اب مناسب یہی ہے کہ اپنی گلو خلاصی اور اس کی بندی آزاد کرو اور اپنی بیوی پر بے وفائی کا دعویٰ کر کے طلاق لے لو۔ اگر یہ نہیں منظور ہے تو تم خود کسی سے عارضی تعلق کر لو تاکہ تمھاری بیوی ہی دعویٰ کر دے۔ شوہر صاحب کی حمیت اس کو بھی نہ گوارا کرتی تھی لیکن یہ حسن اتفاق ہے کہ ایک اسی طرح کی مسماۃ سے ایک ہوٹل میں مڈبھیڑ ہو گئی دونوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہی کیا جو چار دوسرے فریق مقدمہ چاہتے تھے اور سب کے سب آرام سے ہو گئے۔ جیسے ان کے دن پھرے خدا نہ کرے ہندستانیوں کے پھریں۔ دیکھا آپ نے کہ دل کی مجبوری کانٹے کی تول میں ایسی برابر اتری کہ قانون کی پابندی ہر وقت

میں یاد رہی۔ ناظرین یہ مس میو کی کتاب کے جواب میں نہیں عرض کیا گیا ہے بلکہ یہ وہ واقعات ہیں جن پر جج لوگ روز اظہار نفرت کے نوٹ لکھا کرتے ہیں اور جرم کرنے والے خود پریشان ہیں۔

امر حق یہ ہے کہ ہر شخص عشق میں مبتلا نہیں ہوتا اگر ہر شخص مجنوں فرہاد یا لکھنؤ کے فریاد رس الٰہی[1] مرحوم کی طرح کام کاج چھوڑ کر ہجر میں آہ شرر بار ہی کیا کرے تو سودا تشریف لے جائے اور کارخانے بند ہو جائیں، کمپنیوں کے دوالے نکل جائیں۔

قدیم علمائے اخلاق نے محبت کے پانچ درجے قائم کیے ہیں۔ استحسان، مودت، خلت، عشق ولہ اس کے آخری دو درجے بیماری ہیں اور کوئی شک نہیں کہ بیماری ہیں جو سودا یورپ اپنی مجبوریوں سے مول لیتا ہے ہندستان بلاوجہ کاہے کو اپنے سر لے اور عشق کو بھی انھیں لوگوں کے لیے کیوں نہ چھوڑ دے جن میں اس کی صلاحیت ہے جیسے دق وغیرہ میں ہوتا ہے۔

عشق میں جس چیز کی تعریف کی جاتی ہے وہ اس کے قربانی وغیرہ کے مظاہر ہیں ورنہ عشق بجائے خود ایک عارضہ ہے جس میں کلام نہیں۔ رابرٹ برٹن کی قدیم کتاب اناٹمی آف میلینکلی جس کا جواب آج تک انگریزی زبان میں نہیں ہوا اور جس کی تعریف میں ڈاکٹر جانسن کے ایسے نقاد اور دیگر علماء ہمیشہ رطب اللسان رہے ہیں اس مضموں پر موجود ہے۔ متذکرۂ بالا کتاب کا ترجمہ بوجہ لاطینی جملوں کے اس قدر مشکل اور محنت کا کام ہے کہ میں پورے طور سے نہیں کرسکتا۔ اس میں لائق مصنف نے عشق اور ولہ کو بیماری قرار دے کر سیکڑوں قدما کے اقوال نقل کیے ہیں اور وہی معالجہ اور تدابیر تجویز کیے ہیں جو جنوں کے لیے ہیں۔ جلد سوم کے صفحہ 218 میں حسب ذیل عبارت ہے۔

بوعلی سینا نے سات بسیط طریقے اس سخت مرض کے دور کرنے، بدل دینے اور خفیف کرنے کے لکھے ہیں۔ لارن شیس نے دو اصول اصلیہ بتائے ہیں۔ آرنولڈس، وے لی رئیولا، مان ٹالٹس، ہلڈی شیم، لانجینس نے دوسرے دوسرے طریقہ بیان کیے ہیں اور

---

1. یہ ایک اعلیٰ ترین خاندان کے فرد تھے جنھوں نے عمر اسی کوچہ کی خاک چھاننے میں ختم کردی۔ فریادرس آلہی ان کی صدا تھی۔

معالجات لکھے ہیں مگر سب کا منشا وہی ایک ہے۔

اس کے علاوہ دوائیں وغیرہ بھی مندرج ہیں۔ غذا اور پرہیز کی بابت مفصل ہدایتیں موجود ہیں۔ ~~قریب قریب سب لاطینی~~ زبان میں ہیں جن کے نقل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ خیاریں، گل نیلوفر، کاہو اور بہت سی دوائیں جن کا اردو نام معلوم نہیں لکھی ہیں۔ ایک دوا ایگنس کٹس نامی ہے۔

علاج بالمثل میں یہ دوا نامرادی کے لیے نہایت سریع التاثیر ثابت ہوئی ہے ایسے مریضوں کے لیے جو بار بار سوزاک میں مبتلا ہو چکے ہیں اور بقول ڈاکٹر نیشن کے ''پرانے گنہگار'' ہیں بہت مفید ہیں۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر بالمثل علاج میں اس کا یہ اثر ہے تو بالضد علاج میں ضرور سکون پیدا کرے گا۔ یونان قدیم میں ایک تیوہار عورتوں کا ہوتا تھا جس کو تھسموفوریا کہتے تھے اس میں عورتیں مردوں سے نو روز تک جدا رہتی تھیں اور اس زمانہ میں اپنے بچھونوں پر ایک قسم کی پتی بچھاتی تھیں جس کو حینا کہتے تھے۔

ممکن ہے کہ اس لفظ کو عربی حنا سے کچھ تعلق ہو اور اگر ایسا ہے تو ایشیائی ممالک میں جہاں مہندی کا استعمال ہے کیا تعجب ہے کہ اسی غرض سے مروج ہوا ہو کیونکہ مہندی حدت کو کم کرتی ہے اسی اصول پر اگر نیم کی پتی کا مجرد لوگ استعمال کسی نہ کسی طرح رکھیں تو یقیناً مفید ہوگا۔ یہ خیال کرنا کہ آدمی کو نامرد کردیں گی غلط ہے انگریزی دوائیں مثل برومائڈ وغیرہ کے یا ہندستانی دوائیں اسی قبیل کی اگر حکیم ڈاکٹر کی تجویز سے کھائی جائیں تو آدمی کو نامرد نہیں کرتیں بلکہ ایک قسم کا سکون پیدا کردیتی ہیں جو تجرد کی پریشانی کو کم کرتا ہے۔ میرے ناظرین کہتے ہوں گے کہ یہ لکھنے والا سٹھیا گیا ہے جو آج 1928 کی دریافتوں کو چھوڑ کر دقیانوسی کتابیں پیش کرتا ہے اور حضرت نوحؑ کے زمانہ کا معالجہ سکھاتا ہے۔ مجھ کو اعتراف ہے کہ میں نئی روشنی سے جس کا ایک زمانے میں دلدادہ تھا پریشان ہوگیا ہوں خواہ اس کو انحطاط کہیے یا تجربہ کے خوبصورت نام سے تعبیر کیجیے۔

لیکن عقل کا حکم آج بھی وہی ہے جو حضرت نوحؑ کے زمانہ میں تھا اول تو بعض کتابیں ہوتی ہیں جو بڈھی نہیں ہوتیں۔ دوسرے ہم دیکھتے ہیں کہ اگر دخانی اور برقی دریافتوں سے جو اگلے زمانہ میں نہ تھیں قطع نظر کرلی جائے تو دنیا نے کچھ زیادہ ترقی نہیں

کی ہے نہ دنیا کی راحت ہی زیادہ ہوگئی ہے۔ وائے ہے اس ترقی پر جس میں غریبی کی سزا باوجود محنت کے تکلیف ہو اور بے دولتی کلنک کا ٹیکہ لگائے۔ ترقی تو جب کہی جاسکتی تھی جب محنت کا درجہ عمل میں ویسا ہی ممتاز ہوتا جیسا از روئے علم ہے اور بیماری دور کرنے میں بجائے ڈاکٹروں کی آسانی بڑھ جانے کے مریض کے مصائب کم ہوجاتے۔ کلوروفارم ہی کو لیجیے بقول برنارڈشا کے اگلے زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ جب کوئی عمل جراحی کرنا ہوتا تھا تو صرف وہی شخص ہاتھ ڈال سکتا تھا جو فطرتاً اس کام کے لیے موزوں ہوتا تھا، مطب کے طلبا مریض کو ہر طرف سے دبائے رہتے اور وہ استاد جو جراحی کے کمال کو خدا کے یہاں سے ودیعت لایا تھا تیزی سے اپنا کام کرتا تھا۔ مریض کی چیخم دھاڑ رگڑ تگڑ میں ہر شخص جراحی نہیں کرسکتا تھا۔ اب کلوروفارم نے ہر گدھے کو جراح بنا دیا ہے۔ مردہ بدست زندہ۔ جب تک جی چاہے، کاٹو چھانٹو تجربے کرو کتابیں لکھو جو کچھ مریض پر گذرتی ہے وہی جانتا ہے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ کلوروفارم کی خدمات سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس نے حذاقت فن کی مدد نہیں کی۔

ایک ایک شکایت کے لیے ہزار ہزار پیٹینٹ دوائیں ایجاد ہوتی ہیں۔ یہ دوائیں اکثر ایک ہی قدیم اصول پر ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ دولت سمیٹنے کی کوشش میں اگر کوئی شخص پیٹینٹ کے محکمہ والوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوگیا تو دوا ایجاد ہوگئی اور ایک سوداگر نے بہت سے دوا بیچنے والوں کی گاڑھی کمائی میں حصہ لگا لیا۔ آتشک کے لیے پارہ کو لے لیجیے نہ معلوم کب سے یہ دوا دنیا میں رائج ہے۔ آج نو دوا آرسینو بلان سیل ورسان 6-6، 909 اور نہ معلوم کون کون ایجادیں موجود ہیں جو واقعی بیماری کو کم کردیتی ہیں مگر اصل اصول وہی رہا یعنی دو برس پارہ کھانے کی ضرورت پھر بھی باقی رہی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ زمانے نے بانسوں ترقی کی ہے اگر یہ ترقی کہی جائے تو جوں کی چال کی سی ہے۔ پتھری کے آپریشن کے لیے لکھا ہے کہ جو طریقہ اس کے دور کرنے کا نئی ایجاد مانا جاتا ہے یعنی مثانے میں توڑ کر نکالنا وہ صدیوں صدیوں پیشتر رائج تھا اور اس کے آلے تھے جن کی صنعت کی خوبصورتی کا حال پڑھ کر آدمی دنگ رہ جائے۔ یہ خیال کرنا کہ ہر پرانی چیز بیکار اور ازکاررفتہ ہوگئی ہے غلط ہے۔ آیورویدک اور یونانی طریق معالجہ کو لے لیجیے ہر جگہ ہسپتال

موجود ہیں جہاں دوائیں بنی بنائی اور مفت ملتی ہیں ہر طرح آسانیاں اور سہولتیں ہیں لیکن پھر بھی مطب اسی طرح سے بارونق ہیں اور ان کی خیرات اسی طرح جاری ہے اس کے دو وجوہ ہیں جو دونوں میرے خیال کو مضبوط کرتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ پرانے علوم پرانے کپڑے نہیں جو ایک مدت کے بعد کاغذ بنانے کے لیے کارخانہ میں بھیج دیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ باوجود مشکلات کے جو عطار کے یہاں بندھوانے کوٹنے پیسنے چھاننے نیم گرم کردہ شربت افزودہ خاکسی پاشیدہ بنوشانند میں ہیں یا چند رودے اور مکروہج تیار کرنے میں ہیں۔ پھر بھی مقبول عام ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان میں وطنیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اگر غیر ملکی دوا جسم میں پہنچتی ہے تو وہ اپنی زبردست قوت کی وجہ سے گویا جسم کے اخلاط کو زیر کر کے اپنا حکم جاری کر دیتی ہے برخلاف اس کے ہندستانی دوا جسم میں پہنچ کر اخلاط سے اس طرح گھل مل جاتی ہے جیسے برسوں کے بچھڑے ملتے ہیں اور واقعہ بھی یہی ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کاسنی مکو جو ہم استعمال کر رہے ہیں اسی خاک سے پیدا ہوئی ہو جس میں ہمارے آبا و اجداد کی ہڈیوں نے نامیہ کو مدد دی ہے۔ حضرات وطن پرستی اس وجہ سے پسند خاطر نہیں کہ خوبصورت نام ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اس راہ سے بڑھ کر دوسری راہ ترقی کی آسان نہیں ہے۔

راقم الحروف جنسیات پر لکھتے لکھتے نہ معلوم کس میدان میں پہنچ گیا۔ یہ بات بے ارادہ نہیں ہوئی ہے بلکہ لکھنے والے کے خیال میں اس کی ضرورت بھی تھی۔ میرے پڑھنے والے اگر آپ ماشاء اللہ امیر ہیں تو کسی غریب بیچارے نے کبھی آپ کی ضیافت کی ہے؟ اگر آپ خدانخواستہ غریب ہیں تو آپ نے کبھی کسی امیر کی تواضع کی ہے؟ میری کتاب اسی دعوت کا نمونہ ہے۔ رطب و یابس جو کچھ میرے پاس ہے سب اپنے پڑھنے والوں کے سامنے رکھے دیتا ہوں۔ علم کے دولت مندوں کو اس سے فائدہ ہو کہ نہ ہو لیکن فقیر کی نیک نیتی اور خلوص ضرور ثابت ہے۔ جن چیزوں کا یقین مجھ کو ہے وہی دوسروں کے ذہن نشین کروانے کی کوشش کرتا ہوں، کہیں مصنفین کی اسناد پیش کرتا ہوں کہیں تحریر چھوڑ کر تقریر کی بے تکلفی بہم پہنچاتا ہوں گویا آپ سے تنہائی میں مشورہ کرتا ہوں اور اپنے دل کی بات کہہ کر آپ کے دل میں جگہ کرنا چاہتا ہوں۔ بقول میر تقی میرؔ کے پیچ کوئی لڑ واؤں فند کردن، غرض صرف اس قدر کہ پڑھنے والا لکھنے والے کا ہم خیال ہو جائے۔ اگر ہم خیال نہ ہو تو

کم سے کم ان امور پر غور کرے جس کا خیال صرف سطحی طور پر ہوا کیا ہے۔

اس کتاب میں بہت سی انگریزی کتابوں سے مدد لی گئی ہے مگر زیادہ تر مطالب آئیون بلاک جرمن مصنف کی سیکشول لائف آف اور ٹائم سے اخذ کیے گئے ہیں۔

میں نے حتی الامکان بہت احتیاط سے لکھا ہے پھر بھی غلطی بشریت سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی اس لیے امید ہے کہ لغزشیں بہ نظرِ عبرت دیکھی جائیں گی۔

آخر میں ڈاکٹر گوبند پرشاد صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن سے تشریح الاعضا کے باب میں اچھی خاصی مدد ملی۔

یہ کتاب اپنی بدقسمتی اور لکھنے والے کی بدانتظامی سے دو برس پڑی رہ گئی اور نہ معلوم کیا کیا گتیں اس غریب کی ہوگئیں۔ خیر غنیمت ہے کہ کسی نہ کسی طرح چھپ گئی۔

○

"　　ہم ایک ڈرامہ لکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر یہ بیل منڈھے چڑھتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی، اگر ختم بھی ہوا تو مکالمہ بن کر رہ جائے گا ۔ ڈرامہ بڑی چیز ہے "

(ہما بیگم کے نام۔ 29 اکتوبر 1950)

باب اوّل

فصلِ اوّل

قدرت کی حکمت کاملہ کو کہاں تک سراہیئے اور کس کس چیز پر غور کر کے فتبارك الله احسن الخالقین زبان پر جاری کیجیے۔ تخلیق کے اصول کو لیجیے۔ جہاں تک سمجھ میں آتے ہیں قدرت کی اکملیت کی شہادت دیتے ہیں جہاں عقل کام نہیں دیتی وہاں اپنے نقص کا ثبوت مسلم ہو جاتا ہے۔ اہل ارتقاء کہتے ہیں کہ پہلے اختلاف جنس اس طرح سے نہ تھا جیسا کہ آج ہے یعنی بجائے اس کے ایک ہی نوع کے دو جنس ہوں اور وہ آپس میں ایک خاص صورت سے مل کر ایک تیسری چیز اپنے ہی مثل پیدا کریں۔ یہ ہوا کرتا تھا کہ ذی حیات خود ہی بڑھتا تھا اور اپنے سے ایک جزو علیحدہ کر دیتا تھا جو رفتہ رفتہ اسی کے مثل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ آج بھی بہت سی چیزوں میں وہ یہی دکھاتے ہیں۔ اور پودینہ وغیرہ کی مثالیں دے کر کہتے ہیں کہ اس میں نر اور مادہ نہیں ہوتے۔

بہتر قسم کے ذی حیات میں جنس ہونے لگیں کیونکہ قدرت کے حکم کے موافق ہر چیز زیادہ پیچ دار ہو کر اپنے کو تکمیل کے قریب لا رہی ہے اور افتراق جنسی بھی اسی کا نمونہ ہے۔ حیوانی فرد کی زندگی کا تقریباً سب سے پہلا زینہ اس وقت سے مانا جاتا ہے جب مذکر کیڑہ مونث انڈے میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس کی کہانی بہت طولانی اور خارج از بحث ہے مگر اس میں شک نہیں کہ جہاں تک آگے بڑھتے جائیے کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے اور جوڑ کا توڑ بیٹھتا جاتا ہے لیکن اگر شروع کی طرف پلٹ جائیے تو دلائل عقلی قیاسی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

بہر حال ان کا دعویٰ ہے کہ عورت کے ذرات ہوتے ہیں جو انڈے کہے جاسکتے ہیں اور مرد کی منی میں کیڑے ہوتے ہیں یہ چونکہ مشاہدات میں سے ہیں لہٰذا ان سے انکار

نہیں ہوسکتا نہ انکار کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ قدرت نے یہ بھی انتظام کیا ہے کہ یہ کیڑے انڈوں کے اندر پہنچ جائیں۔ انسان کے دل میں خواہش نوع دی ہے اور حظ کا انعام بھی مقرر کیا ہے۔ اگر بجائے ان چیزوں کے بقائے عالم صرف خوف جہنم اور وعدۂ فردا پر ہوتی تو خدا کی خدائی کب کی ختم ہوچکی ہوتی یا صرف ان نیک بندوں کی اولادیں بستی ہوتیں جو حکم خدا کو نہ دوزخ کے خوف سے بجا لاتے ہیں نہ بہشت کی لالچ سے بلکہ قربۃ الی اللہ اور محض قربۃ الی اللہ۔ یہ سل یعنی انڈا اور کیڑا کئی اجزا رکھتا ہے اور نہ معلوم کتنی شکلیں اختیار کرتا ہے اس میں ایک جزو پروٹوپلازم ہوتی ہے جو ایک لسدار مادہ ہے۔ ایک رنگین جال ہوتا ہے اسی کے قریب ایک اور ذرہ ہوتا ہے جو تصویروں میں ایک کرن دار نقطہ کی طرح دکھایا جاتا ہے۔ یہ سل بیسیوں برن بدلتا ہے اور ہفت صد ہفتاد قالب دیکھتا ہوا انسان کی صورت پکڑتا ہے۔ افسوس ان چیزوں کے پلیٹ بغیر صَرفِ کثیر کے پیش نہیں کیے جاسکتے ورنہ باوجود کج مج زبانی کے مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آجاتا۔ ان سل کی تصویروں میں دیکھا جاتا ہے کہ مذکر سل کے اندر سرخ رنگ کا جال ہوتا ہے اور مونث کے اندر اودے رنگ کا ممکن ہے ایک زمانہ میں ان رنگوں کی بھی تخصیصی وجہ سمجھ میں آجائے۔ جس وقت تک مذکر کیڑا انڈے تک نہیں پہنچتا انڈا اپنی جگہ پر ساکن رہتا ہے جس وقت کیڑا پہنچ گیا اسی وقت سے سکون ہیجان سے بدل گیا اور ایک تلاطم برپا ہوتا ہے۔ حکم تخلیق ذرے کو آگے بڑھا کر انڈے تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی گھڑی سے دوڑ دھوپ، فکر معاش، فکر ترقی شروع ہوجاتی ہے۔ اس سے سبق یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ عورت بجائے خود حرکت سے متنفر ہے گویا گھر کی بیٹھنے والی ہے اور مرد حرکت کرنے والا ہے مرد عبارت ہے قواموں سے اور عورت قاعدوں سے۔ جو لوگ مختلف رنگوں سے علاج کرتے ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ دوران خون وغیرہ بڑھانے کے لیے اور اخلاط کو ہیجان میں لانے کے لیے سرخ بوتل کا پانی دیتے ہیں اور اودے رنگ سے سکون و اطمینان حاصل کرنے کا کام لیتے ہیں۔ اسی جگہ سے بقول ایک عالم جید کے ایک اور نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ تمام وہ کوششیں جو دونوں جنسوں کو برابر کرنے کی کی جاتی ہیں۔ خلاف فطرت ہیں۔ اگر دونوں کو ایک کردیجیے تو گویا ایک تیسری جنس پیدا ہوجائے گی جو بجائے خود دونوں کا کام کرے گی۔ حالانکہ یہ ازروئے

ارتقاء رجعت قہقری کہلائے گی جو ترقی کے برخلاف ہے۔

مرد کی منی میں یہ کیڑے پائے جاتے ہیں۔ عورت کی منی ہوتی ہی نہیں نہ اس کو انزال اس طرح ہوتا ہے جس طرح مرد کو، کمال حظ اور اخراج ذرات ذی روح مرد میں ساتھ ساتھ ہیں۔ عورت کے یہ ذرے ایام کے ساتھ یا اکثر قبل آتے ہیں اور کچھ دن زندہ رہ کر مر جاتے ہیں اسی وجہ سے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ فوراً ایام کے بعد استقرار حمل کی زیادہ امید ہوتی ہے اور جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں یہ امید کم ہوتی جاتی ہے۔ حالانکہ ذروں کا آنا اور ایام کا ہونا دو مختلف چیزیں ہیں جو بغیر ایک دوسرے کے بھی موجود ہوسکتے ہیں جو لوگ اولاد کی کثرت سے پریشان ہوجاتے ہیں ان کو بھی یہی صلاح دی جاتی ہے کہ فوراً ایام کے بعد اپنی بی بی سے قربت نہ کرو بلکہ دو ہفتہ کے بعد جاؤ۔ اس وقت بھی لڑکا ہوجانا ممکن ہے اور کبھی کبھی ہو بھی جاتا ہے لیکن نسبتاً اس کا خوف کم رہتا ہے بلاک نے صفحہ 299 میں بہ سند فلیسیٹیو از روئے تجربہ استقرار حمل کا حسب ذیل نقشہ دیا ہے۔

ماہواری کے آخری روز امید استقرار	48 فیصدی ہوتی ہے
پاک ہونے کے بعد پہلے دن	62 فیصدی ہوتی ہے
پاک ہونے کے بعد نویں دن	13 فیصدی ہوتی ہے
پاک ہونے کے بعد گیارہویں دن	9 فیصدی ہوتی ہے
تیئیسویں دن	1 فیصدی ہوتی ہے

حظ کا عزت الکمال عورت میں بھی ہوتا ہے اور کچھ رطوبات خارج بھی ہوتی ہیں لیکن ان میں زندگی کی کوئی نشانی نہیں پائی جاتی بلکہ برعکس اس کے اکثر ہلاکت کا ایک پہلو ہوتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر عورتیں ظاہراً بالکل تندرست ہیں لڑکا نہیں ہوتا ہے اس کے بہت سے وجوہ میں ایک یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اخراج رطوبت ایسی...... عورتوں کو زیادہ ہوتا رہتا ہے اور مجامعت میں جوش کی وجہ سے اور زیادہ ہوجاتا ہے جس میں ایک کھٹاس سی ہوتی ہے جو ذی روح کیڑوں کو مار ڈالتی ہے۔

میرے ایک دوست کے یہاں اولاد نہیں ہوتی تھی اور ظاہراً کوئی وجہ اس کی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ان کو یہ صلاح دی کہ ان کی بی بی قربت کے پہلے اپنا بدن پانی سے اچھی طرح دھول ڈالیں تاکہ جو رطوبت پہلے سے جمع ہو رہی ہے وہ دھل جائے اور صرف اتنی ہی دیر کی رطوبت سے ذی روح ذرات کو مقابلہ کرنا پڑے جو دوران مجامعت میں پیدا ہوں گی۔

اس ترکیب کے علاوہ کچھ اور ہدایتیں بھی تھیں جو میں نے ڈیوس کی کتاب ''موسومہ استقرار حمل بذریعہ آلات'' وغیرہ میں پڑھی تھیں بتائیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سے علاج بھی کرواتے رہے، اب ماشاء اللہ وہ صاحب اولاد ہیں۔

ان تمام امور کو ذہن نشین کروانے کے لیے ضروری ہے کہ اعضا کی ساخت کا اندازہ ہو جائے۔ فطرت کے صنائع سمجھنا ا اور اس کا بیان کرنا کوئی سہل کام نہیں اور جس نے علم تشریح کو بحیثیت ایک طالب علم کے نہ پڑھا ہو اس کے لیے اس کا لکھنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے اس کا سمجھنا کیونکہ اس میں پیچ ہیں۔ اس کے اندر پیچ ہیں اس کے اندر چرخ اس کے اندر کمانی، بہرحال موٹی جھوٹی باتیں آگسٹ فارل کی کتاب ''مسئلہ جنس'' سے اقتباس کر کے لکھے دیتا ہوں۔

O

فصل دوم

مرد کے اعضاء تناسل میں پیشاب کی نالی اور انزال کی نالی از روئے کفایت ایک ہی رکھی گئی ہے اس کے ساتھ خصیے بھی لگے ہیں جو آئندہ نسلوں کا ذخیرہ ہیں اور ایک دوسرا غدود بھی ہے جس کو اپیڈیڈمس کہتے ہیں جو اس میں شامل ہے۔ موخرالذکر اعضاء...... کے اندر لکھوکھا ذی روح کیڑے بھرے ہیں جن میں نہ معلوم کس کی قسمت میں دختر مہ پارہ ہونا ہے اور کس کی قسمت میں جوان صف شکن بہت سے ایسے بھی ہوں گے جو میلے رومال میں چمٹ کر گویا پیدا ہونے سے پہلے ہی داعی اجل کو لبیک کہیں گے یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں ایک ایسا ہو جو ان مشکل مسائل کے سمجھانے کی کوشش کرے اور ایک ایسا بھی ہو جو باوجود دماغ پر زور دینے کے نہ سمجھ سکے مگر اس میں کلام نہیں کہ:

اے قطرۂ منی سر بیچارگی بنہ
کا بلیس را غرور منی شرمسار کرد

یہ کیڑے فرداً فرداً دوسرے کیڑے حسب قاعدہ تقسیم پیدا کرتے ہیں اور غدود کی نالی کی تہہ میں جو دو تھیلیوں میں خالی ہوتی ہے ایک لعاب میں تیرا کرتے ہیں جس کا مجموعی نام منی ہے۔ اس کی خاص بو ہوتی ہے یہ غدود یا کیسے پیڑو کی ساخت میں مثانے کے نیچے ہوتے ہیں اور ہر ایک میں نالی ہوتی ہے جو ذکر کے سوراخ کی جڑ میں جا کر مل جاتی ہے۔ اعضائے تناسل میں اور بہت سے غدود ہیں جو رستے رہتے ہیں اور خالص منی یہاں پہنچ کر ان رطوبتوں کو بھی لے لیتی ہے۔ جس مقام پر یہ دونوں سوراخ ذکر میں ملتے ہیں وہاں ایک ابھار سا ہوتا ہے اسی مقام سے وہ سوراخ پیڑو کے حدود سے آگے بڑھ کر ذکر کی ساخت میں آجاتا ہے جو مجامعت کا جزو متحرک ہے۔

معمولاً اس سوراخ سے پیشاب ہوتا ہے اور انزال کا بھی یہی راستہ ہے اس کے آگے حشفہ ہی سب سے اچھنبے کا معاملہ اس کی کرختگی اور سطبری کا سامان ہے۔ یہ ایک

خاص اعصابی اشارے پر اس کا فربہ ہو جانا طویل ہو جانا اور سخت پڑ جانا خالی از کمال صناعی نہیں۔ یہ صورت ذکر کے تین حصوں کے افعال سے ہوتی ہے جن کو جوف دار یا گڈھے دار اجسام کہتے ہیں ایک ان میں سے نیچے کی جانب ہوتا ہے جو دو ٹکڑوں سے مل کر بنتا ہے اور سوراخ کو گھیرے رہتا ہے یہاں تک کہ حشفہ تک پہنچ جائے۔ دوسرے دو اجسام ذکر کے ادھر ادھر قائم ہیں۔ یہ.......... سب کے سب جوف دار ہوتے ہیں جن میں خون کو جمع رکھنے کی قابلیت موجود ہے۔

یہ اجسام معمولاً خون سے خالی رہتے ہیں۔ ایک پیچ در پیچ قانون قدرت کے رو سے (جس کا عمل اجسام کو خون سے خالی کر دینا اور پھر پُر کر دینا ہے جس کو شریانی ضابطہ کہہ سکتے ہیں) اعصابی چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے نعوذ کے وقت خون سے بھر جاتے ہیں۔ اب یہ عضو اپنے کار مخصوص کے لیے تیار ہو جاتا ہے اسی کے ساتھ ان غدود کے پُر ہو جانے کی وجہ سے مثانے کا راستہ یعنی پیشاب کا منفذ بند ہو جاتا ہے اور منی کی نالیاں سوراخ ذکر میں کھل جاتی ہیں کیونکہ اس کے بعد بار بار کی رگڑ سے ایک پٹھے میں تشنجی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو منی کے کیسوں کو دباتی ہے اور اس سے منی ذکر کے جوف سے نہایت تیزی سے نکل کر رحم یا مضافات رحم تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ایک تذکرہ ہے جس سے اگر کوئی چاہے تو ثواب کا راستہ ڈھونڈھ سکتا ہے اور اگر چاہے تو عذاب کی بے راہ روی اختیار کر سکتا ہے۔ یہ صورت کئی طرح ظہور میں آتی ہے۔ ایک تو دماغی حرکت سے دوسرے دل کی خواہش سے یہ دوسری صورت بھی دماغی افعال پر موقوف ہوگی۔ تیسری صورت خود اعضاء کے دبنے یا صرف مس ہونے سے ہوتی ہے اور یہ آخری کیفیت اکثر اوقات صحیح خواہش پر دلیل نہیں ہوتی۔

○

فصل سوم

عورت کے مقام توالد و تناسل میں پیشاب کا مقام حیض اور مجامعت کے مقام سے علیحدہ ہوتا ہے۔ پیشاب کا راستہ...... طول میں بہت کم ہوتا ہے لیکن عریض ہوتا ہے اس کا تعلق حسب قاعدہ عام مثانہ سے ہوتا ہے۔ اسی سوراخ کے اوپر ایک عضو ہوتا ہے جو مرد کے ذکر سے بہت سی باتوں سے ملتا جلتا ہے اور حکما کا خیال ہے کہ یہی چیز ہے جو مرد میں ترقی کر کے ذکر کہلایا چونکہ عورت میں دوسرے اعضاء زیادہ تقویت پا گئے اس لیے جنسیت قائم ہوتے وقت یہ چھوٹا رہ گیا۔

ذکر کے حشفہ کی طرح سے یہ بھی بہت ذی حس ہوتا ہے اس کو عوام کی زبان میں نکوا کہتے ہیں۔ نکوے کے برابر ادھر ادھر دو کواڑ سے ہوتے ہیں جو فرج کے لب کہلاتے ہیں۔ ان کے اندر ایک اور جوڑی ہوتی ہے جو چھوٹے لب کہلاتے ہیں۔ ان کے بعد وہ راستہ ہوتا ہے جو رحم کی گردن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس تنگ نائے سے گذر کر رحم کی فضا ہے جس کے دوسرے جانب سے دو نالیاں کھلی ہیں جن کی راہ سے عورت کے انڈے رحم تک آتے ہیں۔ یہ انڈے دو غدود سے پیدا ہوتے ہیں جو رحم کے دونوں جانب اوپر کی طرف کچھ فاصلہ پر ہوتے ہیں۔ ان اعضاء کی تشریح بہت طولانی ہے اور ایک عالم علم تشریح اس کو بہت شرح و بست کے ساتھ صفحوں میں لکھتا ہے لیکن میں نہیں لکھ سکتا جس چیز کو آپ خود نہیں سمجھتے اس کو کیا سمجھائے گا یہ علم دریاؤ ہے۔

کنواریوں کے پردۂ بکارت ہوتا ہے یہ ایک لطیف جھلی ہلالی قطع کی رحم سے آگے ہوتی ہے۔ پہلی مجامعت میں معمولاً ضائع ہوجاتی ہے۔ کمسن لڑکیوں میں یہ اتنی کمزور نہیں ہوتی جتنی زیادہ سن والی لڑکیوں میں اور یہ بھی سنا گیا ہے کہ کبھی کبھی یہ بجائے پھٹ جانے کے دیواروں سے چمٹ کر ذکر کو راستہ دے دیتی ہے اور پھر وضع حمل کے وقت ضائع ہوتی

ہے۔ بعض عورتوں میں یہ اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ بغیر نشتر کی مدد کے علیحدہ نہیں ہوتی۔ راقم سے ایک لیڈی ڈاکٹر نے بیان کیا کہ میں ابھی ابھی ایک آپریشن اسی طرح کا کیے ہوئے آرہی ہوں۔ یہ مریضہ اپنے شوہر کے کام ہی کی نہ تھی۔ ایسی حالت میں جہلا یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ عورت پوری طرح سے عورت ہی نہیں ہے۔ اکثر عورتوں کے یہ پردہ اس قدر نازک ہوتا ہے کہ اونچے مقام سے نیچے اترنے میں یا کسی اور طرح سے ضائع ہوجاتا ہے جن لوگوں کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے ان کو خیال رکھنا چاہیے کہ صرف پردۂ بکارت کا نہ ہونا بے عصمتی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ مگر ڈاکٹر لائن اور ڈاکٹر واڈیل جن کے میڈیکل جورر سپروڈینس ہندستان میں رائج ہے کہتے ہیں کہ پردہ بکارت بغیر مجامعت کے نہیں ضائع ہوتا ہے لیکن بہت سی رائیں اس کے خلاف بھی ہیں بعض مقامات پر ایک نہایت ہی بے ہودہ رواج چادر کا معائنہ کرنے کا ہے اور جب خون نہیں ہوتا ہے تو کھلائی یا جو عورت ساتھ ہوتی ہے وہ مختلف جعل فریب اس معاملہ میں کرتی ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوان کو چاہیے کہ اس قابل نفرت رسم کو مٹانے میں حصہ لیں اور جب ان کی شادی ہو تو خلوت کے راز کو معلوم عوام نہ ہونے دیں۔ آگے چل کر انشاء اللہ رنڈیوں کے باب میں بہت کچھ لکھوں گا اس جگہ پردۂ بکارت کے بارے میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ان بدقسمتوں کے یہاں لڑکیوں کو وقت سے بہت پیشتر پیشہ میں جھونک دیتے ہیں تاکہ پردۂ بکارت زیادہ تکلیف سے پھٹنے اور منھ کالا کرنے والے کو اس بدبخت کے باکرہ ہونے کا یقین ہوجائے اور پوری قیمت وصول ہوجائے اور روٹی کمانے کی راہ کھل جائے۔ ایسے لوگوں کو نصیحت کرنا فضول ہے لیکن تاسف ضرور ہے کہ کاش اس سیہ کاری کی ہزاروں برائیوں میں ایک یہی نہ ہوتی۔

عورتوں میں ایک نہایت اہم چیز حیض ہے۔ ہر چوتھے ہفتہ جوان عورت کو چار یا پانچ دن خون آتا ہے بعض عورتوں میں کمی یا بیشی بھی ہوجاتی ہے جو نرم جھلی رحم کی سطح کو گھیرے رہتی ہے اس میں خون کے کیسوں کی بہت کثرت ہوتی ہے۔

بعض اعصابی خواص کی وجہ سے ان میں خون کی اور زیادتی ہوجاتی ہے اور چونکہ یہ جھلی نہایت لطیف ہے اس میں سے چھن کر یہ خون جاری ہوجاتا ہے اس کا ظاہری فائدہ یہ

معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیا مہمان جو عنقریب آنے والا ہے آرام سے اس جھلی سے چمٹ جائے۔ یہ نیا مہمان وہی انڈا ہے جس میں مرد کا کیڑا گھس کر بیٹھ گیا ہے۔ یہ انڈے ہر مہینہ میں ایک یا دو کبھی کبھی تین تک تیار ہوکر قازف نالیوں میں سے رحم میں آتے ہیں۔ ان کا ملاپ جب ہونے والا ہوتا ہے تو اکثر قازف نالیوں ہی میں ہوجاتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رحم میں آکر ملاقات ہوتی ہے جس وقت یہ مردوں والا انڈا رحم کی جھلی سے چمٹ گیا اس وقت سے ایام بند ہوگئے۔ اب یہی خون بچہ کی پرورش میں صرف ہوگا پھر دودھ بن کر بچہ کی غذا ہوگا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عام خیال کے موافق ایام کا ہونا بچہ رہنے کے لیے لازم نہیں ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ اکثر ایام نہیں ہوتے مگر یہ انڈے حسب معمول موجود ہوتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ عورت بال بچوں والی بھی ہوتی ہے۔ گوکہ ایسا کم تر دیکھا جاتا ہے۔ عموماً یہی ہوتا ہے کہ ایام پہلے ہوگئے اس کے بعد انڈے قازف نالیوں میں سے آئے۔ جب انڈے پیدا ہوتے ہیں تو وہ بیرونی عضو جس کو نکوا کہتے ہیں نسبتاً سخت ہوجاتا ہے۔ گویا عورت کے گرم ہونے کی فصل آگئی جس طرح جانوروں میں سال میں ایک مرتبہ یہ فصل آتی ہے۔ اسی طرح انسان میں بارہ مرتبہ یہی واقعہ ہوتا ہے جب ایام پہلے پہل شروع ہوتے ہیں تو تھوڑے زمانہ تک بے قاعدہ ہوتے ہیں اور اس کے بعد ہر عورت کے مزاج کے موافق ایک قاعدہ مضبوط ہوجاتا ہے عموماً تیرہ چودہ پندرہ برس کے سن سے یہ بات شروع ہوتی ہے اور پینتالیس سے پچپن برس کے اندر ایام کا زمانہ ختم ہوجاتا ہے اور پھر عورت بارور نہیں ہوتی گویا پھول اپنی خوشبو کا خزانہ لٹا چکے اور کمھلانے کا زمانہ آگیا۔ ایام سرد ممالک میں بہ نسبت گرم ممالک کے دیر میں ہوتے ہیں۔ اس جگہ ایک امر اور عرض کردوں جو خالی از تعجب نہیں مردوں میں بھی ایک حالت ایام کی سی ہوتی ہے فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ برخلاف عورتوں کے مردوں کا یہ زمانہ سکون اور جنسی خواہشات سے بے پروائی کا ہوتا ہے اور چونکہ خون وغیرہ جاری نہیں ہوتا اس لیے لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا تجربہ ہے کہ بعض مردوں کو کبھی کبھی تھوڑے دنوں کے لیے جنسی باتوں کی خواہش کم ہوجاتی ہے۔ یہی زمانہ مردوں کے حیض کا کہلاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

O

فصل چہارم

خداوند تعالیٰ کے دینے کے ہزار ہاتھ ہیں اور فطرت کے اپنا حکم جاری و ساری کرنے کے ہزار طریقے ہیں۔ خواہش نوع اور انعام حظ کا ذکر اوپر آچکا ہے اس کے علاوہ اور بھی ذرائع ہیں جن سے فطرت اپنا نظم ونسق قائم رکھتی ہے۔ حواس خمسہ ظاہری علاوہ اور کاموں کے توالد و تناسل میں بھی بہت بڑا حصہ لیتے ہیں۔ آنکھ کی خدمات شاعروں نے اس قدر بیان کردی ہیں کہ وہ اب میری تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔

مَس کے اثرات ''جو کم و بیش تقریباً تمام جسم میں موجود ہیں'' بھی ظاہر ہیں۔ آٹو وائینگر ایک جرمن مصنف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شہوت مرد کے تمام اعضا میں اس طرح نہیں ہے جس طرح عورت کے۔ یہ جو واقعہ بھی ہو اس سے گریز نہیں کہ مرد کو بھی اس میں اچھا خاصہ حصہ ملا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ چھونے سے تمام جسم میں ایک برقی قوت سی دوڑ جاتی ہے اور فطرت کا کوڑا اپنا کام کرتا ہے اسی طرح کان سے ایک تار مرکز تناسل کو لگا ہے انسان کا گانا، چڑیوں کا چہچہانا سب اسی غرض سے ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ موسیقی کا صرف یہی کام ہے بلکہ عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ آواز بھی اس قوت کو مخاطب کرتی ہے اور موسیقی عبارت ہے آواز پر پورا قبضہ حاصل کرکے اس سے بہترین کام لینے سے۔ جنسیات میں شامہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ نباتات سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی جن میں خوشبو اسی غرض سے ہوتی ہے جانور بھی اس سے خالی نہیں جن میں بچہ دینے کی فصل میں بو اور زیادہ ہوجاتی ہے اور سونگھنے سے ان کو جو مدد ملتی ہے وہ ہر شخص کے مشاہدے میں ہے۔ بکرے یا دوسرے جانور اس عمل کی تصدیق کرتے ہیں۔ مشکی ہرن ایک لطیف مثال ہے۔

اہل ارتقاء کا خیال ہے کہ انسان کے تمام جسم پر بال تھے اور حسب رائے مختلف حکماء مختلف وجوہ سے اب صرف خصوصیت کے ساتھ جسم کے چند حصوں میں رہ گئے ہیں۔ اسی

وجہ سے انسان کے جسم سے بو بھی کم ہوگئی ہے لیکن اب بھی کچھ باقی ہے اور انسان اسی قدرتِ ارت کے موافق لمبی سانس لے کر شامہ کے ذریعہ سے اپنی مخصوص قوتوں کو تقویت دیتا ہے۔ امریکہ کے ایک مشہور ڈاکٹر جے ڈیوس نے اپنی تصنیف میں ذکر کیا ہے کہ قلت شہوت کا باعث اکثر چھوٹے نتھنے اور قوت شامہ کی کمزوری ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا عمل جراحی بھی ہوتا ہے جو فائدہ بخش سمجھا جاتا ہے۔ مرکز فراخ ہوتا ہے اور خوشبو زیادہ آتی ہے اور جب خوشبو زیادہ آتی ہے تو عضو خاص میں خون کی زیادتی ہوتی ہے جو اس کے حجم کو لازمی زیادہ کرے گی۔ عورت کے اندام نہانی پر جو بال ہیں ان کی بابت حکماء کا یہ خیال ہے کہ علاوہ حفاظت کے اغراض کی ان سے ایک غرض یہ بھی پوری ہوتی ہے کہ وہ خوشبو کو روکے رکھتے ہیں اور تتلی کے پروں کی طرح جس میں اسی غرض سے خوشبو کے ذرات دیے گئے ہیں مذکر کی قوت شامہ کی خدمتی ہیں جسم کی بو کے بارے میں اس ملک میں بھی یہ خیال ہے اور اکثر لوگ دوسروں کے پہنے ہوئے کپڑے سونگھ کر دل کی تپش کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔

آتش مرحوم لکھتے ہیں ؎

میری طرف سے صبا کہو میرے یوسف سے نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری

انسان میں بغل کے نیچے بھی بال ہوتے ہیں لوگوں کا خیال ہے کہ ان سے بھی وہی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ فرانس کی پیشہ ور عورتیں دوران مباشرت میں خاص طریقہ اختیار کر کے بغل کی بو سے اپنے گاہکوں کو خوش کرتی ہیں۔ عطریات کے رواج کی بھی یہی وجہ ہے۔ اکثر چیزیں مثل مشک اور عنبر وغیرہ وغیرہ کے اپنی اصلیت کی وجہ سے شہوت انگیزی کا خاصہ رکھتی ہیں۔ نباتات میں بھی یہ وصف موجود ہے چند مخصوص خوشبوئیں جو دلہن استعمال کرتی ہے خاص ایسے ہی اجزاء سے مرکب ہوتی ہیں۔ یورپ میں بھی ایسی مرکب خوشبوؤں کا استعمال ہوتا ہے اور مختلف طبقے کے لوگ مختلف طرح کی خصوصیات کے عطریات استعمال کرتے ہیں یعنی جیسی خوشبوئیں رنڈیاں استعمال کرتی ہیں وہ شریف زادیاں یا مُسن عورتوں کے رومال اور پنڈوں میں مشکل سے پایئے گا۔

ایک وجہ بالوں کے کم ہونے کی یہ بھی بیان کی جاتی ہے جو قرین قیاس بھی ہے کہ انسان اور حیوان میں دماغ کا فرق ہوجانے کی وجہ سے فطرت کو ہر چیز میں کفایت شعاری کرنی پڑی تاکہ اقتصاد بگڑنے نہ پائے اور جہاں سے انسان کی دم غائب ہوگئی دودھ پلانے کی خدمت صرف عورتوں کے پاس رہ گئی۔ کان وغیرہ چھوٹے ہوگئے۔ وہاں سے بالوں کی کثرت بھی معرض تخفیف میں آگئی۔ بالوں کے کم ہونے سے صاف بات ہے کہ حِس کو ترقی ہوئی۔ مضامین کی کثرت لکھنے والے میں قوت تحریر کی قلت اور اسی وجہ سے پڑھنے والوں میں ضبط وتحمل کی بھی قلت مانع ہے ورنہ اگر صرف اسی موضوع پر صرف چند کتابوں سے پورا پورا اقتباس کیا جائے تو کتاب دگنی ہوکر یہیں ختم ہوجائے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ بالوں کی صفائی سے جلد نکل آئی اور حِس کو وسعت ملی یوں تو حِس ہر مقام پر ہے لیکن چند اعضا بالخصوص ذی حِس واقع ہوئے ہیں۔ اعضا تناسل کی ساخت ظاہر کرتی ہے کہ ان میں حِس زیادہ ہے ان کے علاوہ انگلیاں ہیں، لب ہیں جن کا ملنا دل کی کلی کھلاتا ہے۔ سوا ان کے چند وہ اعضاء ہیں جو اعضائے تناسل ثانیہ سے تعبیر کیے جاسکتے ہیں۔ عورتوں کی چھاتیاں اور ایک حد تک مردوں کی بھی چھاتیاں عنفوان میں مرد کے غدود سینہ بھی بھر جاتے ہیں اور دبانے سے درد ہوتا ہے گویا یہ پرانی یاد ہے جو تازہ ہوجاتی ہے۔ جب ہم آپ بھی سلامتی سے بچوں کو دودھ پلاتے تھے۔ بہرحال حس کے اوپر مجھ کو زیادہ لکھنا نہیں ہے اور بوسے کی یاد دلاکر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

بوسہ کچھ انسان کی خصوصیت نہیں جانور بھی اس مزے سے واقف ہیں لیکن دماغ نہ ہونے کی وجہ سے ان کا بوسہ صرف بوسہ ہے لیکن انسان میں یہی بوسہ عجب چیز ہوگیا ہے اور نہ معلوم کیا کیفیتیں اس میں سما گئی ہیں۔ بوسہ محبت اور پیار کا سب سے بڑا گواہ ہے اور محبت اور پیار کے ضمن میں شوپنہور کیا خوب فرماتا ہے کہ ''جذبہ شہوت انسان میں آکر محبت اور پیار کے خلعت سے معزز ہوا اور ارادہ کے اوپر عقل کی فتح مندی کا سب سے بڑا ثبوت ہاتھ آیا'' جو فرق انسانی اور حیوانی اتحاد میں ہے وہ زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ جانوروں میں مجامعت کے بعد صرف ایک خفیف سا تعلق رہ جاتا ہے جو بچوں کے پروان چڑھتے چڑھتے غائب ہوجاتا ہے یا بچہ دینے کی فصل ہی کے ساتھ رخصت ہوجاتا ہے۔ اعلیٰ ترین

جانوروں میں البتہ دیکھا گیا ہے کہ یہ تعلق خانہ داری کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ چنانچہ بعض قسم کے بندروں میں دیکھا گیا ہے کہ ان کے مسکنوں میں مختلف جھول کے بچے بھی بڈھی بڈھے کے ساتھ رہتے ہیں اور گھر کا مالک ایک طرح کی حکومت بھی رکھتا ہے اس کے جو وجوہ ہوں مگر یہ عقلیت نہیں کہی جاسکتی۔ برخلاف اس کے ہمارے یہاں یہی چیز ایک شیرازہ بند نعمت ہوگئی ہے جس سے انسان انسان کہلانے کے قابل ہوا اور عشق مجازی کا زینہ طے کر کے عشق حقیقی تک پہنچا۔ جیسا کہ دیباچہ میں عرض کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے لکھنے کی غرض یہی ہے کہ آوارہ مزاج اشخاص کی زندگی کچھ بہتر ہوجائے اور مستقل مزاج اشخاص کا استقلال زیادہ ہوجائے۔ بار الٰہا میری زبان میں اثر دے اور میری دعا کو باب اجابت پر بار دے حیف ہے کہ انسان باوجود نعمت عقل کے جانور سے بھی بدتر ہوجائے۔ کیونکہ جانور باوجود فقدان عقل کے سوزاک آتشک جریان نامردی میں گناہ کی راہ سے مبتلا نہیں ہوتے۔

○

فصل پنجم

خواہش اتحاد کے اصول ثانیہ میں شرم بھی ہے اس کی بابت لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قدرتی چیز نہیں ہے بلکہ تہذیب کے ساتھ دنیا میں آئی ہے۔ جارج سمیل کا قول ہے کہ شرم ایک کوشش ہے جس سے انسان اپنی فردیت کو ممتاز کرنا چاہتا ہے۔

ہولاک ایلس کا خیال ہے کہ اس کی شروع عورت سے ہوئی اور پہلی غرض اس کی یہ تھی کہ مادہ اپنے اعضاء تناسل کی حفاظت ناوقت حملوں سے کر سکے۔

اگر ہولاک ایلس کا یہ قول صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ شرم اگر قدرتی نہیں تو اس کے لگ بھگ تو ضرور ہے۔ واقعہ جو ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ شرم ایک عمدہ چیز ہے جس سے احتراز اور اتحاد دونوں کے فائدے نکلتے ہیں اور کسی چیز کی عمدگی کی سب سے بڑی یہ دلیل ہے کہ وہ چیز ہر دو پہلو سے فائدہ رساں ہو جیسے بچہ کا دودھ پینا ہے جو ایک ہی وقت میں ماں اور بچے کو آرام بھی دیتا ہے اور ان کی تکلیف بھی دور کرتا ہے۔ شرم کے نفیس جذبہ کی وجہ سے نہ صرف عورت اپنے مقامات مخصوصہ کی حفاظت ہی کر لیتی ہے بلکہ اس حرکت سے مرد کی رغبت کو بھی بڑھاتی ہے اور دونوں کے لیے ایک طرح کارآمد ہے۔

لامبر سو، ے عالم کا قول ہے کہ شرم کی وجہ علاوہ حفاظت کے ایک اور بھی پہلو رکھتی ہے وہ یہ کہ بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں جب عورت کے مخصوص اعضاء ایک نفرت پیدا کرتے ہیں۔ ان اوقات پر ان کو چھپائے رکھنا ضروری ہے اور شرم اس کام بھی آتی ہے جو لوگ شرم کو قدرتی نہیں مانتے وہ مثال میں تمام وحشی اقوام کو پیش کرتے ہیں جو کپڑا نہیں پہنتے اور اعضاء تناسل کو نہیں چھپاتے جنوبی امریکہ کیوں جایئے خود ہندستان میں ایسی قومیں مثل ناگا وغیرہ کے موجود ہیں جو کچھ قومیں ایسی ہیں جو اپنے اعضاء تناسل کو ہمیشہ کھلا رہنے دیتی ہیں۔ علاوہ ان زمانوں کے جب ان کے خیال میں دوسری جنس سے تعلق کرنے کی فصل ہوتی ہے اور اس وقت وہ ان کو خوبصورتی کے ساتھ کپڑا پہناتے ہیں تا کہ دوسرے

جنس کی نظر میں کھب جائیں اور ان کا خیال اس طرف منتقل ہو جائے۔

بارنارڈ شا کا قول ہے کہ ایسے ننگی بت جن پر حسب سنت آدم ایک انجیر کی پتی شرم گاہ کو چھپائے رہتی ہے کہیں زیادہ شہوت انگیز ہیں بہ نسبت ان بتوں کے جن میں یہ اوچھاپن نہیں ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں کو ننگا دیکھ کر وہ خیالات نہیں آتے جو کسی ایسے کو دیکھ کر آتے ہیں جو اعضائے تناسل اولیہ یا اعضاء تناسل ثانیہ کو چھپانے کے لیے آپ کی آنکھوں کے سامنے خاص اہتمام کرتا ہے۔ کپڑوں کی ایجاد موسمی تکالیف سے بچنے کے لیے بھی کی گئی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس میں اور بہت سے اغراض شامل ہوگئے۔ عورتوں کے کپڑے تقریباً ہر ملک میں ایسے ہوگئے ہیں جن سے جنسی فوائد حاصل ہوں۔ اِسکرٹس جس سے انگریزنوں کی کمر اس قدر پتلی معلوم ہوتی تھی، عیسائی خانقاہ نشینوں کی ایجاد ہے جو بطور سینہ بند کے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ عورتوں کے سینہ کا ابھار کم معلوم ہو۔ اگر یہ ایک دلیل شرم کی مانی جائے تو جو نتیجہ کارسٹ کا آخر کو ہوا وہ حیاپروری سے کوسوں دور ہے۔ یعنی یہ سینہ سے کھسک کر ناف پر آگیا جس سے نہ صرف سینہ کا ابھار ظاہر ہوگیا بلکہ کمر کولے کا چڑھاؤ اتار گات کی گولائی طبیعت کو گدگدانے لگی۔ یہ وہ نتیجہ ہے جو سَتر کے پردے میں ملبوس کا بعض ممالک میں ہوا۔ لکھنؤ میں بھی نصیرالدین حیدر بہادر کے وقت سے زنانے کپڑوں میں ایسی ترمیمیں ہوئیں جو حیاکوشی سے دور جا پڑی تھیں، پائنچے یورپ کی عورتوں کے تتبع میں بڑے کیے گئے۔ پیڑو اور کمر کے پاس تنگی اس قدر زیادہ کی گئی کہ پہننے والیوں کی جان ضیق میں آگئی مگر واہ رے خواہش دلآویزی یہ سب قبول ہوا۔

ایک جرمن صاحب سی ایچ اسٹراز نامی عورتوں کے ملبوس پر ایک کتاب لکھتے ہیں جس میں فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کپڑے اس غرض سے پہننے کا حکم دیا تھا کہ جنسی چیزوں کی خواہش ان کی امت میں زیادہ ہو اور اس طرح آبادی ترقی کرے جس کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد افسوس کرتے ہیں کہ قانون رہ گیا اور شارع علیہ السلام قانون کی اصلی غرض بتانے کے لیے نہ رہ گئے اور عیسائیوں نے نادانی سے عریانی کو گناہ قرار دے لیا۔

آٹو وائننگر جس نے 21 برس کے سِن میں ایک کتاب لکھی جو کارنامہ ہے (سیکس

اینڈ کیریکٹر) اور 23 برس کے سن میں خودکشی کر کے اپنے وطن چلا گیا۔ عورتوں کی حیا کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس صنف کو حیاء و شرم کی ہوا نہیں لگی ہے جو کچھ ہوتا ہے کسی غرض سے ہوتا ہے اور وہ غرض دوسری جنس کے شکار کرنے کی ہوتی ہے۔ اس کا اعتراض ہے کہ اگر عورتوں میں شرم واقعی کوئی چیز ہے تو پھر یہ کیونکر ممکن ہوا کہ اگر آج تک آدمی گردن تک کپڑا پہننے کا فیشن تھا تو عورت کا اگر سب سے اوپر کا تکمہ کھل گیا تو وہ عرق حیا میں غرق ہوگئی اور کل اگر فیشن نے حکم دیا کہ بند قبا وا کردو تو آدھا سینہ کھل جانے پر بھی آنکھ نیچی نہ ہوئی۔ مصنف آنجہانی کے فیصلے عورتوں کے معاملہ میں ایسے دوٹوک نہیں ہوتے جن میں دونوں پہلوؤں کا خیال برابر ہو لیکن اگر غور کیجیے تو اس کا قول بالکل پا در ہوا نہیں ہے۔ جس قدر فیشن یورپ میں بدلتے ہیں اس قدر ایشیا میں نہیں بدلتے مگر پھر بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی بدلتے ہیں تو عورتیں ان کو قبول کرلیتی ہیں اور تیوروں پر میل نہیں آتا۔ پرانے زمانہ کی چادریں اگر نہ رہیں تو مہین ململ کا دوپٹہ اسی آن سے اوڑھا گیا اگر کیچلی کے کرتے نکلے تو اس کی پرواہ نہ کی گئی کہ محرم جھلکے گی ڈھیلے پائجامے جو اکثر مغل اسکولوں کی تصویروں میں دیکھے جاتے ہیں چلے گئے اور نئی تراش کے گھٹنے آگئے جن کی دلآویزی محتاج بیان نہیں۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر دیکھا گیا ہے کہ عورتیں دولھا دلہن کی آرام و آسائش کے وہ سامان کرتی ہیں جو مرد کرتا ہوا شرماتا ہے اور وہ خود اپنے لیے بھی دوسروں کے سامنے ہرگز نہ کرتیں۔ اگر خود اپنے لیے نہ کرتا بر بنائے حیاداری ہوتا تو دوسروں کے واسطے بھی نہ کرسکتیں

بلاک اور نیز دوسرے علماء کے خیال کے موافق کپڑوں میں ترمیمیں اور فیشن کی شروع رنڈیوں سے ہوتی ہے۔ ہندستان میں بھی دیکھا گیا ہے کہ عورتوں کا وہ گروہ جن کا پیشہ مرد کو لبھانا ہے کپڑوں میں دوسری عورتوں سے زیادہ ترمیمیں کیا کرتی ہیں اور شریف زادیاں بھی ایک زمانے کے بعد قبول کرلیتی ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو جس چیز کی بنا بے حیائی پر معلوم ہوتی ہے وہ حیا کی دلیل کیونکر ہوسکتی ہے۔ ایک امر ایسا مسلم ہے جس پر بہت کم اختلاف ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت میں جنسیت مرد سے کہیں زیادہ ہے۔ مرد لڑتا ہے

سوداگری کرتا ہے، فتح کرتا ہے اور ہار جاتا ہے لیکن عورت صرف مرد کے اوپر قربانی کرتی ہے اور اگر کوئی بدبخت نہیں کرسکتی ہے تو وہ زیب النساء کی طرح روتی ہے ۔

بشکند دستے کہ خم در گردن یارے نشد   کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بفرقے جا گرفت   غنچۂ باغ دلِ ما زیب دستارے نشد

لارڈ بائرن مرحوم ڈان جوان میں کہتے ہیں ''مرد کی محبت مرد کی زندگی کا صرف ایک پہلو ہے لیکن عورت کی پوری زندگانی کا مدار ہے۔

اس خیال کے بعد مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ عورت میں نہ شرم ہے نہ بے شرمی اس کی غرض جن چیزوں سے پوری ہو وہی اس کو پسند ہیں۔ آپ کا دل چاہے ان کو شرم کے نام سے تعبیر کیجیے خواہ بے شرمی کہیے۔

ایک امر البتہ ایسا ہے جس میں اکثر مصنفین صنف نازک کو مرد سے بہتر بتاتے ہیں وہ یہ کہ دوسری جنس کو عریاں دیکھ کر اس کو نفرت ہی ہوتی ہے۔ اکثر بیہودہ مرد یہ خیال کرتے ہیں کہ جس طرح وہ عورت کا ستر اتفاقیہ دیکھ کر مشتعل ہوجاتے ہیں عورت بھی مرد کو ننگا دیکھ کر راضی ہوجائے گی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے اس کی وجہ از روئے نفسیات جو ہو مگر اس میں شک نہیں کہ ایسی حالتوں میں عورت کا سوائے جذبۂ نفرت کے اور کوئی جذبہ نہیں ابھرتا ہے۔ یورپ میں ایک قسم کے نیم بیمار نیم دیوانے اور فطرتاً بے حیا لوگ ہوتے ہیں جن کو ایگزبشنسٹ کہتے ہیں۔ یہ کمبخت لوگ جب موقع پاتے ہیں تو اپنے گدھے پن کی وجہ سے عورتوں کے سامنے کپڑے اتارنا شروع کردیتے ہیں اور ان کو خود اس حرکت میں بقول ان لوگوں کے ایک طرح کا حظ بھی آتا ہے مگر اس سے سوا نفرت کے عورتوں میں کوئی رغبت کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ عارضہ بحمد للہ یہاں نہیں ہے۔ اس لیے میں ایک کتاب کا بھی حوالہ دیئے دیتا ہوں (ہمارے زمانہ کی حیات جنسی مصنفہ آئی آئی دن بلاک صفحہ 649 لغایۃ 653) یہ ایک بیماری ہے جو صرع سے ظاہراً تعلق رکھتی ہے اس کتاب میں ایک بیمار نے اپنا حال لکھا ہے جو ہمیشہ اس کے بعد اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہوکر استمنا بھی کرتا تھا۔

اسی ضمن میں دو سطریں رشک کے اوپر بھی لکھ کر اس باب کو ختم کرتا ہوں۔ رشک کا جذبہ جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے اور انسان میں بھی گو کہ مختلف موقعوں پر مثلاً کھانے پینے کے معاملات میں یا دوسری خواہشوں کے سلسلے میں بھی دیکھا جاتا ہے مگر اس کا پورا اظہار جنس ہی کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ اگر غور کیجیے تو یہ جذبہ تقریباً غصہ اور رنج سے مرکب نکلے گا۔ عموماً حکماء کا خیال ہے کہ شروع شروع یہ کیفیت زبردست میں پیدا ہوئی ہوگی، لیکن ڈاکٹر سیرا جو نٹشے کے روحانی شاگردوں میں ہے اس کا خیال ہے کہ یہ کمزور کا حربہ ہے کیونکہ زبردست دوسروں کے مال میں شرکت کر لیتا ہے اور اپنی چیز بچا سکتا ہے پھر اس کو رشک کاہے کا ہونے لگا۔ اگر صورت اول مانی جائے تو یہ مرد کی ایجاد قرار پائے گی۔ اگر دوسری صورت زیادہ قرین قیاس ٹھہری تو ماننا پڑے گا کہ اس کی ترقی کا باعث عورتیں ہوئی ہوں گی کیونکہ ہزاروں ہزاروں برس کی عادت کی وجہ سے قوت اور زبردستی کے کام عورتوں سے منسوب نہیں کیے جاسکتے۔

O

باب دوم

فصلِ اوّل

علماء محققین کے خیال میں رنڈیوں کی شروع اسی طرح سے ہوئی ہے جس طرح ولی کے پیٹ میں شیطان ہوتا ہے یعنی عبادت میں جب روحانیت مادہ پرستی سے بدل گئی، عبادت کرنے والیوں کی صفوں میں گنہگار دکھائی دینے لگے۔ قدیم بابل میں مندروں میں جاکر عورتیں اولاد مانگتی تھیں جیسا پیر فقیر کے مزاروں پر درگاہوں میں امام باڑوں مندروں میں آپ کے یہاں بھی ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ اعتقاد نے عمل کی صورت پکڑی اور اولاد کی خواہشمند عورتیں مندروں میں صف بصف جمع ہونے لگیں اور بجائے دیوتاؤں کے انسانوں سے لڑکے مانگنے لگیں۔

ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ مرد اِن صفوں کے سامنے سے گزرتے تھے اور جس کو پسند کرتے تھے اس کی گود میں ایک چاندی کا سکہ ڈال دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ''دیبی تجھ کو آباد کریں'' اس کے بعد وہ عورت اس مرد کے ساتھ چلی جاتی۔ اکثر امراء زادیاں بڑی شان و شوکت سے آتی تھیں، غریب بیچاریاں جوتیاں چٹخاتی آتی تھیں، خوبصورت مانگی مراد جلد پاتی تھیں بدصورت آس لگائے برسوں بیٹھی رہتی تھیں۔ یہ برا نہیں سمجھا جاتا تھا اور وہ روپیہ مندر کے صَرف کے لیے رکھ لیا جاتا تھا۔ یہی مادہ پرستی کا کھیل ہے جو آج بھی بھیس بدلے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ یہ رسم (کچھ بابل کے اوپر موقوف نہیں تھی بلکہ مصر، روم اور کاری نی تھمین) لوگوں میں سائپرس میں ہندستان کی مرلیوں میں، ہر جگہ پائی جاتی تھی۔ جاپان میں آج بھی کہی جاتی ہے۔

ہولاک ایلس، لٹارنو، والیٹرام گیلیگن وغیرہم کی کتابیں اس سے بھری پڑی ہیں جب

مادہ پرستی نے اور قوت پکڑی تو بنی نوع انسان کے بدگوشت یعنی رنڈیوں کی زیادہ ترقی ہوئی اور بیسویں صدی عیسوی میں یہ کمال بہم پہنچا کہ امریکن گورنمنٹ نے ایک نہایت ہی لائق فائق آدمی کو سلطنت کی طرف سے مقرر کیا کہ اس مہلک عارضہ کی پوری تحقیقات کرے۔ فلیکنسر کی کتاب موجود ہے جن صاحب کا دل چاہے پڑھ لیں اور اگر ہندستان میں رہ کر ان کی سمجھ میں نہ آتا ہو کہ انسان انسان کو نیک نیتی کے ساتھ ٹھنڈے کلیجے اس طرح قعر مذلت میں ڈال کر کیوں کر سمجھتا ہے کہ میں نے اپنا فرض منصبی ادا کیا تو متذکرہ بالا کتاب میں رجسٹرڈ اور انرجسٹرڈ کمانے والیوں کا باضابطہ احوال پڑھ لیں اور عبرت کریں۔

رنڈیوں کی ضرورت ایسے ملکوں میں جہاں تعدد ازدواج جائز ہے نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے ایسے ممالک میں زناکار عورتوں کے ساتھ قانون سختی سے برتاؤ بھی کرتا ہے۔ البتہ ان ملکوں میں جہاں ظاہر بظاہر صرف ایک بی بی ہوسکتی ہے یا جہاں سوداگری وغیرہ کی ضرورتوں سے اغیار زیادہ جمع ہوتے ہیں ہر قسم کی گنہگاری کے آڑھتیئے دلّال اکٹھا ہوجاتے ہیں اور سامان سیہ کاری ہر نمونے کا تھوک فروشی اور خوردہ فروشی کے لیے مہیا ہوتا ہے۔ آپ فرمائیں گے ہندستان قدیم کے اصول زندگی میں بیرونی دنیا سے بے تعلقی رکھی گئی تھی پھر یہاں کیوں رنڈیاں ہوئیں۔ (قدیم تاریخیں درباروں وغیرہ میں رنڈیوں کا ذکر کرتی ہیں۔)

اس کے جواب میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ زنان بازاری جن معنوں میں یورپ میں مشہور ہیں یا جن معنوں میں یہ ہندستان میں آج کل پیدا ہورہی ہیں اس ملک کی اصل کسبیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ جیسا کہ لفظ کسبی سے ظاہر ہوتا ہے جس کا مفہوم ''پیشہ ور'' ہے۔ ہولاک ایلس نے ایک جلیل القدر مصنف کا قول نقل کیا ہے اور والٹر ایم گلیکن نے دعویٰ کیا ہے کہ ہندستان قدیم اور نیز ہندستان جدید کے دامن پر نسبتاً دھبہ نہ ایسا گہرا سیاہ ہے نہ اس قدر متعفن گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل۔ نوجوانوں کا ناصح مشفق بن کر بیٹھا ہوں کہ وہ پاکبازی کی زندگی بسر کریں اور ہندستانی رنڈیوں کی قصیدہ خوانی کرتا ہوں، کانپا جاتا ہوں کہ کہیں ایسی لغزش نہ ہوجائے کہ بجائے فائدہ کے نقصان کا سامنا ہو، لیکن میری نیت نیک ہے اور میں اپنے خدا سے توفیق مانگتا ہوں کہ دودھ کا دودھ اور پانی

کا پانی الگ کر کے دکھا سکوں تا کہ ظاہر ہو جائے کہ غریب ہندستان کی برائیاں دوسرے مقامات کی برائیوں سے گو کم گہری ہیں، پھر بھی چو آب از سر گذشت چہ یک نیزہ و چہ یک دست آدمی کو ڈبونے کے لیے ویسے ہی جی دھاری ہیں جیسے ان سے زادہ عمیق برائیاں۔ ہندستان میں برخلاف دیگر ممالک کے رنڈی کی بھی ایک قوم ہے جن کی پشتینی روایات ہیں جو ہر فرد کی مطمح نظر ہیں۔ یورپ میں کوئی مولود ایسا نہیں ہوتا جس کی نسبت یہ کہا جاسکے کہ آج ایک خوبصورت رنڈی پیدا ہوئی یا آج ایک بھڑوا پیدا ہوا جو لوگ اس پیشے میں ہیں وہ اس وجہ سے نہیں ہیں کہ ان کو اپنی نانی دادی کی طرح اونچی رنڈی ہونے کی ہوس ہو بلکہ وہ تقدیر کا لکھا پورا کرتی ہیں۔ لڑکپن یا الہڑ جوانی کے زمانے کی بدقسمتی بری صحبت یا ماں باپ کی غلطیوں کا بھرنا بھرتی ہیں اور اپنے پیشہ پر ناز نہیں کر سکتیں۔ (یورپ میں بگڑ جانے کے بڑے اسباب میں بھوک بھی بیان کی جاتی ہے۔)

ہر شخص ان کو ذلیل نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان سے دامن بچا کر چلتا ہے۔ چونکہ سوا بُری عادتوں کے یا کھانے پینے کی ضرورتوں کے اور کوئی تقاضا مثل نام آوری یا خاندانی روایات کو برقرار رکھنے کا نہیں ہوتا اس لیے ان کے افعال کردار حرکات، سکنات، خیالات، ہر چیز میں انسان کی خواری اور تباہی کی تصویر نظر آتی ہے وہاں ایک ہی عورت کے نہ معلوم کتنے پنتے ہوتے ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ ایک ہی عورت آج ''پھٹے کپڑوں میں خنداں مثل گل ہے'' اس وجہ سے کہ عصمت کی بہار بے خزاں اس کے پاس ہے اور کل اس کی جگہ صرف عمدہ کپڑے اور زیور رہ جاتے ہیں اور پرسوں دونوں کو کھو کر پکاڈلی کی سڑکوں پر نسوانیت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ یہی احوال اٹھارہویں صدی میں تھا جب گولڈ اسمتھ نے ڈزرٹیڈ ویلج کی نظم لکھی تھی اور یہی احوال آج بیسویں صدی میں ہے جب ''لندن گرل'' پر ایک جلیل القدر آرچ بشپ نے اپنی رائے ظاہر کی ہے جس میں اسی کا رونا ہے۔

چونکہ وہ لوگ اپنے خاندان والوں کے بیچ میں بیٹھ کر اپنے پیشے پر افتخار نہیں کر سکتے لہٰذا ایک گروہ ان کا مختلف وجوہ سے اُس سلسلہ میں جا پڑتا ہے جس کو پاسٹیزم کہتے ہیں۔ یہ عجیب بلائے بے درماں ہے۔ ایک بڑھیا جو گناہ کا سلسلہ خود نہیں قائم رکھ سکتی بہت سی لڑکیاں جمع کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو (مسز وارنز پروفیشن از برنارڈ شا) چونکہ قوانین مزاحم ہوتے

ہیں لہٰذا سیکڑوں ترکیبیں ایجاد کی جاتی ہیں۔ لڑکیاں دور دراز ممالک سے منگوائی جاتی ہیں تا کہ کوئی ان کا ہمدرد نہ اٹھ کھڑا ہو اکثر ان میں کی قرض کی وجہ سے بڑھیا قطامہ کے بس میں ہوتی ہیں بعض ایسی ہوتی ہیں کہ وہ اپنے وطن جا بھی سکتی ہوں تو جاتے ہوئے ڈرتی ہیں۔

ظاہر میں ان کے چہرے سرِ شام ہنستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر دل ان کے روتے روتے مر گئے ہیں۔ یا دن رات کی نامہربانیوں، سختیوں، خودغرضیوں کی وجہ سے مر کر بھوت ہوگئے ہیں۔ ٹالسٹائے نے اپنی کتاب ری سرکشن میں ایک تصویر دکھائی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ تیسرے پہر سے یہ دین و دنیا کی بدقسمت عورتیں میلے کچیلے نجس مضرِ صحت بچھونوں سے اٹھتی ہیں۔ گزشتہ رات کی ماندگی شراب خواری بے اعتدالی ان کے تھکے چہروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اب کپڑے، زیورات جن پر ان کا قبضہ نہیں ہے بلکہ وہ دوسرے کی ملکیت ہیں تقسیم ہوتے ہیں ایک سائبیریا سے آئی ہے دوسری مصر سے گئی ہے، تیسری برازیل کی ہے۔ ایک دوسری سے لڑ رہی ہے۔ یہاں تک کہ بڑھیا نے آکر تقسیم کردیا اب تیل پٹی سے درست ہوکر نشست کے کمرے میں آئیں۔ لیجیے صاحب خریدار آنا شروع ہوئے، کوئی بڈھا ہے کوئی جوان ہے کوئی سخت مزاج، کوئی نرم مزاج ہے، کوئی چڑچڑا ہے، کوئی بے تکا دل لگی باز ہے۔ کسی کے منھ سے بو آتی ہے کوئی نشے میں حواس کھوچکا ہے کوئی مال اٹھا لے جانے کی تاک میں ہے۔ مختلف قوم کے لوگ ہیں، مختلف درجے کے ہیں، بالکل کم سن لڑکے ہیں اور بہت بوڑھے یہودی ہیں ضرورت سے زیادہ خوش دکھلانے والے ہیں اور ایسے بھی ہیں جن کے آنے کی غرض نہیں معلوم۔ قصہ مختصر اس طوفان گناہ و بے رحمی میں نفیس قوائے انسانی گھٹ گھٹ کر مرجاتے ہیں اور انسان نہ معلوم کیا ہوکر رہ جاتا ہے۔

خود ہندستان میں کلکتہ بمبئی وغیرہ میں جہاں یورپ کے اصول تجارت ترقی کر چکے ہیں۔ یہ حالتیں پیدا ہونی شروع ہوگئی ہیں اور اس کے نمونے ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک نامہ نگار کا بیان ہے کہ میں بمبئی میں ایک گناہ خانہ میں ایسے وقت گیا جس وقت ان بدقسمتوں کی زندگی کا دوسرا پہلو دیکھ سکوں۔

دن کے ایک بجے میں نے دیکھا کہ فرش پر کھرّی چارپائی پر آرام کرسی پر یہ عذاب

الٰہی کی گرفتار بے چینی کی نیند سو رہی ہیں۔ بُوھیا نائکہ نے گاہک کو دیکھ کر ان کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا بعض اٹھ بیٹھیں بعض کروٹ بدل کر پھر لیٹ رہیں۔ اب کی بار یہ زیادہ بے رحمی سے جگائی گئیں جو بادل ناخواستہ اٹھیں اور بے بسی کی ترش روئی دکھا کر دوسرے کمروں میں چلی گئیں۔ کچھ دیر کے بعد صاف کپڑے پہن کر نشست کے کمرے میں آنا شروع ہوئیں۔ ایک کو میں نے اپنے قریب بٹھا لیا اور بے وقت تکلیف دہی کی عذر خواہی کی۔ لیکن اس کے چہرہ پر کوئی تغیر تبدل نہ ہوا جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ بیچاری ہمدردی سے اس قدر دور جا پڑی ہے کہ عذر خواہی یا نرمی کی باتوں سے بالکل اجنبی ہوگئی ہے۔ اس کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ بھلا کوئی ایسا بھی آنے والا ہے جس کا انتظار رہتا ہے وہ بالکل نہ سمجھی تب میں نے وضاحت کی لیکن وہ کسی طرح نہ سمجھ سکی۔ بلکہ تضیع اوقات سے گھبرانے لگی اور بے سمجھے بوجھے پریشان ہوکر بولی کہ ہم کو سولجر لوگ زیادہ دے جاتے ہیں اور ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس کے بعد میں نے اس کو کچھ روپیہ دیے جس کی وجہ سے اس کے نزدیک میری حماقت مسلم ہوگئی لیکن احسان کی نرمی چہرے سے دور ہی رہی۔ دوسرا واقعہ کلکتہ کا ہے وہاں بھی اسی طرح کے گھر میں جانے کا اتفاق ہوا اور میں نے سلسلہ کلام جاری کرنے کے لیے سگریٹ پیش کیا۔ بعض نے لے لیا ایک نے نہ لیا بلکہ میرے سگریٹ کیس کے قریب قریب خالی ہوجانے پر میری تکلیف پر نظر کی۔ مجھ کو یہ تعجب تھا ہی کہ نرمی کا پہلو اس میں کیونکر باقی رہ گیا کہ اس نے مجھ سے پھر سگریٹ کی خواہش کی میں نے دے دیا لیکن پہلی مرتبہ انکار کی وجہ بھی پوچھی معلوم ہوا کہ وہ اپنی ایک ساتھ والی کے لیے چاہتی تھی جس کو بہت عادت تھی لیکن اس کو ملتے نہ تھے آنے جانے والے شراب سگریٹ سب کچھ پلاتے تھے مگر یوں گھر میں اس کو اپنی کمائی میں سے سگریٹ بھی پینے کو نہ ملتا تھا نہ معلوم کیا مجبوری اور کیا بے بسی تھی کہ اس کے بعد بھی وہ گھر نہ چھوڑ سکتی تھی۔

اول الذکر عورت کے حالات کا میں نے تجسس کیا تو معلوم ہوا کہ چند ہی روز ہوئے ہیں کہ وہ اپنا دوردراز کا گھر چھوڑ کر مجبوراً اس جہنم میں داخل ہوئی ہے۔

فی زمانہ اس طرح کے قانون بین الاقوام بنائے گئے ہیں کہ دوسرے ممالک سے لڑکیاں آسانی سے نہیں آسکتیں پھر بھی اصول معاشرت خود ملک کے اندر اس قدر سامان

تیار کرتے ہیں کہ ان کی کثرت میں ظاہراً کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی۔ میری ڈتھ نے ایک خیال ایک ایشیائی شخص کی زبان سے ظاہر کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

ٹرکی کا وزیر کسی شخص کے یہاں دعوت میں گیا ہے اور دیر رات کو پکاڈلی کی راہ سے واپس آرہا ہے۔ بہت سی عورتوں کو سڑکوں پر شکار کی تلاش میں پھرتا دیکھتا ہے اور جب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں تو کہتا ہے:

''یہ کہیے مغربی تہذیب کا صرف روکار ہی دلآویز ہے ورنہ پیچھے کا حصہ اس قدر کریہہ منظر ہے۔''یورپ میں علاوہ ان قسموں کے دوسری قسمیں بھی ہوتی ہیں جن کو لولٹ گرسٹ مسٹرس وغیرہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ انسانیت کا پہلو ازسرتا پا نہیں کھو بیٹھتیں لیکن یہ لوگ صد بیمار کے مقابلہ میں ایک انار سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ ایک فرقہ وہاں پولٹیکل رنڈیوں کا بھی ہوتا ہے جو جاسوسی کے ذریعہ سے سلطنتیں الٹتی پھرتی ہیں لیکن ان کا شمار اس زمرے میں نہیں ہوسکتا۔ ایک طبقہ کام کاجی عورتوں کا اور پیدا ہوگیا ہے جو دن بھر کارخانوں وکانوں میں خواندہ صیغوں پر کام کرتی ہیں اور صرف اس قدر تنخواہ پاتی ہیں کہ قناعت کے ساتھ کھا پی لیں اور بس۔ دولت مند ممالک میں سامان تعیش ضروریات زندگی میں سے ہوتا جاتا ہے، دکانوں میں طرح طرح کی چیزیں بجی ہوئی ہیں۔ مفلسی کی جوانی، ہر چیز کو دل چاہتا ہے۔ لہٰذا آمدنی میں کچھ اضافہ کرلیتی ہیں، مگر سلیقہ اور خوش مذاقی کے ساتھ پھر بھی ان لوگوں کا مقابلہ ہندستانی رنڈیوں سے کرنا مناسب نہیں۔

اب اس تصویر کا وہ پہلو ملاحظہ ہو جس میں ہندستانی رنگ بھرا ہوا ہے۔ یہ لوگ بھی بدقسمتی میں خود ہی اپنی مثال ہیں۔ عورت کا وہ پہلا حق جس کے بل پر وہ کسی کے مال کو اپنا مال کہتی ہے کسی کے گھر کو اپنا گھر کہتی ہے، کسی کی عزت کو اپنی عزت کہتی ہے۔ ان کو نصیب نہیں اس کا نعم البدل ناممکن ہے لیکن سوا شوہر کے اور جتنی خوبیاں خاندان اور یگانگی کی ہیں اس سے محروم نہیں۔ اس کی تعلیم اور تربیت خلاف فطرت ہوتی ہے اور اس کی دنیا ہی نرالی ہے عموماً شریف لڑکیوں کو سلیقہ خانہ داری کے اصول محبت اور قربانی کی تربیت گھروندے اور گڑیا کا بیاہ رچا کر دی جاتی ہے۔ ان کے دشمنوں کو بڈھیا نائکہ یہ سب کچھ سکھائے اگر آج یہ سکھیں گی تو کل یہی برتیں گی اور اپنا گھر چھوڑ کر کسی مرد آدمی کے ساتھ

زندگی تیر کرنے کی کوشش کریں گی۔ اگر آج ہنڈکلیا کھیلیں گی تو کل چولھا پھونکنے میں آسانی ہوگی۔ یوں اگر دل کے ہاتھوں مجبور بھی ہوئیں تو دو دن کی خانہ داری پھر مونڈھے پر لا کے بٹھا دے گی۔ گھر میں ذکر اذکار بھی ایسے ہی سنتی ہیں جن سے استقلال صدق مقال ہمدردی وغیرہ کی وقعت دل میں نہ رہ جائے مگر یہ سب باتیں اپنے قدر دانوں کے ساتھ ہیں گھر میں دیکھیے تو درد بھی ہے اور بھائی بہنوں ماں بیٹوں میں انسانی پہلو محبت کا بھی موجود ہے۔ جس طرح باپ لڑکے کے ساتھ تعلیم کے بارے میں سختی برتتا ہے تاکہ اس کا فائدہ ہو۔ اسی طرح بوڑھی نائکہ بھی اپنے پیشے کی ضرورت سے اپنی کمسن لڑکی کو پیشے میں جھونک دیتی ہے تاکہ اس کو نفرت ہو جائے اور اس کام سے صرف اسی قدر دلچسپی رہ جائے جس قدر روپیہ کمانے کے لیے ضروری ہے۔

ایک میر شکار نے فخریہ بیان کیا کہ ''ہم صاحب اپنی ذات کے کھرے کنچن ہیں ہمارے یہاں آج تک نہ کوئی بیٹھی نہ کسی نے نکاح کیا'' بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلو خیال کا کس قدر ذلیل ہے اور واقعی ذلیل ہے مگر اسی طرح ذلیل ہے جیسے حضرت نوحؑ کی کشتی پر سور کے متعلق ذلیل کام گُہ (گو) کھانے کا تھا جس سے دوسروں کو فائدہ ہوتا تھا۔ اگر بجائے اس کے ان بدقسمتوں کو یہ تعلیم دی جاتی کہ جس سے رسم ہو اس کے گھر بیٹھ جاؤ تو یہ نہ معلوم کتنے گھر گھالتیں اور اپنی بُری تربیت سے خدا جانے کتنی شریف نسلیں برباد کرتیں۔ ایک بڈھا میر شکار تھا اس کے سامنے اگر کوئی میر انیسؔ مرحوم کا مشہور مصرع ''جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو'' پڑھ دیتا تو وہ اس قدر چڑھتا تھا کہ بیٹھے سے کھڑا ہو جاتا تھا۔

خیال تو فرمائیے کہ جب یہ حال تربیت کا ہوگا تو ان لوگوں کے دل پر کسی کے حبیب کی یا اپنے حبیب کی جدائی کیا بیٹھے گی۔ یہ میں نہیں کہتا کہ ہندستان میں اس کے خلاف نہیں ہوتا۔ میرا صرف یہ دعویٰ ہے کہ جہاں یہ نصب العین ہوگا وہاں دوامی تعلقات کے حادثات کم پیش آئیں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسی غرض کو پورا کرنے کے لیے تعلیم بھی دی جاتی ہے کہ دوسری ہم پیشہ سے برابری کا دعویٰ رکھنا مگر سہرے جلوے والی شریف زادی کے مقابلہ میں ''ایاز قدر خود بشناس'' کو بھول مت جانا۔ ایک صاحب کے پاس ایک

طوائف نوکر تھی جس کو انھوں نے دو دن تک برابر نہ یاد کیا۔ تیسرے دن جب ملاقات ہوئی تو مکاری کی تعلیم نے زبان شکوہ کھلوائی۔ ادھر سے کہا گیا کہ ہم نے دو راتیں محل سرا میں بسر کیں۔ وہ چپ ہوگئی بعدازاں لوہا لوہے سے کاٹنے کی غرض سے پوچھا گیا کہ کیا یہ بھی ناگوار ہوا۔ گو کہ وہ رنڈی سن کے لحاظ سے پختہ کار نہ تھی مگر اس نے فوراً ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ "خدا آپ کو اور ان کو ہمیشہ سلامت رکھے میری مجال ہے" صاف بات ہے کہ یہ بھی مکاری کا ایک دوسرا پہلو تھا مگر اس میں اس تعلیم کا پتہ ضرور چلتا ہے جو ان لوگوں کو ملتی ہے۔ میرے دوست میرے پڑھنے والے اگر اس نقل سے تمھارے دل میں ان کمبختوں کی جگہ ہوئی ہو تو میں پیش خدا مواخدہ دار ٹھہروں گا کہ جس وقت تو اظہار مطالب پر قدرت نہیں رکھتا تھا تو تو نے قلم کیوں اٹھایا۔ میرا مقصد اصلی ان لوگوں کی تعریف نہیں ہے بلکہ صرف یہ کہ یورپ، جہاں سوداگری میں حکمت عملی میں مادہ پرستی کی بے دردی میں ہم سے آگے ہے سیاہ کاری میں بھی ہم سے سیاہ تر ہے۔ آپ یہ کہیں گے کہ بجائے اس چمکدار لفافہ کے جس میں رنڈیاں ایک اصول کی پابندی سے قدم باہر نہ نکالیں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ تو یورپ کی بے حیائی اور شقاوت سے بھی کچھ بڑھ چڑھ کر ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا نہیں ہے میرا تو صرف یہ دعویٰ ہے کہ آرزو ہر رنڈی کی یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے خاندانی روایات کو برقرار رکھے اور جب اصول کی پابندی پر نظر رہے گی تو انسانی نرمی ضرور جھلکے گی۔ دنیا میں دولت کی وجہ سے بھی مزاجوں میں فرق آجاتا ہے اور غریبی کی ضرورت بھی خواہش کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہتوں کو پیٹ پالنے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

اس ملک میں موسیقی اور اس پیشے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسباب زمانہ کی ستم ظریفی میں بھی غضب کا تال میل ہے۔ یہ دھوکے کی ٹٹی ہی سہی مگر بے حجابی کا پردہ ضرور ہے اور جاپان اور ہندستان کی خصوصیات میں سے ہے۔ جاپان میں گیشا اچھوں میں اچھی نہ سہی بروں میں اچھی ضرور ہے۔ اس کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ اس کو موسیقی وغیرہ کی تعلیم باقاعدہ دی جاتی ہے اور اصول خانہ داری سے بھی بے بہرہ نہیں ہوتی۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ قہوے خانوں وغیرہ میں کمانے کے بعد اچھی طرح شادی کرتی ہے اور آبرو کی زندگی بسر کرتی ہے۔

خیر بہتر قسم کے نوجوان تو اس کو کیا بیاہتے ہوں گے مگر شائستگی، صفائی اور سلیقہ مندی کی وجہ سے کہیں نہ کہیں کھپ ضرور جاتی ہوگی۔

آوارگی کی برائیاں اس قدر اظہر من الشمس ہیں کہ ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں پھر بھی اس قدر کہہ دینا ضروری ہے کہ بعض برائیاں صرف ایک پہلو سے نقصان پہنچاتی ہیں۔ لیکن اس راہ میں ہر طرح کا ضرر ہے۔ تندرستی پر سب سے زیادہ جوکھم آتی ہے کیونکہ ڈاکٹروں کا قول ہے کہ اس پیشہ میں مشکل سے کوئی ایسی ہوگی جو دو برس کے اندر سزائے کردار نہ پا چکتی ہو۔ جب یہ حالت ہے تو ممکن ہے کہ کوئی خوش قسمت مرد دو چار مرتبہ بچ جائے لیکن پھر بھی روز بد سامنے ضرور آئے گا۔

بعض بدقسمت ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر سر منڈواتے ہی اولے پڑتے ہیں مالی اقتصاد اس وجہ سے بگڑ جاتا ہے کہ ان مصارف کا بجٹ نہیں تیار ہوسکتا۔ بعض ناتجربہ کار اپنے زعم ناقص میں خیال کرتے ہیں کہ ہم ایسا کرلیں گے بعض جھوٹے عیاش اس کے دعوے دار بھی ہوتے ہیں مگر جب جرح کیجیے تو کھل جاتا ہے کہ غلط ہے۔ ان نقصانوں سے بالاتر نقصان نفس کا ہے۔ آدمی اپنے پائے سے گر جاتا ہے اور وہ عیوب اس میں پیدا ہوجاتے ہیں جو اِس عالم اور اُس عالم میں ہر جگہ اس کو ناکامیاب رکھتے ہیں۔ خودغرضی، جھوٹ، کمینہ پن، تنگ خیالی، دغا، بے وفائی، جرائم، بری صحبت وغیرہ۔ یہ وہ چیزیں نہیں کہ آدمی ان سے مل کر چلے اور کورا نکل آئے اور اس راہ میں خواہ وہ یورپ ہو یا ہندستان ہر مقام پر متذکرۂ بالا برائیوں کی ٹھوکر ہے۔ اس کوچہ میں پڑ کر انسان یہ دیکھتا ہے کہ میں نے محبت کے یوسف کو شہوت پرستی کے بازار میں کوڑیوں کے مول بیچ ڈالا ہے اور انسانیت کے درجہ سے گر کر صرف ایک خفیف سا حیوانی درجہ سے اونچا رہ گیا ہوں۔ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ واردات قلبیہ ہیں جس کو ہر عیاش محسوس کرتا ہے اور اگر اس میں غور و فکر کی کچھ بھی قابلیت باقی رہ جاتی ہے تو خود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہوتا ہے۔

قدیم زمانے میں رنڈیاں صرف امراء کا کھلونا تھیں۔ غریب نہ ان کی آرزو کرتے تھے نہ ان کو ضرورت تھی کیونکہ لوگ وطن چھوڑ کر کم جاتے تھے اور شادی کے لیے دولت مند ہونے کی شرط جیسا کہ آج ہے نہ تھی۔

ڈیماکریسی کے برکات اگلے زمانے والوں کو کہاں نصیب تھے کہ سامان عیش ہر امیر غریب کے لیے ان کی حیثیت کے مطابق ہر وقت مہیا رہے۔ ڈیماکریسی کے اوپر خیال آیا کہ ساٹھ ستر برس پہلے لکھنؤ میں بلکہ جیسا کہ مصنف ''وومن آف انڈیا'' نے لکھا ہے تمام ہندستان میں رواج تھا کہ امراء زادے جو بسم اللہ کے گنبد میں تربیت پاتے تھے جب جوان ہوتے تھے تو احتیاط کے ساتھ ان کو دو چار صحبتیں رنڈیوں کے یہاں کی دکھا دی جاتی تھیں یا کم سے کم اس کا موقعہ دیا جاتا تھا کہ اگر وہ ایسا چاہیں تو بڑے بوڑھے چشم پوشی کرلیں۔ اس کی ضرورت یوں پڑتی تھی کہ اس زمانے میں پبلک اسکول تو تھے نہیں جہاں برابر کی نوک جھونک اٹھاکر امراء زادوں کی تعلیم مکمل ہوجائے اور ہمچو من دیگرے نیست کی بو دماغ سے نکل جائے۔ رنڈیوں کے یہاں اصول کے موافق کسی کی روک ٹوک نہیں ہوسکتی اور ہر شخص کا درجہ برابر تھا۔ جو شریف زادے وہاں چھپ کر جاتے تھے وہ اپنی شخصیت کو چھپاکر برتاؤ کرتے تھے۔ جو کمینے وہاں روز کے آنے جانے والے ہوتے تھے ان کی اصلیت کھل جاتی تھی اور وہ بن بات کی بات پر لڑائی جھگڑا کرنے پر تل جاتے تھے۔ اس میں آدمی کو خودداری، بچ کر چلنا، موقعہ پڑے تو بلا دوسرے کی مدد کے اپنے بل بوتے پر مقابلہ کرنا اور اپنی حفاظت کرنا سب کچھ آجاتا تھا۔ ڈاکٹر مرزا محمد ہادی صاحب کی کتاب امراؤ جان ادا اس مضمون پر بہترین کتاب ہے جو ہر شخص کو پڑھ لینا چاہیے۔

یہ عجیب بات ہے کہ رنڈی بازی کا شوق اکثر کمزوری کی علامت ہوتا ہے۔ ہمارے صوبہ جات کا ایک بڑا مشرقی ضلع اس دعوے کی عمدہ دلیل ہے۔ مرطوب آب و ہوا یا علم الانسان کے دوسرے اسباب کی وجہ سے اس ضلع کے آدمی اعضاء جوارح، خیالات، ہمت وغیرہ میں مغربی اضلاع کے آدمیوں سے کم ہوتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب کے سب ایسے ہی ہوتے ہیں کیونکہ ایسا نہیں ہے اور اس ضلع کے اعلیٰ طبقے نے بھی عمدہ لوگ پیدا کیے ہیں، مگر چونکہ حکم کثرت پر لگایا جاتا ہے اس لیے ایسا کہا گیا۔ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ اس ضلع میں چھوٹی چھوٹی رشوتیں بڑی آسانی سے چلتی ہیں۔ بعض عوارض بھی جو ترائی اور مرطوب زمین کے ہیں یہاں بہت ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جتنی کھپت رنڈیوں کی اس جگہ ہے دوسری جگہ نہیں۔ یہاں کی نیچ قوم کی عورتیں

دوسرے مقام کی عورتوں سے زیادہ بنی چنی رہتی ہیں۔ یہ ہر شخص کا تجربہ ہے کہ عموماً چھوٹے درجے کی عورتیں جن کو گھر بار کے کام کاج، بچوں کی دیکھ بھال، غریبی کی مشکلات سے ہر وقت سامنا رہتا ہے۔ اس قدر موقعہ نہیں پاتیں کہ بناؤ سنگھار کریں اور سوا تیج تہوار کے دن رات سر جھاڑ منہ پھاڑ میلی کچیلی گھوما کرتی ہیں۔ مگر اس ضلع میں مشکل سے کوئی عورت ایسی دکھائی دے گی جو بغیر تیل پٹی، مانگ چوٹی، سندور ٹکلی کے گھر سے قدم باہر نکالتی ہو۔ کچھ نہیں تو حبابی موتیوں کی ایک لڑی ہی گلے میں ہوگی۔ یہ سب کس واسطے؟ صرف اس واسطے کہ مردوں کو اپنے فرائض کی طرف رجحان ہو۔ پیشہ ور عورتوں کی وہ کثرت گھر گرہستیوں کی یہ حالت آخر اس کی وجہ کیا۔ وجہ یہ کہ گھر میں اشتعال جذبہ کی وہ آسانیاں نہیں جو پیشہ ور کی بے حیائی سے ممکن ہیں اور جہاں داد وستد کی بات آگئی وہاں عورت اپنے خواہشات نہ پورے ہونے کی شکایت نہیں کرسکتی۔ لہٰذا لوگ خودغرض ہو گئے ہیں اور اپنی تشفی کرلیتے ہیں۔ عورت چاہے راضی ہو چاہے بھاڑ میں جائے۔ عبرت کی بات ہے کہ یہی وہ ضلع ہے جہاں نان کوآپریشن کا دم نکلا۔ گاندھی ہمیشہ سر پیٹ پیٹ کر کہا کرتے تھے کہ یارو یہ خیال نہ کرو کہ ستیہ گرہ نامردوں کا حربہ ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ سب سے زیادہ جس چیز کا مقابلہ سخت ہے وہ غصہ اور دوسرے قسم کے جذبات ہیں۔ اگر اپنے دل کو ایسا نہیں پاتے تو اس میدان میں ہرگز قدم نہ رکھو لیکن لوگوں نے خیال کیا کہ گاندھی یوں ہی کہتے ہیں یا نان کوآپریشن کا بازار گرم کرنے کے واسطے کہتے ہیں۔ اگر مشکل ہے تو مارنا مشکل ہے، مار کھانے میں کونسی ہلدی پھٹکری لگتی ہے۔ اس خیال کی غلطی اس وقت معلوم ہوئی کہ جب ہزاروں آدمیوں کے بیچ میں چند غریب پولیس والے گھر گئے اور کثیر التعداد فریق کے اوپر غصہ اور کینہ وری نے یلغار بول دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی نے بھی اپنی غلطی محسوس کرکے ستیہ گرہ روک دی۔ اسی کے مقابلہ میں پنجاب کو دیکھیے جو ہندستان میں سب سے زیادہ بہادر صوبہ ہے اور خالصہ کو دیکھیے جو اس صوبے کی ایک اعلیٰ قوم ہے اور اکالی کو دیکھیے جو خالصہ کی ناک ہے۔ کس کو نہیں معلوم کہ جب ستیہ گرہ کرنی پڑی تو یہی اکالی سینوں پر متعدد تمغے بہادری کے لگائے گوروں اور پولیس والوں کی ٹھوکریں کھاتے تھے مگر غصہ کو پاس نہ آنے دیتے تھے۔ قوت باہ کو بہادری سے وہی نسبت

ہے جو سپاہی کو ہتھیار سے ہے یا عورت کو ناز و کرشمہ اور قربانی سے ہے کہ اگر ایک نہیں تو دوسرے کا سبھاؤ نہیں، پھر بڑے حیف کی بات ہے کہ مرد انسانیت کا جامہ رکھے اور اس چیز کی قدر نہ کرے جو مردانگی کا جوہر ہے۔ ایک حکایت اور بس اسی پر ختم ہوا اور آپ حضرت کے لیے دعا۔ ایک مہنت صاحب جو ہمارے یہاں اکثر آتے تھے اور بڑے قدآور پہلوان تھے۔ مجھ سے کہنے لگے ''بچہ میں نے عورت کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ میں نے کہا بابا تو تم کو غصہ بہت ہوگا۔ اس نے کہا غصہ تم کمزور آدمیوں کو آتا ہے۔ ہماری طاقت نے غصہ وصہ سب کو دبا دیا ہے۔ جس وقت وہ یہ کہہ رہا تھا اس کا سینہ تن گیا تھا۔ لاطینی مثال ہے کہ جسم عمدہ دل عمدہ جسم خراب دل خراب۔

○

''کسی رانڈ بیوہ کے یہاں ایک طوطا پلا تھا۔ وہ ہر وقت اس عورت کو مغلظات سنایا کرتا تھا۔ ایک دن اس کے یہاں ایک پیر صاحب تشریف لائے طوطے کو سن کر کہنے لگے ارے تیرا طوطا بڑا فحاش ہے پنجرہ کھول دے یہ اڑ جائے۔ کہنے لگی رہنے دیجیے میاں، گھر میں مردوئے کی ایسی بولی تو سنائی دیتی ہے۔''

(''بیوی کیسی ہونی چاہیے'' کشکول)

فصلِ دوم

شادی

دنیا کے اہم ترین مسائل میں شادی بھی ہے جس کے لیے نٹشے فرماتا ہے کہ ''شادی کرنا چاہتا ہے اور اولاد کا خواہشمند ہے، مبارک ہو تجھے مگر پہلے مردیت بہ آزمائے وآنکہ زن کن'' شادی مذاق نہیں نہ یہ حکم نٹشے کا یا مصرعہ سعدی کا مذاق ہے۔ ان پُر مغز اقوال میں نہ معلوم کس قدر معنی ہیں۔

ایسے وسیع موضوع پر لکھنا اور اختصار کو مدنظر رکھنے کے بعد بھی یہ امید کرنا کہ مبحث پر کسی طرح کی روشنی پڑ سکے گی غلطی ہے میں صرف اس نیت سے لکھنا چاہتا ہوں کہ تازہ اور قوی دماغ والوں کی توجہ اس طرف مبذول ہو اور وہ کام جو میرے دل و دماغ کی قدرت سے باہر ہے وہ لوگ کر کے ایک مبارک نتیجہ پر پہنچ جائیں۔

شادی از روئے ارتقا اور اس کے ہر پہلو پر رائے زنی ان مصنّفین کا حصہ ہے جنھوں نے اپنے کمال کی مہریں علوم تاریخ پر لگائی ہیں۔ ایک چھوٹے سے رسالے کے لیے اس کی حاجت نہیں یہاں تو صرف یہ دکھانا ہے کہ عملاً کیا کیا جائے جو ایک گونہ آسائش زیادہ ہو جائے۔ علمی مباحث سے قطع نظر کر کے تین پہلو ہیں جن پر ہمارے نوجوانوں کو غور کرنا چاہیے۔

1۔ شادی کے لیے بہترین زمانہ کون ہے۔
2۔ آیا انگریزی طریقہ شادی کا ٹھیک ہے یا ہندستانی۔
3۔ آیا صرف ایک شادی عمدہ ہے یا زیادہ بھی فائدہ رساں ہو سکتی ہیں۔

سب سے بڑا اور اہم سوال شادی کی عمر کا ہے۔ ہم لوگ جن کی تقلید کرتے ہیں ان

کے نزدیک شادی کا زمانہ مرد کے لیے 30-40 اور عورت کے لیے 20-30 تک بہت عمدہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعی عمدہ ہے مگر انھیں قوموں کے لیے ہے جن کی عمریں زیادہ ہوتی ہیں اور جہاں موسم کی وجہ سے یا ملک کی وجہ سے یا خودمختاری کی وجہ سے لوگ دیر میں جوان ہوتے ہیں اور دیر میں بڈھے ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں تو یہ حال ہے کہ یہ مرغ طرب کب آیا اور کب گیا۔

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

یہاں اگر چالیس برس میں شادی کی نوبت آئے تو غضب ہی ہو جائے۔ ممکن ہے کہ کم عمری کا ایک باعث کمسنی کی شادی بھی ہو، بلکہ یقیناً ہے۔

لیکن سیکڑوں اور وجوہ بھی ہیں جو اس جگہ بیان نہیں ہو سکتے۔ بچپن کی شادی تو سرے ہی سے بُری ہے لیکن پھر بھی سوال باقی رہتا ہے کہ سب سے زیادہ مناسب زمانہ کون ہے۔ انسان میں ایک زمانہ بچپن اور جوانی کے درمیان میں ہوتا ہے جس کو باڑھ کا زمانہ کہتے ہیں جس طرح بچپن کی شادی کو مضر صحت سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح اس زمانہ کی شادی کو بھی انسان کے لیے زہر ہی تصور کرنا چاہیے جب لڑکا یا لڑکی بچپن کے آخری زینے پر ہوتے ہیں تو ایک تغیر پیدا ہوتا ہے جو طبیب اور غیر طبیب سب کی تشخیص میں آجاتا ہے۔ آدمی دبلا ہو جاتا ہے قد کا طول یکبارگی زیادہ ہو جاتا ہے بچپن کا بھولا پن رخصت ہو جاتا ہے لیکن شباب کی دلآویزی کو دیکھنے والا نہیں پاتا۔

اس زمانہ کے شروع ہوتے ہی بچے میں خیالات گہرے ہونے لگتے ہیں۔ لڑکی میں شرم کے آثار شروع ہو جاتے ہیں، لڑکے میں جنسی خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ آدمی رائے خود قائم کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ماں باپ کی حکومت ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ جھلّا پن پیدا ہو جاتا ہے، کسی وقت کاہلی گھیرتی ہے، کبھی کام کرنے کا ضرورت سے زیادہ جوش و انہماک ہوتا ہے، کبھی چپ سی لگ جاتی ہے، رازداری کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہی زمانہ باڑھ کا ہے جو ہم آپ روز دیکھتے ہیں۔

اب انسان جنسی امور کے اوپر قادر ہو جاتا ہے، لیکن اعضا اور جوارح پوری تقویت پر نہیں ہوتے اور ہر جزو بدن اپنی طرف طاقت کا سامان کھینچتا ہے۔ اس چھینا جھوری میں

اگر اہلِ خدمات بھی اپنا حق مانگنے کھڑے ہو گئے تو سمجھ لیجیے کہ غضب ہی ہوا۔ آج کا ٹوٹا برسوں میں کیا مدت العمر میں بھی نہیں پنپتا۔ ڈاکٹر میری اسکار لیپ نے کیا خوبصورت نقل بیان کی ہے جو لفظاً نہیں بلکہ معناً ہدیہ ناظرین ہے۔

سلطانہ ملکہ کے پاس اس کا بیٹا بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے ''اماں میں اپنی شادی کروں یا نہ کروں۔

ماں: تمہارے دل میں یہ خیال کیونکر پیدا ہوا کیونکہ ابھی تمھاری عمر اس قابل نہیں ہے۔

شہزادہ: میرے بھائی لوگ ہیں جو متعدد شادیاں کر چکے ہیں اور میرے مصاحبین بھی مختلف عورتوں کے پیغام مجھ تک پہنچاتے ہیں جو میری مشتاق ہیں۔ ماں بیچاری کا دل دھڑکنے لگتا ہے اور وہ کہتی ہے کہ میں تم سے ایک سوال کرتی ہوں غور سے سننا اور تامل سے جواب دینا۔

ماں: فرض کرو کہ تم شکار کو گئے ہو اور اپنے خیموں سے بہت دور جا پڑے ہو واپسی میں بھوک نے غلبہ کیا ہے اور تم قدم بڑھائے ہوئے اپنے پڑاؤ کو آرہے ہو کہ راستہ میں ایک معصوم ملتا ہے جو اپنا مختصر کھانا لیے بیٹھا ہے۔ آیا تمھاری عالی ہمتی کے شایاں یہ ہے کہ اس نازک بے بس بچہ کا آذوقہ جو تمھارے لیے بالکل ناکافی اور اس کے لیے نہایت ضروری ہے چھین کر کھاؤ یا چند قدم اور صبر کرو جہاں خود تمھارے لیے انواع واقسام کے نعمات چنے ہوئے ہوں، جو تم کو سیر بھی کر دیں گے اور قوت بھی بخشیں گے۔ یہی حال میرے بیٹے تیری اٹھتی جوانی کا ہے کیونکہ تیرے اعضا ابھی قوت کے کمال کو نہیں پہنچے ہیں۔ اگر اس وقت میں وہ صَرف شروع ہوا جس میں بعد کو بھی اصراف کی گنجائش نہیں تو اولاد کمزور ہوگی اور تیرے گھر کا چراغ آباد اجداد کا نام کیونکر روشن کرے گا۔ میں نے تم کو نو مہینے پیٹ میں رکھا اس زمانہ میں میں نے وہ احتیاط کی جو میرا فرض تھا۔ میں نے کوئی چیز ایسی نہیں کھائی جو تم کو بے چین کرے۔ بے وقت جاگی نہیں، بے وقت سوئی نہیں کہ تم بے کل ہو گے۔ کھانے میں احتیاط کی، پینے میں احتیاط کی، معاشرت کے ہر پہلو میں تمھارا

آرام مقدم رکھا تا کہ تم ویسے ہی ہو جیسا کہ ہر ماں چاہتی ہے خدا کا شکر ہے کہ میں اپنی خواہش میں اس حد تک کامیاب ہوئی۔ اب میری پت اور اس جلیل القدر سلسلہ کی پت تمھارے ہاتھ ہے تھوڑا زمانہ اور باقی ہے پھر وہ وقت بھی آجائے گا جس میں تمھارا آرام اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اب میری خواہش ہے کہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ میری نصیحت کو گرہ باندھو گے اور وہ کرو گے جس کی مجھ کو آرزو ہے۔

شاہزادہ: میں وعدہ کرتا ہوں۔

ماں: مجھے یقین ہے لیکن میری تشفی کے لیے ایک بات اور کرو تو میں سکھ نیند سو سکوں گی۔

شہزادہ: میں حاضر ہوں۔

ماں: تم دو دن کھانا مت کھاؤ جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ کٹھن سے کٹھن موقعہ پر بھی تمھارا قول مردہ نہ ٹھہرے گا۔

شہزادہ: آپ دو دن کہتی ہیں میں تین دن کے لیے ارادہ کرتا ہوں۔

ماں نے بیٹے کو محبت کی نظر سے دیکھا اور امتحان کا تہیہ کیا۔ ان تین دنوں میں ماں نے یہ انتظام کیا کہ بہت سی بہتر غذائیں، فواکہ، مشروبات ہر وقت آنکھوں کے سامنے چنے رہیں اور نگاہ کے آگے سے گزرا کریں لیکن شہزادہ نے پھر کر بھی نہ دیکھا اور مدت آزمائش ختم ہوگئی۔ ماں نے بیٹے کو چھاتی سے لگایا جس میں شہزادی اور شاہزادہ گم ہوگئے، ماں بیٹے رہ گئے۔ اس کے بعد بولی کہ اب مجھ کو تمھارے اوپر بھروسہ ہے۔

باڑھ کا زمانہ نکل جانے کے بعد میرے خیال میں فضول انتظار کر کے قیمتی وقت ہاتھ سے دینا ہندستانیوں کے لیے مناسب نہیں۔ ایک ہندی مثل ہے اگمن کھیتی اگمن پوت۔ یعنی شروع کی کھیتی اور شروع جوانی کا بیٹا، اگر دیر کو شادی کی اور دیر کو لڑکا ہوا عمریں کم وہ لڑکا نہیں گورکن ہوتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ آج مادی دوڑ دھوپ کا تقاضا یہی ہے کہ شادی صرف اس وقت کی جائے جب آدمی دولت مند ہو اور مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے، لیکن جب دولت کی یہ بہتات نہ تھی نہ یہ پرستش تھی اس وقت لوگ یہی خیال کرتے

تھے اور اسی پر عامل بھی ہوتے تھے کہ دل کی خوشی کے لیے دولت کی ضرورت نہیں۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اہلی زندگی بعض غریب بھی ایسی بسر کرتے ہیں جس پر امیروں کو رشک آتا ہے۔

پھر شادی کے لیے کس قدر دولت مند ہونے کا انتظار کیا جائے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ جب تک عورت کی پوری کفالت کوئی نہ کر سکے اس وقت تک اس کو شادی کرنے کا حق نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کفالت کا مفہوم کیا ہے۔ ایک مفہوم اس کا انگریزی پہلو سے ہے اور ایک ہندستانی۔ ہمارے نوجوانوں کی نظر ہندستانی پہلو پر نہیں جاتی، نہ اس پر نظر کرنے کی کوئی وجہ پیش آتی ہے۔ برخلاف اس کے یورپ والا پہلو ہر وقت پیش نگاہ رہتا ہے اور وہ ہی دل کی نظر پر بھی چڑھ جاتا ہے۔ یعنی ہمت مردانہ کا مقتضی یہ ہے کہ جب تک اس قدر دولت بہم نہ پہنچ جائے کہ آدمی بی بی کو نہایت آرام سے رکھ سکے شادی نہ کی جائے۔ واقعی یہ خیال قابل آفریں ہے لیکن بغیر دولت کے بھی آرام ممکن ہے اور اس انتظار میں بھی تو کچھ خرابیاں ہیں۔

انگریزوں میں اس طرح مختلف طبقات برادری قومیت پر مبنی نہیں۔ جیسا کہ ہمارے یہاں ہیں۔ گو کہ ان کے یہاں معاشرتی قانون ہمارے یہاں سے بہت زیادہ سخت ہے اور سختی سے برتا بھی جاتا ہے، لیکن وہ بجائے قومیت کے دولت اور علم وغیرہ کی بنا پر ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اگر کسی شخص میں علم اور دولت اپنے باپ دادا سے زیادہ ہو گئے تو وہ ہر لحاظ سے اپنے طبقے سے نکل کر دوسرے طبقے میں جا پڑا۔ لارڈ ریڈنگ لائیڈ جارج اور سیکڑوں ایسی مثالیں روز کے دیکھنے میں آتی ہیں کہ یہ لوگ اپنے پرانے طبقے سے بالکل ہی غیر ہو کر نئے طبقے میں گھل مل جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں اس کے بالکل برخلاف ہوتا ہے۔ یہاں کوئی شخص ہزار غریب ہو جائے یا ہزار امیر ہو جائے۔ علم میں بھی کمی بیشی آ جائے پھر بھی وہ اپنے طبقے سے بالکل نکل ہی جاتا ہے نہ دوسرے طبقے میں پوری طور سے داخل ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر آدمی جس طبقے کا ہے اسی طبقے کی نسبت سے اپنے عیال کی پرورش کر سکتا ہے تو وہ کفیل کہے جانے کا مستحق ہے۔ کسی طبقے کو لے لیجیے شیخ کو لے لیجیے یا ٹھاکر کو لے لیجیے۔ گو مختلف افراد میں دولت اور علم وغیرہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پھر

بھی وہ برابر کے سمجھے جاتے ہیں اور ان باتوں میں جو قومیت کا پتہ دیتی ہیں برابر ہیں بھی۔ مثلاً پردہ یا روایات خاندانی وغیرہ اگر ان باتوں کے ساتھ وہ چیز بھی ہے جس کو اصطلاح میں گوشت روٹی سے خوش یا کھاتا پیتا گھر کہتے ہیں تو اور زیادہ دولت کا انتظار کر کے بہترین وقت کھو بیٹھنا سوائے شامت کے اور کیا کہا جائے۔ ہمارے یہاں عورتوں کی تربیت ایسی ہوتی ہے کہ امیرزادی بھی متوسط الحال کے یہاں پہنچ کر اچھی طرح کاٹ ڈالتی ہے اور اس کو اتنی بڑی مصیبت نہیں جانتی، جتنی یورپین عورت سمجھتی ہے۔ یہ خیال ایک مثال سے صاف ہوجائے گا۔ نان کوآپریشن کے زمانہ میں ایک نہایت ہی مستقل مزاج جوشیلے نیک نیت وکیل میرے عنایت فرماؤں میں تھے وہ عیال کی وجہ سے نان کوآپریشن کرتے ہوئے دبتے تھے لیکن وکالت نہ چھوڑنے سے بھی پریشان تھے۔ عندالذکر انھوں نے دل کی کیفیت بیان کی کہ اگر مجھے پچاس روپیہ ماہوار کا سہارا ہوجائے تو میں ابھی وکالت چھوڑ دوں۔ یہ بات انھوں نے صرف اپنی فطرتی قناعت کی بنا پر کہی ہوگی مگر جس وجہ سے یہ خیال ان کے دل میں بغیر ان کی اطلاع کے گزرا ہوگا یا رہا ہوگا کہ وہ دیکھتے تھے کہ جس طبقے میں ہم ہیں اور جو سفید پوش کہلاتا ہے اس میں سیکڑوں روپیہ ماہوار سے لے کر پچاس روپیہ تک کا آدمی قبول کرلیا جاتا ہے بلکہ اس سے بھی کم والے کی گنجائش ہے بشرطیکہ دوسرے شرائط موجود ہوں۔

انگریزی کتابوں میں اکثر دیکھتے ہیں کہ ایک عورت باوجود سچی محبت کے اپنی زندگی تباہ کردیتی ہے اور کسی ادھیڑ امریکن کروڑپتی کے ساتھ صرف اس وجہ سے شادی کرلیتی ہے کہ جس قدر دولت مندی کی وہ عادی تھی اس کا عاشق اس قدر دولت مند نہیں تھا۔ اسی کے مقابلہ میں ہندستانی شریف خاندانوں کو دیکھ لیجیے جہاں عموماً لڑکی کو زیادہ عمدہ کپڑے اس وجہ سے نہیں پہناتے کہ نہ معلوم کہاں تقدیر ہو۔ اپنے بچے کو کون نہیں چاہتا اس کے آرام میں اپنا آرام کون نہیں دیکھتا مگر بات یہ ہے کہ ان گئے حالوں پر بھی ہندستانی کی نظر صرف دولت ہی پر نہیں جاتی۔

دوسرا پہلو جس کا اشارہ کیا جاچکا ہے یہ ہے کہ آیا انگریزی طریقہ شادی کا ٹھیک ہے یا ہندستانی۔ انگریزی طریقے میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ اعزاء و اقربا دونو جوانوں کو ان کی طبائع

کا لگاؤ پہچان کر اگر ناموزوں جوڑ نہ ہو تو ارتباط بڑھانے کا موقع دیتے ہیں جس کا نتیجہ شادی ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ نہایت ہی قرین عقل و انصاف ہے لیکن یہ تصور کرنا کہ ربط ضبط کی وجہ سے عورت مرد ایک دوسرے کے عادات خصائل کمزوریوں اور نیز زبردستیوں سے واقف ہو جاتے ہیں بڑی غلطی ہے۔ آپ نے سنا نہیں کہ ''خبث نفس نہ گردد بسالہا معلوم'' اور پھر اس وقت جبکہ ہر دو جانب کوششیں یہی ہوں کہ صرف روشن پہلو دوسرے کی آنکھ میں چکاچوندھ ڈال دے۔ اگر لوگ کورٹ شپ ہی کے زمانے میں صحیح رائے قائم کر سکتے تو یقیناً کوئی شادی خراب نتیجہ نہ دکھاتی، جوانی کا عالم آرزوؤں، مرادوں کا زمانہ دو دل یکجا ہیں مگر بیچ میں تلوار رکھی ہے۔ بقول برنارڈ شا کے اس حالت کو جس قدر طول دیتے چلے جائیے گا آنکھوں پر پردے اور زیادہ گہرے پڑتے جائیں گے۔

صحیح رائے خدا کے لیے بتائیے کیونکر قائم ہو گی۔ یہ تو ان شادیوں کا حال ہوا جو شومی بخت سے بری ثابت ہوئیں۔ اب ان شادیوں کو لیجیے جو آرام و آسائش کی ثابت ہوئیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ صرف کورٹ شپ کا نتیجہ ہے۔ اگر کورٹ شپ کی وجہ سے ہوتیں تو بعض ہندستانی شادیاں کیوں آرام کی ہوتیں۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ اصل جزو جو آرام کی زندگی زوجین کو نصیب کرتا ہے وہ کوئی اور ہو گا۔ امر واقعی یہ ہے کہ ہر صحیح تندرست انسان میں اتنے اغراض دوسرے سے وابستہ ہیں کہ اگر کوئی خاص موانع مثل سخت اختلاف مزاج کے جیسے کتے اور بلی میں یا سانپ اور مور میں ہوتے ہیں نہ ہوئے تو کوئی دو انسان باہم آرام کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ سانپ اور مور کے اوپر یاد آگیا کہ ایف ڈبلیو مین نے اپنی خوبصورت ہندو کہاوتوں میں قدیم زمانے کے ایک راجہ اور رانی کا ذکر کیا ہے جن میں اختلاف طبائع کا یہ تھا کہ راجہ کو قریب پا کر رانی بے ہوش ہو جاتی تھی اور ایک پنڈت نے بتایا کہ پہلے جنم میں تم مور اور سانپ تھے۔ خیر یہ تو اگلے زمانے کی باتیں ہیں مگر اختلاف طبائع اگر بے انتہا ہوا تو آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ دو آدمی آرام کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے شادی کو جوا کہتے ہیں لیکن ہزاروں میں کہیں ایک ایسا اتفاق ہوتا ہے جس میں تمام غرضوں کے اوپر طبیعت کا اختلاف غالب آجائے اگر کورٹ شپ کی چمک دمک ملمع کو تھوڑی دیر کے لیے دور کر دیجیے جو

یورپین ناولوں وغیرہ سے پیدا ہو جاتا ہے تو ڈاکٹر جانسن کے قول کی تصدیق ہر دل کرنے لگتا ہے۔ یعنی ''میرے نزدیک اہلی زندگی میں فرق عظیم نہ آئے۔ اگر لارڈ جینسلر شادیاں تجویز کردیا کریں'' ہر شخص جو پراپا گنڈا کے معنی سے کچھ بھی واقف ہے جانتا ہے کہ ایک کام کے لیے نہ معلوم کتنے دوسرے کام کرنے پڑتے ہیں۔ یورپ کی معاشرتی زندگی کا مقتضی یہی ہے جو وہ کرتے ہیں مگر اس غرض کو پورا کرنے کے لیے ان کو مجبوراب یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ جب تک محبت نہ پیدا ہو شادی نہ کرنا چاہیے اور ہر شخص اسی کا مدعی بھی ہے لیکن اصلیت دیکھیے تو کچھ اور ہی ہے۔

میکس نارڈو مشہور جرمن مصنف اپنی کتاب ''تہذیب حال میں جھوٹ کا فتوائے جواز'' میں کہتا ہے کہ پچھتر سیکڑہ شادیوں میں صرف محبت بدنام ہوتی ہے اور دوسرے مصالح پورے ہوتے ہیں۔ جارج ہرتبہ کی تحقیقات کے موافق 90 فیصدی شادیاں ایسی ہی ہوتی ہیں خدا نہ کرے کوئی غلط خیال قائم ہو جائے۔ عورت اور مرد کے تعلقات خدا کی عام ترین نعمات میں سے ہیں اور ہر شخص اس کے مزے سے واقف ہے لیکن جب بحث کریں گے تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ مسئلہ زیر بحث اس چیز سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتا جس کا تجربہ ہم ہندستانیوں کو ہے جس انگریز سے باتیں کیجیے یہی پایا جائے گا کہ اس کے خیال میں ہندستانیوں کو محبت کی نعمت میں حصہ ہی نہیں ملا۔ ایک تجویز رخصت کرایانے کی دفعہ کے متعلق دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا جس میں مجوز صاحب نے از روئے فلسفہ ہندستانی طریقہ پر اعتراضات جڑ کر اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ ان لوگوں میں صحیح جذبۂ محبت کا کہیں پتہ بھی نہیں لگتا۔ انگریزی قوم کو دیگر اقوام کے لوگ ''اسناب'' کہتے ہیں یعنی ہچو من دیگرے نیست'' کا پیالہ پیے ہوئے ہیں۔ مضمون زیرِ غور اس کی پوری تصدیق کرتا ہے۔ بھلا غور کیجیے کہ دنیا کی سب سے بڑی روحانی فضیلت دماغ کا سب سے لطیف کارنامہ فطرت کی سب سے عظیم ودیعت خدا کی سب سے بڑی موہبت کہ جب وہ قدم آگے بڑھاتی ہے تو تمام صفات انسانی اس کا دامن ہاتھ میں لے کر مدارج طے کرتے ہیں اور اقتصادی، معاشرتی، مذہبی، اخلاقی منازل قطع کرتے ہوئے حسن مطلق تک پہنچ جاتے ہیں لیکن یورپ کے نزدیک ہم اس سے محروم ہیں۔ حالانکہ اس کے بڑے بڑے مصنفین کو دیکھ لیجیے مشکل سے

کوئی ایسا ملے گا جو خود اس کا رونا نہ روتا ہو۔

شیکسپیئر کہتے ہیں مرد جب کورٹ شپ یعنی (نسبت) کرتا ہے تو اپریل (بہار) ہوتا ہے جب بیاہ کرتا ہے تو دسمبر (پت جھڑ) ہو جاتا ہے۔ ٹالسٹائے فرماتا ہے ''سو میں مشکل سے ایک ملے گا جس نے شادی سے پہلے شادی نہ کی ہو اور پچاس میں مشکل سے ایک نکلے گا جس نے بی بی کو دھوکا دینے پر کمر نہ باندھی ہو۔ اگر آپ مجھ سے پوچھتے ہیں تو شروع کی محبت فطرت کا جوشِ حیات ہے جو اپنے موقعہ پر مناسب ہے جیسے سوڈا واٹر کا ابال کہ اگر نہ ہو تو گیس کا فائدہ بھی ہوا ہو جائے۔ اس کے بعد والی محبت البتہ سدِ سکندری کی طرح عمیق بناء پر قائم ہے لڑکوں میں اشتراک بہتر زمانے کی یاد، انحطاط یا وسطِ حیات میں ایک کو دوسرے کا سہارا، ایثار اور استیثار کا خلاصہ اصل بندشیں ہیں جو دو دلوں کو اس طرح ملاتی ہیں کہ پھر وہ جدا نہیں ہوتے اور ایک کے مرجانے پر بھی زندہ رہتے ہیں۔ یہی وہ محبت ہے جو کورٹ شپ سے بے نیاز ہے۔

برنارڈ شا نے انسان فوق الانسان کا جید ڈراما لکھا تو بہت سے نوجوانوں نے استفسار کرنا شروع کیا کہ اگر آپ کا یہ منشاء ہے کہ ہم لوگ انگلستانہ کی ضمانت نظری کر دیں تو ہم طیار ہیں تجربہ کار مصنف نے جواب دیا کہ خبردار کہیں ایسا کرنا بھی نہ کہ بغیر اس بندش کے مل جانا۔ ایجاب و قبول تو ہر جگہ ہوتا ہے لیکن اصل چیز اس کا اعلان اور قانونی بندش بھی ہے۔

پھر جب یہ ٹھہری تو وہ ناول نویسوں کے دعوے اور نوجوانوں کے دم خم کہاں باقی رہے امیر کا شعر کورٹ شپ کی کیا خوب تعبیر کرتا ہے ؎

نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزا میں کیا کہوں آغاز آشنائی کا

اسکر وائلڈ نے اپنے اشعار نثریہ میں ایک مضمون لکھا ہے جو بعد از مرگ مصیبت کا مرثیہ ہے۔ لیکن اُس زندہ بہار شادمانی یعنی کورٹ شپ کی بے ثباتی کا بھی پتہ دیتا ہے جس پر نوجوانوں کو ناز ہے ''عالم برزخ میں ایک روح جو نیک ارواح میں سے ہے جناب باری

میں بار بار التجا کرتی ہے کہ بار الہا مری نیکیوں کے بدلے مجھے اجازت دے کہ کھڑے کھڑے دنیا میں جاؤں اور اپنے عاشق کو تسکین دے کر الٹے پاؤں واپس آؤں مگر باب اجابت بند کا بند رہتا ہے اور مانگنے والی مانگے جاتی ہے یہاں تک کہ حکم ہوتا ہے کہ جا مگر واپس آکر اس کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ وہ روح دنیا میں آتی ہے وہی کمرہ ہے وہی بیٹھنے کی نرم جگہ ایک دوسری عورت گرم کیے ہے اور عاشق کہہ رہا ہے ''ہاں میں چاہتا تو اس کو بھی تھا مگر تیری محبت تو کوئی دوسری ہی چیز ہے جس کا مزہ ہی نرالا ہے۔'' ان دونوں کے پس پشت ایک شعلہ اٹھتا ہے اور بیچاری مستہام روح جناب رب العزت میں عرض کرتی ہے کہ میرے مالک عذاب زیادہ کر کیونکہ میں اس عذاب کا مزہ چکھ آئی ہوں جس کے آگے دوسرے عذاب غنیمت ہیں۔ دور کے ڈھول سہاؤنے یہ کورٹ شپ ہے اور یہ اس کے برتنے والے انگریز حضرات والا صفات کی باتوں پر ہنسی آتی ہے کہ ایک شادی کی رسم تو بر بنائے اقتصاد تجویز کی ہے اور فرماتے ہیں کہ جی نہیں۔ میں تو اخلاق حسنہ کا حامی ہوں عیاشی کرنے کے لیے چاہے کرلوں مگر دم محبت ہی کا بھرے جاؤں گا۔

ملاحظہ ہو جرمنی کا بہت بڑا ماہر بلاک جس کی کتابوں کے ترجمے ہر زبان میں موجود ہیں (گو ہمارے یہاں نہیں) خاص آپ کے بارے میں کیا خیال ظاہر کرتا ہے۔

انگریز ڈان[1] جان کا کینڈا جنوبی اور ٹیوٹانک یعنی جرمن اقوام کے ''ڈان جانوں سے بالکل ہی جدا ہے۔ ان کی خصوصیات میں محبت کی گرم جوشی سے زیادہ جس چیز کا جزو ہے وہ دوسرے کے اوپر فتح حاصل کرنے کا ناز ہے فتویٰ شہوانیہ کو راضی رکھنا اصل تقاضا نہیں ہے بلکہ اس حالت میں بھی سرد مہری ان کا منہ چڑھاتی رہتی ہے۔

سوپ تو سوپ ہنسے چھلنی کیا ہنسے جس میں بہتر چھید مگر صرف سننا ہی نہیں پڑتا بلکہ ہمارے نوجوانوں کے دل میں یہ خیالات اس طرح جاگزیں ہوجاتے ہیں کہ اگر اس کے

---

[1] ڈان لقب ہے جوان برورن دھواں ایک بڑا عیاش جس کے متعلق مختلف یورپین زبانوں میں قصے لکھے گئے ہیں۔ لارڈ بائرن اور برنارڈشا نے بھی لکھا ہے موزارٹ کا ڈراما جرمنی میں بہت مشہور ہے۔ یہ شخص حسب روایات آخرکار جہنم میں ڈال دیا گیا۔ برنارڈشا نے اس کو ایک نہایت خوبصورت پیرایہ میں بے قصور ثابت کیا ہے۔ اصطلاح میں عیاش کو کہتے ہیں۔ ہماری زبان میں عورتوں کا بھیڑیا مفہوم کو ادا کردے گا۔

خلاف سنتے ہیں تو یقین نہیں آتا اور جب یقین ہوتا ہے جو اچنبھا ہوتا ہے۔ یورپین شادی کے اصول کی قلعی ناروے کے مشہور فلاسفر اور ڈراما نویس اِبسن نے ڈالز ہاؤس میں ایسی کھولی ہے اور ان کے دعوائے محبت کی وہ دھجیاں اڑائی ہیں کہ اس کے بعد چڑیوں کا گانا از روئے محبت غنیمت معلوم ہوتا ہے مگر ان انسانوں کا اظہار عشق بے معنی بکواس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ متذکرہ بالا ڈراما میں قصہ یہ ہے کہ ایک میاں بی بی دو قمریوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں کہ بی بی شوہر کے آرام کے خیال سے ایک جعل بناتی ہے شوہر کی محبت بدنامی کے خوف سے غائب ہو جاتی ہے۔ جب وہ خدشہ دور ہو جاتا ہے محبت پھر عود کر آتی ہے۔ عورت کہتی ہے کہ تم نے مجھ کو عمر بھر دھوکے میں رکھا۔ واقعی تم کو مجھ سے محبت نہیں تھی بلکہ صرف اپنے لطف کے لیے پیار تھا کہ جب تک بدنامی کا خوف نہ تھا باقی تھا جب وقت پڑا تو تم نے میری دل سوزی کی قدر نہ کی اور جب وہ خوف مٹ گیا تو پھر عاشق معشوق ہو گئے۔

اگر میرا دعویٰ اب بھی دلیل کا محتاج ہے تو حسب ذیل ترجمہ ملاحظہ ہو۔

''ڈاکٹر این ٹن جے گراس ہانسنگر کی پرانی مگر دلچسپ کتاب جس کا نام ''عورتوں کا مسئلہ اور کسبی کا پیشہ، رومن کیتھولک مذہب میں طلاق نہ ہو سکنے کی رو سے خصوصاً اسٹریا کے قانون میں اور زمانہ حال پر فلسفیانہ نظر'' اس میں ایک ایسی فہرست ملتی ہے جو عالم علم النفس حکیم قانون داں اور عالم علم القوم سب کے لیے یکساں دلچسپ ہے۔ نیز اس شخص کے لیے بھی کارآمد ہے جو حیات انسانی پر نظر رکھتا ہو۔ اس میں سو شادیوں کا نقشہ دیا گیا ہے اور دیگر شادیوں کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے اور گم شدگی سے بچائی جائے کیونکہ ہمارے زمانے کی شادیوں پر بھی یہ مثالیں پورے طور سے صادق آتی ہیں۔ سب سے پہلے تو مصنف شادی کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ یہ دیکھتے ہوئے کہ کس قدر تعداد ان لوگوں کی ہے جنھوں نے خوشگوار زندگیاں قانون کے اندر رہ کر اور پھر بھی فطرت کے موافق بسر کی ہیں۔ آیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ قانون نکاح اور مذہبی اصول اور معاشرتی ضابطہ نے وہ منشا پورا کیا جس کے لیے وہ بنائے گئے تھے۔ آیا یہ کہ ان طریقوں سے عموماً

شادیاں خوشگوار، بارور، آبرو کی اور مبارک بھی ہوئی ہیں؟ مصنف کو شروع شروع کیتھولک دنیا کے سامنے یہ تصویر جو واقعات پر مبنی ہے پیش کرتے ہوئے بہت پس و پیش تھا۔ حالانکہ یہ تصویر بہت تجربوں اور جانچ کے بعد تیار ہوئی تھی۔ اس نے مختلف طبع اور مختلف حیثیت اور نسب کے سو آدمیوں کی شادیوں کی جانچ کی۔ اس نے کوئی انتخابی قاعدہ نہیں اختیار کیا جیسے آتے گئے ویسی ہی سپرد قلم ہوتے گئے۔ اس نے پھر ایسے ہی دوسرے سو بیاہے (شادی شدہ)۔ آدمیوں کو لیا اور تیسری بار پھر سو شادی شدہ لوگوں کو جانچا۔ ہر بار نتیجہ وہی نکلا اور خوشگوار اور ناخوشگوار شادیوں کا یہی تناسب نکلا۔ خود مصنف کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

گو کہ میں نے دل و جان سے واقعی دلی مسرت کی شادیوں کی تلاش کی مگر اس وقت تک میں ناکامیاب رہا اور میں آج تک دعوے کے ساتھ یہ نہ تعین کر سکا کہ واقعی صحیح آرام کی شادیاں سوا نادرات کے عام بھی کہی جا سکتی ہیں۔

مصنف کے خیال میں یہ نقشہ جو بہم پہنچایا ہے غلط رائی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ نپی تلی جانچ سے اخذ کیا گیا ہے جس میں برسوں لگے ہیں اور ایسے ذرائع کی وجہ سے ہاتھ لگے جو مختلف طبقوں میں در آنے کے اس کے پاس تھے۔

آپ اس طویل مشکل اور احتیاط کی سو شادیوں کی فہرست جس میں ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں ملاحظہ ہو۔

طبقہ امراء

1۔ شادی غنیمت، بی بی بیمار۔ آتشک کا شک، شوہر کی پاکبازی شادی کے پہلے مشکوک، لڑکے بیمار۔

2۔ آخر زمانے میں میاں بی بی دونوں خوش جوانی میں شوہر نے آزادانہ زندگی بسر کی۔

3۔ آخر عمر میں میاں بی بی دونوں خوش، لاولد۔

4۔ میاں نامرد بی بی مغموم۔

5۔ میاں بڈھے بی بی بے وفا۔

6۔ میاں بی بی ظاہراً خوش لڑکے کنٹھ مالا میں مبتلا۔

7 میاں مجبوراً گھر سے دور بی بی بے وفا۔

8۔ میاں بی بی دونوں ناخوش، شوہر عیاش۔

9۔ ظاہراً دونوں آدمی آخر عمر میں خوش۔

10۔ شوہر بڑا عیاش آوارہ، بی بی مغموم مگر چپ، لاولد۔

11۔ ایضاً۔

12۔ بے جوڑ شادی مگر خوش۔

13۔ شوہر بلغمی خوش مزاج، بی بی بہت آوارہ، لڑکے بیمار۔

14۔ شوہر آوارہ بی بی چپ، میاں بی بی نے آپس میں طے کرلیا کہ حالت لاعلاج ہے۔

15۔ شوہر آوارہ بی بی آوارہ دونوں آتشک میں مبتلا، لڑکے بیمار۔

16۔ دونوں آدمی بیماریوں میں گھرے ہوئے اور پریشان، شوہر عیاش، بدمزاج، بی بی بیمار، روز بروز گرتی جاتی ہے۔

17۔ شوہر ذلیل عیاش، بی بی سے بگاڑ، بی بی مغموم

طبقہ متوسطین کا اعلیٰ حصہ

18۔ دونوں آدمی بیزار، شوہر نامرد، بی بی سن کی اوتری مگر آوارہ، لاولد، دن رات دنگافساد۔

19۔ دونوں آدمی ایک حد تک بسبب نیک دلی اور نرم مزاجی کے خوش، شوہر شہوت پرست، بے وفا، بی بی باوفا اور بیمار۔

20۔ دونوں آدمی مغموم، دن رات کی دانتا کل کل۔

21۔ بلغمی مزاج شوہر، دولت مند، بی بی بیمار، لاولد ظاہر بظاہر خوش۔

22۔ دونوں آدمی انحطاط کے زمانے میں خوش، گزشتہ زندگی مشکوک، لڑکوں کو کنٹھ مالا۔

23۔ شادی سے پہلے بی بی اونچے درجے کی خانگی تھی شوہر آوارہ تھا، لاولد۔

24۔ ظاہر بظاہر آرام کی شادی، شوہر جوان بی بی بڈھی، شوہر چھپے چھپے اپنا دل خوش کر لیتا ہے۔

25۔ ناخوشگوار شادی، دونوں آدمی بیزار، شوہر آوارہ، بی بی برداشت کرتی ہے۔

26۔ واقعی آرام کی شادی۔

27۔ مشکوک آرام کی شادی۔

28۔ نہایت ہی ناخوشگوار شادی، شوہر آوارہ، بداطوار، بی بی نیم حواس، لڑکے آتشک زدہ۔

29۔ ناخوشگوار شادی، شروع شروع میں شوہر نے کچھ بے وفائی کی، بی بی نے آج تک معاف نہ کیا۔

30۔ نہایت ہی خوشی کی شادی، دونوں آدمی آوارہ زناکار بی بی شوہر کے علم میں کماتی ہے، شوہر کی متعدد آشنائیں ہیں، دونوں آدمی حکیمانہ نظر رکھتے ہیں۔

31۔ شوہر اصول اخلاق کا دشمن جس کا پیشہ عورتوں کو پھانسنا ہے، بی بی بگاڑ کیے ہوئے۔

32۔ خوشگوار شادی، شوہر حسن پرست مگر حد کے اندر بی بی نرم مزاج، صابر چاہنے والی اور باوفا۔

33۔ شوہر اعمال کی سزا بھگتتے ہیں۔ بی بی بے پروا ہَین ہَین کی شادی۔

34۔ شوہر بی بی کے روپیہ سے آرام میں ہیں۔ مگر بی بی سے لاپروا، بی بی بیمار، روز بروز گھٹتی جاتی ہے۔

35۔ شوہر نامرد، بی بی شوہر کے علم میں ایک دوست سے بے تکلف، ایک طرح سے آرام کی شادی کہہ لیجیے۔

36۔ دونوں بے حیا اور آوارہ، لامذہب، ایک دوسرے سے بے پروا، اچھی خاصی آرام کی شادی۔

37۔ شوہر بڈھا، بیمار، ازکار رفتہ عیاش، بی بی ایک دوست سے بے تکلف، اچھی خاصی

آرام کی شادی۔

38۔ ناخوشگوار شادی، شوہر بلغمی مزاج، بی بی نہایت ہی مغلوب الشہوت۔

39۔ ناخوشگوار شادی، روپیہ کے لالچ سے ایک امیر آدمی کی بی بی کو بھگالایا اور پھر اس کو بھی چھوڑ دیا، لاولد۔

40۔ شوہر کثرت کی وجہ سے نامرد، بی بی آوارہ، خوشگوار تعلقات۔

41۔ شوہر کثرت کی وجہ سے نامرد، بی بی صابر خوشی کی شادی۔

42۔ ایضاً

43۔ خوشگوار شادی، دونوں آدمی بالکل جوان ابھی آزمائش نہیں پڑی۔

44۔ خوشی کی شادی، شوہر بلغمی مزاج، بی بی باوفا۔

45۔ شوہر کثرت کی وجہ سے نامرد، بی بی امیر، فی الحال خوشگوار شادی۔

طبقہ متوسطین کا ادنیٰ حصہ

46۔ خوشی کی شادی، شوہر بلغمی، کبھی کبھار بے وفائی کر لیتا ہے، بی بی برداشت کرتی ہے، باوفا اور نیک ہے۔

47۔ خوشی کی شادی، دونوں آدمی جوان اور دولت مند، شوہر چوری چھپے تاک جھانک کر لیتا ہے۔

48۔ ناخوشگوار شادی ضرورتاً دباؤ سے شادی ہوگئی ہے۔ شوہر ایک رنڈی رکھے ہے، بی بی سے بگاڑ ہے۔

49۔ ناخوشگوار شادی، غریبی، جلاپا، لاولدی۔

50۔ خوشی کی شادی، بی بی برداشت کرتی ہے اور بدمزاج غصہ ور شوہر کا خیال رکھتی ہے۔

51۔ ناخوشگوار شادی، شوہر ایک خانگی کی صحبت میں خوش، بی بی ایک بے وفا آشنا کی صحبت میں بھی ناخوش۔

52۔ ناخوشگوار شادی، بلغمی مزاج شوہر آوارہ بی بی، دن رات تو تو میں میں۔

53۔ ناخوشگوار شادی، شوہر زن مرید، نامرد، بی بی لڑاکا، غصہ ور زبردست۔

54۔ میاں بی بی نے بگاڑ کرلیا ہے۔

55۔ خوشگوار شادی، شوہر نیک مزاج اور دھوکے میں رکھا گیا ہے۔ بی بی مغلوب الشہوت، آوارہ، لڑکے غیر تندرست، عورت کو لاعلاج امراض۔

56۔ خوشگوار شادی، شوہر از کار رفتہ پرانے عیاش، بی بی کبھی کسب کراتی تھیں اب اتری ہوئیں۔ دونوں ایک طرح کے لاعلاج امراض میں مبتلا۔

57۔ خوشگوار شادی، ضرورت اور موٹاپے کی وجہ سے۔

58۔ شوہر جعلیا فریبیا، جس طرح سے ممکن ہے گھر والوں کو آرام دیتا ہے، بی بی پہلے کسبی تھی۔ شوہر کی دلجوئی کی وجہ سے خوشی کی زندگی بسر کرتی ہے۔

59۔ خوشگوار شادی، دونوں رنگین مزاج، دونوں ایک دوسرے کو آزادی دیے ہوئے ہیں۔

60۔ ایضاً

61۔ خوشگوار شادی، شوہر نے نہایت ہوشیاری سے اپنے ہتھکنڈے چھپائے ہیں، بی بی باوفا اور ہر وقت دلجوئی کرنے والی۔

62۔ ناخوشگوار شادی، دونوں طرف لغزشیں اور اس کے ناگزیر نتائج۔

63۔ ناخوشگوار شادی، شوہر کی وفاداری میں کلام کی گنجائش۔

64۔ ایضاً

65۔ ایضاً

66۔ ناخوشگوار شادی، شوہر نے بی بی کے روپے سے کاروبار کیا ہے اور آوارگی میں اڑاتا ہے، بیوی بدمزاجی کے ذریعہ سے بدلہ نکال لیتی ہے، مصلحت کی وجہ سے شادی ہوئی تھی۔

67۔ ناخوشگوار شادی، روپیہ کے لالچ میں، جوان شوہر کو بڈھی ناکوں چنے چبواتی ہے،

شوہر شراب پی پی کر جان دے رہا ہے۔

68۔ دونوں کنجوس مکھی چوس، ہم خیالی اور خودغرضی کی وجہ سے خوشگوار شادی۔

69۔ عصمت بی بی از بے چادری، انتہائی غریبی میں ایک دوسرے کو نہ چاہیں تو کیا کریں۔

70۔ خوشگوار شادی، شوہر بڑا شرابی، عورت لالچی، لاولد۔

71۔ بگاڑ ہوگیا، شوہر نے بی بی کو چھوڑ دیا، غریبی میں کسب کرانے لگی۔

72۔ ناخوشگوار شادی، شوہر نامرد، بی بی پرشہوت، ہر وقت لڑائی۔

73۔ میاں بی بی دونوں جوان، بی بی ایک دولت مند یہودی کے تعلق میں ہے، وہی گھر کا خرچ چلاتا ہے۔

74۔ ناخوشگوار شادی، شوہر آوارہ، بی بی سے بے پروا، بی بی لاعلاج مریض، لڑکے آتشک زدہ۔

75۔ ناخوشگوار شادی، دونوں فریق محتاج بیمار۔

76۔ کاروبار کی بنا پر شادی ہوئی ہے، شوہر نے تین دولت مندوں کے سامنے بی بی کو یکے بعد دیگرے پیش کیا، اسی پر روٹیاں چلتی ہیں۔

77۔ بداخلاقی کی تصویر، شوہر ایک جعل فریب کا پیشہ کرتے ہیں، بی بی کو ایک پرانے آشنا پنشن دے گئے ہیں، لڑکیاں ماں کا رویّہ سیکھ رہی ہیں۔

78۔ ایک طرح کی غنیمت شادی، شوہر پہلے خدمت گار تھے، اب کاروبار کرتے ہیں، بی بی پہلے کماتی تھیں، کچھ اندوختہ کیا تھا، لاولد۔

79۔ خوشگوار شادی، عورت چلتی ہوئی، شوہر گھامڑ۔

80۔ ناخوشگوار شادی، شوہر بی بی کی صورت سے جلتا ہے، وہ بھی جان عذاب میں کیے رہتی ہے۔ روپیہ پیسہ ساتھ لائی تھی۔

81۔ آوارہ شوہر، آوارہ بی بی، بگاڑ ہے، لڑکوں کو کنٹھ مالا۔

82۔ نامرد شوہر، پُرشہوت عورت، بیمار لڑکے، ہر وقت جوتی میں دال بٹتی ہے۔

83۔ ادھیڑ عمر کے عیاش منش شوہر، جوان بی بی بے فکری اور دولت کی وجہ سے خوشگوار تعلقات۔

84۔ رنگین مزاجی کی شادی، بی بی ایک امیر آدمی کی نوکر ہیں، گھر کا کام آرام سے چلتا ہے۔

طبقہ ادنیٰ

85۔ آوارہ شوہر، پہلے جہیز کی دولت تھی، اب دونوں فقیر، بازار میں چھوٹی پونجی کی دلالی کرتے ہیں، بی بی مریض، لڑکے مر گئے۔

86۔ غریبی میں ایک دوسرے سے خوشگوار برتاؤ کرتے ہیں۔

87۔ خاندان بھر کٹنا پا کرتا ہے۔

88۔ بڑی خوشگوار شادی، میاں چور، بی بی چھنال۔

89۔ غریبی کی وجہ سے ناخوشگوار شادی۔

90۔ ناخوشگوار شادی، شوہر شرابی، بی بی غریبی اور مشکلات میں محنت مزدوری کرتی ہے۔

91۔ ناخوشگوار شادی، غریبی، جَلاپا، بیماری، شکایات، جا و بے جا۔

92۔ نوکر لوگ، بی بی اور لڑکی آقائے ولی نعمت کی چپّی کرتی ہیں۔

93۔ ناخوشگوار شادی، دنگا فساد، بے اعتباری، نفرت و حقارت۔

94۔ ناگوار شادی، راست باز شوہر، جس کو بی بی دھوکا دیتی ہے اور غریبی کی وجہ سے شوہر کا دباؤ نہیں مانتی۔

95۔ ناخوشگوار شادی، شوہر چھوڑ کر بھاگ گیا۔

96۔ شادی بداخلاقی کا نمونہ، ماں باپ لڑکیاں سب کی زندگی حرام کاری پر بسر ہوتی ہے۔

97۔
98۔ نہایت غریب، تباہی کی شادیاں، سب کے سب محتاج خانہ میں پہنچ گئے۔
99۔

100۔ واقعی خوش نصیب جوڑا، زندگی کی کڑیاں ساتھ جھیلیں ایک نے دوسرے کی فروگذاشتیں بھلا دیں، سکھ دکھ میں ساتھ نہ چھوڑا، ایک پاکبازی کا ساتھ بہتر سے بہتر معنی میں۔

اس طویل فہرست کے گوشوارے حسب ذیل ہیں۔

نمبر 1۔

ناخوشگوار تعلقات	فیصدی	48
بَین بَین کے تعلقات	فیصدی	36
واقعی خوشگوار تعلقات	فیصدی	15
راست بازی کے تعلقات	فیصدی	؟
راست بازی بہ پابندی شرع	فیصدی	

کون ہوتا ہے حریف مۓ مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

نمبر 2۔

بنوع دیگر۔

اپنے ارادے اور خواہش کی وجہ سے بداخلاق شادیاں	فیصدی	14
آوارہ اور عیاش مزاجی کی وجہ سے بداخلاق شادیاں	فیصدی	15
واقعی ایسی جن میں بدی کا گمان بھی نہ ہو سکے	فیصدی	؟

دریں جہاں گل بے خار کس نچید آوے چراغ مصطفوی با شرار بو لہبیت

نمبر 3۔

بیبیاں جو شوہر کے کرتوتوں بیمار ہوئیں	فیصدی	20
بیبیاں جو بغیر شوہر کی برائی کے کیفر کردار کو پہنچیں	فیصدی	30
بیبیاں جو اپنے افتاد طبیعت کی وجہ سے تکلیف میں تھیں	فیصدی	12

تعدد ازدواج کا سوال بھی اس قابل نہیں کہ نظری کر دیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک شادی سے بہت سی جھنجھٹیں مٹ جاتی ہیں اور زندگی کی روانی میں موجیں کم اٹھتی ہیں، لیکن طبائع مختلف ہیں اور اگر یہ ترکیب فطرت کے خلاف واقع ہوئی ہے تو اچھی کہے جانے کی مستحق نہیں۔ میرے پڑھنے والے تعصب سے ذہن کو خالی کر کے میری گزارش سنو اگر اس کے بعد بھی لغو اور مضر معلوم ہو تو مجھ کو شکایت نہ ہوگی۔ دنیا کا کوئی حصہ مشکل سے ایسا ملے گا جہاں زیادہ تر لوگوں نے ایک ہی وقت میں ایک عورت سے زیادہ کو نہ جانا ہو، یا اس کی عمر بھر میں کسی وقت حسرت نہ ہوئی ہو، جن ممالک میں تعدد ازدواج جائز ہے وہاں کا ذکر نہیں، ان ممالک میں جہاں لوگ ایک زندگانی اور ایک محبت کی کہانی کے قائل ہیں وہاں کیا ہوتا ہے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اعترافات کے دفتر تیار ہوسکتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ میں تعدد ازدواج کی ضرورت موجود ہے آئے دن روز طلاق اور نکاح کے نئے قانون ڈھالے جاتے ہیں۔ چونکہ فطرت کے موافق نہیں پڑتے لہٰذا بدلنے پر بھی چول نہیں بیٹھتی۔ ہیولاک ایلس کہتا ہے کہ "ایسے قاعدے بنانا کہ جس سے آدمی تعدد ازدواج کا مرتکب ہو اور اگر وہ اخلاق کا دباؤ نہیں مانتا تو تعدد ازدواج کی ذمہ داریوں سے بچ بھی نکلے یہ معنی رکھتا ہے کہ ان باتوں پر اس کا دل بڑھایا جاتا ہے گویا ہم لوگ ایسی شے کی قیمت اونچی کر رہے ہیں جس کو زبان سے برا کہتے ہیں۔ دنیا کے کسی حصہ میں تعدد ازدواج اس قدر عام نہیں جس قدر کہ عیسائی ممالک میں۔

ایک اور صاحب کا قول ہے کہ مغرب میں عیاشی بمقابلہ مشرق کے بدرجہا سہل ہے "لیکی" کا قول ہے کہ گو ایک دوامی بی بی کا ہونا قاعدہ عام ہے لیکن یہ دعویٰ بیکار ہے کہ اس طرح کے قواعد کسی قوم کی طبیعت کے موافق ہیں۔ چارلس کنگسلی ایسے پادری کا قول

ہے کہ عورت کی دنیا اس وقت تک آرام کی نہیں ہوسکتی جب تک آخری ٹکڑا اس قانون کا مہذب دنیا سے نکال نہ ڈالا جائے گا۔ (327 وومن اینڈ پولی گمی) بلامبالغہ ہزاروں اقوال بڑے بڑے لوگوں کے اس دعوے پر تائیداً پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن سب سے بڑا تائیدی گواہ خود آدمی کی عقل ہے۔ اس کا فتویٰ لے لیجیے۔ بقول شوپنہار کے مرد کے توالد و تناسل کا زمانہ عورت کے توالد و تناسل کے زمانہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ اب فرمائیے کیا کیا جائے؟ آپ فرمائیں گے ضبط کیا جائے۔ فطرت کہتی ہے ہمارا حکم مانو اور آپ فرماتے ہیں ضبط کرو۔ یا تحصیل لاحاصل میں پڑو جو پھر فطرت کے منافی ہے۔ امریکن سوشیالوجسٹ وارڈ کا قول ہے کہ تخلیق کے سمندر کے کناروں پر نہ معلوم کس قدر ہڈیاں چونا ہوکر رہ گئی ہیں۔ یہ ان لوگوں کی ہیں جو خلاف فطرت عمر کی کشتی کو پار لگانے کی کوشش میں تھے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا ویسی ہی ہو جیسا کہ ہونا چاہیے تو جھوٹ کو چھوڑ دو اور سچ کو ویسا ہی دلآویز بناؤ جیسا جھوٹ ہے اس کو ساری کرو، اس کو متعدی کرو اس میں وہ قابلیتیں پیدا کرو جو چھوت کی بیماری میں ہوتی ہیں۔ یعنی اڑ کر لگ جائے اور کوئی شخص سانچ کی آنچ سے بچ نہ جائے۔ اگر وارڈ کی صلاح ماننے کے قابل ہے تو چاہے تعصب آنکھوں پر پردے ڈالے رہے، چاہے غلط تعلیم بجلی چمکاتی رہے لیکن ماننا پڑے گا کہ ہم جو تقلید معاشرتی معاملات میں کر رہے ہیں وہ غلط ہے۔

ہمارے اوپر یہ بھی اعتراض عائد کیا جاتا ہے کہ ہم عورت کی قدر نہیں کرتے۔ معترضین سے کوئی پوچھے کہ آپ اتنی قدر کرتے ہیں، مگر آپ کے قانون نے بی بی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا ہے کہ اگر شوہر بلا وصیت مرجائے تو وہی پیاری بی بی متروکہ میں سے کچھ نہ پائے۔ اگر عورت سے مراد صرف بی بی ہے اور چاہنے سے مطلب صرف چڑیوں کی طرح چہچہانا ہے تو واقعی معترضین سچ کہتے ہیں اور ہم غلطی پر ہیں۔ لیکن اگر عورت میں ماں اور بہن بھی شریک ہیں جو دوبارہ نصیب نہیں ہوسکتیں تو ازار بندی رشتہ قائم ہونے کے بعد ان سے مغائرت یا علیحدگی قابل تحسین نہیں کہی جاسکتی۔ ہر شخص کی اقتصادی، معاشرتی، ملکی، اخلاقی ضرورتیں اس کو مجبور کرتی ہیں جن سے ہم کو واسطہ نہیں لیکن یہ کوشش ہر ہندستانی کا فرض ہے کہ وہ اپنے نوجوانوں کو ان دلآویز مغالطوں سے بچائے،

کیونکہ کئی شادیاں کرنا اس سے تو ضرور غنیمت ہے کہ آدمی شادی ایک ہی کرے لیکن اپنے اختیارات وسیع کردے۔ ایک قوم کے اصول اخلاق و مذہب و معاشرت دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ وہی باتیں جو ایک کے لیے تریاک ہیں ممکن ہے دوسرے کے لیے زہر ہوں۔ عیسائیوں کا فرقہ جو مارمنز کہلاتا ہے اسی کو لے لیجیے۔ ان لوگوں کے یہاں متعدد شادیاں عام طور سے رائج ہیں اور یہ نہایت کامیاب قوم مانی جاتی ہے۔ تجارت، زراعت اور دیگر حرفتوں میں بہترین قوموں کی ٹکر کے سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں زنا کاری کوئی خواب میں بھی نہیں دیکھتا جن لوگوں نے اس قوم کے مسائل کو موقعہ پر جاکر بہ نظر تحقیقات دیکھا ہے۔ وہ ان کی شائستگی، امن پسندی، انتظام، صفائی وغیرہ کے قائل ہیں رشک کے معاملہ میں اختلاف ہے لیکن خود مارمن عورتوں کے خطوط مختلف مصنفین نے نقل کیے ہیں جو رشک کو اپنے سے اسی طرح دور رکھتی ہیں جیسے شائستہ خیال لوگ حسد کو یا سپاہی خوف کو بھگا دیتا ہے۔ رشک، حسد، خوف وغیرہ کا پیدا ہونا فطرت ہے لیکن دوسرے صفات انسانی ان کو دور کرتے رہتے ہیں اور اسی وجہ سے شرع و قانون میں ان باتوں کا گناہ صرف اسی وقت شمار ہوتا ہے جب ان عیوب کی وجہ سے کوئی امر خلاف حکم صادر ہو جائے۔ شادی کے متعلق دو تعلیمیں قرآن کی پیش کی جاتی ہیں جو بات بر بنائے عقل ہو وہ ہر مذہب کے لیے یکساں ہیں۔ مسلمانوں کی تخصیص نہیں۔ پہلا حکم ہے ''اپنی پسند کے موافق دو تین چار شادیاں کرو، لیکن اگر خوف ہے کہ انصاف نہ کرسکو گے پس ایک ہی پر قانع رہو۔'' یہ حکم نان و نفقہ اور دوسرے ظاہری برتاؤ کے لیے ہے یعنی اگر تم دونوں کو کھانے کپڑے خبر گیری توقیر وغیرہ کے معاملات میں ایک حیثیت سے نہیں رکھ سکتے تو کئی شادیاں مت کرو۔

دوسری تعلیم یہ ہے کہ ''تم اگر کوشش بھی کرو تو بھی عورتوں کے بیچ میں انصاف کرنے پر ہرگز قادر نہیں ہو۔ پس بالکل ایک ہی کی طرف ایسا نہ جھک پڑو کہ دوسری کو چھوڑ بیٹھو، جو بیچ ادھڑ میں لٹکی معلوم ہو۔'' اس آیت میں دل کے رجحان کی طرف اشارہ ہے یعنی ظاہری برتاؤ میں برابری ممکن ہے مگر لازمی طور سے ایک کی محبت زیادہ ہوگی۔ اس لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ فرائض کا خیال کرکے دوسری بیبیوں کو بھی جانتے رہو۔ یہ اسی فطرت کا خیال کرکے بتایا گیا ہے جس کو دن رات سب جھٹلاتے ہیں۔ اگر اسی صلاح پر عمل کریں تو دنیا میں زنا بھی کم ہو جائے اور عورتوں کی سچی قدر بھی بڑھ جائے۔ سب سے زیادہ نقصان جو دو یا

زیادہ بیبیوں میں بتایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر محبت میں ساجھا ہوا تو فردیت کی تکمیل مشکل ہے نہ معلوم فردیت کی تکمیل سے کیا مراد ہے۔ شاید یہ ہو کہ انسان بجائے خود ایک مکمل ہستی ہے لیکن وہ اسی وقت مکمل ہوسکتی ہے کہ جب اسے ہر پہلو سے ایسا بنائے یعنی تمام حقوق و فرائض کا توازن قائم رکھے۔ میں پوچھتا ہوں کہ فردیت کی تکمیل ایسی بی بی کے ذریعہ سے کیونکر ہوسکتی ہے جو دھوکے میں رکھی جاتی ہے۔ محبت واقعی فردیت کی تکمیل کرتی ہے.......... مگر محبت اور فطرت یا صداقت میں تال میل بھی ہو۔ فردیت کی تکمیل کا سہرا صرف بی بی کے سر کیوں ہو۔ اگر کوئی اپنی اولاد کو اس کا حق نہ دے اور بی بی سے خوب محبت کرے تو فردیت کی تکمیل کیونکر ہوجائے گی۔ شیکسپیئر نے کنگ لیر کے ڈرامے میں بتایا ہے کہ خواہ کوئی ہو اگر اس کے حق سے اس کو زیادہ دینا چاہو گے تو ایسا ہی گناہ کرو گے جیسا کہ اگر کم دینا چاہتے۔ اگر آدمی انصاف پر نظر رکھے تو ہر فرد کو اُس کا حق دے سکتا ہے۔ اگر بے انصافی پر نظر رہی تو کسی حقدار تک حق نہ پہنچے۔ فطرت نے وہ انتظام کیا ہے کہ اگر انسان اس کا حکم مانتا رہے تو چاہے عورت ہو چاہے مرد سب کو صحیح آسائش نصیب ہوسکتی ہے۔ اگر فطرت سے تفاوت ہوئی تو تمام آرامیں دھوکا ثابت ہوں گی۔ بہت سے غلط خیالات اسی تعلیم کا لازمی نتیجہ ہیں۔ جو ہم لوگوں کو دی جاتی ہے کہ جس میں نہ ہندستانی خیالات پختہ ہوتے ہیں نہ انگریزی اور ہم لوگوں کی حالت اس آدھے کچے آدھے پکے پھل کی سی رہ جاتی ہے جس کو کھیل میں لڑکے توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ مکالے نے کلارکوں کی ضرورت سے یہ تعلیم رائج کی تھی جب اس سے زیادہ بلندی مقصود ہی نہیں تھی تو پیدا کہاں سے ہوتی۔ اسی تعلیم کے مارے ہوئے بابو کہلاتے ہیں۔ کسیٹو لیبان، فرانسیسی محقق تمدن ہند میں ہم لوگوں کو بابو کے نام سے تعبیر کرکے حسب ذیل خیالات ظاہر کرتا ہے۔

"گزشتہ چالیس پچاس برس میں اس انگریزی تعلیم کے پیالے بڑی مقدار میں دسیوں کو پلائے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک انوکھا جدید فرقہ ملک میں پیدا ہوگیا ہے جو بابو یا انگریزی تعلیم یافتہ کے نام سے مشہور ہے.......... بابو ایک عجیب برزخ ہے۔ اس کی دماغی اور اخلاقی حالت عجیب قسم کی ہے۔ ہم اس کے مطالعہ سے معلوم کرسکتے ہیں کہ یہ ایک قسم کی مصنوعی قوم کا فرد ہے جس کے خصائص نہایت عجیب ہیں۔ بابو پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ تعلیم جس کو ہم زمانہ حال میں تمام برائیوں کا علاج سمجھے

ہوئے ہیں جب بلارعایت متعلموں کے دماغ کے دی جائے، تو کیسے برے نتائج اس سے ظہور میں آتے ہیں۔ دماغی اور اخلاقی حالت کے لحاظ سے بابو کی مثال ایک ایسے جہازراں کی ہے جس کا قطب نما گم ہوگیا ہے جو الفاظ اس کے دماغ میں جمع ہوگئے ہیں وہ اس کے سامنے ایسے خیالات کے مترادف ہیں جو اس کی سمجھ کے لیے اجنبی اور ناموزوں ہیں.......... کوئی بات ایسی متعجب کرنے والی نہیں جیسے کہ بابو کے غیر مسلسل و پراگندہ خیالات کی روانی اس کے بے مہار ذہن میں وشنو، شیو، مشتری، پرنس آف ویلز یونان و روم کے مشاہیر، قدیم جمہوری ریاستیں موجودہ بادشاہتیں اور اسی قسم کے صدہا غیر مسلسل و پراگندہ خیالات اس طرح پراگندہ ہیں جیسے فضائی ذرے جن کو ہوا جدھر چاہتی ہے اڑائے لیے پھرتی ہے۔ جدید خیالات کی تعبیر وہ اپنے قدیم موروثی خیالات کے مطابق جو اس کے ذہن میں بیٹھے ہوئے ہیں اور جن تک اس کی رسائی ہے کرتا ہے اور اس پر طرہ یہ ہے کہ وہ اس نئی تعلیم کی بدولت قدیم خیالات کو بھی ٹھیک طور پر نہیں سمجھتا...... اسی کے ساتھ ساتھ اگر ایک بابو کا کسی پرانے دیسی طرز کے تعلیم یافتہ پنڈت سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت اس کے مقابلہ میں کیسا سنجیدہ لائق اور خوش آداب و اخلاق ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی ہمارے یورپی جلسے میں کھڑا کردیا جائے تو خودبخود اس کی عزت و وقار دلوں میں پیدا ہو بخلاف اس کے بابو کی نقلی شخصیت اور اس کے غلامانہ تملق سے نفرت ہوتی ہے۔"

(مترجمہ سید علی بلگرامی مرحوم۔)

غلامانہ تملق کی بہترین مثال جو میری نظر میں ہے عرض کرتا ہوں۔ جس زمانہ میں مانٹیگو مرحوم نے ہندستان میں دورہ کرکے نئے حقوق کا اعلان کیا تھا اور ہندستان کی ایک جماعت نے اس کو ناکافی سمجھ کر لینے سے انکار کیا تھا۔ کلکتہ کانگریس کے جلسہ میں ایک پرجوش ہونہار بنگالی مقرر نے جوش میں مانٹیگو کو وانڈرنگ جیو[1] کہا تھا۔

---

[1] وانڈرنگ جیو، لفظی معنی آوارہ گرد یہودی۔ عیسیٰ علیہ السلام کو اس نے اپنے دروازے پر بیٹھنے نہ دیا تھا۔ آپ نے اس کے لیے بددعا کی۔ تب سے آج تک وہ دنیا بھر میں پھر رہا ہے۔ قبر اس کو قبول نہیں کرتی۔ ملاحظہ ہو اسی نام کی کتاب مصنفہ مین سو۔

بعض یہودیوں نے اس پر اظہار ناراضی کیا تھا جو بالکل بجا و درست تھا۔ پریسیڈنٹ نے اظہار افسوس کر کے دفع دخل کیا اور بات ختم ہوگئی۔ لیکن غور کرنے والوں کے لیے یہ سبق باقی رہ گیا کہ آخر اس ہندو تعلیم یافتہ مقرر نے یہودیوں کو سخت بات کیوں کہی۔ اگر وہ انگریزوں، مسلمانوں، ایرانی یا یونانیوں کو کہتا تو خیر ایک بات تھی کہ ان قوموں سے اچھا یا برا تعلق ہندستان کو رہا ہے مگر یہودیوں سے کبھی کوئی نقصان ہم کو نہیں پہنچا ہے۔ یہ بھی نکتہ قابل لحاظ ہے کہ ہندو مذہب میں کسی دوسرے مذہب والے کو برا کہنے کی گنجائش نہیں (بابو آریہ سماج صاحب معاف کریں گے) کیونکہ اس مذہب میں نئے افراد داخل نہیں ہوتے پھر یہ کیا تھا؟ سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ اس انگریزی داں بنگالی کے دماغ میں یورپ کی تعلیم نے ایسا اثر کیا تھا کہ عین ایسے وقت جبکہ وہ ہندستان پرستی کے جوش میں دوسری قوموں پر معترض تھا اس وقت میں بھی شیکسپیئر کا شائلاک اس کے دماغ کے اوپر قبضہ کیے ہوئے تھا۔ اسی کو غلامانہ تملق کہا گیا ہے۔

ڈاکٹر آنند گوسوامی، اپنی کتاب میں اسی کی طرف اشارہ کر کے ہمارے معترضین کو جلی کٹی باتیں سناتا ہے کہ اب تم لوگ ہم کو ہنستے ہو حالانکہ تم نے خود غلط تعلیم کا طریقہ جاری کر کے بابو تیار کیا ہے جو تمھارے ہی کینڈے پر بنا ہے۔

ایک رکاوٹ رشک کے دھڑکے سے بھی دل میں پیدا ہوتی ہے۔ واقعی رشک و رقابت ایک ناگوار پہلو اہلی زندگی کا ہے مگر دنیا بہشت نہیں ہے البتہ یہاں ٹھیک کام کرنے سے ممکن ہے کہ بہشت کا راستہ سیدھا ہوجائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بھائیوں بھائیوں میں رشک ہوتا ہے اور اگر ماں باپ اپنا فرض ٹھیک طور سے ادا نہیں کرتے تو یہی رشک بعد کو صلۂ رحم قطع کرا دیتا ہے۔ لیکن ماں باپ جیسا ہونا چاہیے ویسے ہوئے تو رشک مساعدت اور محبت سے بدل جاتا ہے جس کی وجہ سے بھائی بھائی کا غم بانٹ کر آدھا کر دیتا ہے اور خوشی میں شریک ہوکر دوگنی کر دیتا ہے۔ اگر شوہر بھی ویسا ہی ہو جیسا موجودہ تعلیم میں ناممکن ہے تو عورتوں کو ان کا حق دے کر راضی رکھے اور ماں بہن بی بی میں عدل و قسط کرے۔ یہی رشک جو راون کی طرح بہت سے ہونق چہرے لیے ہوئے ہم کو خائف کر رہا ہے۔ نیا برن بدلے اور بجائے زندگی تلخ کرنے کے آرام زیادہ کردے۔ سَوتیا ڈاہ جو اختو بختو کی

لڑائی میں دکھائی دیتی ہے عورتوں کو یہ سکھلائے کہ گھر کا انتظام ایک سے ایک بڑھ کر کرے۔ شوہر کی دلجوئی میں ہر وقت مقابلہ رہے، لڑکوں کی تربیت اور تعلیم میں روزافزوں ترقی رہے۔ گھر کو چار چاند لگ جائیں اور شوہر کا سر آسمانِ افتخار میں جا لگے۔ اسی لیے سعدی علیہ الرحمہ کہتے ہیں ''مردیت بہ آزمائے و آنگہ زن کن'' ایک چشم دید حکایت عرض کرتا ہوں۔ میرے ایک عزیز جن کی تعلیم ایک مدت مدید تک سرزمین عراق میں ہوئی تھی اپنے گھر واپس تشریف لائے اور پشتینی جائداد جو بہت قلیل رہ گئی تھی اس پر بہ ہزار قناعت گزران کرتے تھے۔ چونکہ وہ انگریزی ناولوں سے ناواقف تھے، فطرت کے صحیح تقاضے کو سمجھ گئے اور ایک دوسرا عقد کرلیا، میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیا چھپے ہوئے انسانی صفات عود کر آئے ہمت زیادہ ہوگئی تہیہ بڑھ گیا، خوشی دوگنی ہوگئی، چہرے کی شکنیں غائب ہوگئیں جو وقت دفینہ ملنے اور معجزات کے انتظار میں کٹتا تھا معاش کے زیادہ کرنے کی ادھیڑبُن میں صرف ہونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر میں واقعی رونق زیادہ ہوگئی اور آمدنی بڑھ گئی۔ چونکہ شرع کے پابند تھے، لہٰذا اگر ایک کو اچھا کپڑا پہنانا چاہتے تھے تو محنت کرکے دو کے لیے مہیا کرتے تھے، جلاپے کا یہ حال تھا کہ دونوں ہر وقت اس آگ میں جلتی تھیں کہ کون زیادہ دل داری کرتی ہے اور کون دوسری سے زیادہ ہنس مکھ ہے ؎

رشک چہ کنی ست کہ پیش مرداں بہ آید

ایک سے زیادہ بی بی کے ذکر پر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ اگر مرد ایک سے زیادہ شادی کرے تو عورت بھی کیوں نہ کرے جو شخص علم الجنس سے واقف ہے وہ ایسا نہیں کہہ سکتا۔ مرد پر مجامعت کا دائمی اثر نہیں پڑتا، عورت جس مرد کو پہلے پہل جانے گی اس کی تصویر اپنی ذات میں ہمیشہ لیے رہے گی۔

خود بلاک کو (جس کی کتاب صفحہ 201 سے یہ مضامین لے رہا ہوں) یہ بات پسند نہیں آئی ہے مگر علم و انصاف سے مجبور ہوکر اعتراف کرتا ہے کہ زمانہ قدیم کا تجربہ بھی بتاتا ہے خصوصاً اگر عورت کے لڑکا ہو چکا ہے اور جی لومر کی کتاب تو آئندسای کوسس کا ذکر کرکے اپرس ٹاٹ کا قول نقل کرتا ہے جو متذکرۂ بالا مسئلہ کی پوری تائید کرتا ہے۔

طب یونانی کی کتابوں میں لکھا ہے کہ استقرار حمل کے زمانے میں جس مرد کا خیال

عورت کے دل میں ہوتا ہے اکثر بچہ اسی کو پڑتا ہے۔ میرے خیال میں جو لوگ ناسمجھی سے عورت کی طرف داری میں ایسی لغو باتیں کہہ اٹھتے ہیں ان سے عورت کی روح خوش نہ ہوتی ہوگی۔ عورت مرد کی طرح ہری چگ نہیں اس کی خدمات بلند ہیں۔ اس کے افکار بلند ہیں، وہ خدا کی امانت کی امین ہے، وہ مردوں کی خامیوں کا کفارہ ہے، وہ فطرتاً ایک محصی ہے، نسوانیت کی روح پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

سس کا تارے بہت ہیں اور تاروں کا سس ایک
ہم اُس تم کا بہت ہیں اور ہم کا تم اُس ایک

وہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا نہیں کرتی کہ کسی کے دو بیبیاں ہیں یا ایک یوں غلط تعلیم سے جو چاہے سکھلا دیجیے دنیا قائم رکھنا اس کی اصلی غرض ہے۔ اگر وہ اس دھوکے میں ڈال دی گئی کہ کئی بیبیوں سے اس میں ہرج ہوگا تو وہ سوتاپے پر بھی جان دینے کو تیار ہو جائے گی اور خدا واسطے کو جلاپے کا روگ مول لے گی۔

میرے دوستو میں نے اپنے دل کی بھڑاس بہت نکال لی مگر پھر بھی کم نکلی۔ وجہ یہ کہ میں انگریزی خیالات کا شکار ہوگیا اور ہوش تب ہوا جب عمر چالیس بہاریں دیکھ کر پت جھڑ کے قریب آئی۔ یہ مذاق نہیں مرثیہ ہے مجھ کو یاد اور افسوس کے ساتھ یاد ہے کہ کم سنی میں صاحب اولاد ہونے کا حال سن کر مجھ سے ایک انگریز نے طنزاً پوچھا کہ ''تمھارے بیبیاں کے ہیں'' اس وقت میں ایسا یورپ کا پیالہ پیے ہوئے تھا کہ مجھ کو ناگوار ہوا تھا گویا اس نے کوئی بری بات کہی تھی۔ اگر اس وقت مجھ کو عقل ہوتی تو بجائے یورپ کی تقلید کے ایشیا کی تقلید کرتا۔ کون جانے کہ باوجود ہزار در ہزار نقائص کے آج سے بہتر نہ ہوتا ۔

قدرِ ایامِ شباب از فلکِ پیر بہ پرس کہ نداند بجز از پیر کسے قدرِ شباب

ایک زمانہ تھا کہ تمام ان باتوں کو جو اپنے چھوٹے دماغ میں نہ سماتی تھیں، لغو اور غلط تصور کیا کرتا تھا۔ اسی ذیل میں رسول اللہ صلعم کی وہ حدیث بھی تھی جس میں کسی شخص نے اپنی فلاکت کی شکایت کی تھی اور رسول صلعم نے فرمایا تھا کہ شادی کرو اور اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں تب مفلسی دور ہوئی۔ قرآن میں آن یکونوا فقراء یغنهم الله

من فضلہ میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے۔

اب مجھے حدیث متذکرہ بالا کا ویسا ہی یقین ہے جیسے کسی دوسرے قرین قیاس امر کا۔ جن لوگوں کی شادیاں ہوچکی ہیں اور جنھوں نے قولاً وفعلاً یہ ظاہر کردیا ہے کہ ایک کی زندگی دوسرے کے ہاتھ گروی ہے ان کے لیے تو تعدد ازدواج قرین مصلحت نہیں کیونکہ معاہدہ معاہدہ ہی ہے چاہے اسٹامپ پر ہو چاہے دل کی لوح پر اور خدا کسی کی آس نہ توڑے۔ لیکن جن لوگوں کے پاؤں میں ایسی بیڑیاں نہیں پڑی ہیں وہ اگر چاہیں تو شروع ہی سے دفع دخل کرسکتے ہیں۔ یہ آج تک کسی نے نہیں کہا ہے اور نہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہر شخص کئے شادیاں کرے کیونکہ افتادطبیعت ہر شخص کی ایک نہیں لیکن یہ ضرور ہونا چاہیے کہ مصنوعی تعلیم کی وجہ سے لوگ اپنے حقوق اور اپنے فرائض میں کمی نہ کریں۔ ایک عالی ہمت بزرگ قوم جو اس وقت تک بقید حیات ہیں ان کا قول مشہور ہے کہ ''جب میرے لڑکے انگریزی پڑھ کر صرف نام کے مسلمان رہ گئے تب میں نے پھر۔سے بنی ہاشم پیدا کرنے پر کمر ہمت چست باندھی اور ''ہمت مرداں مدد خدا'' وہ کامیاب بھی ہوئے۔ تعدد ازدواج کے اوپر مستقل کتابیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک ملک اور ہر زمانے میں ایک سے زیادہ شادیاں عموماً صرف امراء کیا کیے ہیں۔

غریب جس طرح دوسرے امور میں معذور ہے اس میں بھی ہے۔ آج بھی یہی ہونا چاہیے کہ جو لوگ اپنے ملک اور قوم کی یہ خدمت کرسکتے ہیں اپنے فرائض میں کوتاہی نہ کریں کیونکہ جو لوگ کام کم کرتے ہیں ان لوگوں میں یہ قوتیں دوسروں سے زیادہ ہوجاتی ہیں اور ''ہر کسے را بہر کارے ساختند'' میرے مخاطب دل اور دماغ کے تباہ شدہ رؤسا نہیں جو باپ دادا کی ہمت اور بلند نظری کی شہرت پر زندگی گزارتے ہیں اور عقل و ہنر کا پس ماندہ عیاشی کرکے مٹی میں ملا رہے ہیں بلکہ میرا خطاب ان رؤسا سے ہے جن کے پاس میراث پدری بھی ہے اور علم پدر بھی جو نہ صرف گندے پوتڑوں کے رئیس ہیں بلکہ اعضاء جوارح، ہڈی اور خون کے بھی رئیس ہیں جن کے سر اور سینے پرانے خزانوں کے امین ہیں۔

بہرحال کوئی شادی ایک کرے یا دو چار کرے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہم تقلید کس کی

کرتے ہیں۔ اگر کسی نے متعدد شادیاں کیں اور مارمنز کی تقلید میں کیں یا کسی نے ایک ہی کی اور یورپ کی تقلید میں کی تو وہ اپنے وطن کی خدمت میں قاصر رہا۔ یہی حال پردے وغیرہ کا ہے کہ اگر اس کو یورپ کی پیروی میں چھوڑو گے تو نتیجہ اچھا نہ ہوگا اور اگر اپنی روایات کے موافق چھوڑو گے تو پاؤں پیچھے نہ پڑے گا۔

میرے دوستو کسی دوسرے ملک سے قرض لے کر کوئی ملک سرسبز نہیں ہوسکتا جب تک خود بھی اس کو قرض نہ دے۔ یہی حال ہماری تہذیب کا ہے اگر ہندستان نے سو پچاس آدمی ایسے پیدا کردیے جو انگریزی زبان، خیالات، افکار میں انگریزوں کی ٹکر کے ہوگئے تو کیا خوشی کی بات ہے۔ یہ وہ مال ہے جو ہم نے دوسرے سے ادھار لیا ہے اور اس کے بدلے میں ان کو بہت قلیل یا کچھ نہیں دیا ہے۔ اگر ملک بھر خدانخواستہ ویسا ہی ہوجائے جیسے وہ حضرات ہیں جو دوسری تہذیب سے پورے طور سے کامیاب ہیں تو ہندستان کا دوالہ نکل جائے دو ممالک کے آپس میں لین دین کی مثال جو دی گئی ہے ممکن ہے از روئے اقتصاد غلط ہو۔ مگر مانگے کی تہذیب ملک کو خاک میں ملا دے گی۔ اس میں شک کی گنجائش نہیں۔

انھیں مطالب کو ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور مدظلہ العالی نے مختلف پیرایوں میں خوب بیان کیا ہے۔ موصوف کی کتاب ''ہوم اینڈ دی ورلڈ'' میں ایک ہندستانی خیال رئیس کا ایک دوست ہے جس کے اوپر بدقسمتی سے انگریزی تعلیم کا وہی اثر ہوا ہے جس سے ''بابو'' کی سند ہاتھ آتی ہے۔ یہ حضرت بڑے قومی لیڈر لکچرر اور اپنے زعم ناقص میں ہندو مسائل کے مفسر ہیں، مگر وہی آدھی انگریزی آدھی ہندستانی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جتنی غلط تعلیمیں بم کے گولے بغاوت، غداری کے قبیل کی ہوتی ہیں۔ آپ ہی کے معجون مرکب دماغ سے نکلتی ہیں اور آخرکار اس شریف کا گھر ہر پہلو سے خاک میں مل جاتا ہے۔ اس کتاب کا نام ''گھر اور دنیا'' بہت خوب رکھا گیا ہے جس طرح ایک شخص کی وجہ سے ایک گھر خاک میں مل گیا اسی طرح غلط تعلیم سے اگر دنیا تباہ ہوجائے تو تعجب نہیں۔ یہی موضوع گینندر ناتھ ٹیگور کی تصویروں کا بھی ہے جو ملاحظہ ہوں۔ مجھ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ بات ختم ہوچکی، رات باقی ہے دو دو باتیں اور کرلوں۔

اکثر حضرات سے یہ بھی سنا ہے کہ کورٹ شپ نہ ہونے کی وجہ سے ہندستانی شادی میں رنگینی کی بہار نہیں ہوتی۔ اگر ہندستان کے مراسم پر ایک خاص رخ سے نظر کی جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ ملکی خصوصیات کی پیروی نے ہر چیز کو بوقلموں بنا دیا ہے ہندستانی لڑکی کی زندگی بیاہی عورت سے بالکل مختلف ہوتی ہے اس کا کھانا، کپڑا، برتاؤ سب دوسری طرح کا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے شادی کی اہمیت اس کے دل پر ایسی ہوتی ہے کہ کورٹ شپ کے طریقے میں ممکن نہیں۔ پھر مراسم جو اسی غرض سے رکھے گئے ہیں اس کی دلی کیفیتوں کو ایک خاص طرح سے چمکاتے ہیں۔ شادی کے پہلے عورت کے خاص خوشبوئیں لگائی جاتی ہیں جن سے جلد نرم اور چمکدار ہو۔ مختلف مراسم مختلف گانے قربانی کو سراہتے ہیں اور ترقی نوع پر اس طرح سے تیار کرتے ہیں کہ عورت میں نسوانیت بڑھ جائے نہ یہ کہ ملنے کے شوق میں دلہن دولھا ہوجائے۔ لارڈ لے ٹن کی مشہور تصویر ''ویڈڈ'' یعنی شادی شدہ میں دلہن کی آنکھیں ایسی بنائی ہیں جس کو دیکھ کر دولھا کی آنکھیں نیچی ہوجائیں۔ واقعی اس شادی کی رنگینی سے بیچاری ہندستانی عورت بہرہ ور نہیں۔

آٹو وائنگر نے عورتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک وہ جن میں مادریت غالب ہوتی ہے اور دوسری وہ جن میں معشوقیت غالب ہوتی ہے ''ماں عورت'' اپنے حقیقی فرض یعنی اولاد پیدا کرنے کی خواہش میں مرد پر انتخابی نظر نہیں ڈالتی بلکہ اپنی غرض پوری کرنے کے لیے ایک مرد کو قبول کرلیتی ہے اور اسی میں منہمک رہتی ہے۔ معشوق عورت زندگی بھر کے ساتھ پر نظر کرکے انتخاب کرتی ہے اور ہر مرد کو شوہر نہیں بنانا چاہتی، نہ اپنی انانیت کی وجہ سے قربانی کے وہ صفات رکھتی ہے جو ماں عورت میں ہوتے ہیں۔ کوئی عورت نہ بالکل معشوقیت ہی رکھتی ہے نہ بالکل مادریت بلکہ جس میں جو پہلو غالب ہوتا ہے وہی کہلاتی ہے۔ ہندستان میں ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ آٹو انگر کی تقسیم کے موافق جو معشوق عورت ہے وہ بھی تربیت سے ماں عورت ہوجائے اسی لیے جب مرد دلہن کے مکان کی طرف چلتا ہے تو مردانگی کی عظمت اس کے چہرے پر چمکائی جاتی ہے اور حسب رواج اگر عورت کی طرف سے لوگ آتے ہیں تو وہ بھی شوہر کے برتر حقوق کا پتہ دیتے ہیں۔ تقریباً ہندستان بھر میں کسی نہ کسی خوبصورت پیرایہ میں یہ ظاہر کردیا جاتا ہے کہ آج سے بچپن کی زندگی کو

عورت نے خیر باد کہا اور فرائض مادری کے اٹھانے پر تیار ہوئی۔ زبان حال سے وہ گڑیوں سے رخصت ہوتی ہے اور اپنی سہیلیوں سے رخصت ہوتی ہے اور ماں باپ سے کہتی ہے کہ لو خدا حافظ تمھاری محبتوں کا شکریہ مگر جس کام کے لیے پیدا کی گئی ہوں وہ میرا فرض اصلی ہے تم نے میرے حق میں کوتاہی نہیں کی۔ خدا ایسا کرے کہ مجھ سے بھی حقوق شوہری میں کوتاہی نہ ہو آج تک اس گھر کے دیوتا میرے دیوتا تھے اور یہ گھر میرا گھر تھا آج سے میرا دیوتا دوسرا ہے اور میرا گھر دوسرا ہے۔ اس صبح کے انتظار میں رات سوئی نہیں آج کی رات اپنے شوہر کی خاطر سے جاگوں گی اور صبح کو دیکھ لینا کہ میں بالکل دوسری ہوجاؤں گی اور جس رنگ میں میرا شوہر رنگا ہے اسی رنگ میں رنگ جاؤں گی آگ جو ترقی نوع کی ایک برکت والی نشانی ہے درمیان میں ہوتی ہے اگر یہ نہیں ہوتا تو مہندی سیندور شہانہ رنگ اس عنصر عظیم کی نیابت کر کے اپنا کام کرتے ہیں جب دلھن گھر میں آتی ہے تو لچھمی کے پاؤں برکت کی رونمائی دیتے ہیں اور مسلمانوں میں بھی عورت کے پاؤں دھوکر شوہر وہی پانی گھر میں چھڑکتا ہے جس سے وہی برکت مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ اردو کا محاورہ پاؤں دھوکر پینا شاید یوں ہی ایجاد ہوا ہو۔

○

باب سوم

فصل اول

سوزاک

سوزاک وہ بیماری ہے جس میں پیشاب کے راستہ مواد آتا ہے۔عورت اور مرد دونوں کو ہوتا ہے اور انگریزی تحقیقات کے موافق صرف اسی طرح ہوسکتا ہے کہ اس کا زہر ایک فریق کے عضو تناسل سے نکل کر دوسرے کے اندر پہنچ جائے۔ یورپین تحقیقاتیں اس قدر کوشش اور قابلیت سے کی جاتی ہیں کہ ان کے احسان سے بنی نوع انسان سبکدوش نہیں ہوسکتی مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہزاروں آدمی جب اس نامراد مرض میں گرفتار ہوتے ہیں تو اپنی بے قصوری کا دعویٰ کرتے ہیں جو شخص زنا کا مرتکب ہوسکتا ہے وہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے لیکن پھر بھی کوئی انتہا ہے آخر کہاں تک لوگوں کی نسبت دروغ بافی ہی کی رائے قائم کرتے چلے جائیں گے۔ اسی ضمن میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ طب یونانی وغیرہ کی رو سے یہ مرض احتلام یا چوٹ وغیرہ سے بھی ہوسکتا ہے۔تقریباً پچاس برس ہوئے نیسر نامی محقق نے ایک خاص جرثوم دریافت کیا جو سوزاکی مواد میں ہوتا ہے۔ اسی وقت سے یہ طے پایا ہے کہ جس سوزاک میں کیمیاوی ترکیب سے یہ جرثوم فاعلی حالت میں پایا جائے تو یقین کرنا چاہیے کہ اصل بیماری ہے جو عموماً گناہ کی راہ سے آتی ہے اور جب انفعالی حالت میں پایا جائے تو چوٹ وغیرہ کی وجہ سے ماننا چاہیے۔ چوٹ وغیرہ کی وجہ سے ہے تو اس کا علاج بھی سہل ہوتا ہے اور تکلیف بھی کم ہوتی ہے۔ اس مقام پر یہ بھی عرض کردینا چاہتا ہوں کہ ایک گروہ خود یورپ میں ایسا موجود ہے جو سرے ہی سے جرثوم کے نظریہ کو خیالی تصور کرتا ہے اگر ہینمین اور اس کے امریکی شاگردوں کو چھوڑ بھی دیجیے تب بھی سیکڑوں لائق فائق لوگ اس کے منکر موجود ہیں۔ اس کے خلاف برنارڈ شا نے اپنے ایک طویل

دیباچہ میں مبسوط بحث لکھی ہے۔ حالانکہ وہ ہینمین کو بھی اسی طرح چٹکیوں میں اڑاتا ہے جیسے دوسروں کو۔

حامیان جرثوم کے تازہ ترین دریافت یہ ہے کہ ہر بیماری کے جراثیم انسان کے جسم میں موجود ہیں لیکن صرف انفعالی حالت میں رہتے ہیں اور مرض پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ جب باہر سے زہر آ کر ان میں ملتا ہے تب وہ فاعلی صورت اختیار کرتے ہیں اور بیماری کا راج ہو جاتا ہے جو لوگ اس میں شک لاتے ہیں وہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر یہ ہوتا تو تندرست جسم پر حملہ کرتے وقت زیادہ سے زیادہ فوج جرثوم کی ہونی چاہیے تھی نہ کہ بعد کو حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ جوں جوں مرض اپنے کمال کے درجہ کو پہنچتا جاتا ہے اسی نسبت سے جراثیم بھی تعداد میں زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور پھر اسی طرح کم بھی ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جرثوم بیماری کا باعث نہیں قرار دیے جاسکتے بلکہ یہ دافع مرض ہیں کیونکہ جب جسم پر بیماری کا حملہ ہوتا ہے تو حفاظت خود اختیاری کی بنا پر طبیعت خود جراثیم میں فاعلی قوت پیدا کردیتی ہے کہ وہ بیماری کو کھا جائے اور اسی وجہ سے بیماری کے ساتھ ان کی تعداد بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔ متذکرۂ بالا معترضین مثال کے طور یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی چیز میں تعفن زیادہ ہو جاتا ہے تو فطرت اس میں کیڑے پیدا کردیتی ہے اور کیڑوں کے ہوتے ہی تعفن کم ہو جاتا ہے۔ یہ روز کا مشاہدہ ہے جس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ بدتمیز گھروں کی موریوں کو دیکھ لیجیے جہاں سونڈے رینگنے لگے بو کم ہوگئی۔ ڈاکٹر میکنی کاف جن کے دہی کا دور دورہ تھا وہ بھی فرماتے ہیں کہ ہمارے (بلگیرین کلچر) میں جو کیڑے ہیں وہ امعاء میں اپنی نوآبادی بناتے ہیں اور جو بیماری باہر سے آتی ہے اس کو کھا لیتے ہیں چنانچہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی دہی کھانے والا ایک مدت کے بعد امعاء کی تمام بیماریوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ظاہراً میں اپنے موضوع سے دور جا پڑا۔ لیکن واقعاً ایسا نہیں ہوا بلکہ اس بحث سے میرا مدعا حسب ذیل تھا بیمار سے ہمدردی ہر تندرست کا فرض ہے لیکن بعض بیماریاں ایسی ہیں جن کا احوال آدمی بحیثیت ایک ہمدرد یا تیماردار کے سنتا ہے مگر اس کے بعد بلا پروانہ شاہی قاضی بن جاتا ہے اور بیمار کو اخلاقی مجرم ٹھہراتا ہے۔ یہ فعل مقامِ قضا پر بہت مستحسن ہے لیکن اپنی جگہ سے ہٹ کر نہایت ہی مذموم ہے لہٰذا جس وقت آپ کے احباب میں کوئی بدقسمت یہ کہے

کہ میں ناکردہ گناہ پکڑ گیا ہوں تو اس غریب کے لیے حسن ظن ہی سے کام لیجیے کیونکہ اختلاف متذکرۂ بالا کے بعد اس کے جرم میں شک کیا جاسکتا ہے اور اگر نہ بھی کیا جائے تو بھی آپ کو شکر بھیجنا چاہیے کہ وہ اسباب ونتائج آپ کے لیے اکٹھا نہیں ہوئے جن کا شکار وہ ہوگیا۔ ایسے ایسے موقعوں پر ڈاکٹر لوگ اپنی نظر نہایت وسیع کردیتے ہیں اور بجائے مریض اور اس کے ناشائستہ افعال پر غور کرنے کے وہ یہ سوچتے ہیں کہ مرض اور تندرستی میں مقابلہ ہے مرض کی فتح میں نوع انسان کی شکست ہے یہی پہلو غیر طبیب کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اگر آپ نے یہ رویہ نہ اختیار کیا تو آفت کا مبتلا غریب اچھا بھی نہ ہوگا کیونکہ زیادہ خرابی اس طرح کے امراض میں یہ ہوتی ہے کہ ابنائے جنس کی نظر میں گر جانے کے خوف سے آدمی کھلم کھلا علاج معالجہ میں دوڑ دھوپ نہیں کرسکتا اور یہ حالت اس وقت تک نہیں مٹنے کی جب تک لوگ مجرم اور سزایاب میں فرق نہ کریں گے۔ مجرم اسی وقت تک مجرم ہے جب وہ جرم کر رہا ہے اس وقت مجرم نہیں جب وہ غریب سزا کاٹ رہا ہے۔ اسی بنا پر بعض حکمائے اسلام نے یہ حکم دیا ہے کہ قیدیوں کو تماشا مت بناؤ،
پھر اصل مطلب کی طرف عود کرتا ہوں۔ سوزاک کا زہر پیشاب کی نالی میں پہنچ گیا تو دو سے لے کر چھ دن کے اندر وہاں ایک زخم ڈال دیتا ہے پہلے آدمی کو پیشاب کرتے وقت ایک کیفیت تیزی اور گرمی کی محسوس ہوتی ہے لیکن پیشاب کچھ ایسا زیادہ نہیں ہوتا یہ کوشش فطرت کی طرف سے مرض کو دھو ڈالنے کے لیے ہوتی ہے ایسے ہی وقت میں آدمی فریق ثانی کو سوزاک کی نشانی دے دیتا ہے اور خود بے خبر رہتا ہے۔ اگر آدمی پیشاب کے راستہ کا منہ کھول کر دیکھتا ہے تو اندر معمول سے زیادہ سرخی معلوم ہوتی ہے رفتہ رفتہ آماس بھی ہوجاتا ہے۔ اب سوزش بھی بڑھنے لگتی ہے اور رقیق مادہ بھی خارج ہونے لگتا ہے بسا اوقات یہی دھبے سفید کپڑے پر دیکھ کر آدمی پہلے پہل باخبر ہوتا ہے۔ اس کے بعد سوزش میں ترقی ہوتی ہے مواد گاڑھا اور زیادہ مقدار میں آنے لگتا ہے، رنگ زرد اور سبزی مائل ہوجاتا ہے راتوں کی تندی نہایت اذیت دیتی ہے چڈھوں میں گلٹیاں پڑ جاتی ہیں جو زیادہ چلنے پھرنے سے برخلاف آتشک کی گلٹیوں کے کبھی کبھی پک بھی جاتی یں۔ اس حالت کو (اکیوٹ) یا عنفوان مرض کہتے ہیں۔ اگر آدمی نے بے جا شرم اور گدھے پن کی رازداری

سے کام نہ لیا تو عمدہ باضابطہ علاج سے دس پندرہ دن میں اچھا ہوگیا مگر ایسے بھاگو ان انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ زیادہ تر تو وہی لوگ ہوتے ہیں جنھوں نے کچھ دن چھپانے کی کوشش کی اس کے بعد کسی عطائی کا نسخہ پینے لگے اور بعد خرابی بسیار حکیم ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ دس روز کے بعد کا زمانہ سب اکیوٹ یا وسط حیات کا کہلاتا ہے اس زمانہ میں آماس جاتا رہتا ہے۔ گلٹیاں کم پڑ جاتی ہیں اور مواد میں کمی اگر نہ بھی ہوئی تو تکلیف میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور ہوجاتی ہے۔ اس حالت میں لوگ بہت اچھے ہوجاتے ہیں تیسرا درجہ کرانک یا سوزاک کے بڑھاپے کا ہے۔ یہ ایک مہینے کے بعد آتا ہے اس کا بڑھاپا دوسروں کے بڑھاپے سے مختلف ہوتا ہے یعنی جو جو سن بڑھتا جاتا ہے اس بیماری کی امید زیست قوی ہوتی جاتی ہے ؎

پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے

اور اکثر آدمی کے ساتھ قبر میں جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ایک سفید ریشہ سا پیشاب میں خارج ہونے لگتا ہے جس کو انگریزی میں گلیٹ کہتے ہیں۔ یہ وہ رطوبت غیر صالح ہے جو پرانے زخم سے رستی رہتی ہے اور پیشاب کی نالی میں جمع ہوکر نالی کے سانچے میں ڈھل کر ایک مہین دھاگے کی طرح ہوجاتی ہے اور پیشاب کے پہلے نکل جاتی ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی آدمی اپنے کو بالکل اچھا پاتا ہے اور اگر معاً کسی دوا کے بعد یہ کیفیت پیدا ہوئی تو وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں اچھا ہوگیا۔ حالانکہ ممکن ہے یہ بالکل دھوکا ہی ہو کیونکہ پیشاب کی نالی میں ہزار در ہزار غدود ہیں اور ہر غدود کے درمیان میں جوف بھی ہوگا۔ انھیں جوفوں میں زہریلا مادہ درۂ دانیال کی توپوں کی طرح چھپا بیٹھا رہتا ہے جہاں نہ پچکاری اثر کرسکتی ہے نہ کوئی دوسری ترکیب اور دوران مجامعت میں جس وقت خون کی کثرت کی وجہ سے ہر جوف کھل جاتا ہے نکل کر دوسرے فریق کو بغیر اطلاع گھائل کردیتا ہے۔ پہلی مرتبہ کے سوزاک میں اچھے ہونے کی امید زیادہ ہوتی ہے لیکن اگر آدمی نے بری عادتیں نہ چھوڑیں تو ہر نئے زہر کے آنے کے بعد امید صحت کم ہوتی جاتی ہے۔ پیشاب بند ہونے کا جو عارضہ جو پرانے زخم کے تنگ اور رفتہ رفتہ بند ہوجانے سے ہوتا ہے۔ دو تین مرتبہ سوزاک ہونے کے پہلے نہیں ہوتا او بعد کو بھی ہر شخص کو نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر کنٹ اور

نیز دوسرے ہومیو پیتھ ڈاکٹروں کا قول ہے کہ یہ مرض زیادہ تر ان لوگوں کو ہوتا ہے جو تیز دواؤں کی پچکاریاں لیتے ہیں۔ بعض چاندی اور تانبے کے زبردست مرکبات اگر اب نہیں تو تھوڑے دن ادھر تک ڈاکٹروں میں رائج تھے اور اب بھی بعض بے تکے کامپاؤنڈر وغیرہ محلے والوں کو اس قسم کی دوائیں بتا کر اس شریف پیشہ کو بدنام کر دیتے ہیں۔ اس موذی کے کارنامے یہیں نہیں ختم ہوجاتے ہیں کبھی کبھی گٹھیا ہوجاتی ہے جس میں درد اور آماس دونوں کی بہتات ہوتی ہے صرف ہاتھ کے انگوٹھے کے درد سے لے کر پورا جسم تختہ ہوجانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ گو افسوس کی بات ہے مثانہ پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ پراسٹٹ گلینڈ پر اس کا اثر ہوتا ہے جس کی تکلیفیں ضعیفی میں نہایت ہی صعب ہوتی ہیں اپی ڈیڈیمس غدود پر اس کا اثر ہوتا ہے جس سے منی میں توالد و تناسل کے زندہ اجزا نہیں رہ جاتے اور آدمی باوجود تمام باتوں کے صاحب اولاد نہیں ہوتا۔ تمام ان لوگوں میں جو صاحب اولاد نہیں ہوتے تقریباً پچاس سیکڑہ اسی وجہ سے نہیں ہوتے، کبھی کبھی قلب پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ کبھی گردوں سے مواد آنے لگتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ بعض اعصابی بیماریاں بھی ہوجاتی ہیں۔ عورت غریب پر اس سے زیادہ مصیبت لاتا ہے ان میں یہ مرض اور زیادہ مشکل ہوجاتا ہے۔ مرد اگر پچاس سیکڑہ اچھے ہوتے ہوں گے تو عورتیں دس سیکڑہ اچھی ہوتی ہوں گی مرد کو سوزاک پیشاب کے اعضاء کے متعلق زیادہ نقصان پہنچاتا ہے عورت میں توالد کے اعضاء کی طرف تباہی پھیلاتا ہے۔ گو کہ پرانا ہونے پر عورتوں کو تکلیف کم رہ جاتی ہے۔

اندام نہانی، فم رحم، قازف، نالیاں، خصیۃ الرحم، اندرونی جھلی قصہ مختصر کوئی شے محفوظ نہیں رہتی۔

ایک عارضہ اور بھی ہے جس کا ذکر میں نے اخیر کے لیے اٹھا رکھا تھا یعنی اگر اس کا مواد آنکھ میں لگ جائے تو پھر چوبیس گھنٹے کے بعد اس کا علاج ناممکن ہے۔ ہر مریض کو اس کا احتیاط ضروری ہے۔ اکثر مریض خصوصاً شروع میں بار بار یہ محسوس کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی تازہ قطرہ مواد کا تو نہیں آیا یا جسم کو بے کلی کی وجہ سے ادھر ادھر ہٹاتے ہیں یا لنگوٹ وغیرہ ٹھیک کرتے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ فوراً ہاتھ دھو ڈالیں کیونکہ اکثر بھولے سے

آدمی آنکھ کھجا لیتا ہے ڈاکٹر لوگ کہتے ہیں کہ اس کا زہر صابون اور پانی سے دھل جاتا ہے۔ اگر صابون نہ ہو تو مٹی یا بھیگا ہوا چونا کسی چیز سے مل کر ہاتھ دھو ڈالا جائے بلکہ بہتر ہوگا کہ ڈاکٹروں کی طرح عادت ڈال لی جائے کہ جب کھجانا وغیرہ ہو تو جہاں تک ممکن ہو ہاتھ کی پشت سے کام لیا جائے۔

ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ اگر آنکھ میں زہر پڑ جائے لیکن وہ پروٹارگل سے دھو ڈالی جائے تو بچ جائے۔ اسی وجہ سے اگر ماں کو سوزاک ہے تو نوزائیدہ بچے کی آنکھ پروٹاگل سے دھو ڈالی جاتی ہے تا کہ رحم سے نکلتے وقت اگر آنکھوں پر کچھ اثر ہو گیا ہو تو وہ مٹ جائے۔

ایک کتاب سونیا میرڈ جس میں امریکہ کی ایک کروڑ پتی عورت کا حال ہے اسی موضوع پر لکھی گئی ہے اور قابل دید ہے۔

○

فصل دوم

آتشک

دوسرا سخت مرض جو اعضائے جنسی سے تعلق رکھتا ہے آتشک ہے۔ سوزاک اور آتشک اس طرح کے موذی اور تباہ کن امراض ہیں کہ جس کو دو میں سے کوئی ہوتا ہے وہ اسی کو دوسرے سے زیادہ برا پاتا ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ آتشک سوزاک سے زیادہ مہلک ہے۔ اس کی تاریخ نہایت ہی غیر مکمل ہے۔ پندرھویں صدی کے آخری دھاکے میں یہ مرض وبا کی صورت میں بعض یورپین ممالک میں شروع ہوا۔ اس کے پہلے لوگ اس سے اِس قدر ناواقف تھے کہ انھوں نے اس کو فسادِ خون یا جذام کی ایک قسم تجویز کیا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ کولمبس کے جہاز پر یہ بیماری امریکہ سے آئی جو لوگ اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہتے ہیں کہ کولمبس کے جہاز نے اپریل 1493 میں سویل کے بندر میں لنگر ڈالا صرف دو مہینے کے اندر یہ وبا فرانس، اٹلی اور شمالی جرمنی تک کیونکر پہنچ گئی۔ اس زمانے میں ریل نہ تھی۔ دخانی اور ہوائی جہاز نہ تھے کہ ایک ملک کا مال اس قدر جلد دوسرے ملکوں کی آسائش کے لیے بھیجا جاسکتا پھر کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ بیماری کولمبس نے پھیلائی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نیک خبر یا نیک کام آج بھی اس قدر جلد نہیں پھیلتے جس قدر بری خبر مشہور یا برے کام مقبول ہوجاتے ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ اس کی آگ بھی یونہی پھیل گئی ہو کولمبس کی لائی ہوئی دوسری چیز (تمباکو) کس قدر رائج ہوئی ہے کہ جس کی دھواں دھار مقبولیت کے آگے قرآن اور وید سب رہ گئے۔ بڑے بڑے یورپین تحقیق کرنے والے مدعی ہیں کہ ہندستان وغیرہ میں یہ بیماری پورتگال، کی حکومت کے ساتھ آئی اور گو سلطنت گزر گئی مگر اس کی نشانی باقی رہی۔ ہمارے یہاں کی پرانی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نسخے ہندستان قدیم میں لکھے جاچکے ہیں جس سے صاف ظاہر

ہوتا ہے کہ اگر بالکل یہ نہیں تو اس قسم کا ایک مرض ہندستان میں پہلے سے رہا ہوگا ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں کونکہ اس سے ملتا جلتا ایک اور مرض ہے جو آتشک کی چھوٹی بہن کہی جاسکتی ہے۔ اگر ہندستان والوں نے اس مرض کو آتشک سمجھ لیا ہو تو کیا تعجب ہے۔ اس کے مغربی مشہور نام سفلس کی شان نزول یہ ہے کہ ایک اٹلی کے ڈاکٹر نے ایک نظم لکھی جس میں اس نامراد مرض کا پورا حال ایک کسان کی زبانی درج کیا اور اس کسان کا نام سفلس رکھا۔ لیجیے صاحب وہی نام بیماری کا قرار پا گیا۔ جب یورپ کی واقف کاری کا یہ حال ہو تو ایشاوالوں نے اگر سافٹ شینکر کو سفلس سمجھ لیا ہو تو کیا تعجب ہے۔ جس طرح سے سوزاک کے بارے میں خیال ہے کہ بغیر قربت کے نہیں ہوسکتا۔ آتشک کے لیے نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ بیماری اکثر ایک ہی گلاس میں پانی پینے سے حقہ پینے سے ایک ہی برتن میں میں کھانا کھانے سے یا دوسرے الحاق جو اسی قسم کے ہوں ان سے بھی ہوجاتی ہے جن ممالک میں صفائی اور اصول حفظان صحت کی احتیاط کم ہے وہاں آتشک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ساٹھ سیکڑہ واقعات اسی طرح پر ہوتے ہیں۔ ہندستان کی چھوت میں ہزار دوسری برائیاں ہوں مگر اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے امراض سے ایک حد تک حفاظت رہتی ہے۔ متذکرۂ بالا طریقوں سے اگر آتشک ہوئی تو پہلا چھالا عموماً اسی مقام پر پڑتا ہے جہاں سے زہر نے سرایت کی ہے۔ اگر مجامعت سے ہوئی تو زخم اعضائے تناسل پر پڑتا ہے۔ عموماً حشفہ یا اسی کے قریب ڈھیلی کھال پر عورت کے بھی ایسے ہی مقامات پر ہوتا ہے۔ زہر لگنے کے تین خواہ چار ہفتہ کے بعد ایک چھالا پڑتا ہے جو پھوٹ جاتا ہے اور زخم ہوجاتا ہے۔ اس میں مواد نکلتا ہے جو خود بھی بہت زہریلا ہوتا ہے۔ عموماً یہ ایک ہی ہوتا ہے (اگر دو تین زخم ہوں تو گمان غالب ہے کہ یہ سافٹ شینکر ہے) اس زخم کی پہچان یہ ہے کہ اس کے کنارے اٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور اگر کلمے کی انگلی اور انگوٹھے سے اس زخم کے دور کو دبایا جائے تو اچھی خاصی سختی معلوم ہوتی ہے جو دوسرے زخموں میں نہیں ہوتی۔ اس وقت میں اگر کم عقلی اور بدبختی سے آدمی نے کام لیا تو بیماری اور سرایت کرجاتی ہے۔ اگر فوراً کسی لائق طبیب سے رجوع کرلیا تو ممکن ہے کہ زہر آگے نہ بڑھنے پائے یا اس قدر کم بڑھے کہ اس کا دور کرنا نسبتاً سہل ہو۔ اس مرض کی ترقی شروع زمانے میں برابر

معلوم ہوتی رہتی ہے۔ پہلے جڑھوں میں گلٹیاں پڑیں جس کا مطلب یہ ہے کہ غنیم نے یہاں قبضہ کرکے اپنی چوکی بٹھا دی ہے۔ پھر بغل میں گلٹی محسوس ہوئی۔ لیجیے صاحب اب یہاں تک قبضہ ہوگیا پھر گردن کے غدود میں درد ہوا گویا یہاں بھی اس کا راج ہوگیا۔ سات ہفتے گذرنے پر حرارت محسوس ہونے لگتی ہے۔ طبیعت گرتی جاتی ہے، جی نڈھال رہتا ہے، اعضا شکنی دردسر بھوک کم لگتی ہے، اس کے بعد دوسرا درجہ شروع ہوتا ہے۔

اس میں تمام جسم پر تانبے کے رنگ کے دانے پڑ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ مرطوب جھلیوں پر جیسے منھ، زبان، پاخانہ کے مقام پر زخم یا کھرکھراہٹ سی معلوم ہوتی ہے جو کبھی کبھی ترقی کرکے بودار زخمی مسّے ہوجاتے ہیں۔ حلق میں درد شروع ہوتا ہے جو بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات متذکرۂ بالا علامات آدمی معمولی سمجھتا رہتا ہے اور حجاب کی وجہ سے ابھی تک کسی کو آگاہ نہیں کرتا۔ مگر حلق کی تکلیف چونکہ اور وجوہ سے بھی ہوتی ہے لہٰذا ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ اس درجہ پر پہنچ کر اکثر دیکھا گیا ہے کہ پیشانی پر جہاں بال جمنا شروع ہوتے ہیں وہاں بھوری یا قریب قریب سفید چتیاں دکھائی دینے لگتی ہیں اور گلے میں بھی یہی حال ہوتا ہے۔ یہ علامت بلاشک و شبہ آتشک کی ہوتی ہے اور صرف عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ بال گرنے لگتے ہیں اور یہی نہیں کہ کنگھی کے ساتھ یا دھونے ہی میں گریں بلکہ بالخورے کے ایسی چکنی چکنی جلد کھل جاتی ہے۔ اس درجے پر پہنچ کر آتشک کا عملہ دخلہ اندر باہر مکمل ہوجاتا ہے۔ جگر خراب ہوجاتا ہے، گردے ماؤف ہوجاتے ہیں، حافظہ جواب دے دیتا ہے، طحال بڑھ جاتا ہے، آنکھیں خراب ہونے لگتی ہیں۔ اگر قرار واقعی دوڑ دھوپ نہ کی گئی تو یہی علامتیں اور زیادہ ہوتی گئیں اور بیماری کا تیسرا درجہ شروع ہوگیا۔ اس درجہ میں بھی دانے وغیرہ بری موذی صورتیں پکڑتے ہیں، حلق میں آماس زیادہ ہوکے زخم ہوجاتے ہیں۔ کوّا گر جاتا ہے، بانسہ بیٹھ جاتا ہے، تالو میں چھید ہوجاتا ہے، سفید سفید چھیچھڑے منھ سے نکلا کرتے ہیں، بو کی انتہا نہیں رہتی، آدمی موت مانگتا ہے مگر نہیں ملتی۔ اس کے بعد بھی مرے کو ماریں شاہ مدار، فرصت نہیں ہوتی، دق، فالج، جنون، گردوں میں مواد سب ہی گتیں ہوجاتی ہیں۔ تیسرے درجہ تک تو علاج آتشک ہی کا رہتا ہے مگر آخری درجے میں ہر عارضہ بجائے خود مرض ہوجاتا ہے اور علاج

علیحدہ علیحدہ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک تو گنہگار سزا بھگتا ہے اب ناکردہ گناہوں کی باری آتی ہے۔ بی بی بے چاری تو بہت زمانہ ہوا کہ گرفتار ہوچکی ہے کیونکہ شروع کے دو برسوں میں یہ مرض نہایت ہی ساری ہوتا ہے اور اگر کوئی خوش نصیب ایسی ہوئی کہ اس زمانہ میں بچ نکلی تو بعد کو نہ بچی کیونکہ چاہے جس قدر دن ہوجائیں جب اس بیماری کے آثار جسم پر عود کر آئیں گے تب ہی زہر میں دوسرے کو لگ جانے کی کیفیت پیدا ہوجائے گی۔ یہ نہ ہوا تو جب لڑکا پیدا ہوا تو اکثر دودھ پلانے کے زمانے میں ہوجاتی ہے۔ چنانچہ یورپ میں پچاسوں رپورٹیں شفاخانوں کی موجود ہیں جن میں ماں بچ گئی اور انا بیچاری تباہ ہوگئی۔ فرانس کے مشہور عالم ڈاکٹر ڈراما نویس (بریو) نے ایک ڈراما اسی مضمون پر لکھا ہے جس کا نام دیمجید گڈس ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے ڈرامے بھی اس کے جنسی معاملات پر ہیں جو واقعی پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ اب اس کے بعد لڑکوں کی باری آتی ہے زیادہ تر کو ایام حمل پورے نہیں ہونے پاتے اور اسقاط ہوجاتا ہے۔ اگر بدنصیبی سے پیدا بھی ہوا تو منحنی کمزور، جسم پر جھریاں پڑی ہوئیں، جیسے سوکھے کا مارا جسم پر چھالے خصوصاً ہتھیلی اور تلوؤں پر، ہڈیاں بھی ٹیڑھی ہوجاتی ہیں، دانت بہت جلد یا بہت دیر میں نکلتے ہیں جو سیاہ اور بیچ میں کیڑی کھائے ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ دو پشتوں تک اس عارضہ کا اثر اچھی طرح دیکھا گیا ہے یہاں تک کہ آتشک زدہ عورتوں کی لڑکیاں بھی اسقاط حمل سے بری نہیں۔

یورپ کی تحقیقات سے مردوں میں یہ عارضہ بیس اور چھبیس برس کے درمیان میں زیادہ ہوتا ہے اور عورتوں میں اٹھارہ اور بیس کے درمیان میں لیکن ہر وقت ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے۔ الفرڈ فورنیر کی کتاب اور نیز بریو کی تصنیفات ملاحظہ ہوں۔

ایک دوسرا عارضہ ساریہ جو آتشک سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ سافٹ شینکر کہلاتا ہے۔ یہ بھی سوزاک کی طرح ایسا کھیل ہے جو بغیر دو کے نہیں کھیلا جاسکتا۔ عموماً عضو تناسل پر ایک دانہ پڑتا ہے جو زہر لگنے کے دو ہی تین دن بعد پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ دانہ بھی قریب قریب آتشک کے دانہ کی شکل کا ہوتا ہے اور ناواقف لوگ اس عارضہ سے بمقابلہ آتشک کے زیادہ متوحش ہوتے ہیں کیونکہ آتشک کا دانہ جیسا کہ بیان ہوچکا ہے صرف ایک ہی ہوتا ہے مگر اس کا مواد لگ کر اور دانے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آدمی نے عقل سے کام لیا اور

صفائی رکھی اور فوراً کسی باضابطہ معالج سے رجوع کیا تو بہت جلد اچھا ہو جاتا ہے البتہ کبھی کبھی چڑھے کی وہی گلٹی جو آتشک میں نہ درد کرتی نہ پکتی ہے۔ اس بیماری میں پک جاتی ہے جس کو ہندستان میں بد کا پھوڑا کہتے ہیں اور صرف ایک چڑھے میں ہوتی ہے۔ عموماً تو یہی ہوتا ہے جو عرض کیا گیا لیکن کبھی کبھی اس کا بھی زہر پھیلتا ہے لیکن چونکہ اس کتاب کا مقصد لوگوں کو بے وجہ خائف کرنا نہیں بلکہ ہوشیار کرنا ہے لہٰذا اس سے قطع نظر کی جاتی ہے۔

اس جگہ یہ بھی ذکر کر دینا چاہیے کہ ایک بیماری نائی کے استرے سے ہو جاتی ہے جس میں بالوں کی جگہ مواد کے بھرے دانے پڑ جاتے ہیں اور غلطی سے اکثر لوگ ان کو بھی آتشک سمجھنے لگتے ہیں، مگر حکیم، ڈاکٹر، وید وغیرہ فوراً پہچان لیتے ہیں۔

اس مرض میں ہزار دوائی کی ایک دوا ہے کہ اس جگہ کے بال نہ بنوائے جائیں۔ یورپ میں زیرناف استرے کا استعمال نہیں ہوتا جس کی گندگی محتاج بیان نہیں اگر استرے کی حفاظت کر لی جائے تو اس طریقے کی خوبیاں قابل لحاظ ہیں۔

O

باب چہارم

فصلِ اوّل

حفاظت

سوزاک ہو خواہ آتشک اس سے بچنے کی سب سے بہتر اور لاجواب ترکیب یہ ہے کہ آدمی نہ آگ کھائے نہ انگارے ہگے، لیکن افسوس کہ دنیا ایسی ہے نہ اس طرح کی بنائی گئی ہے۔ یہاں لوگ گناہ بھی کریں گے اور کیفر کردار کو بھی پہنچیں گے پھر کیا فائدہ کہ لکھنے والا صرف اخلاقی پہلو پر زور دے جس پر خدا کے خاص بندوں نے ہمیشہ زور دیا اور نیک بندوں نے عبرت کی مگر گنہگار بندوں نے اپنے ہتھکنڈے نہ چھوڑے۔ اس کتاب کا یہ بھی منصب نہیں کہ اصول اخلاق کے ہمیشہ بدلتے یا نہ بدلتے رہنے پر بحث کرے یا ہر ملکے و ہر رسے کی تفسیر بیان کرے کیونکہ اس کو جس چیز سے سروکار ہے وہ صرف مادّی جسم کی تندرستی ہے۔ روحانی حفاظت کے لیے اور بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ لہٰذا یہ عرض کیا جاتا ہے کہ یہ بیماریاں ناتجربہ کاروں کی ہیں۔ اگر آدمی ہاتھ پاؤں بچا کر راہ چلے تو بے راہ روی پر بھی عقل کے اندھوں سے کم ٹھوکریں کھائے۔ زمانہ کی روش وہ ہے کہ ہر شخص شادی کرنے پر قادر نہیں۔ بری صحبت خراب پرورش ماحول کا اثر جب آدمی میں سرایت کر جائے تو سب سے پہلے اس کو غور کرنا چاہیے کہ آیا عقل اور دور اندیشی کچھ کام آ سکتی ہے یا نہیں۔ اگر اس نے ایسا کیا تو یقیناً وہ بچ نکلے گا کیونکہ فطرت نے وہ انتظام کیا ہے کہ جسم میں کوئی چیز ضرورت سے زیادہ جمع ہو جائے تو بلا کوشش کے کم ہو جائے اور ایسی حالت میں عموماً احتلام ہو جاتا ہے۔ اگر کسی مجرد تندرست مرد کو ہفتے میں ایک دو بار تک احتلام ہو جایا کرے تو چنداں ہرج نہیں کیونکہ احتلام میں برخلاف عام خیال کے اخراج منویہ اس قدر نہیں

ہوتا جتنا کہ سمجھا جاتا ہے بلکہ اس میں دوسری بے کار رطوبتیں بھی نکل جاتی ہیں۔ اگر کوئی نادان مرد 24-25 برس کی عمر کے پہلے یہ کہے کہ میری حالت ناقابل برداشت ہے تو نہایت تاسف کا موقع ہے کیونکہ باڑھ کے زمانہ میں یہ حالت ہونا صرف بری صحبت وغیرہ سے ممکن ہے جس چیز کو وہ فطرت کی ضرورت سمجھ رہا ہے وہ یقیناً گندہ خیالی ہے، گندہ خیالی انگریزی میں اس بری عادت کو کہتے ہیں جس میں آدمی ہروقت جنسی معاملات کی ادھیڑبُن میں رہتا ہے۔ بے تکلف احباب میں جب بیٹھتا ہے تو اسی طرح کے اذکار میں اس کا دل لگتا ہے، تنہائی میں جب بیٹھتا ہے تو انھیں خیالات سے دل خوش کرتا ہے۔ یہ حالت یا تو بری صحبت سے پیدا ہوتی ہے یا خود طبیعت اسی طرح پیدا کرتی ہے۔ جیسے وہ بیماری پیدا کرتی ہے جب یہ حالت ہو تو آدمی کو چاہیے کہ اپنے ہم صحبتوں پر غور کرے۔ اس ماحول کو جانچے جس میں وہ ہے۔ اگر ان میں کوئی برائی پائے تو اس کو ترک کردے۔ ہزار علاج کا ایک علاج پرہیز ہے۔ یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ تندرستی کو پرہیز سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر کسی قوت سے کام نہ لیا جائے تو اس میں فرق آجاتا ہے۔ مگر تیس برس کے سن سے پہلے نقصان شروع ہونا کسی ڈاکٹر حکیم یا تجربہ کار نے بیان نہیں کیا ہے۔ گوکہ اس کے بعد ضرور نقصان ہوتا ہے۔ بعض اعصابی بیماریاں مثل اختلاج وغیرہ ہوجاتی ہیں۔ سر کے پچھلے حصہ میں دھمک اور میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے، کام میں دل نہیں لگتا، رات کی نیندیں اڑ جاتی ہیں، خیالات پریشان رہتے ہیں، یورپین تہذیب کے ساتھ ہزارہا نعمات آئے ہیں مگر کھلی ہوا کے کھیل سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں، اگر کوئی انسان اپنے خیالات پریشان کن پاتا ہے یا مزاج کا رجحان ایسی جانب پاتا ہے جس سے اس کا دل اس کو برا کہتا ہے تو فٹ بال ہاکی کرکٹ وغیرہ کی طرف منہمک ہوجائے۔ جنسی برائیوں کو ڈنرمگدر بھی دور کرتے ہیں اور واقعی دور کرتے ہیں کیونکہ تھوڑے دنوں میں اعضاء اور جوارح پر آدمی غور کرنے لگتا ہے تو اس کو کچھ ایسا فرق معلوم ہوتا ہے کہ اس پر وہ ناز کرنے لگتا ہے اور خود بخود جسم کی چستی کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کی فکر میں پڑ جاتا ہے لیکن ماننا پڑے گا کہ یہ چیزیں بھی ہاکی فٹ بال وغیرہ کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ ڈنرمگدر وغیرہ میں انسان کا صرف جسم بہتر ہوتا ہے اور دل کا بہتر ہونا جسم کی تندرستی کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن ہاکی فٹ بال میں دل اور جسم پر شروع ہی سے یکساں اثر پڑنے لگتا ہے۔ انسان کو یہ معلوم ہوجاتا

ہے کہ دشمن سے مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ دوست کی مدد کس طرح کی جائے، کم وقفہ میں رائے قائم کرنے کی مشق ہوتی ہے۔ اپنی رائے پر وثوق ہونے لگتا ہے، یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ خودغرضی اور نام آوری کو ترک کرکے اپنے جتھے اور گروہ کی مدد یوں کرتے ہیں اور خودغرضی میں جو خوشی ہوتی ہے اس میں اور گروہ کی خوشی میں یہ فرق ہے۔ فتح کے اوپر ناز بے جا بے کار معلوم ہونے لگتا ہے۔ ہار میں ہمّت کم نہیں ہوتی، جیتنے کے بعد نہ تو کھیلنے والا سینہ تان کر مرغ کی طرح بانگ دینے لگتا ہے نہ ہار جانے کے بعد مایوسی اور حرماں کا شکار ہوجاتا ہے جس طرح ڈنرمگدر کا اثر مدت العمر باقی رہتا ہے۔ اسی طرح باضابطہ کھیل کا اثر بھی آئندہ زندگی پر پڑتا رہتا ہے۔ یہ وہ نیکی ہے جو بہت برسوں کے بعد بھی عود کرتی ہے۔

ڈیوک آف ولنگٹن کا قول ہے کہ واٹرلو کی لڑائی کی فتح پر لوگوں کو تعجب کیوں ہے۔ یہ لڑائی میں ہیرو کی فٹ بال فیلڈ میں بیسیوں مرتبہ جیت چکا تھا۔ نپولین کے مقابلہ میں لڑائی کا رنگ تیسرے پہر کو بالکل بدل گیا تھا۔ مگر ولینگٹن کو ہراس نہ تھا۔ بلوشر کا بھی راستہ دیکھتے تھے۔ شام کا بھی راستہ دیکھتے تھے، مگر ہمت کو فٹ بال کی عادت برقرار رکھے تھی۔ گذشتہ لڑائی میں ہی غور کر لیجیے جو چیز انگریزوں کے آڑے آئی وہ ان کی فٹ بال ہاکی کی عمدہ عادت تھی۔ ابھی کل کی بات ہے سب کو یاد ہے کہ جرمن فتوحات دیکھنے والوں کے اوسان ٹھنڈے کیے دیتے تھے مگر ہارنے والے ہمت کے دھنی تھے۔ میدان جنگ کے اخبار وہ تھے جو نپولین کی میدان جنگ کی رپورٹوں کو مات کرتے تھے۔ پھر بھی عالی ہمتی وہ تھی جو ولنگٹن کو حیرت میں ڈالتی۔ یہ سب نتیجہ اسی قومی خصوصیت کا تھا جس کو خود انگریز لوگ کھیل کود کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایک گروہ اصحاب شریعت کا ایسا بھی ہے جو بر بنائے لہو ولعب ہاکی فٹ بال کو ترک کروا کے بانک اور بنوٹ کو رواج دینا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ حضرات والا صفات انگریزی کھیلوں سے ویسے ہی ناواقف ہیں جیسے ہندستانی کھیلوں سے، اول تو صورت ببیں حالم مپرس، دویم رعب شرع اجازت کس کو دے سکتا ہے اور اگر کوئی جسارت کرکے پوچھ بھی لے کہ جناب بانک اور بنوٹ کی خوبیاں بیان فرمائیں تو معلوم ہوجائے کہ سلامتی سے بانک بنوٹ کی خوبیوں

اور برائیوں سے اسی قدر ناواقف کاری ہے جس قدر ہاکی فٹ بال سے۔ بانک بنوٹ وغیرہ چستی چالاکی بہادری کے حربے ہیں جو بجائے خود لاجواب چیزیں ہیں۔ مگر یہ خیال کرنا کہ معاملات زندگی میں ان سے وہ فائدہ ہوگا جو مل کر کھیلنے کے باضابطہ کھیلوں سے ہوگا جن کی وجہ سے انگریزی قوم کی بقا ہے تو نہایت غلطی ہے۔ یہ دو طریقے ایک دوسرے کا بدل ہو ہی نہیں سکتے۔

مگر کس کے منھ میں زبان ہے جو کہہ سکے کہ ایسی چیزوں کا مقابلہ کیا جارہا ہے جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کے درمیان میں مقابلہ کرنا ایسا ہے کہ جیسے کوئی لڑکا تفریق کا سوال نکالنے میں چھ مچھروں میں سے پانچ ہاتھی باقی نکال لے اور ایک مچھر جواب آئے۔ مسائل میں بال کی کھال نکالنے کا نتیجہ سوا اس کے دوسرا کیا ہوسکتا ہے۔ خود حضرات مفتیان ان چیزوں کے صفات و عیوب سے ناواقف مگر فتوے دینا ضروری، مجبوراً عرف کے اوپر فتویٰ جاری ہوگیا یعنی عوام ان چیزوں کو کھیل کود کہتے ہیں۔ لہٰذا لہو ولعب کی تعریف میں آگیا۔ لیجیے چھٹی ملی، اس پر ہرگز نظر نہیں کہ شارع علیہ السلام جو پیغام لائے تھے اس کی غرض کیا تھی۔

پھر ان باتوں کے بعد بھی ہزار تاسف کے ساتھ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بعض طبائع ایسے ہوں گے کہ باوجود ان باتوں کے بری راہ اختیار کرلیں گے۔ انھیں لوگوں کے لیے شاعر کہہ گیا ہے:

چوبِ ناصاف کو ہر چند تراشا میں نے آدمیت کا سزاوار یہ مُنوا نہ ہوا

صرف ایسے لوگوں کو ہدایت کرنا اس کتاب کا کام ہے۔ مُلّا مزاج حضرات اور وہ داڑھی دار عورتیں جن سے کوئی زمانہ خالی نہیں ہوتا نفرتیں کریں گے اور کوسنے دیں گے کہ یہ دیکھیے صاحب زنا کاری کی بِدّ یا پڑھائی جارہی ہے مگر لکھنے والا ان لوگوں کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ اگر ایک گنہگار بھی سوزاک یا آتشک سے بچ گیا یا ایک مبتلا کی تکلیفیں کم ہوگئیں تو ان لوگوں کی لعن طعن مجھ کو ایسی خوش آئند ہیں جیسے سسرال کی گالیاں، عیاشی کی برائیاں کافی بیان ہوچکی ہیں۔ احتیاطاً پھر کہتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ اس نامراد عیب کی طرف ترغیب دلانے کے لیے نہیں کہتا ہوں بلکہ صرف اس واسطے لکھتا ہوں کہ اگر سب

عیوب دور نہ ہوں تو کچھ ہی دور ہو جائیں۔ حرام کاری کے بعد خصوصاً اور یوں عموماً بعد انزال پیشاب کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اکثر لوگ اس کے اوپر فوراً قادر نہیں ہوتے، لیکن کوشش سے کامیاب ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ عادت ہو جاتی ہے۔ اگر کسی شخص کا دل باوجود خیال آنے کے اٹھنے کو نہ چاہے تو اس کو یقین کر لینا چاہیے کہ میں نے اپنی قوت سے زیادہ نفس پرستی کی ہے جو مضر صحت ہے ہر شخص کی قوت برابر نہیں ہوتی، نہ کوئی تعداد مباشرت کی مقرر کی جاسکتی ہے لیکن اعضاء کا اس قدر کسل مند ہونا کہ پیشاب کرنے کو اٹھنا پسند نہ ہوا۔ اس بات کی عمدہ دلیل ہے کہ وہ شخص کثرت کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اس کے پہلے کہ آدمی کسی بازاری عورت کے قریب جائے اس کو یہ خوب دیکھ لینا چاہیے کہ چہرے یا جسم پر دانے وغیرہ تو نہیں ہیں۔ یا کوئی علامت ناک پیشانی یا گلے پر گزشتہ بیماری کی تو نہیں پائی جاتی۔

دوران مجامعت میں اس کو تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے کیونکہ یہ بڑی علامت بیماری کی ہے۔ اس کے بعد جلد سے جلد کسی تریا کی قابلیت رکھنے والی چیز مثل پرمیگنٹ یعنی سرخ دوا وغیرہ سے جسم کو دھو ڈالنا چاہیے۔ اگر کوئی ایسی چیز دستیاب نہ ہو تو خود اپنے پیشاب سے خوب دھو ڈالے۔ آتشک کا زہر جلد کے کسی خراش یا زخم کے ذریعہ سے آتا ہے اور یہ دعوے سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ دھل ہی جائے گا۔ لیکن اپنی طرف سے کوئی احتیاط اٹھا نہ رکھنا چاہیے۔ سوزاک کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ اس کی حفاظت اسی طرح ہوسکتی ہے کہ پچکاری لے لے۔ جو لوگ سوزاک کا مزہ چکھ چکے ہیں وہ تو یقیناً خود پچکاری لے لیں گے جن کو یہ تمغہ ابھی نہیں ملا ہے وہ اگر خود نہ لے سکیں تو کسی ڈاکٹر کے پاس چلے جائیں بہت ہلکا پرمیگنٹیٹ کافی ہوگا۔ یہ عمل جلد سے جلد نہیں تو چوبیس گھنٹوں کے اندر ضرور ہو جانا چاہیے۔ تندرست کو پچکاری میں تکلیف نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ حفاظت کی بہت سی صورتیں ہیں، ایک فرینچ لٹر یعنی ربڑ کی تھیلیاں ہیں جو جسم کے اوپر چست چڑھ جاتی ہیں۔ یہ مختلف دبازت کی ہوتی ہیں۔ بعض بہت موٹی ہوتی ہیں جن میں حسن اور حظ دونوں کم ہوتے ہیں لیکن بہت مرتبہ کام آتے ہیں۔ بعض بہت پتلے ہوتے ہیں جو کم دن چلتے ہیں لیکن حظ میں فرق کم آتا ہے۔ ان سے پوری حفاظت بیماریوں کی ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں عیب یہ ہے

کہ یہ اکثر پھٹ جاتے ہیں۔ ربڑ موسمی اثرات سے بہت جلد خراب ہوجاتا ہے اور دوسری غلطی جو لوگ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ سر کی طرف تھوڑا حصہ خالی چھوڑ دیا جائے لوگ اس کو خوب کھینچ کر چڑھاتے ہیں۔ اگر استعمال کے پہلے یہ کھینچ کر دیکھ لیا جائے اور شروع سے تھوڑا سا حصہ خالی رکھا جائے تو پھٹنے کا خوف کم رہ جاتا ہے۔ اس آخری ترکیب پر ہر شخص خیال نہیں کرتا اور اس وقت فطرت کا تقاضا بھی یہی ہوتا ہے کہ خوب کھینچ کر چڑھایا جائے۔ بعض میں اخراج کے لیے ایک پتلی سی تھیلی آگے لٹکا کرتی ہے۔ اس تھیلی کے علاوہ بھی تھوڑی جگہ خالی چھوڑنی چاہیے ایک اور چیز جو کسی مچھلی کی جھلی ہوتی ہے وہ بھی اسی کام آتی ہے۔ یہ باریک فرنچ لٹر سے بھی زیادہ باریک ہوتی ہے اور آدمی اس کو محسوس بھی نہیں کرتا، ایک اور چیز بھی ہے جو کم خرچ بالانشیں آدمی خود تیار کرسکتا ہے۔ بکرے کا مثانہ لیجیے اور اس کی چربی چاکو کی باڑھ سے کھرچ ڈالیے۔ اس کے بعد دھو کر پانی کپڑے پر جذب کرلیجیے بعدازاں ایک ذرا سی دُہنیت مثل گھی مکھن یا ویسلین کے لگا کر کسی ڈبیہ میں رکھ چھوڑے۔ اس کو کام میں لانے کی یہ صورت ہوتی ہے کہ اس کو اس طرح چڑھائیں جیسے کوئی رومال کے درمیان میں کھڑی انگلی رکھ کر اس کے چاروں گوشے اٹھا کر پوری انگلی پر غلاف کی طرح چڑھائے۔ جب یہ کرچکے تو ایک ربڑ کا چھلّا جو کسی پرانے فرنچ لٹر سے علیحدہ کرلیا ہو بیچ عضو پر چڑھائے جو اس جھلی کے چاروں کونوں کو دبائے رہے۔ مباشرت میں اول تو محسوس کم ہوتی ہے۔ دوسرے اس میں یہ بھی صفت ہے کہ چونکہ یہ رومال کی طرح کھلی ہوئی ہوتی ہے اس لیے اس کے دھونے میں دِقّت کم ہوتی ہے اور اس کی حفاظت کے لیے ذرا سا تیل، گھی، مکھن، ویسلین، کوئی چیز کافی ہے۔ فرنچ لٹر اول تو دھلتا مشکل سے ہے، دوسرے سنگ جراحت کو باریک پیس کر اس میں رکھنا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض دوائیاں بھی ملتی ہیں۔ ایک نیم قرص نما ٹکیہ ہوتی ہے جس کو ''وائفس فرینڈ'' یا گھر گرست کی سہیلی کہتے ہیں۔ اس کا ذکر اگر میں غلطی نہیں کرتا ہوں تو مسز اینی بسنٹ نے بھی مسئلہ آبادی کے ضمن میں کیا ہے یہ بطور حمول کے استعمال ہوتی ہے۔ بیماری اور نیز حمل کو روکنے کے لیے بہت کارآمد سمجھی جاتی ہے، لیکن اس میں بھی ایک خامی ہے۔ یعنی دہنیت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ استعمال کرکے طبیعت الجھتی ہے۔ ایک

دوسری دوا جرمنی سے آتی ہے جس کو ''گانوٹن'' کہتے ہیں۔ اس کی ٹکیہ بھی اسی طرح استعمال کی جاتی ہے اس میں دہنیت وغیرہ نہیں ہوتی، نہ اس کا حجم زیادہ ہوتا ہے۔ اگر فوراً کام میں لانا ہے تو پانی میں ڈبو کر استعمال ہو ورنہ تین منٹ اس کے لیے کافی وقت ہے۔ اس کو فریقین محسوس نہیں کرتے اور اگر عورت چاہے تو مرد جان بھی نہیں سکتا۔ جو لوگ لڑکوں سے گھبرا گئے ہیں یا جن عورتوں کی تندرستیاں جواب دے چکی ہیں ان کے لیے بہت کارآمد ہے۔ حالانکہ لڑکوں کی پیدائش صرف اس بنا پر روکنا کہ تعلیم وغیرہ میں دقت ہوگی وہ یورپین خیال ہے جو مجھ حقیر کی سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ اگر طبیب کہے تو امر دیگر ہے۔

ان تمام باتوں کے بعد بھی اگر کوئی کمبخت بلا میں گرفتار ہو جائے تو ذرا سا تعجب نہ کرنا چاہیے، رنڈیاں چاہے جتنی اونچی ہوں اگر ان کے ذریعے سے بیماری آجائے تو خلاف امید نہیں کہا جاسکتا۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ بازاری عورت جس سے برسوں سے واقف ہیں اور ہر طرح سے اطمینان والی ہے، ایک دن اپنے پیار اور محبت کا پورا ثبوت دے دیتی ہے۔ ارے یہ کیا ہوا! تماشبین صاحب قرآن اٹھانے کو تیار ہیں۔ نہا دھو کر مسجد میں جانے کو تیار ہیں کہ میں نے سوا اپنی قدیم آزمودہ پابند آشنا کے دوسری کا منھ دیکھا ہو تو رو سیاہ وہ بھی ہنس ہنس کر قسمیں کھاتی ہے کہ مجھ کو کوئی بیماری نہیں اور اگر ہوتی تو میں تم سے پوچھتی ہوں آخر تم سے کیونکر چھپی رہتی۔ میں بھی یہی کہتا ہوں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اجی حضرت مجھ سے سنیے، یہ آپ کی مشغولہ معشوقہ جو ہیں بہت دن ہوئے اس کا بھرنا بھر چکی ہیں۔ دوا علاج، دھوڑ دھوپ اچھی ہوئی خدا نے چنگا کر دیا۔ اب یہ سوزاک سے خود متاثر نہیں ہیں، لیکن کبھی کبھی اپنے چاہنے والوں کو رکھی رکھائی سوغات دے دیتی ہیں۔ ان کو انگریزی میں کیریر کہتے ہیں۔ آپ ان کو ڈس کی گانٹھ کہیے۔ میرے پڑھنے والے اگر خدانخواستہ تمھارے دشمن بھی کسی دن ان آفتوں میں مبتلا ہو جائیں تو میری وصیت قبول کرنا کہ شرم کو اسی وقت دھو کر پی جانا اور کسی سمجھ دار باضابطہ طبیب وید یا ڈاکٹر سے فوراً رجوع کرنا عطائیوں کے پھیر میں نہ پڑنا، نہ ملک اشتہارستان یعنی پنجاب سے خفیہ پارسل منگوانا، آج تک کسی کو نہیں دیکھا کہ اعزا اقربا احباب سے اپنی حالت چھپانے میں کامیاب ہوا ہو۔ پھر کیا فائدہ کہ مرض بھی نہ اچھا ہو اور پردہ بھی فاش ہو۔ مصیبت کے مارے بیماری کے

مبتلاؤں کو غور کرنا چاہیے کہ حیا جو ایمان کا جزو ہے جو مردانگی کا اسی طرح جوہر ہے جیسے نسوانیت کا زیور ہے۔ جو آدمی کو غلط راہ چلنے سے روکتی ہے جب انسان نے اسی موتی کی آب کھودی تو ندامت جو گناہ کے بعد پیدا ہوتی ہے اس کا پالنا پوسنا ایسا ہے جیسے کسی عورت کی گود خالی ہو جائے اور وہ گلہری کا بچہ پال کر اپنا دل بہلائے۔ جس وقت تک یہ بیماری نہ آئے اس وقت تک اس سے ایسا بھاگنا چاہیے جیسے کوئی شیر سے بھاگتا ہے۔ جب آن پڑے تو مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے اور رہی سہی ہمت کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ بارہ بنکی کے ضلع میں ایک مشہور بدمعاش اور اس کے بھائی کو پھانسی دی گئی تھی۔ جب ان کو پھانسی کے مقام پر لائے تو چھوٹا بھائی سراسیمہ ہو گیا۔ بڑے بھائی نے کہا ''یہ کیا نامردی ہے یہ ضرور ہے کہ تو میری وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہوا مگر اب تو ہو چکا اب مردانگی سے پھانسی پر چڑھ جا۔'' اسی طرح سے ان بیماریوں کے بارے میں بھی کرنا چاہیے۔ جو سختیاں ان بیماریوں کے باب میں بیان ہوئی ہیں پھر بھی کم ہیں اور روز دیکھی جاتی ہیں لیکن ہر شخص کی یہ حالت نہیں ہوتی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ عمدہ علاج، وقت پر دوا دوش اور باضابطہ احتیاط سے بہت سی تکلیفوں سے بچ بھی جاتے ہیں۔ سوزاک کے بہت سے مجربات ہیں۔ جو کبھی کبھی اچھا کر دیتے ہیں یا کم سے کم اتنا وقفہ ضرور دیتے ہیں کہ آدمی تکلیف سے چھٹکارا پا کر علاج معالجہ جاری رکھے اور اچھا ہو جائے۔ آتشک میں بھی پارہ وغیرہ کے مرکبات ایسے ہیں کہ اگر شروع ہی سے ان کا خارجی اور داخلی استعمال ہو تو زہر کچھ کم ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کا حکیموں کا دعویٰ ہے کہ پارہ کے استعمال سے آتشک کا زہر ایسا جل جاتا ہے جیسے کاغذ آتش زدہ اینٹھ کر خاک سیاہ ہو جاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس زبردست دھات کا استعمال کسی پڑھے لکھے معالج کے ہاتھ سے ہو۔

عطائی کے ہاتھ میں یا ناتجربہ کار پیشہ ور کے ہاتھ میں بھی ایسا ہے جیسے اندھے کو بیلچہ دے کر باغ کی درستی کروائے۔ اسی طرح کی بے عنوانیوں سے لوگ پارے کے نام سے گھبرانے لگے ہیں۔ آتشک کا ایک نیا علاج بھی نکلا ہے جو واقعی بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ یہ جرمنی کی ایجاد ہے اور اب دوسرے ملکوں میں بھی اسی طرح کا بننے لگا ہے۔ اس سے مرض کے شدائد فوراً کم ہو جاتے ہیں مگر اس کے بعد بھی پارے کا استعمال کم سے کم دو

برس جاری رکھنا چاہیے۔ جو لوگ عادت دیرینہ کی بنا پر یا صحبت کے زبردست اثر میں پڑ کر عیاشی کرتے ہیں ان کی اصلاح ہونا مشکل ہے۔ البتہ جو لوگ واقعی یا اپنے گمان میں بشریت کے سخت تقاضے کی وجہ سے کرتے ہیں۔ ان کے لیے ایک نکتہ فرانس کے مشہور مصنف بریو کا بتایا ہوا عرض کیے دیتا ہوں۔ اگر آپ دیکھتے ہیں کہ آپ برسوں کے پرہیز کی وجہ سے کام اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ کھوپڑی کے پچھلے حصہ میں درد ہوتا ہے، نیند اڑ گئی ہے۔ خلاف عادت اسی طرح کے منصوبے بلاوجہ آیا کرتے ہیں اور شادی نہیں ہوسکتی تو کسی اتری ہوئی عورت سے منہ کالا کر لیجیے۔ یہ صورت کسی نوجوان رنڈی سے دائمی تعلق کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے کیونکہ یہاں دلآویزی کم ہوگی جس سے شکر کی مکھی بنیے گا اور شہد کی مکھی نہ بنیے گا اور دوران خون بھی کم ہوجائے گا ان سب سے بڑھ کر جو صفت ہے وہ یہ ہے کہ بازاری عورتیں اپنے پیشے کا نقصان عموماً اٹھان کی جوانی ہی میں برداشت کر چکتی ہیں اور اگر بیماری کا کچھ اثر باقی بھی رہتا ہے تو شروع مرض کی ایسی چھوت کم سے کم آتشک میں نہیں رہتی۔ عصمت بی بی از بے چادری، بقول فرانسیسی مصنف کے ننگی کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی جب حسن کی دولت کے ساتھ بیماری کا خزانہ بھی لٹ چکا ہے تو وہ دے ہی کیا سکتی ہے۔ ان شرمناک بیماریوں کی بڑی مصیبت کا پہلو یہ بھی ہے کہ رنڈی اور تماشبین اگر اپنے اعمال کی سزا پاتے ہیں تو بے جا نہیں، لیکن بیچاری شریف پردے کی بیٹھنے والی اس کا خمیازہ اٹھاتی ہے اور اف نہیں کر سکتی نہ کھلم کھلا علاج کرنے پاتی ہے نہ اپنے ہم جنسوں میں اپنی تکلیف کا رونا رو سکتی ہے۔

سوختیم و سوزش ما بر کسے ظاہر نہ شد
چوں چراغانِ شبِ مہتاب بے جا سوختیم

اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ شادی کے بعد شوہر صاحب رونمائی میں یہی تحفہ دیتے ہیں کیونکہ ازالۂ بکر میں جسم چھل جانے کی وجہ سے زہر کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ نئی نویلی دلہن شرم کی بات منہ سے کیونکر نکال سکتی ہے۔ شوہر صاحب کو معلوم ہوا تو وہ بھی کچھ ناواقف کاری کچھ گناہ کو چھپانے کی کوشش، تکلیف کو شروع شروع کی بات پر محمول کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مرض ترقی کر جاتا ہے اور غریب ناکردہ گناہ اکثر نہ آل کی رہتی ہے نہ اولاد کی۔

اس پہلو سے بڑھ کر سخت پہلو دوسرا نہیں۔ مگر آئے دن روز ہوتا ہے اور شریف زادی برداشت بھی کرتی ہے۔ ہمارے صوبے کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے چالیس برس کے تجربے میں نہ معلوم کس قدر شریف زادیوں کو دیکھا ہے کہ ان مظالم کا شکار ہوگئی ہیں اور حرف شکایت زبان پر نہیں لائیں۔ یہاں تو یہاں سلوینس اسال نے سوشل پیرل میں لکھا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں بھی یہی حال ہے کہ ہنی مون کے زمانے میں نہیں معلوم کس قدر بیچاریاں محبت کے پردے میں مجروح ہوتی ہیں۔ معلوم نہیں وہ لوگ بھی ہندستانی بیبیوں کی طرح زندگی پار کردیتی ہیں۔ یا ہر ایسی عورت قانونی چارہ جوئی کرتی ہے۔ یہ رسالہ اخلاق کے اوپر نہیں لکھا گیا ہے مگر بغیر کہے بھی رہا نہیں جاتا کہ جو شخص دیدہ و دانستہ اپنی بے خطا بی بی کو اس آفت میں ڈال دے یا رنڈی ہی کو سوزاک دے دے۔ اس سے زیادہ برا آدمی مشکل سے دکھائی دے گا۔ گو ویسے ہی برے آدمی روز دکھائی دیتے ہیں۔ خود میرے ایک ہم مکتب کو یہ عارضہ ایک رنڈی سے ہوگیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے نہ معلوم کتنی حرام زادیوں کو دے کر اپنی تکلیف کا بدلہ لے لیا۔ یہ خباثت تشریح کی محتاج نہیں۔ مگر فطرت کے تقاضوں کو اخلاق کے نکتے نہیں روک سکتے۔ لہٰذا ایسے شخص کے لیے رنڈی بازی کرلینا اتنا برا نہیں جتنا کہ شادی کرنا مگر اس حالت میں بھی اس کو کم سن، یا ایسی رنڈی کے پاس بلا احتیاط جانا جس کو وہ تندرست جانتا ہے شادی کرنے سے بھی زیادہ برا ہے کیونکہ بی بی تمھاری امانت خبیثہ جوگ کما کر رکھے گی مگر دوسرے کو نہ دے گی۔ برخلاف رنڈی کے کہ وہ سخاوت کے دریا بہادے گی اور جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے تمھاری سیہ کاری کی روشنی ہر جگہ پھیل جائے گی۔ ہاں اتری ہوئی رنڈیاں جو یقیناً جنگ آزمودہ سپاہی کی طرح بہت سے زخم کھا چکی ہیں ان کے پاس جانا بھی غنیمت ہے مگر اس حالت میں بھی یہ نہایت ضروری ہے کہ اگر تم نے فرنچ لٹر وغیرہ استعمال نہیں کیا تو باتوں باتوں میں ان کو اپنی حالت سے آگاہ کردو، یا کم سے کم ایسی باتیں کرو کہ وہ ہوشیار ہوجائیں۔ یہ لوگ اپنے پیشے کی وجہ سے ان بیماریوں سے صرف اسی قدر ڈرتی ہیں جس قدر فیل بان ہاتھی سے ڈرتا ہے جو منھ سے تو یہی کہا کرتا ہے کہ صاحب سولی پر کی نوکری ہے مگر مست ہاتھی پر بھی بند نہیں ہوتا۔ رنڈی اس طرح کی باتوں کی عادی

ہوتی ہے۔ وہ اس قدر برا نہ مانے گی جس قدر تم خیال کرتے ہو۔ نہ یہ خیال کرے گی کہ تم دوسرے آنے جانے والوں سے زیادہ بھلے فریبے ہو۔

اگر شامت اعمال سے تمھاری شادی ہوگئی ہے تو سب سے پہلے تم کو چاہیے کہ اپنی بی بی سے پورا حال بیان کردو۔ ضرور بیان کردو، ضرور بیان کردو اور اس کے بعد بھی جتنی احتیاطیں عرض کی گئی ہیں ان کا خیال ہمیشہ رکھو۔ ہندستانی عورت یقیناً اس وقت بھی ہمدردی نہ چھوڑے گی۔

صبر تلخ ست ولیکن برِ شیریں دراد

وہ زمانہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ آجائے گا کہ تمھارا معالج تم سے کہہ دے گا کہ تم اب اچھے ہوگئے۔

○

فصل دوم

نشہ

غلطیوں کی سخت جانی مشہور ہے اور شراب اس کی بہترین مثال ہے۔ لوگ اس کی برائی ہمیشہ بیان کرتے چلے آئے ہیں مگر یہ بَلا انسان کا پنڈ نہیں چھوڑتی۔ اس کی بھلائیوں میں صرف اس قدر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ شراب اپنی تیزی کی وجہ سے دوران خون زیادہ کردیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دوران خون بھی ہر حالت میں مفید نہیں کیونکہ ہر کمالے را زوالے۔ جس قدر زور سے گیند دیوار پر پڑے گا اتنے ہی زور سے واپس آئے گا۔ دوران خون بھی جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر اترنے میں کم ہوگا۔ سب سے بڑی صفت جو اس کی بیان کی جاتی ہے اور جس ضرورت سے عموماً ہندستانی اس کو اختیار کرتے ہیں وہ امساک ہے لوگوں کی جہالت کا یہ حال ہے کہ وہ شراب کے امساک کو قوت کی نشانی جانتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ شراب صرف خیالات کو دوسری طرف بانٹ دیتی ہے اور اس وجہ سے دیر ہوتی ہے۔ تھوڑی سی شراب جس کی مقدار دوا کے حدود سے نہیں نکلتی (میرے خیال میں دس قطروں سے لے کر ساٹھ قطروں تک) باہ کے لیے ضرور مفید بتائی جاتی ہے لیکن اگر رفتہ رفتہ بڑھائی نہ گئی تو دو ہی چار دنوں میں بیکار معلوم ہونے لگتی ہے اور مقدار زیادہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بڑھ جانے کا وہی نتیجہ ہوتا ہے جو کم سے کم ہندستانی شرابی کا عموماً اور انگریزی شرابی کا خصوصاً نظر آتا ہے۔ یہ بڑھ گئی تو اس کا فائدہ نقصان سے بدل جاتا ہے مگر ناواقف کار کو چند روز تک فائدہ ہی دکھائی دیتا ہے اس کے بعد وہ بھی کف افسوس ملنے لگتا ہے۔ اس کی وجہ حسب ذیل ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کرچکا ہوں۔ شہوت تین قسم کی ہوتی ہے۔ اول دماغ کی تحریک سے جو اعلیٰ قسم کی انسانی نعمت ہے، دوسرے دل کے تقاضے سے یہ بھی غنیمت ہے، تیسرے اعضاء کی رگڑ اور

مساس سے۔ یہ تیسری حالت ہمیشہ مضر اور کمزور کرنے والی ہوتی ہے۔ شراب میں جس وقت دماغ ماؤف ہوگیا تو اس کی دلچسپی جاتی رہتی ہے اور وہی تیسری قسم والی بات رہ جاتی ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ قلت باہ ہوتا ہے۔ جس شراب خوار سے پوچھ لیجیے آپ کو بتا دے گا کہ اگر شراب پینے والا بغیر شراب کے مباشرت کرنا چاہتا ہے تو سرعت خفیف کرتی ہے۔ جب اس کی عادت اور زیادہ ہوجاتی ہے تو علاوہ بہت سی دماغی قلبی اور جگر کی بیماریوں کے یہ بالکل نامرد بھی کردیتی ہے "جس کے لیے سرمنڈایا وہی کہے سرمنڈی" (ملاحظہ ہو بلاک صفحہ 443 اور نیز جارج ہرتھ کا قول)۔

سوزاک اور آتشک کی سب سے بڑی دلال شراب ہے۔ گناہ کا سودا جس قدر خریدا جاتا ہے زیادہ تر اسی کے ذریعے سے ہوتا ہے بڑے بڑے مصنفین نے لکھا ہے کہ ایک ہی عورت کو دو آدمی مصرف میں لائے اور شرابی پھنس گیا اور ہوشیار بچ نکلا وجہ یہ کہ نشہ میں آدمی صرف یہی نہیں کہ دیر تک مصروف رہتا ہو بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ احتیاط نہیں کرتا اگر کھال میں خراش آگئی تو اس کے اعصاب دماغ تک خبر نہیں پہنچاتے۔ اگر عورت کھلم کھلا بیمار ہے تب بھی آگ میں پھاند پڑنے میں باک نہیں۔ پھر اس کے بعد بھی کچھ پرواہ نہیں۔ صبح کے وقت اعضاء شکنی، کسل ایسا مسلط ہے کہ اس وقت بھی کچھ نہ ہوسکا اور آخرکار بیمار پڑ گئے۔ شراب سے قوت ارادی پر وہ زوال آتا ہے کہ دیکھنے والے عبرت کریں۔ بلاک نے لکھا ہے کہ ایک نیک چلن شائستہ خیال فوجی افسر ایک دعوت سے اپنے گھر آرہا تھا۔ رات بھیگ چکی تھی اور دماغ بھی تر تھا، یکبارگی ایک عورت نے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا اور می برد ہرجا کہ خاطر خواہ اوست۔ اپنے گھر لے گئی اس نے پہچان لیا کہ نرم چارہ ہے اور تھا بھی ایسا ہی۔ جب ہوش ہوا تو اس نے دیکھا کہ میں ایک کریہہ منظر بڈھی ٹکاہی کو پہلو میں لیے لیٹا ہوں۔ دو چار دنوں میں جس بات کا دھڑکا تھا وہی سامنے آئی۔ مواد کا اخراج شروع ہوا، مگر "رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت" کیمیاوی ترکیب سے کھل گیا کہ اخراج میں سوزاک کی زہر نہ تھا بلکہ فقط یوری تھرائیٹس ہوگیا تھا۔ یہ خرابیاں تو وہ ہیں جو بلا واسطہ شراب کے ذریعہ سے ہوتی ہیں اس کے علاوہ دماغ بھی خراب ہوجاتا ہے جگر تو سب سے پہلے خراب ہوتا ہے۔ کسی شرابی سے پوچھ لیجیے کہ تمھارے جگر کا کیا حال ہے۔ کسی حکیم ڈاکٹر سے پوچھ لیجیے کہ کتنے شرابی جگر کی وجہ سے مرتے ہیں۔ تعداد سن

کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ ہندستانی شاید اس وجہ سے کہ وہ بچپن سے اس سے مانوس نہیں ہوتے یا موسمی اثرات کی وجہ سے اعتدال نہیں قائم رکھ سکتے۔ یورپین سے زیادہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ تمام ماہرین اس پر متفق ہیں کہ اگر شراب بند کردی جائے تو زیادہ تر جرائم کا دروازہ مسدود ہوجائے گا۔

لڑائی کے زمانے میں جن ممالک نے اس کا لحاظ کیا تھا وہاں کی رپورٹیں پورے پورے طور سے اس کو ظاہر کرتی ہیں۔ دوسری قوموں کی نسبت میں نہیں کہہ سکتا لیکن ہندستانی جب شراب کا استعمال کرتے ہیں تو حرکات اور گفتگو میں آزادی کا عذر ڈھونڈنے کے لیے کرتے ہیں یعنی اگر کسی شخص کا دل چاہتا ہے کہ وہ اس وقت خوب بکے یا شور کرے تو وہ شراب کی آڑ ڈھونڈھ لیتا ہے۔ یوں اگر وہی حرکتیں کرے تو احباب کا ڈر لگا ہوا ہے اور خود اپنے ضمیر کا دھڑکا ہے کہ سڑی کہلاؤں گا لیکن شراب کے بعد یہ تکلفات اٹھ جاتے ہیں اور آدمی جانتا ہے کہ میں جو خفیف الحرکاتی کروں گا وہ شراب کے سر منڈھی جائے گی۔ شراب کی یہ خاصیت کہ طبیعت کی اصلیت کو ابھار لاتی ہے۔ میرے خیال کی تائید کرتی ہے۔ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ جو رنگ طبیعت کا پہلے ہوا وہی گہرا ہوجاتا ہے۔ اگر سود خوار کو شراب پلا دیجیے تو یقیناً وہ سود زیادہ مانگنے لگے گا۔ اگر سخی کو پلا دیجیے تو وہ سخاوت زیادہ کرنے لگے گا۔ وعلی ہذالقیاس شراب پی کر گالیاں بکنا یا ناشائستہ حرکات کرنا خود زیادہ تر اپنی افتادِ طبیعت پر موقوف ہے۔ شراب کو گالیوں سے گو خاص انس ہے لیکن اگر کوئی شخص نشہ میں گالیاں بکنی شروع کردے تو یقین رکھیے کہ بغیر شراب کے بھی یہ شخص مزاج کا گندہ دہن ہے کیونکہ پینے والے کا دل دوسرا نہیں ہوجاتا گو دماغ ماؤف ہوجائے۔ شراب کی برائیاں شرابی کے ساتھ دفن نہیں ہوجاتیں بلکہ کم سے کم ایک پشت تک ضرور باقی رہتی ہیں۔ پاگل خانوں کی رپورٹیں موجود ہیں کہ زیادہ تر سڑی وہ ہیں جن کے ماں باپ یا دونوں شراب کی کثرت سے عادی تھے۔ جو لوگ کثرت سے نہیں پیتے ان کی اولاد بھی بے داغ نہیں بچتی۔ تازہ ترین تحقیقات یہ ہے کہ اگر تھوڑی سی بھی تر دماغی میں اولاد پیدا کی ہے تو وہ چند قطرے اولاد کو ترکہ میں ملیں گے۔ بہت پینے والے کا کیا ذکر ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ شراب زدہ اولاد صرف سترہ فی سیکڑہ تندرست ہوتی ہے۔ باقی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے اور وہ بیماریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دق

سے ان سے ملاقات صرع سے ان سے بھائی چارہ، دماغ کی خرابی سے ان کو رغبت اور جرائم سے تو گویا دانت کاٹی روٹی ہے۔ جگر کی بیماریوں کا کیا کہنا، وہ تو اپنی ہی ہیں۔ یہ سب مبالغہ کے ساتھ نہیں لکھا گیا ہے بلکہ اس موضوع پر جس قدر کتابیں ہیں ایسے ہی مضمون سے بھر پڑی ہیں۔ اسناد لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہولاک ایلس بلاک فارل والٹر، ایم گیلکین سل ویس اسٹال وغیرہ وغیرہ ملاحظہ ہوں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ تولید کے کیڑے اپنے ساتھ عوارض مثل دق وغیرہ کے نہیں لاتے بلکہ ان میں صرف ایک رجحان والدین کی بعض بیماریوں کی طرف ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے شراب کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی اولاد فوراً پہچان لی جاتی ہے۔ اگر استقرار حمل دوران نشہ میں ہوا ہے تو گویا لڑکے کے ماتھے پر لکھا ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ چند بڑے جلیل القدر لوگ پولو کھیل رہے تھے ان میں دو نوجوان تھے جو دونوں بہت اچھے کھیلنے والے تھے۔ مگر ایک جب گھوڑا دوڑاتا تھا اس کا سارا جسم ہلتا تھا اور دوسرا زین پر میخ کی طرح گڑا ہوا تھا۔ ایک شخص جو میرے پڑوس میں بیٹھا تھا۔ اس سے اپنے پاس والے سے اسی نوجوان کے بارے میں کچھ باتیں ہوتی تھیں (Child of Alcohol) (یعنی ابن الشراب) کا لفظ میں نے اپنے کانوں سے سنا۔ ابن الشراب اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو ماں باپ کے نشہ کی حالت میں پیٹ میں آتا ہو۔ مجھ کو یہ واقعہ اس وجہ سے یاد رہا کہ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ مغربی سرد ممالک کے رہنے والے ہیں ان کی معاشرت میں شراب ایسی درآئی ہے کہ گلے کا ہار ہوگئی ہے۔ امریکہ نے اس کو قانوناً ناجائز ٹھہرایا ہے پھر بھی شراب الیہود جس کے معنی چھپ کر پینا ہے برابر جاری ہے۔ یورپ میں شراب کے چھوڑنے میں ایک امر اور بھی ہارج ہے۔ فرانس، اٹلی اور اسپین وغیرہ میں بہترین شرابیں تیار ہوتی ہیں۔ ان کی سوداگری سے کروڑوں کی آمدنی ہے۔ چنانچہ تھوڑا زمانہ ہوا فرانس والوں نے طے کیا تھا کہ ایک جہاز مختلف شرابیں لے کر بندر بندر گھومے اور لوگوں کو مفت پلائے۔ ہندستان کے لیے یہ عذر بھی نہیں ہے۔ شراب کا نقصان سب کے لیے یکساں ہے۔ لیکن کمزور کو بہت جلد مار لیتی ہے۔ طاقتور لوگ اکثر اس کے نقصان کو جلد محسوس نہیں کرتے۔ اس لیے پتہ نہیں چلتا جو لوگ شراب کے عادی ہیں وہ شروع شروع میں موٹے بھی ہوجاتے ہیں مگر یہ دھوکا ہی دھوکا ہے۔ چہرے پر سرخی تندرستی کی علامت ہرگز نہیں۔ کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ جوں جوں شراب کی

عادت زیادہ ہوتی جاتی ہے چہرے اور ناک کی رنگت بڑھتی جاتی ہے۔ شیریڈن کے ڈراما ڈوانیا یا (بڑی انا) میں نہایت ہی شوخی سے سرخ ناک کا ذکر کیا ہے۔ شرابیں سانپ کی طرح ہزاروں قسموں کی ہوتی ہیں۔ بعض تو ایسی ہیں کہ وہ صرف خاص رقبوں کے انگوروں سے تیار ہوتی ہیں اور صرف خاص خاص خانقاہوں کے راہبوں کو ان کے نسخے معلوم ہیں جو علم سینہ ہے بعض بہت قیمتی ہیں بعض غریبا مئو کم قیمت ہوتی ہیں۔ ان کے نقصانات میں بھی سانپ ہی کی طرح فرق ہے۔ ہمارے ہندستانی پینے والے اکثر اس سے نہیں واقف ہوتے ہیں اور ہر شراب کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ غالب مرحوم نے اپنے خطوط میں لیکور کا ذکر کیا ہے جس کو یقیناً وہ عام شرابوں کی طرح استعمال کرتے رہے ہوں گے۔ حالانکہ بہت قلیل مقدار میں صرف کھانے کے بعد پی جاتی ہیں اور عموماً میٹھی ہوتی ہیں جن میں مختلف خوشبوئیں دماغ کو دھوکا دیا کرتی ہیں اور مختلف اجزاء سے تیار ہوتی ہیں۔ نفاست خیال کے پہلو سے بھی اگر دیکھیے تو شراب ویسی ہی قابل نفرت ہے جیسی دوسرے پہلوؤں سے، ہمارے صوبے کی تخمیناً ایک بہت جلیل القدر ذات جن کے شانے کی لطافت ان کے دل و دماغ کے صفات کی طرح لاجواب ہے مجھ سے کہتے تھے کہ شراب پینے والوں میں اتنے بڑے بڑے خوش مذاق ہیں اس کی کھٹاس کی بو سے کراہت کیوں نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ بعض شرابوں میں خوشبوؤں کے بقعے چھوٹا کرتے ہیں۔

انھوں نے جواب دیا کہ سڑاہند کی بو پھر بھی ہوگی کیونکہ کسی چیز کی اصلیت کہاں جائے گی۔ واقعی کھٹاس کی بو ہر حال میں باقی رہتی ہے۔ ایک دوسرے عنایت فرمانے بھی ایک بات اسی طرح کی کہی جو مجھ کو بہت پسند آئی۔ انھوں نے کہا کہ حظ مباشرت جس سے بڑھ کر کوئی دوسرا حظ نہیں اس کو مدہوش ہوکر کم کرنا کسی نفیس مزاج کو پسند نہ ہوگا۔ اس میں کلام نہیں کہ بات نہایت معقول تھی، کیونکہ کھانا کھانے میں جب زبان پر ذائقہ کم ہوجاتا ہے تو آدمی ذرا سی چٹنی اچار چکھ لیتا ہے تاکہ زبان کی خصوصیت میں چوکھاپن آجائے، پھر کس قدر بدمذاقی ہے کہ آدمی دوران خون بڑھا کر اس حظ کو کُٹھل کرے۔ جس کا اثر آدمی کے ہربُنِ مو میں ہوتا ہے اور جس کا مقابلہ کوئی دوسری مادّی لذت نہیں کرسکتی۔

○

فصل سوم

قوّت

جارج ہرتھ کا قول ہے ''میں یہ نہیں کہتا ہے کہ انسان بڑھاپے میں اعضائے تناسل سے ہر وقت کام لینے کی کوشش کیے جائے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ انسان کے دل کو یہ تقویت رہنی چاہیے کہ میں قادر ہوں اگر یہ نہ ہوا تو کچھ نہیں۔''

ہر صحیح اور تندرست انسان سن شعور پر پہنچ کر اس نعمت سے مستفیض ہوتا ہے اور بقائے جنس کے خدمات انجام دیتا ہے۔ اس قوت سے یہی فائدہ نہیں بلکہ تمام وہ صفات جو مرد کے جوہر ہیں اسی قوت کے قدموں سے لگے ہیں۔ جانوروں میں بھی یہی حال ہے۔ آختہ اور نر گھوڑے میں فرق دیکھ لیجیے۔ وہ دم خم چمک دمک کنڈہ گھونگھٹ جو نہ صرف گھوڑوں کی قوم کو نگاہ میں ممتاز کرتا ہے بلکہ سوار کی بھی قدر بڑھاتا ہے سب اسی صفت پر موقوف ہے۔ آختہ ہونے کے بعد سب کچھ رہ جاتا ہے مگر وہ بات نہیں رہتی۔ ہولاک ایلس کا خیال ہے جس سے دوسرے مصنفین نے بھی اتفاق کیا ہے کہ شروع شروع مرد کے ظاہری اور نیز باطنی اعضاء تناسل دوسرے جنس سے بے خبر رہ کر عمل کرتے ہیں جس کو اصطلاح میں خواہش فردی کہہ لیجیے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ یہی قوت ہے جو شاعری مصوری اور دوسرے لطیف فنون میں ظاہر ہوتی ہے بلکہ تمام وہ باتیں جن کو مرد فخر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور عورت قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اسی قوت کے مظاہر ہیں۔ شاید نٹشے بھی اسی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ ہمارے بہت سے قویٰ مثلاً غصہ، نفرت، شہوت کا اگر کوئی کارآمد مصرف، مثل چارا کاٹنے، قاصدی کرنے یا ہل چلانے کے نہ نکالا گیا تو یہ مضر ثابت ہوں گے۔ اس کے ظاہری معنی یہی معلوم ہوتے ہیں کہ انسان میں یہ قویٰ بھی فائدہ رسانی ہی کے لیے خلق ہوئے ہیں۔ مگر ان کے استعمال میں بڑی احتیاط برتنی چاہیے تاکہ مثل

دودھاری ہتھیار کے یہ خود استعمال کرنے والے کو نقصان نہ پہنچادیں۔ خواہش فردی سے گذر کر خواہش اشتراکی ہے اور یہی اس باب کا موضوع ہے۔ عموماً ہر صحیح تندرست آدمی بچپن کا زمانہ طے کرنے کے بعد اس سے کامیاب ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ یعنی انسان اس نعمتِ عظمیٰ سے بالکل یا کسی درجہ تک محروم بھی رہ جاتا ہے۔ ایسے لوگوں میں جو پیدائشی ہیں ان کو اس قدر تکلیف نہیں ہوتی جیسی ان بدقسمتوں کو جو بعد کو اس بیماری میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ اطبا نے اس بیماری کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ کہ جس میں اولاد پیدا کرنے کی قابلیت کے باوجود آدمی مباشرت پر قادر نہیں ہوتا اور دوسرے وہ جس میں باوجود مجامعت کی قابلیت کے اولاد نہیں پیدا کرسکتا۔

اگر اعضاء میں پیدائشی نقص ہے تو تو کچھ کہنا نہیں۔ البتہ جہاں بعد کو ہوجائے وہاں علاج کی گنجائش ہے۔ مادۂ توالد میں کیڑے نہ رہ جانا جس میں مجامعت کی قابلیت باقی رہتی ہے لیکن اولاد نہیں ہوتی۔ اکثر تو سوزاک کی وجہ سے ہوتی ہے۔ تندی اور کرختگی کی کمی جلق سے ہوجاتی ہے۔ معدے کی خرابی سے بھی ہوجاتی ہے۔ جلق کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ یہ عارضہ عموماً باڑھ کے زمانے میں شروع ہوتا ہے۔ اس کے استاد اکثر ہم مکتب ہوتے ہیں اور بھی سیکڑوں طریقے اس کے ہونے کے ہیں۔ کام کاج نہ کرنا پڑھنے میں دل نہ لگانا، ضرورت سے زیادہ گرم کپڑے پہننا۔ گرم لحاف توشک استعمال کرنا، بستر پر بہت دیر پڑے رہنا۔ قصہ مختصر تمام وہ کام جس میں آدمی بیکاری کی وجہ سے منصوبے گانٹھا کرے انگریزی مثل ہے کہ بیکار آدمی کا دماغ شیطان کا کارخانہ ہے۔ جلق کی دریافت اکثر گھوڑے کی سواری، کپڑوں کی رگڑ وغیرہ سے بھی ہوجاتی ہے اور جس لڑکے میں ذرا بھی رجحان اس طرف ہوا وہ اس کو شروع کردیتا ہے۔ اکثر گود کے بچے اس کے عادی ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر بچے اپنے عضو کو ملا کرتے ہیں۔ اس میں ان کو لطف آنے لگتا ہے۔ ناواقف کار عورتیں یا تو پرواہی نہیں کرتیں یا بڑی بڑائی لاکھ کی ایک گلی بنوا کر کمر میں باندھ دیتی ہیں۔ مگر بچہ اس کو چھوتا بھی نہیں۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کے جسم میں کھجلی ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ غلاف کے نیچے میل دبا ہو جس کو ماں یا انا نے بہت دنوں سے صاف نہ کیا ہو۔ پیٹ میں کیچوے کی وجہ سے بھی یہ عادت ہوجاتی ہے جن لوگوں میں

ختنے کا رواج نہیں ان کو لازم ہے کہ کھال کو الٹ کر میل کچیل کو دور کرنے کی ضروری عادت لڑکوں میں پیدا کریں۔

جلق میں جو بات سب سے زیادہ تباہ کرنے والی ہے وہ رگ اور پٹھوں کا خراب ہونا نہیں ہے بلکہ عام جسم کا انس نکل جانا ہے۔ اکثر اخراج کی وجہ سے دل و دماغ کمزور ہوجاتا ہے۔ چہرہ زرد ہوجاتا ہے۔ اعضا دبلے ہوجاتے ہیں، دل دھڑکنے لگتا ہے، کام میں جی نہیں لگتا، سر چکر کھایا کرتا ہے۔ زیادہ تر طالب علم جو امتحان میں فیل ہوتے ہیں یا شروع کی ذہانت حافظہ کھوکر کودن ہوجاتے ہیں اسی کے مارے ہوئے ہوتے ہیں۔ نقصانات کی فہرست طویل ہے لیکن جو مصیبت سب سے بڑی نازل ہوتی ہے وہ نفسیات کی رو سے ہے۔ یعنی آدمی کی عقل اس کی خواہش سے دب جاتی ہے۔ دنیا کے ہر کام میں زندگی کے ہر شعبے میں اس کا نقصان عمر بھر تباہی لایا کرتا ہے۔ عقل بالکل پُچھے بٹیر کی طرح خواہش سے دب جاتی ہے جو بات عقل فائدے کی بتاتی ہے اس کو آدمی اونھ کر کے ٹال دیتا ہے۔ آدمی روتا ہے مگر کام شروع کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اعضاء کی خرابی کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض ڈاکٹر لوگ کہتے ہیں کہ رگڑ تگڑ سے پٹھے بجائے کمزور ہونے کے قوی ہوتے ہیں۔ بڑے آدمیوں کی بڑی بات ہم کیا منھ کھول سکتے ہیں۔ لیکن کتابوں میں یہی پڑھا ہے اور اس قدر اخبار سنے ہیں۔ جو عام علم کا درجہ رکھتے ہیں کہ عضو مخصوص کا سر تندرستی کی حالت سے زیادہ بھاری ہوگیا ہے۔ جڑ کے پاس عام حالت سے زیادہ لاغری آگئی ہے۔ آدمی عورت کے کام کا نہیں رہ گیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اعضاء کی کامل مضبوطی کے بعد کبھی کبھار کی بات سے ہرج نہ ہوتا ہو اور صرف کثرت ہی سے یہ تمام باتیں پیدا ہوتی ہوں لیکن جہاں تک عام جسم کی حالت کا تعلق ہے یعنی چہرے کا زرد ہوجانا، ہاتھ پاؤں کا لاغر ہوجانا، چہرہ بد رونق ہوجانا یہ تو ہزار مرتبہ کی دیکھی بات ہے۔ رہی ہمت کی پستی، ارادے کی کمی، ان عیوب کے پیدا ہوجانے میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب سے سخت عیب جو اس نالائق عادت میں ہے وہ یہ کہ اس کی روک ٹوک ناممکن ہے اور جہاں ایک مرتبہ لڑکا سیکھ گیا اس کا بھولنا ویسا ہی ناممکن ہے جیسے الف بے کا۔ اگر کوئی ماں باپ لڑکے کی ایسی حالت دیکھیں تو عام اس سے کہ باڑھ کا زمانہ ہو یا کامل بلوغ کا، شادی کردینا

چاہیے کیونکہ یہ عادت اسی طرح چھوٹ سکتی ہے۔ رقت کی شکایت بھی اس عادت سے ہوجاتی ہے لیکن یہ تمام باتیں تھوڑے دن ترک کرنے کے بعد مٹ جاتی ہیں اور آدمی بالکل اچھا ہوجاتا ہے اور اگر کوئی نقصان اور نقصانوں سے زیادہ باقی رہتا ہے تو وہ ہی سب سے بڑا نقصان عقل کی شکست اور خواہش کی فتح کا ہے۔ فرانس کے مشہور سیاسی فلاسفر ''روسو'' نے اپنے اعترافات میں اس عادت کے خود شکار ہونے کا ذکر کیا ہے۔ مگر ان بزرگوار کی یہ حالت بھی ہوگئی تھی کہ ایک مرتبہ کسی بازاری عورت کے یہاں بڑے اشتیاق سے گئے تھے اور جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس چلے آئے۔ جب وہ عورت ان کی طرف سے بے آس ہوگئی اور انھوں نے عذر خواہی میں فرمایا کہ کیا کہوں جیسے ہی میں نے تمھارے گھر میں قدم رکھا ایک ریاضی کا بہت پیچیدہ مسئلہ دماغ میں ایسا جاگزیں ہوگیا کہ اس وقت طبیعت مخاطب نہیں ہوئی تو اس سے رہا نہ گیا اور کہہ بیٹھی ''تو پھر عورتوں کو کیوں گھیرے رہتے ہو، جاؤ ریاضی سے دل بہلاؤ''۔ اس قصے کے بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ اس طرح کی اتفاقی حالت ممکن ہے تندرست سے تندرست مرد کی بھی عمر میں ایک مرتبہ ہوجائے لیکن دیکھا یہی گیا ہے کہ صرف ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے جن کی قوتیں اس وجہ سے کم رہ گئی ہیں یا اعصابی مزاج واقع ہوئے ہیں۔ 'روسو' کی ایسی حالت کو روحانی نامردی کہتے ہیں۔ پہلے پہل اکثر یہ اس طرح شروع ہوتی ہے کہ آدمی کسی وجہ سے ایک عورت سے صحبت کرنے میں ناکامیاب رہتا ہے اور اس کے بعد ہر عورت کے ساتھ یہی معذوری پیش آتی ہے۔ اگر یہ حالت کسی بڑے اختلاف طبع پر مبنی ہے تو تو بڑی مشکل ہے ورنہ جب کبھی ایک مرتبہ بھی کسی عورت سے کامیاب ہوگیا تو رفتہ رفتہ ہر عورت کے ساتھ مباشرت کرسکتا ہے اور اس عورت کے ساتھ بھی کمی جاتی رہتی ہے۔ اگر کسی کو ایسا واقعہ پیش آئے تو اس کو فکر کرنا چاہیے کہ کون سے اسباب ایسے ہیں جن کا اثر خراب پڑتا ہے۔ آیا کوئی بو یا خوشبو ناگوار ہے کسی چیز کا دھڑکا تو نہیں لگا ہے۔ فریق ثانی کی کوئی ادا تو ایسی نہیں ہے جس سے کوئی اس طرح کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جو پریشان کن ہے اور اسی طرح کے سیکڑوں وجوہ بیان کیے جاسکتے ہیں۔ ایسی حالتوں میں بیماری کے دور نہ ہوجانے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اگر خیالات میں تبدیلی پیدا کردی جائے۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے

کہ جگہ، وقت، قطع، حرکات، سکنات اگر بدل جاتے ہیں تب بھی یہ کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر ان باتوں سے بہت پریشان نہ ہونا چاہیے بلکہ کسی لائق ذی علم ڈاکٹر سے پورا کچا چٹھا کہہ دینا چاہیے اور اس کی صلاح پر عمل کرنا چاہیے۔

ایک امریکن ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ ایک مریض ایسا تھا جو اپنی نئی نئی بی بی کو عمل زن و شو سے بلند تر سمجھتا تھا اور اس عمل کو گندہ خیال کرتا تھا، اس کا دل کہتا تھا کہ ایسی پاک صاف ہستی کا یہ نجس مصرف۔ یہ اس کی حماقت تھی۔ عورت و مرد کا رابطہ نہ نجس ہے نہ کوئی عورت یا مرد اس فعل کو اپنے لیے کمتر سمجھ سکتا ہے، کھانا پینا وغیرہ خود اپنی ذات کے فائدے تک محدود ہے، یہ وہ حکم خدا ہے جس میں اس کے دو بندے ایک ہی وقت فائدہ اٹھا رہے ہیں اور فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

شیکسپیئر نے رحم کے لیے لکھا ہے کہ خدا کی رحمت میں وہ در آتا ہے جو رحم کرتا ہے اور وہ بھی در آتا ہے جس پر رحم کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں جنسی فرائض کے اوپر یہ قول بدرجۂ اولیٰ صادق آتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ اس طرح ہو کہ ضمیر کو ناگوار نہ ہو ورنہ اس کے برابر بُری چیز مشکل سے نظر آتی ہے۔ میں نے صرف حلال کہنے کے بجائے ''ضمیر'' کی شرط لگائی ہے۔ حرام کاری وغیرہ کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ جائز طریقے میں بھی اس کی احتیاط رکھنی چاہیے کہ تندرستی کو نقصان نہ پہنچے۔ عنفوان میں اس بات کی امید رکھنا کہ لوگ ہماری نصیحتوں کو یاد رکھیں گے، حماقت ہے اور ایمان کی بات ہے ''نئی جوانی مانجھا ڈھیلا'' اگر کسی نے یاد رکھا تو اس نے شباب کی داد نہیں دی، لیکن اس قدر ضرور ہونا چاہیے کہ اپنے شریک کی تندرستی کا خیال ضرور رہے۔ جسٹس کرامت حسین اعلی اللہ مقامہ علم الاخلاق میں فرماتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ سلوک زوجین میں اعتدال قائم رکھے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو کم سے کم یہ تو ضرور ہو کہ مرد کی طرف سے عورت کے حقوق کا پلہ بھاری رہے۔ اسی مقام پر ایک صلاح جملہ معترضہ کی طرح اور عرض کر دی جائے۔

شروع ایام حمل میں تو اس قدر احتیاط کی ضرورت نہیں لیکن آخر زمانے میں بہت خیال رکھنا چاہیے۔ پھر بھی اگر مجبوری ہوجائے تو پس پشت سے حسب قاعدہ فطرت

مجامعت کرنے میں رحم کے منہ پر چوٹ لگنے کا ڈر کم رہتا ہے۔ قرآن میں ہے تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں چاہو آگے سے جاؤ چاہو پیچھے سے جاؤ۔

ڈاکٹروں کا تجربہ ہے کہ ہزاروں نوجوان لڑکے ان کے پاس آئے ہیں اور اپنی خیالی مصیبت کا دکھڑا روتے رہے۔ میری شادی ہونے والی ہے لیکن میں بالکل ازکار رفتہ ہوں جلد کوئی دوا دیجیے ورنہ خودکشی کرلوں گا اور یہ دھڑکا اس وقت تک دور نہیں ہوتا جب تک شادی نہیں ہوجاتی۔ خیالی نامردی کی نیو یہیں سے پڑتی ہے اور ایسے ہی لوگ آگے چل کر خیالی نامردی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ نشہ کی زیادہ عادت سے بھی آدمی ازکار رفتہ ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ شراب کے بارے میں بیان ہوا۔ ساٹھ ستر برس ادھر تک افیون کا رواج بہت تھا اور آج بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ امساک کا کوئی نسخہ مشکل سے نکلے گا جس میں بھنگ اور افیون کا جزو نہ ہو اور افیون کھانے والے تھوڑے دن امساک وغیرہ کا حماقت آمیز لطف اٹھاتے ہیں۔ اس کے بعد نہ امنگ باقی رہتی ہے نہ تمنا، اب افیون کا دور گیا اور کوکین کا دور آیا۔ افیون کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا کھانے والا بے حیائی کی زندگی بڑی پاتا ہے۔ کوکین کھانے والا زیادہ جیتا بھی نہیں اور قوت کا یہ حال ہے کہ اگر قربت کے پہلے کھالی جائے تو آدمی یوں ہی لیٹا رہ جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مرد کو عورت کی خواہشات پوری کرنے کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے۔

ڈاکٹر میری اسٹوپس نے اس بات پر بہت زور دیا ہے اور ہولاک ایلس کا قول نقل کیا ہے۔ جہاں اس نے بہ سند دیگر محققین بیان کیا ہے کہ تمام ان عورتوں میں جو رحمی شکایات میں مبتلا ہوتی ہیں پچھتر فی سیکڑہ اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ مباشرت میں ان کی خواہشات پوری نہیں ہوتیں۔ یورپ کی یہ حالت ہو لیکن مشرقی ممالک میں یہ شکایت نہیں کیونکہ یہاں ہر شخص دوسرے کی خواہش پورا کرنا عادۃً اپنا فرض جانتا ہے۔ یہ صرف خیالی دعوے نہیں ہیں بلکہ بقول مختلف حکما گرم ملک والے جنسی قوی میں سرد ملک کے باشندوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ پھر بھی اگر کسی وجہ سے جلدی ہوجائے تو اس کے لیے دوائیں کھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر درمیان میں محبت ہے تو ایثار و استیثار تندرست انسانوں کا کام

نکالے جاتے ہیں۔ اگر محبت نہیں ہے اور صرف شہوت پرستی ہے جس میں خرید و فروخت کی ٹھہری ہے تو آدمی بیکار زحمت کاہے کو اٹھائے گا۔

کثرت مباشرت سے بھی آدمی رجولیت سے گذر جاتا ہے۔ اس کی دوا صرف یہی ہے کہ پرہیز کیا جائے۔ طلا وغیرہ ہمیشہ مضر صحت ثابت ہوتے ہیں۔ تیز دوائیں لگا کر جلد میں سوزش پیدا کردی جاتی ہے جس سے رگوں میں خون زیادہ دوڑنے لگتا ہے مگر اس زیادتی کا نتیجہ آخرکار کمی ہوتا ہے کیونکہ جو زیادہ دوڑے گا وہ زیادہ تھکے گا بھی۔ کھانے کی دواؤں میں ایسی دواؤں کو ترجیح دینا چاہیے جو غذائیت رکھتی ہوں اور معدہ کو درست کرتی ہوں۔ معدہ اگر درست رکھا جائے تو پچھتر فی سیکڑہ آدمیوں کی شکایتیں دور ہوجائیں اور باقی ماندہ پچیس سیکڑہ کو افاقہ نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب میں معالجات نہیں لکھے جاسکتے ہیں لیکن چند چیزیں ایسی ہیں جن کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ شہد، انڈے، دودھ، عنبر کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ قیمت کی زیادتی کی وجہ سے ہر شخص تجربہ نہیں کرسکتا۔ مگر کتابوں میں دیکھا ہے کہ جب ملاح لوگ سمندر میں اس کو پاجاتے ہیں تو بندرگاہ پر پہنچ کر ادھم جوت دیتے ہیں۔ آج کل بھیڑ وغیرہ کے غدود سے دوا تیار کی جاتی ہے جو بہت فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔ ان سب چیزوں سے بڑھ کر بھی جو عمل ہے وہ پرہیز اور پاکیزہ خیالی ہے۔ خیالی نامردی کی ابتدا نہ معلوم کیونکر ہوتی ہے شاید یہ وجہ ہوتی ہو کہ دو چار مرتبہ غلط کاری سے یہ وہم پیدا ہوتا ہو یا از روئے نفسیات کوئی اور وجہ ہو۔ نوجوانوں کو اپنے اوپر بھروسہ رکھنا چاہیے اور یہ خیال کرنا چاہیے کہ خدا کی نعمتیں عام ہیں۔ ہم بلاوجہ کیسے محروم رہ سکتے ہیں۔ بلا اشتعال اگر تندی وغیرہ نہ ہو تو ہرگز نہ گھبرانا چاہیے۔ کیونکہ اگر آپ کے اعضا میں ظاہر بظاہر کوئی پیدائشی نقص نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ہمہ وجوہ تندرست نہ ہوں۔

اس ضمن میں یہ بھی عرض کردیا جائے کہ جریان کے خیالی یا واقعی مرض سے بھی نوجوان لوگ بہت پریشان ہوتے ہیں۔ یہ مرض خراب عادتوں اور نیز معدہ کی خرابی سے ہوتا ہے۔ اس کی علامتیں یہ ہیں کہ احتلام زیادہ ہونے لگتا ہے۔ چہرہ زرد، جسم لاغر اور قلب دھڑکنے لگتا ہے، محنت نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ علامتیں کسی خراب عادتوں کی بنا پر نہیں ہیں تو تھوڑی سی احتیاط مرض کو دور کردے گی۔ رات کو فرش یا تخت پر سونا، چت نہ لیٹنا، شام کو

بھی چوکی پر جانے کی عادت ڈالنا، پیشاب کر کے آرام کرنا، رات کو غذا کی تقلیل کرنا اور معدے کا فعل درست کرنا بقول مہاتما گاندھی کے ٹھنڈے پانی سے نہا لینا بہت مفید ہے۔

مجرد آدمی کو اگر ہفتہ میں ایک دو بار خواب ہو جائے تو چنداں پروا نہ کرنا چاہیے کیونکہ سوتے میں جو اخراج ہوتا ہے وہ تمام قیمتی جوہر کا نہیں ہوتا بلکہ اس میں اور بہت سے رطوبات بھی نکلا کرتے ہیں۔

ایک غلط خیال اور رائج ہو گیا ہے جس سے ناتجربہ کار نوجوان خداواسطے کو پریشانی میں پڑ جاتے ہیں اور اشتہار باز دوا فروشوں کی بن آتی ہے۔ طلا وغیرہ کے اشتہارات میں عموماً ہوتا ہے کہ اگر رگوں میں پانی آ گیا ہے تو اس کے استعمال سے بہت جلد جذب ہو جائے گا۔ اکثر دھوکے باز تو ایک پرچہ سوالات کا بھی اشتہاروں کے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔

1۔ پشت عضو پر رگ موٹی تو نہیں ہو گئی ہے۔

2۔ آپ کو اکثر احتلام تو نہیں ہوتا؟ وغیرہ وغیرہ۔

بلوغ کے بعد رگ کا موٹا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں اور جس غریب نے ایک مرتبہ بھی غلط کاری کی یا نہیں کی ہے وہ اپنی حالت کا موازنہ کر کے سہم جاتا ہے۔ آگاہ ہو جائیے کہ ان علامتوں پر علاج صرف دھوکے باز دوا فروشوں کو مفید ثابت ہوا ہے اور کسی کو نہیں۔

○

باب پنجم

فصل اوّل

امرد پرستی

امرد پرستی کا نجس اور ناگوار مبحث ایسا نہیں ہے جس پر لکھ کر دل خوش ہو مگر ضرورت کی مجبوری سب کچھ کرواتی ہے۔ یہ فعل شنیعہ اچھا خاصہ عام ہے۔ قدیم مکتبوں میں پایا جاتا ہے اور آج کل کے مدرسوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس موضوع پر یورپین تصانیف سے مضامین لے کر لکھنا نہیں چاہتا اسی وجہ سے یہ باب بہت چھوٹا ہوگا۔ یورپ کی علمی تحقیقاتیں بڑی عمدہ چیزیں ہیں لیکن انھیں لوگوں کے لیے ہیں جو علم میں پایہ رکھتے ہوں۔ اگر کوئی فرومایہ لکھتا ہے تو قدم قدم پر یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مافی الضمیر ادا کرنے میں قاصر رہ جاؤں اور نتیجہ غلط نکلے۔ اس کے علاوہ خلاف فطرت طریقوں میں وہ شیطانی ذہانتیں کام میں لائی گئی ہیں کہ ان کے ذکر سے روح کو متلی ہوتی ہے اور عقلِ دور اندیش چلّاتی ہے کہ ایسے موقعوں پر جہلِ شے بہتر از علمِ شے ہی مناسب ہے۔ بہرحال اس قدر لکھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے کہ یہ عادت خواہ پردے کی وجہ سے یا بعض مذاہب قدیم و جدید کے غلط مفہوم کی وجہ سے ہو ایک بلائے بے درمان ہے جس کی برائی زناکاری سے بدرجہا زیادہ قابل نفرت ہے۔ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے لوگ ہر خطہ زمین میں ایسے ہوئے ہیں جن کی نسبت اس طرح کی باتیں مشہور ہوئی ہیں۔ مگر یہ دلیل اس بات کی ہرگز نہیں ہوسکتی کہ کوئی شخص اسی بنا پر اپنے لیے اس کو جائز جان لے دنیا میں بہت سے لوگوں نے چوریاں کیں ہیں، خون کیے ہیں، کرایہ پر ناکیں کاٹیں ہیں مگر اس وجہ سے ان حرکات کا جواز کسی شخص کے لیے نہیں ثابت ہوتا۔ اس معاملہ میں اکثر حضرات کی بے حیائی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس کا نام حسن پرستی رکھا ہے۔ حسن پرستی ایک

اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔ جس کو نجاست سے کوئی علاقہ نہیں حُسن جو بالفاظ دیگر جمال الٰہی ہے۔ اس کے مظاہر آدمی ہر پھول میں دیکھے پتی میں دیکھے نہایت ہی پاک اور کامیاب طریقہ سے عورت میں دیکھے اور عورت مرد میں دیکھے اپنے سے کمسن ہم جنس میں اس طرح دیکھنا کہ گویا کسی دوسرے انسان میں یہ چیزیں مفقود ہیں برے معنی رکھتا ہے۔

ہزاروں نالائق حسن پرستی کے مبارک لفظ کو خاک میں ملاتے ہیں۔ حالانکہ اس کے معنی تک نہیں جانتے۔ جس وقت ایک کم سن آدمی کسی کمسن کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں ایک احساس خوشی کا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی افکار کا مدار خودغرضی اور ہمدردی کے عمدہ تناسب کے اوپر واقع ہوا ہے۔ اسی بنا پر ہم جب کسی بیمار کو دیکھتے ہیں تو دہل جاتے ہیں۔ یہ کیفیت اسی فطرتی خودغرضی اور ہمدردی کا نتیجہ ہے جس پر انسان کی ساخت ہوتی ہے یعنی بیماری کی وراثت آدم سے ہم کو اسی طرح پہنچی ہے جیسے اس شخص کو۔ گویا اس کی بیماری خود ہماری علالت کا پیشہ خیمہ ہے۔ یہی حالت تندرستی کی ہے جب ہم دوسروں کو شفایاب ہوتے دیکھتے ہیں تو ہم کو بھی اچھے ہونے کی امید پڑتی ہے۔ آدمی کو خبر ہو یا نہ ہو مگر جب وہ کسی ہونہار نوجوان کو اپنے قریب پاتا ہے تو فطرت کا وہ تقاضا جو انسان کو کامیابی کی فطرت کی طرف لے جاتا ہے جاگ اٹھتا ہے اور آدمی کا دل اس اقبال مند کمسن کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ فطرت کہتی ہے کہ اے شخص تیرا وقت گزر گیا تو کوئی ہرج نہیں اگر تیرے ہاتھ سے تیر نکل چکا اور نشانہ خالی گیا تو کیا پرواہ ہے۔ یہ دوسرا انسان جو تیرا ہی مثل ہے بلکہ تو ہی دوسرے جامہ میں ہے۔ ابھی تیر چٹکی میں لیے ہے۔ مگر اس نے نشانہ اڑا دیا تو وہ بھی تیری ہی کامیابی ہے۔ ایک طرف سِن کی زیادتی کے ساتھ ناکامیابی گزشتہ مواقع کا ملال۔ آئندہ سے یاس، دوسری طرف سِن کی کمی کی وجہ سے ہر موقعہ آنے والا ہے جس میں کامیابی اسی طرح قبضہ اقتدار میں ہے جس طرح ناکامیابی۔ انحطاط کی جگہ امنگ ہے انفعال کی جگہ ہمت ہے اور تجربہ کی بزدلی کی جگہ الھڑپن کی عالی حوصلگی ہے جس کی سب سے بڑی دلآویزی مشکلات سے بےخبری ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جو ہر باپ بیٹے کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے اور اسی کو شاعر کہتا ہے ؎

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

سرسید علیہ الرحمہ نے ایک نکتہ کہانی کی صورت میں بیان فرمایا ہے جس میں خواب کا

استعارہ لیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک اندھیری ڈراؤنی رات میں، ایک ضعیف اپنی گزشتہ زندگی پر افسوس کر رہا ہے کہ اتنے میں خدمت کی پری جس کا نام ہمیشہ رہنے والی نیکی بھی ہے۔ آسمان سے اترتی ہے وہ محسوس کر رہا ہے کہ میرا وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ اب یہ معشوقہ میری نہیں ہوسکتی۔ اتنے میں لوگ اس کو یہ کہہ کر جگاتے ہیں کہ بیٹا اٹھو عید کی صبح ہے اور زندگی کی ابتدا گویا گھر کے بڑے بوڑھے زبان حال سے اس لڑکے کو بتا رہے تھے کہ وہ معشوقہ تیرے انتظار میں بیٹھی ہے۔

ناظرین اس دلآویز نقل میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بڑھاپے میں کیا کیا حسرتیں انسان کو گھیرے رہتی ہیں اور سوا اس کے کہ وہ جوانوں کو کامیاب دیکھ کر پوری ہوں اور کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے مسن انسان نوجوان کا بہی خواہ ہوتا ہے اور اس کو دیکھ کر خوش وقت ہوتا ہے۔ یہ ایک عجیب کیفیت ہے جس سے بڑھاپا مستفیض ہوتا ہے جو زیادتی عمر کی محدود نعمات میں سے ہے۔ اگر اس کا نام حسن پرستی ہے تو واقعی خوب چیز ہے کیونکہ اس میں کسی فرد کی قید نہیں نہ کسی خاص تناسب اعضاء کی پابندی ہے۔ اگر حسن پرستی اس سے آگے بڑھی تو گستاخی معاف شیطان کی شاگردی ہے اور اس گناہ کے خلاف احتجاج اس باب کا نصب العین ہے۔ گنہگاری جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو انفعال مٹ جاتا ہے۔ اخلاق کا یہ سرطانی پھوڑا یوں تو ہر جگہ پایا جاتا ہے لیکن بعض اضلاع اور بعض طبقوں میں اور بعض درس گاہوں میں اس قدر عام ہے کہ جو لوگ اس میں آلودہ نہیں بھی ہیں وہ بھی اس کو زیادہ برا نہیں سمجھتے۔ اگر لوگ حیا کو ایمان کا جزو سمجھ کر اس قسم کے اذکار کو داخل ظرافت نہ سمجھیں تب بھی غنیمت ہے۔ مگر مہذب لوگوں کو اس قسم کی باتیں کرتے سنا ہے کاش یہی نہ ہوتا لعنت بکار شیطان۔

علت مشائخ، لغت میں اس مفعولیت کی عادت کو کہتے ہیں جو بڑھاپے میں خشکی کی وجہ سے ہو جانا بیان کی جاتی ہے۔ یہ ہرگز قرین قیاس نہیں ہے کہ اگر کسی نے بچپن میں اس کو نہیں جانا ہے تو بڑھاپے میں یبوست کی وجہ سے اس کا عادی ہو جائے۔ اسی قسم کے بہت سے لغو دلائل تھے جس کی وجہ سے میں نے بہت سی کتابوں سے انتخاب چھوڑ دیا کیونکہ وہ اس سے بھی کچھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔

○

فصل دوم

ہسٹیریا

یہ رسالہ صرف نوجوان مردوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ اگر آدمؑ و حواؑ کی سنت پر نظر کر کے کچھ ہسٹیریا پر بھی لکھ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ تہذیب جو ملکی زمین و آسمان وطنی خصوصیات اور قومی روایات سے پیدا ہوتی ہے کسی وقت مضر نہیں۔ وہ تہذیب جو دوسرے ممالک دوسری قوموں اور دوردراز کے سمندروں سے آتی ہے اسی طرح کارآمد ہوسکتی ہے جیسے مانگے کے کپڑے جن سے ستر پوشی بھی ہوجاتی ہے اور کپڑے کے پھول پتی کی نفاست بھی ویسی ہی رہتی ہے مگر اینچ کھینچ کر پہننے کی وجہ سے نہ تراش کی خوبصورتی باقی رہتی ہے اور نہ تناسب اعضاء کا پورا پتہ چلتا ہے۔ اگر صرف اسی قدر خرابی ہوتی تو خیر، غضب تو یہ ہوتا ہے کہ یہ لباس کہیں ڈھیلا ہوتا ہے کہیں کسا جس کی وجہ سے موسم اور ہوا سے پوری حفاظت بھی نہیں ہوسکتی جس کا اثر تندرستی پر پڑتا ہے۔ خدا کرے یہ طولانی تشبیہ ٹھیک اتری ہو اور میرا مطلب ذہن نشین ہوجائے یعنی موجودہ تہذیب اپنی بے انتہا خوبیوں کے ساتھ بہت سے اعصابی امراض بھی جلو میں لائی ہے اور ہسٹیریا بھی انھیں میں سے ایک ہے۔ یہ مرض ہندستان کے لیے نیا نہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہ عورتیں جو جنّات بھوت چڑیل وغیرہ کے زیراثر سمجھی جاتی تھیں اصل میں اسی بیماری کا شکار ہوتی تھیں بہت سی عورتیں بدکاری کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے جھوٹھ موٹھ کی بیماری تیار کرتی تھیں اور آج بھی ایسا ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس آزار کی یہ شدت کبھی نہیں تھی جو آج دیکھنے میں آتی ہے۔ فی زمانہ نہ معلوم کس قدر نوجوان عورتیں اور لڑکیاں اس میں مبتلا دکھائی دیتی ہیں وہ عورتیں جو ذہین تیز اور نازک واقع ہوئی ہیں موٹی بھدی سل گیگلی لڑکیوں کی بہ نسبت زیادہ مبتلا ہوتی ہیں۔ اختناق الرحم، ہسٹیریا کا قریب قریب لفظی ترجمہ ہے کیونکہ ہسٹیریا یونانی

زبان میں ایک لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی عورت کا رحم ہے۔ اگلے زمانے میں جب ہر چیز کی دریافت اس قدر وسیع اور گہری نہ تھی۔ بیماریوں کی تعریف جامع زیادہ اور مانع کم ہوتی ہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ فلاطون نے فرمایا ہے کہ رحم ایک ذی روح ہے تو توالد و تناسل میں اگر کامیاب نہیں ہوتا تو غصہ سے جزبز ہوکر تمام مقامات پر دوڑا دوڑا پھرتا ہے روح کو حیران کرتا ہے پھیپھڑوں کی راہ بند کرتا ہے اور جسم میں طوائف الملو کی پیدا کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو (گائنوکالجی مصنفہ اوڈ حاشیہ صفحہ 2)

لفظ ہسٹیر یا یا اختناق الرحم کے معنی تو یہ ہوئے جو اوپر بیان کیے گئے لیکن مفہوم میں عارضہ بھی شامل ہے جو دوسرے اعضا کی وجہ سے یہی اثرات پیدا کرتا ہے اور کبھی کبھی مردوں کو بھی ہوتا ہے۔ اس حالت میں اس عارضہ کا مرکز دماغ وغیرہ ہوتا ہے مقعد کے عوارض سے بھی ہسٹیر یا سنا گیا ہے مگر عورتوں میں ڈاکٹروں کا تجربہ ہے کہ اس عارضہ میں جنسی اعضاء ضرور ماؤف ہوتے ہیں۔ عورتوں میں ہسٹیر یا کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں ایک وہ جو فطرتی کیفیات سے پیدا ہوتی ہے مثلاً ایام کے دنوں میں حمل میں بلوغ کے وقت سن یاس کے شروع میں کیونکہ ان اوقات میں اعضاء جنسی میں ایک تغیر تبدل واقع ہوتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں اندرونی اعضائے تناسل میں ورم ہو جاتا ہے یا دوسری طرح اپنا کام پورا نہیں کرتے جو لوگ جنات بھوت پلید کا تعلق نو جوان عورتوں سے ماننے پر نہیں بھی تیار ہیں وہ بھی ایک طرح دوسری طرح کے مغالطہ میں پڑ جاتے ہیں یعنی کبھی کبھی اس مرض میں جو بہت کم مہلک ہوتا ہے اور صرع میں جو بہت ہی برا مرض ہے فرق نہیں کرتے اس لیے مابہ الامتیاز نکتے ڈاکٹر مور کی فیملی مڈیسن سے نقل کیے جاتے ہیں گو ترجمہ لفظی نہیں ہے۔

	صرع	ہسٹیر یا
دورہ کے شروع میں چیخنا......	ایک بار......	کئی بار ہوسکتا ہے
گر پڑنا	یکبارگی ممکن ہے چوٹ آجائے	ہاتھ پاؤں بچا کر غش کرنا
پیشاب	عالم غشی میں اکثر ہو جاتا ہے	کبھی نہیں ہوتا

زبان	دانت سے اکثر کٹ جاتی ہے	زبان کبھی نہیں کٹتی ہونٹھ ممکن ہے کٹ جائے جس میں تکلیف کم ہوتی ہے۔
ہاتھ پاؤں مارنا	بلاوجہ	عموماً تیمارداروں کے مقابلہ میں
موقع	تنہائی یا غیر تنہائی میں	صرف اس وقت جب لوگ موجود ہوں۔
طول	صرف تھوڑی دیر	دن دن بھر لگ جاتا ہے۔
انداز	جیسا کہ بیان ہوا	مختلف طریقوں سے جس میں ممکن ہے کہ خوبصورتی کی دھج نکلے۔
چوٹ	مریضہ اکثر زخمی ہوجاتی ہے	خود کبھی[1] چوٹ نہ کھائے گی ممکن ہے تیمارداروں کے ناخن یا دانت لگ جائیں۔
جنس	دونوں جنسوں کو	زیادہ تر جوان عورتوں کو۔

اگر اس نقشہ کے بین السطور پر غور کیجیے جہاں معنی لکھے ہوتے ہیں تو یہ خیال گزرتا ہے کہ صرع ایک مرض ہے اور ہسٹیریا ایک قسم کا موذی غمزہ ہے یہ ہرگز نہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ واقعی ایک مرض ہے جس میں عورت کو اچھی خاصی تکلیف ہوتی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ چونکہ اس موہنی جنس کی فطرت میں ایک خوشگوار، دلآویز، دلکش، تصنع شامل ہے اس لیے یہ بیماری اس جنس کو زیادہ ہوتی ہے۔

---

[1] ایک نہایت نیک شریف لڑکی کو یہی مرض تھا۔ ایک روز دورے کی حالت میں تڑپ رہی تھی اور اس کے ماموں اس کی چوٹی پکڑے سرہانے بیٹھے تھے، میں معالج تھا میں نے ان سے کہا آپ چھوڑ دیجیے یہ پلنگ سے نیچے نہ گرے گی کیونکہ ہسٹیریا میں مریضہ چوٹ نہیں کھاتی۔ انھوں نے چھوڑ دیا اور وہ لڑکی دو منٹ کے اندر چھپکلی کی طرح پٹ سے زمین پر آرہی۔ یاد رکھیے گا کہ اس مرض میں کان کام کرتے رہتے ہیں۔

ہسٹیریا کے مریضہ سے سختی کے ساتھ ہرگز نہ برتاؤ کرنا چاہیے لیکن معالجات میں نرمی برتنا اس سے بھی زیادہ مضر ہے۔ بازو کس کر باندھنا، یا تیز دوائیں مثل چونا اور نوسادر کے مرکبات کے جس کو امونیا کہتے ہیں سنگھانا، یا ویلیرین وغیرہ کے استعمال میں اگر نرمی برتی گئی تو گویا مرض پالا گیا۔ تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ ہسٹیریا اور نوجوانی کی قید کوئی لازمی بات نہیں ہے بلکہ بعض مزاج اس طرح کے واقع ہوتے ہیں کہ وہ ہر زمانے میں اس بیماری کا شکار رہتے ہیں۔ اس مزاج والیوں کو جو بیماری ہوتی ہے وہ زیادہ شدید معلوم ہوتی ہے۔ خود اس عارضہ کی ہزاروں صورتیں ہیں۔　ع

بسیار شیوہ است بتاں را کہ نام نیست

ہنسنا، رونا، گھڑی گھڑی مزاج کا رنگ نرالا ہوتا ہے۔ اگر بخار بھی آئے تو عموماً اس طرح کا نہ ہو جیسے دنیا کو ہوتا ہے بلکہ توقع کے خلاف کوئی نہ کوئی بات انوکھی نکلے۔ مثلاً لرزے کے ساتھ پیاس یا تنہا رہنا نہ پسند ہو پھر بھی تیمارداروں سے کہا جائے کہ جاؤ یا اسی قبیل کی اور متضاد باتیں۔ اس تحریر کا اثر شاید یہ ہو کہ ہسٹیریا والیاں مجھے کوسنے دیں۔ لہٰذا پھر عرض کرتا ہوں کہ اس مرض کو ہرگز ہرگز بنوٹ نہ تصور کیا جائے۔ یہ ایک مستقل بیماری ہے اور قابل علاج ہے۔ اس بیماری میں غلط ارادے پر رائے مستحکم ہو جاتی ہے اور بس۔

ایک وجہ ہسٹیریا کی اور بیان کی جاتی ہے جو یورپ میں بہت پائی جاتی ہے لیکن ہزار ہزار شکر کی جا ہے کہ ہندستان کی جہالت یہاں کی عورتوں کو اس سے ایک حد تک محفوظ رکھے ہے۔ حضرت لوط کے قصہ میں لکھا ہے کہ ان کی قوم کو شیطان نے وہ ترکیبیں سکھائیں کہ مرد عورت اپنی اپنی ضرورتیں پوری کرنے لگے۔ یورپ کی عورتیں ایک قدم اور آگے بڑھ گئیں۔ یعنی دوسری عورت کی بھی مرہون احسان نہ ہوئیں۔ مریم من فیض جبریل از مزاج خود گرفت۔ لاحول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ ممکن ہے کہ ہندستان میں بھی یہ مضرت والی ترکیب جاری ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر کہیں ہے بھی تو بہت کم عورت کے لیے جلق مرد سے کہیں آسان ہے۔ مرد کی قوت مرکزی ہوتی ہے یعنی چند اعضا اس کے لیے مخصوص ہیں عورت کی قوت منتشر ہوتی ہے یعنی مختلف اعضاء میں اس کا اثر ہوتا ہے اور بقول شخصے گردن سے گھٹنوں تک ہر جگہ اس کا جلوہ ہے چنانچہ ایک عورت کا واقعہ

''بلاک'' نے بحوالہ ''موریلکیا'' لکھا ہے کہ وہ اپنے جسم کے چودہ مختلف اعضاء کے مساس سے منزل ہوجاتی تھی۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ لڑکیوں کو پاؤں سے چلانے والی کپڑا سینے کی مشین نہ دینا چاہیے کیونکہ رانوں کو آپس میں رگڑنے سے عورت محظوظ ہوسکتی ہے۔ اوڈ لکھتا ہے کہ ایک لڑکی کرسیوں کی پشت یا دو میزوں کو پکڑ کر اپنے پورے جسم کا بوجھ ہاتھوں پر دے کر زمین سے پاؤں اٹھالیتی تھی اور اسی طرح اپنی پوری تسکین کرلیتی تھی۔ ایک عجیب قصہ اور بھی لکھا ہے کہ ایک لڑکی کو ہمیشہ سے ایک پاؤں ہلانے کی عادت تھی جس سے یقیناً دونوں رانیں آپس میں لڑتی رہی ہوں گی اور اس کو لطف حاصل ہوتا ہوگا۔ اس کی ماں نے تصدیق کی کہ زمانۂ حمل میں ایک پالتو بلی پلنگ پر چڑھ آئی ماں نے اس لڑکی کے باپ سے کہا کہ اس کو ہٹادو چنانچہ اس نے اس کو جھٹک کر زمین پر پھینک دیا۔ بلی کے نہ معلوم کہاں چوٹ آگئی کہ وہ ظاہراً مردہ معلوم ہونے لگی۔ یہ عورت چونکہ اس کو بہت چاہتی تھی پریشان ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں وہ بلی اپنی ایک ٹانگ جھٹکنے لگی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اچھی ہوگئی لیکن جنین پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ جب یہ لڑکی پیدا ہوئی تو یہ بھی اسی طرح ٹانگ جھٹکتی تھی اور رفتہ رفتہ اس سے جلق کی صورت پیدا ہوگئی۔ اسی غایت سے حکما نے کہا ہے کہ ایام حمل میں عورت کو ہر طرح کی پریشان کن باتوں سے بچانا چاہیے۔

لہٰذا ہر باپ کو بھائی کو اور ہر نوجوان شوہر کو خیال رکھنا چاہیے کہ اگر کسی نابالغ لڑکی کو کوئی اضطراری حرکت اس طرح کرتے ہوئے پاوے تو ہوشیار ہوجائے۔ بالغ لڑکیوں کے چہرے پر ہیجان اور اس کے بعد سکون اور اعضاء کے ڈھیلے ہوجانے کا اندازہ یا ہیجان کے بعد اعضاء کے کانپنے کا انداز اگر دیکھا جائے تو غافل نہ رہنا چاہیے بلکہ اس کے دفعیہ کی فکر کرنا چاہیے۔

ہیولاک ایلس نے کاونٹ کیبزلنگ کی مولفہ کتاب ''میرج'' میں اور ڈاکٹر میری اسٹوپس نے اپنی کتابوں میں ہسٹیریا کی ایک دوسری وجہ پر بہت زور دیا ہے جس کا تعلق براہ راست نوجوان شوہر سے ہے اور جو یورپ میں بہت پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میری اسٹوپس وغیرہ کا خیال ہے کہ حفظان صحت کی تعلیم اور عمدہ تربیت کی وجہ سے ہسٹیریا کا سبب وہ باتیں کمتر ہوتی ہیں جو پہلے بیان کی گئیں اور ان کی بجائے زیادہ تر سبب وہ ہوتا

ہے جس میں عورت بیچاری بے بس ہے۔ یعنی مرد کو انزال پیش از وقت ہو جانا اس جگہ اگر ہیولاک ایلس کی بیان کی ہوئی عورت کے انزال اور شہوت کے سات مابہ الامتیاز باتیں بیان کردی جائیں تو بے جا نہ ہوں گی۔

1۔ عورت کی یہ قوت ظاہر بظاہر مفعولیت کی ہے۔

2۔ زیادہ پیچ در پیچ ہے۔ مشکل سے ہیجان میں آتی ہے۔ بیرونی اشتعال کی زیادہ محتاج ہے اور بہ نسبت مرد کے انزال دیر میں ہوتا ہے۔

3۔ یہ قوت صرف بار بار کی مجامعت کے بعد عود کرتی ہے۔

4۔ کثرت مجامعت کے حدود مرد کے مقابلہ میں دیر میں شروع ہوتے ہیں۔ یعنی کثرت مجامعت عورت کو دیر میں نقصان پہنچاتی ہے۔

5۔ عورت کے جسم میں شہوت صرف دو ایک اعضاء میں محدود نہیں ہے۔

6۔ شہوت کے اوقات مقرر ہیں (ملاحظہ ہو نقشہ مرتبہ ڈاکٹر میری اسٹوپس کی کتاب میپسی میرج)

7۔ عورت کی خواہش سن کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے اور اس کے ابھارنے کے طریقے برخلاف مرد کے مختلف عورتوں میں جدا جدا ہوتے ہیں۔

میرے نوعمر پڑھنے والو یہ ایک نہایت نازک مسئلہ ہے جس میں بلاوجہ صرف مرد کی ناواقف کاری سے عورت کا بیمار پڑ جانا ممکن ہے اگر آدمی گنوار ہوا تو وہ چیز جو تندرستی کو بڑھانے والی ہے نقصان کا باعث ہوگی۔ گوکہ گرم ملک کے باشندوں کو اور عنفوان کے زمانے میں اس طرح کے مشوروں پر کاربند ہونا سہل نہیں ہے لیکن اگر یہ باتیں تحویل حافظہ میں رہیں تو داشتہ آید بکار کی مصداق ہوں گی۔ مردوں کو چاہیے کہ قربت سے پہلے خوش دلی کا اظہار کریں بوسہ اور دوسرے عنوان کے مساس سے دوسرے فریق کو اپنا ہم آہنگ بنائیں اور دیر آید درست آید کو پیش نظر رکھیں۔ اخلاق کی پرانی کتابیں اس قسم کی ہدایتوں سے مالا مال ہیں اہل ہنود کے یہاں تو اس علم کے اصول اس وقت سے سکھلائے جاتے ہیں جب انگلستان وغیرہ میں لوگ ننگے رہتے تھے اور کپڑا پہننے کے بجائے گیرو ملتے

تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ مرد کو انزال عموماً جلد ہو جاتا ہے اور عورت کی تشفی دیر میں ہوتی ہے لیکن اگر مرد اپنی قوت ارادی سے پورا کام لینے کی عادت ڈال لے اور بقول سید انشاء مرحوم کے پہلے "ہتھ پھیر" کی بدیا کو خوش اسلوبی کے ساتھ عمل میں لائے تو سیپ چیت سواتی کی بوند سے محروم نہ رہے۔

یورپین محققین کا عام خیال ہے کہ یورپ میں یہ شکایت بہت زیادہ ہے۔ بحمد للہ کہ ہندستان میں لوگ اس پہلو کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں۔ پھر بھی اس قدر کہنے میں کوئی ہرج نہیں کہ جوش میں خودغرضی کا حصہ کم ہونا چاہیے اس کے لیے خدانخواستہ امساک کی گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف مردانہ وار خیال اور اسی وجہ سے قوت ارادی کی مضبوطی کافی ہے۔

امساک کے نسخوں کے بارے میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ زیادہ تر نسخہ جات میں افیون، بھنگ یا دیگر منشی چیزوں کا جزو ہوتا ہے جن کی مضرت اتنی جگہ بیان ہو چکی ایسی دواؤں سے یا نشے کی عادت ہوتی ہے یا ان خاص نسخوں کا عادی ہو جانا پڑتا ہے۔ لالہ بہ اعتبار عبنک جو اس سے بھی برا ہے جس قدر افیونیوں کو آپ آنکھیں مانگتے دیکھتے ہیں ننانوے فیصدی وہ ہیں جنھوں نے جوانی میں اپنی کوتاہ نظری سے افیون اسی غرض سے شروع کی تھی۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے پھر دل چاہتا ہے کہ پڑھنے والوں کو ان کی مردانگی کا واسطہ دلا کر عرض کروں کہ عورت اور مرد کے تعلقات میں اپنے فرائض کو ہمیشہ یاد رکھیں اور بجائے اس کے کہ گویا اپنا بوجھ ہلکا کر رہے ہیں یا دشمن سے بدلہ نکال رہے ہیں۔ دو دلوں کو ایک کرنے کی کوشش کریں۔ میری اسٹوپس عورت ہو کر ہدایت کرتی ہے کہ عورتوں کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ مجامعت میں تمام اعضاء کا حصہ ہے صرف یہی نہیں کہ باہیں گلے میں ہوں۔ اگر یہ نصیحت مرد لوگ اپنے لیے بھی تصور کریں اور اس ناچیز صلاح کو گرہ باندھیں تو انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی نیک بیبیاں ہسٹیریا اور دوسرے نسوانی امراض سے بچی رہیں۔ آمین ثم آمین۔

O

خاتمہ

اس کتاب میں زیادہ باتیں ایسی ملیں گی جو پسند عام سے دور اور نئی روشنی کے برعکس ہیں۔ مغرب کی دریافت، مغرب کی معلومات، مغرب کی حکومت کا اثر، قصہ مختصر تمام چیزیں اس رسالہ کے خلاف ہیں، عذرخواہی میں صرف اس قدر عرض کیا جاسکتا ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے از روئے دیانت لکھا گیا ہے۔ یہ ہرگز نہیں ہوا ہے کہ کسی کو خوش کرنے کے لیے یا کسی کو خفا کرنے کے لیے یا خود اپنے ہی دل کو خوش کرنے کے لیے کوئی خیال ایسا ظاہر کیا گیا ہو جو خود لکھنے والے کو غلط معلوم ہوتا ہو۔

آج کل عورت کے حقوق اور عورت کی قابلیت مرد کے کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ عورت پارلیمنٹ میں بیٹھتی ہے، عورت موٹر ہانکنے کی نوکری کرتی ہے۔ عورت انجینئری کی نوکری کرتی ہے۔ عورت کانسٹبل ہوتی ہے اور ہر شعبہ میں عمدہ کام کرکے دکھا دیتی ہے۔ لہٰذا عورت مرد کے برابر ہوگئی۔ لکھنے والے کا خیال بدقسمتی سے اس نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ عورت یہ سب کچھ کرسکتی ہے وہ اس سے بھی زیادہ کرسکتی ہے وہ میدان جنگ میں لڑسکتی ہے۔ وہ مار سکتی ہے اور مرسکتی ہے۔ وہ اپنے زخمی شوہر کو میدان جنگ سے اٹھا لاسکتی ہے اور اس کے بعد چتا پر بیٹھ کر ستی ہوسکتی ہے لیکن وہ مرد کے برابر نہیں بلکہ مرد سے برتر ہے۔ صرف فرق اس قدر ہے کہ دونوں جنسوں کے کام کرنے کے دائرے الگ الگ ہیں۔ اس امر کو مان کر اگر عورت کو بڑے لاٹ صاحب بنا دیجیے تو صرف یہی نہیں کہ کسی کو عذر نہ ہو بلکہ یہ کہ ادھر دس پندرہ برس کے دیکھتے ہوئے یقیناً کام بھی اچھا کرے گی۔ جس وقت تک عورت کے متعلق لڑکوں کو نو مہینے پیٹ میں رکھنا ہے۔ اُن کو دودھ پلانا ہے جب تک اس صنف کو ایام ہوتے ہیں جب تک عورت مرد پر حکومت کرلیتی ہے تب تک مرد اور عورت برابر نہیں ہوسکتے۔ ہیولاک ایلس جس سے بڑا ماہر جنسیات انگریزی سرزمین نے پیدا نہیں کیا ہے اپنی کتاب مین اینڈ ومن میں بیسیوں نقشے دے کر اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے اور

جسمانی اور دماغی کاموں کے گوشوارے اور جدولیں تیار کر کے اپنا دعویٰ ثابت کرتا ہے اور کتابیں بھی موجود ہیں جو سب ایک ہی راگ گاتی ہیں۔ اس معاملہ میں اگر یہ رسالہ گنہگار ہے تو تنہا نہیں دنیا کی بڑی بڑی تصانیف کے ہمرکاب ہے۔

تعدد ازدواج کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس میں ظاہراً یورپین ہم خیال کم ملیں گے۔ دل کا حال خدا جانتا ہے، مشرقی برادران ہزاروں ہیں کہ ادبار اور بے طاقتی کی وجہ سے ان کی بات نگاہ میں نہ جچتی ہو یہ بدقسمتی ہے۔ خیر متعدد بیبیوں کا سوال تو صرف امراء سے متعلق ہے۔ البتہ طریق شادی سے ہر صحیح اور تندرست انسان کو واسطہ ہے۔ اسی کے متعلق حفظان نسل کا بھی مسئلہ ہے جس کو یوں سمجھ لیجیے کہ یورپی ممالک نے یہ طے کیا ہے کہ دونوں جنسوں کے نوجوان لوگ آپس میں مل کر اپنی اپنی زندگی کا ہمزاد و دم ساز چھانٹ لیا کریں تاکہ بہتر قسم کی نسل روز بروز بہتر ہوتی رہے۔

اگر زمانے کی چال اسی طرف لے گئی تو ہم کو بھی جانا پڑے گا خواہ وہ راہ اچھی ہو یا خواہ بری لیکن آج یہ سب کچھ ہوتا دکھائی نہیں دیتا نہ ہندستان اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ یہ باتیں بلا انقلاب کے عمل میں آجائیں پھر ایسی باتوں کو بتانا جو مہاتما گاندھی کے چرخے کی طرح ناممکن ہوں کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔ یہ کتاب کتب سماوی کی طرح ہر زمانے کے لیے نہیں لکھی گئی ہے یہ تو اس وقت کے نوجوانوں کی صلاح کار ہے کل جب ہندستان یورپ کا جامہ پہن لے گا۔ اور یہ کتاب اپنا کام کر چکے گی آپ ہی طاق نسیان پر پہنچ جائے گی علاوہ بریں یہاں بیٹھے بیٹھے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں کورٹ شپ نے دنیا کو جنت بنا دیا ہے لیکن یہ خیال کچھ پادر ہوا سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہاں بھی لوگ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لے کر عاشق نہیں ہوتے اور یہاں بھی جو کچھ قاعدے جانچ پڑتال کے مقرر ہیں بجائے کورٹ شپ کے اگر عمدہ غذا پیٹ بھر کو ملے تو نسل ضرور بہتر ہونے لگے۔

پنجاب میں کورٹ شپ نہیں لیکن غذا میں فرق ہے۔ وہاں کے کسانوں کا مقابلہ اودھ کے کسانوں سے کر لیجیے۔ اس کے علاوہ اگر پردہ حسب اصول شرع چھوڑا جائے جس میں چہرے کا پردہ مشکل سے ثابت کیا جاسکتا ہے تو کورٹ شپ کی بہت سی خوبیاں آجائیں گی۔ ہندوؤں کے یہاں پہلے ہی سے پردے کی وہ سختی نہیں۔ رہے شادی کے بعد

کے ضوابط معاشرت۔ اس معاملہ میں سب سے بہتر گواہ جو پیش کیا جاسکتا ہے کہ کاونٹ ہرمان کیزر لنگ کی کتاب ''بک آف میرج'' ہے جو 1927 میں شائع ہوئی ہے اس کا دیباچہ اور دو ایک باب کیزر لنگ کے لکھے ہوئے ہیں باقی ابواب مختلف مشاہیر عالم کے قلم سے ہیں جو اپنے اپنے شعبہ میں حَکَم مانے جاتے ہیں ڈاکٹر بیٹرس ایم ہنکل امریکی خاتون جس نے اپنی عمر عورتوں کے کام میں صرف کی ہے تحریر کرتی ہے کہ ہمارے یہاں کی عورتیں مادریت کے لیے بہمہ وجوہ موزوں ہیں البتہ زوجیت کے لیے مشکل سے تیار کہی جاسکتی ہیں۔ خود ہیولاک ایلس ایک مضمون میں جو انھوں نے حال ہی میں سیٹرڈے ریویو میں لکھا ہے اور جس کو 29 رمئی 1927 کے لیڈر الہ آباد نے نقل کیا ہے کہتے ہیں کہ ''وہ زمانہ گیا جب (خلیل خان فاختہ اڑاتے تھے) اور لوگ عورتوں کو ان کی لغزشوں پر قتل کر ڈالتے تھے۔ اس طرح کی زبردستیوں کا وقت اب نہیں رہا۔ اب ہم میاں بی بی کو ایک دوسرے کی جائداد نہیں تسلیم کرتے۔ اب زنائے محضہ بجائے ٹریجڈی کے کامیڈی کی بات ہوگئی لیکن جذبۂ رشک پھر بھی انسان میں موجود ہے۔ یہ ایک بہیمیت ہے جس سے پالتو جانور تک خالی نہیں لیکن ہم لوگ انسان اسی وقت ٹھہر سکتے ہیں جب رشک کے اوپر فتح حاصل کر کے تہذیب کا خلعت پہنتے ہیں۔'' کیزر لنگ کا قول ہے کہ ''شادی صرف دو آدمیوں کی متحدہ خوشی کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں تکلیفیں بھی ہیں۔'' جس مقام پر یہ جملہ آیا ہے وہاں مفہوم یہی رشک کے پہلو والا ہے۔ رومن کیتھولک جن کے یہاں طلاق کسی حالت نہیں ہے اور پراٹیسٹنٹ جن کے یہاں زنا کی سزا طلاق ہے ان دونوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ رومن کیتھولک شادی صرف جنسی اتحاد کا نام نہیں ہے بلکہ پوری زندگی کا انتظام ہے جس میں مذہبی زندگی بھی شامل ہے اور جنسی زندگی صرف اس کی ایک شاخ ہے جو ہرگز اتنی اہم نہیں کہ اگر وہ ٹوٹ جائے تو نکاح ادھڑ جائے۔

پھر اسی مضمون میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''ہم لوگوں نے وفاداری کے پہلو کو اس قدر تقویت دے دی ہے کہ دونوں جنسوں کے نوجوان لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ وفاداری کا خیال محال تھا اور جنون تو وہ لوگ اپنی جگہ پر شرمندہ ہوتے ہیں اور کہیں خال خال ایسے نکلتے ہیں جو ایک دوسرے سے پوری بات کہہ کر دو دلوں میں صفائی پیدا کر لیتے ہیں اور

اعتماد بڑھا لیتے ہیں جو بجائے خود بہترین نتیجہ شادی کا ہے گو اس میں وفاداری نہ بھی ہو۔"
ملاحظہ ہو لیڈر 29 مئی 1927

میرے نوجوان ہندستانیو پہلے اپنا دل تول لو کہ تم سے یہ باتیں ممکن ہیں۔ تب کورٹ شپ اور انگریزی طریق محبت کو اختیار کرنے کی ہوس کرو۔ اسی کے مقابلہ میں ایک مقام آٹور انتفلڈ ایف آر جی ایس آئی سی ایس کی کتاب وومن آف انڈیا سے بھی نقل کرنے کو دل چاہتا ہے جس میں اس نے ہندستانی طریق شادی کے عیوب کے ساتھ ہی ساتھ اس کے ہنر بھی بیان کیے ہیں۔ صفحہ 21 میں مسلمانوں کے قانون شادی کے بارے میں لکھتا ہے کہ "اس طرح کا قرین عقل اور قرین انسانیت طریقہ صفحۂ عالم پر نہیں دکھائی دیتا۔" پھر صفحہ 117 میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں لکھتا ہے "مسلمان عورتوں کی ہدایت کے لیے آسمانی قانون موجود ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو اس سے زیادہ قرین عقل، عُمدہ انصاف اور انسانی آزادی کی حمایت کا ضابطہ کسی قانون میں نہ پایا جائے۔

ہندو طریق شادی کی خوبصورتیوں سے صفحہ کے صفحہ رنگین ہیں جن کا پہلو دوسرا ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ہمارے نوجوانوں کو یہی خواہش ہے کہ جب تک عاشق نہ ہو لیں شادی غلط ہے۔ ہائے غیر قوم پرستی وائے غیر قوم پرستی۔ بھاڑ میں جائے غیر قوم پرستی۔

آخر کتاب میں ایک دفع دخل ضروری سمجھتا ہوں۔ ہم لوگ جو یورپ نہیں گئے ہیں اور نہ یہاں انگریزوں سے گھل مل جاتے ہیں۔ یورپین عورتوں کی شوخی طرّاری اور لبھانے کا انداز دیکھ کر ان کی نسبت وہی رائے قائم کرتے ہیں جو اسی انداز کی ہندستانی عورتوں کو دیکھ کر کرتے۔

ایسا کرنا ان لوگوں کے ساتھ بڑی بے انصافی کرنا ہے۔ ان کے اصول اخلاق بہت سی باتوں کو صرف جائز ہی نہیں رکھتے بلکہ ان کا حکم دیتے ہیں جو ہمارے یہاں منع ہیں۔ ہمارے یہاں عورت کو سکھایا جاتا ہے کہ تمام دلآویزیاں، شوخیاں، لگاوٹ کی باتیں صرف اپنے شوہر کے لیے اٹھا رکھو ان کے یہاں بتایا جاتا ہے کہ ہر مرد کو اپنی طرف مخاطب کر لینے کا انداز سیکھو مگر اپنی عصمت کو ہاتھ سے نہ دو۔ اگر وہ لوگ ہمارے اصول اخلاق برتنے کی

جگہ اپنے قاعدوں کو مضبوطی سے پکڑے ہیں تو برا کہے جانے کے سزاوار نہیں۔ ان کے یہاں عورتوں کا کام صرف پان بنانا اور نسل بڑھانا نہیں بلکہ اور مشاغل اس کثرت سے ہیں کہ ان کو ہر وقت جنسی معاملات میں غرق رہنے کا وقت ہی نہیں۔ کھیل، تماشے، تفریحیں، علمی مشاغل، روزی کی فکریں، معاشرتی فرائض وغیرہ وغیرہ عورتوں کے لیے اسی قدر ہیں جس قدر مردوں کے لیے اور ہر ایک ان میں کا تعلیمی پہلو رکھتا ہے اگر وہ ان تمام باتوں کو چھوڑ کر صرف جنسی معاملات میں ہی پڑ جائیں تو ذلیل و خوار ہو جائیں اور بجائے حکومت کرنے کے ہماری طرح کسی کی غلامی کریں کیونکہ زنا کاری کا چسکا قوموں کو اسی طرح خاک میں ملا دیتا ہے جس طرح عورتوں کی سچی قدر نہ کرنا قوموں کو تباہ کر دیتا ہے۔

انگلستان کے اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے لوگ جن کی تعلیم و تربیت عمدہ ہوئی ہے اخلاق کی رو سے ویسے ہی پاک باز ہیں جیسے کسی دوسرے ملک کے لوگ۔ آگ اور پانی کا آٹھوں پہر کا ساتھ دیکھ کر ان کے اصول اخلاق میں ایک نئی چیز ایجاد ہو گئی ہے جو یورپین اصول پر پردہ چھوڑنے کے بعد ہم کو بھی اختیار کرنا ہو گی۔ اس کو فلرٹیشن کہتے ہیں۔ یعنی عورت اور مرد آپس میں اس طرح شیر و شکر ہو جائیں کہ دیکھنے والا للچا جائے۔ اور سعدی کا یہ شعر سمجھ میں آ جائے ؎

عاشق امروز بذوقے پرشاہد بہ نشست
کہ دل زاہد از اندیشۂ فردا برخاست

مگر یہ بہار صرف دیکھنے ہی کی ہے۔ اس سے کوئی واقعی برائی نہیں مقصود ہے۔ اگر وہ لوگ جب ملیں تو اسی میں غلطاں پیچاں ہو جائیں تو ہمارے ہی ایسے ہو جائیں۔ ان لوگوں نے قومی ترقی اور فطرت کے تقاضوں کے درمیان میں ایک سمجھوتہ کر لیا ہے۔ فطرت کا حصہ یہ ہوا کہ عورت اور مرد اکٹھا ہو کر دل بہلانے کی باتیں کر لیا کریں۔

قومی ترقی کا حصہ یہ ہوا کہ اس حد تک نہ چلے جائیں کہ پھر کچھ باقی ہی نہ رہ جائے۔ اس کو برت لینا ناممکن نہیں جن عورتوں سے ہنسی کا رشتہ ہوتا ہے ان سے خدانخواستہ ہندستان میں بھی آلودگی کی نوبت نہیں آتی۔

یورپ میں بچپن سے سکھایا جاتا ہے کہ عورت کا کام مرد کو اپنی طرف مخاطب کر لینا ہے یہ ہرگز نہیں بتایا جاتا ہے کہ جب موقع ہاتھ آئے تب ہی گناہ میں سَن جاؤ۔ کم سے کم پڑھے لکھے طبقے میں تو یہی ہوتا ہے پھر بھی آگ سے کھیلنے میں کچھ لوگ جل ہی جاتے ہوں گے مگر ہر شخص چرکا نہیں کھاتا۔

رنڈیوں کے باب میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کو شاید اکثر حضرات پسند نہ فرمائیں ایسے حضرات سے گزارش ہے کہ اگر اور نہیں تو صرف یہی ایک کتاب ''ودمن آف انڈیا'' پڑھ لیں تب رائے قائم کریں۔ اگر قدیم یونانی تاریخ میں کامریڈ یا ہٹارا کا حال پڑھ لیں تو اور اچھا ہے۔

بیماریوں کے بارے میں پھر وہی التماس ہے کہ ہزار علاج کا ایک علاج گناہ سے پرہیز ہے۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو دوسرا درجہ احتیاط کا ہے جس میں دوراندیشی سے کام لیا جائے۔ اگر یہ بھی نہ ہوسکا تو کم ہمتی نہ کرنا چاہیے بلکہ بیماری کا مقابلہ استقلال سے کرنا چاہیے اور علاج کے زیراثر ہونے سے گھبرانہ جائے اگر نصیب دشمناں اس میں بھی ناکامیابی ہوئی تو دنیا کی تکلیفیں عقبیٰ کا کفارہ ہیں اور آپ کہہ سکتے ہیں ؎

یارب بدل اسیر من رحمت کن   بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن
بر پائے خرابات رومن بخشائے   بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

تسکین قلب خود پکار اٹھے گی ؎

گویند بہ حشر گفتگو خواہد بود   واں یار عزیز تند خود خواہد بود
از خیر محض بجز نکوئی یابد   خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود

○

تنقید

آپ خود اپنی تنقید لکھا کیجیے۔ ڈیوڈ ہمیشہ یہی کرتے تھے (مسز گبرگ ماخوذ از بک آف آرتھ)

1۔ کتاب غیر مکمل ہے

تسلیم ہے۔

2۔ باتیں اس قدر صاف لکھی ہیں جن سے نفرت ہوتی ہے

ضرور ایسا ہے مگر مجبوری تھی، ملاحظہ ہو طِب اور فقہ کی کتابیں، نیز مولوی اشرف علی تھانوی کی بہشتی زیور

3۔ اس طرح کے مضامین میں سنجیدگی بہت ضروری ہے

خوش دلی کی برکت سے آنسوؤں کے تار میں دھنک دکھائی دیتے ہیں جن سے ناگوار مضامین کی سختی میں نرمی پیدا ہوجاتی ہے۔

4۔ عبارت کہیں کہیں مشکل ہوگئی ہے

تسلیم ہے مگر مسائل کی دشواری کا بھی خیال کیجیے، پھر بھی اعتراض صحیح ہے۔

5۔ جنسیات میں پالیٹکس گھس گئی ہے

پالیٹکس سے کون چیز خالی ہوسکتی ہے۔

6۔ اکثر لوگ ناراض ہو جائیں گے

جی ہاں۔ تو پھر کیا کیا جائے؟

7۔ ناولوں کے حوالے سند نہیں

بڑی علمی کتابوں میں افسانوں کے حوالے دیے جاتے ہیں ناول اگر فطرت کی عمدہ ترجمان ہے تو حقیقت حال پر صحیح روشنی ڈالتی ہے۔

8۔ پیڈنٹری ہے

اس کے تو ہم بھی قائل ہیں

9۔ باقی خامیاں مصنف خوار معترضین کے لیے چھوڑ دی گئی ہیں، بقول آسڑوی شاعر پٹونی

مرحوم کے آخر وہ بھی خدا کے بندے ہیں، ان کا رزق بھی تو بہم پہنچتا ہے۔

بہ ناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

O

''شوال کا مہینہ تھا۔ مولوی صاحب نے اذان دی اس کے بعد آسمان پر دھنک دکھائی دیا۔ میں نے بعد کو مولوی صاحب سے از راہ بے تکلفی کہا ''مولوی صاحب میں تو آپ کو مسلمان سمجھتا تھا مگر آپ تو نرے سنّی ہی نکلے'' اُس دن سے مولوی صاحب کی اذان سب اذانوں کے بعد ہی ہوتی ہے اور کسی پڑھے لکھے سنّی نے اعتراض بھی نہیں کیا کہ تم نے اذان میں دیر کر دی......''

(چودھری محمد علی: ''میرا مذہب'')

محمد علی رُدولی

(مُصنّف)

فہرست

عنوان

ایک بیٹی، ایک بھتیجی اور ایک بہو کے نام

ہندستان کی ہوا ایسے آرام کی ہے کہ لوگ مضبوط اور زیادہ محنتی نہیں ہوتے۔ دوسری جگہوں پر جہاں ہر چیز اتنے سہل میں نہیں مل جاتی۔ جیسے عرب یا انگلستان۔ وہاں لوگ بڑے محنتی ہوتے ہیں۔ بھیک مانگ کر یا جنگل میں ساگ اور پھل کھا کر لوگ ہندستان ہی میں کاٹ سکتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں ایسا کریں تو مر جائیں۔ اسی وجہ سے یہاں کے لوگ جیتے کم ہیں اور کمزوری کی وجہ سے بیماری حیرانی کا مقابلہ کم کرسکتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے کھانوں میں بھی لہسن، پیاز، ادرک، ہلدی، مرچ مسالے اتنے پڑتے ہیں کہ بچوں کی باڑھ کم ہوجاتی ہے۔ بیاہ بھی کمسنی میں ہوتا ہے۔ باڑھ کے زمانے میں بچّے تو پیدا ہوجاتے ہیں مگر ان کا جسم پوری طرح مضبوط نہیں ہونے پاتا۔ اسی وجہ سے بچّے بھی کمزور پیدا ہوتے ہیں اور ماں باپ بھی کمزور رہ جاتے ہیں۔ اس حالت میں عورت مرد سے زیادہ نقصان میں رہتی ہے کیونکہ اس کو مہینہ ختم ہونے کے بعد سے 280 دن (نہ کم نہ زیادہ) بچہ پیٹ میں پالنا پڑتا ہے اور پیدا ہونے میں بڑی محنت پڑتی ہے۔ دودھ پلانے کی مصیبت اس کے سوا۔ اگر اوپر کا دودھ پلاؤ تو ذرا سی بھول چوک میں بچہ کھیل گیا اور دوسرا بچہ پیٹ میں جلد آگیا۔ تلے اوپر کے بچّوں میں عورتیں جلد بوڑھی ہوجاتی ہیں اور ان کا پیٹ بگڑ جاتا ہے۔ اگر کوئی بات اس طرح کی نہ ہوئی تو ''بیسی کھیسی'' مثل تو ضرور پوری ہوجاتی ہے۔ انگریزنوں کو دیکھیے کہ پچاس برس تک جوان رہتی ہیں اور حوصلہ اس کے بعد بھی رہتا ہے۔ ہمارے یہاں جہاں دو تین بچے ہوئے جھلنگا ہوکر رہ گئیں۔

دق کا مرض ہندستان میں بہت بڑھ گیا ہے اور عورتیں اس بیماری میں مرد سے زیادہ پھنستی ہیں کیونکہ کمزور ہی کو سب مرض دباتے ہیں۔ پردے میں رہنے کی وجہ سے بھی اس کمبخت بیماری کو اور مدد مل جاتی ہے۔ ایسی عورتوں کے بچے بھی کمزور رہتے ہیں اور اس طرح کمزوری عورت مرد سب میں بڑھتی جاتی ہے۔ دنیا میں رہ کر کوئی دنیا کو چھوڑ نہیں سکتا

اور روز روز کے بچوں کا ہونا رک نہیں سکتا۔ چاہے جان رہے یا جائے۔ اسی لیے یہ ''پردے کی بات'' لکھی ہے۔ اگر عورتیں پڑھ لیں گی تو فائدہ میں رہیں گی۔

بڑے بڑے ڈاکٹروں نے یہ پتہ چلایا ہے کہ مہینے میں صرف دو ہی تین چار انتہائی پانچ دن ایسے ہوتے ہیں جن میں لڑکا رہ سکتا ہے اور اگر ان چار پانچ دنوں میں عورت مرد الگ رہیں تو پھر مہینہ بھر بچہ رہنے کا ڈر نہیں۔

جب آئندہ مہینہ شروع ہونے کو ٹھیک پندرہ دن رہ جاتے ہیں تو عورت کے اندر ایک چھوٹا سا انڈا پیدا ہوتا ہے جیسے اس کتاب میں چھوٹے سے چھوٹا نقطہ یہ انڈا صرف چوبیس گھنٹے ایسا رہتا ہے کہ مرد کا کیڑا اس سے مل سکے اور بچہ پیدا ہو سکے۔ مرد کا کیڑا بھی عورت کے بدن میں پہنچ کر زندہ تو کئی دن رہتا ہے مگر مرد کے بدن سے نکلنے کے بعد صرف دو دن اتنا زوردار رہتا ہے کہ انڈے میں گھس کر بیٹھ رہے اور لڑکا رہ جائے۔ اس طرح سب ملا کر مہینے میں تین دن ہوئے جس میں عورت مرد اگر نہ ملیں تو لڑکا نہ ہو۔ سمجھانے کے لیے پھر کہہ دوں۔ آج آپ نہائیں ابھی لڑکا نہ رہے گا یا آئندہ مہینہ ہونے کو بارہ تیرہ دن رہ گئے ہیں تب بھی کوئی ڈر نہیں ہے۔ اگر ڈر ہے تو اس دن جس دن آئندہ مہینہ ہونے کو صرف پندرہ دن رہ جائیں گے اور اس کے دو دن پہلے اور ایک دن بعد تک اگر میاں بی بی ملے تو بچہ رہ جانے کا یقین ہے۔ یعنی اس پندرہ دن کے دو دن پہلے بھی اگر میاں بی بی اکٹھا ہو چکے ہیں تو لڑکا رہ جائے گا اور اسی پندرہویں دن کے ایک دن بعد بھی یعنی جب چودہ دن مہینہ ہونے کو رہ گئے ہیں تب بھی لڑکا رہ سکتا ہے۔ آپ اب سمجھ گئی ہوں گی کہ پندرہواں دن پیٹ رہنے کے لیے یقینی ہے اور اس خاص دن کے دو دن پہلے بھی لڑکا رہنے کا ڈر ہے اور ایک دن بعد آپ کے سمجھانے کے لیے پھر دوہراتا ہوں۔

آئندہ مہینہ ہونے کو جب ٹھیک سترہ دن رہ جائیں گے تو لڑکا رہ سکتا ہے۔ آئندہ مہینہ ہونے کو جب سولہ دن رہ جائیں گے تب بھی لڑکا رہ سکتا ہے۔ جب پندرہ دن رہ جائیں گے تب بھی رہ سکتا ہے اور جب چودہ دن رہ جائیں گے تب بھی۔ اگر ان چار دنوں میں عورت مرد نے ایک دوسرے کو نہیں جانا ہے تو اس مہینے میں کوئی ڈر نہیں ہے اور نہانے کے بعد بھی کوئی ڈر نہیں ہے جب تک پھر نیا مہینہ ہونے کو سترہ دن نہ رہ جائیں۔

لیجیے نقشہ میں بھی لکھے دیتا ہوں۔

مہینے میں چار دن ایسے ہیں کہ اگر میاں بیوی ملے تو لڑکا رہ جانا ضروری ہے۔

1۔ آئندہ مہینہ ہونے کو جب ٹھیک سترہ دن رہ جائیں۔
2۔ آئندہ مہینہ ہونے کو جب ٹھیک سولہ دن رہ جائیں۔
3۔ آئندہ مہینہ ہونے کو جب ٹھیک پندرہ دن رہ جائیں۔
4۔ آئندہ مہینہ ہونے کو جب ٹھیک چودہ دن رہ جائیں۔

اکثر عورتیں اپنا حساب تو جانتی ہیں مگر اس میں اگر تھوڑا سا اَل بَل ہوجاتا ہے تو وہ یہی سمجھا کرتی ہیں کہ حساب ٹھیک ہے۔ اس لیے نجس ہونے کی تاریخ لکھ لینا بہت ضروری ہے۔ خالی اپنی یاد پر بھروسہ کرنے میں دھوکہ ہوجائے گا۔ یہ بھی خیال ہے کہ ہر عورت کو چاہیے کہ اپنا حساب سال بھر لکھ کر دیکھے تب اس پر بھروسہ کرے۔ اگر کسی کا حساب ایسا بندھا ٹکا ہے کہ اس کو چھ ہی مہینے میں اپنی ماہواری کے حساب کا یقین ہوجائے تو کافی ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہو یا نا بعض عورتوں کا مہینہ پچیس دن کا ہوتا ہے بعض کا چھبیس دن کا۔ بعض کو ستائیس دن کا، بعض کو اٹھائیس، انتیس، تیس، اکتیس اور کسی کسی کو بتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔ بعض کو ایک بار اٹھائیس دن پر دوسرے میں انتیس دن پر اور پھر تیسرے میں ستائیس دن پر ہوتا ہے اور پھر اسی طرح سے اٹھائیس، انتیس، ستائیس۔ بعض کو اسی طرح کا الٹ پھیر دوسری تاریخوں کے ہوتے ہیں۔ ان سب کا حساب زبانی رکھنا ٹھیک نہیں۔ اس میں غلطی ہوجانے کا ڈر ہے جس کو ٹھیک ٹھیک حساب رکھنا ہو اس کو چاہیے کہ مہینہ شروع ہونے کا دن اور تاریخ لکھ رکھے۔ چاند کبھی انتیس کا ہوا کبھی تیس کا۔ انگریزی مہینہ کبھی چھوٹا ہوا کبھی بڑا۔ اس لیے مہینے کا حساب تاریخ سے لگائیے مگر دن ضرور لکھ لیا کیجیے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ حساب لگانے میں جس دن مہینہ شروع ہو وہ دن جوڑا جائے گا جس دن اگلا مہینہ شروع ہوگا وہ دن اس مہینے میں نہ جوڑا جائے گا بلکہ اگلے مہینے میں جوڑا جائے گا جس عورت کو مہینہ بندھی ٹکی تاریخ پر ہوتا ہے اس کو تو کوئی مشکل نہیں۔ فرض کیجیے کسی کو انتیس دن پر ہوتا ہے اور پھر فرض کیجیے کہ پہلی جنوری کو کپڑے میلے ہوئے اور چھ کو نہائیں تو صاف بات ہے کہ اب انتیس تاریخ تک فرصت ہی فرصت ہے۔ اب انتیس تاریخ سے پندرہ دن الٹے گن

لیجیے۔ یعنی انتیس، اٹھائیس، ستائیس.......... اسی طرح پندرہ دن تک گنتی چلی آیئے تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ انڈے کے آنے کا دن پندرہ جنوری ہے۔

مرد کا کیڑا دو دن تک کام کا رہتا ہے اس لیے اگر میاں بی بی چودہ یا تیرہ جنوری کو مل چکے ہیں تو لڑکا رہ جائے گا یا پندرہ کو ملے تب بھی رہ جائے گا۔ بس صاف ہوگیا کہ ایسی عورت تیرہ، چودہ، پندرہ، سولہ جنوری کو چار تاریخیں سنبھلی رہے تو اس کو ڈر نہیں۔ اب ایسی عورتوں کو لے لیجیے جن کو کبھی چھبیس دن پر ہوتا ہے اور کبھی تیس دن پر اور کبھی ان کی درمیانی تاریخوں میں ایسی عورتوں کو چاہیے کہ اپنے ماہواری نقشے میں کم سے کم دن والا مہینہ لکھ کر دھیان میں رکھیں اور اسی طرح زیادہ سے زیادہ دن والا مہینہ لکھ کر یاد رکھیں جن مہینوں میں درمیانی تاریخوں میں ہوئی ہیں ان کا لکھنا ضروری نہیں۔ مثال کے لیے نقشہ دیا جاتا ہے۔

(نقشہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

اس نقشے میں گول (o) نشان انڈے کا ہے اور چھلک (x) کا نشان مہینے کا ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوجائے گا کہ اگر کسی کو چھبیس دن کا مہینہ ہوتا ہے اور وہ آج نہانے کو ہوئی ہے تو اس کا انڈا بارہویں دن پیدا ہوگا۔ اسی طرح جس کو بتیس دن کا مہینہ ہوتا ہے وہ اگر آج نہانے کو ہوئی تو اس کا انڈا اٹھارہویں دن پیدا ہوگا۔ اس نقشے میں احتیاطاً ایک دن پہلے اور ایک دن بعد کو اور بڑھا دیا گیا ہے یعنی جس کو چھبیس دن سے لے کر بتیس دن تک کا مہینہ ہوتا ہے وہ اگر آج مہینے کو ہوئی ہے تو نویں دن سے لے کر انیسویں دن تک یعنی گیارہ دن پرہیز کرے۔

فرض کیجیے کسی ایسی عورت کو چار جنوری کو مہینہ ہوا ہے تو اگلا مہینہ اس کو انتیس جنوری سے لے کر چار فروری تک کسی دن ہوسکتا ہے۔ اس حساب سے اگر لڑکا رہ سکتا ہے تو بارہ جنوری سے بائیس جنوری تک۔ اب چار جنوری سے لے کر گیارہ جنوری تک اور 23 جنوری سے لے کر 9 مہینے ہونے تک کوئی ڈر نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایسی عورتیں کم نکلتی ہیں لیکن جو ہیں ان بے چاریوں کو گیارہ دن بچنا پڑے گا۔ یا دوسری ترکیبیں کرنا ہوں گی جو اسی کتاب میں لکھی ہیں۔

مہینہ کتنے دن ہوا	۳۲ دن	۳۱ دن	۳۰ دن	۲۹ دن	۲۸ دن	۲۷ دن	۲۶ دن	
۱								۱
۲								۲
۳								۳
۴								۴
۵								۵
۶								۶
۷								۷
۸								۸
۹								۹
۱۰								۱۰
۱۱								۱۱
۱۲								۱۲
۱۳							o	۱۳
۱۴						o		۱۴
۱۵					o			۱۵
۱۶				o				۱۶
۱۷			o					۱۷
۱۸		o						۱۸
۱۹	o							۱۹
۲۰								۲۰
۲۱								۲۱
۲۲								۲۲
۲۳								۲۳
۲۴								۲۴
۲۵								۲۵
۲۶							x	۲۶
۲۷						x		۲۷
۲۸					x			۲۸
۲۹				x				۲۹
۳۰			x					۳۰
۳۱		x						۳۱
۳۲	x							۳۲
۳۳								۳۳
۳۴								۳۴

نوے سیکڑہ تندرست عورتوں کو اٹھائیس دن پر ہوتا رہتا ہے یا ایک دو دن گھٹ بڑھ بھی دیکھا گیا ہے کہ ستانوے سیکڑہ عورتوں کا کوئی نہ کوئی حساب بندھ جاتا ہے۔ صرف تین سیکڑہ عورتیں ایسی ملی ہیں جن کا کوئی حساب ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس لیے حساب لگانے کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہر عورت کو مہینے میں گیارہ گیارہ دن پرہیز کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کبھی اپنی خواہش سے کبھی دوسرے کی ضرورت سے کبھی مصلحت کی وجہ سے کبھی محبت کے ہاتھوں مجبوریاں ہو جاتی ہیں لیکن پھر بھی بہت کچھ عورت کے ہاتھ میں ہے۔ اگر عین وقت پر نہیں تو پہلے سے اس طرح کا رویہ رکھا جاسکتا ہے۔ میں نے ایک بڑی نیک عفیفہ عورت کے بارے میں سنا ہے کہ اس نے اپنے میاں سے ہنسی میں کہا کہ بہن بھائی کی طرح پاس لیٹتے اچھا نہیں لگتا۔ کئی عورتوں کو کہتے سنا ہے کہ بچے بڑے بڑے ہو گئے ہیں گود میں چھوٹے بچے کو جی چاہتا ہے۔ لکھنے والا بڈھا ہے اور اسی وجہ سے اکثر نوجوان میاں بی بی مجھ سے مشورہ لیتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ بہت سے بچے ہونے میں صرف مرد بدنام ہوتا ہے حالانکہ ذمہ داری عورت کی زیادہ ہوتی ہے۔ پڑھنے والیاں اس جملے پر ایک بارگی بارود کی طرح لے نہ اڑیں بلکہ ٹھنڈے کلیجے سوچیں عورت کی طرف مرد ہمیشہ کھنچتا ہے۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ عورت جس وقت بن سنور کر سامنے آوے یا جس وقت وہ چاہے اسی وقت ایسا ہو بلکہ یہ تو ہر گھڑی ہوا کرتا ہے چاہے اس وقت عورت کے دل میں مرد کے لبھانے کا خیال ہو چاہے نہ ہو۔ قریبی رشتہ داری، گناہ کا خوف، پنچ برادری کا خیال، دنیا کا ڈر، سن کا فرق یا اپنے چاہنے والی سے وفاداری کا خیال یہ چیزیں ہیں جو مرد کو روکا کرتی ہیں نہیں تو ہر عورت کی طرف ہر مرد کا دل ہر وقت کھنچتا رہتا ہے اور عورت کی روح اس کو پسند بھی کرتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آبروداری کے خیال سے یا اور وجھوں سے وہ اس کو برا مانے۔ یہ تو ہر عورت اور مرد کا حال ہوا۔ اب میاں بی بی کا کیا پوچھنا وہاں تو کوئی چیز روکنے والی نہیں ہے۔ ہاں ایک چیز روک سکتی ہے وہ خود عورت کا ارادہ۔ اگر عورت نہ چاہے تو دو ایک دن بات ٹل سکتی ہے۔ یاد کیجیے عمر بھر میں بہت سے ایسے موقع ہوئے ہوں گے کہ آپ نے اپنے ساتھی کا جوش ٹھنڈا کر لیا تھا۔ مگر یہ اسی وقت ہوا ہوگا جب آپ نے دل سے اس کی کوشش کی ہوگی۔

فرض کیجیے آپ کے بدن کے اندر کوئی تکلیف ہے یا آپ پوجاپاٹ کرنے جارہی ہیں یا آپ قصابہ باندھے نماز پر کھڑی ہورہی ہیں اور واقعی دل سے چاہتی ہیں کہ اس وقت نہ بولیں تو آپ نے ہمیشہ مرد کو روک دیا ہے۔ کچھ عورت کی نگاہ میں ایسا ہوتا ہے کہ بے اس کے مرد کا دل ابھر ہی نہیں سکتا ہے۔ کچھ عورت کی مسکراہٹ میں ایسا ہے کہ ''نہیں'' ''ہاں'' ہوکر رہ جاتی ہے۔ مہینے میں زیادہ سے زیادہ صرف پانچ دن ایسے ہیں کہ جس میں احتیاط کی جائے باقی مہینہ بھر پڑا ہے ہنس کھیل کر زندگی بسر کرنا آپ کو نصیب ہو۔ کون روک سکتا ہے۔ ہاں اگر آپ اپنی تندرستی چاہتی ہیں اور بچوں کی صحت اور تعلیم تربیت کا خیال ہے تو پانچ دن سنبھلی رہیے۔ علاج معالجے کے سلسلہ میں اکثر بچوں کی ٹوٹی ہوئی عورتوں کو کہتے سنا ہے ''روٹی کپڑے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے'' یا ''بڑے ظالم سے پالا پڑا ہے آپ کو کیا معلوم؟'' معاف کیجیے گا میں ان بہانوں کا نہیں قائل۔ اگر غریب بدقسمت رنڈی ایسی بات کہے تو ایک حد تک جا بھی ہے۔ اگر آپ گھر گرہست آبرودار ہوکر ایسی بات کہیں تو میں زیادہ قصور آپ ہی کا کہوں گا۔

ان باتوں کے بعد اگر پھر بھی مجبوری آن پڑی تو مرد سے کہیے کہ ربڑ کی تھیلی جس کو ''فرنچ لیٹر'' کہتے ہیں چڑھا لے۔ ضرورت کے بعد اس کو دھوکر اور کپڑے سے پانی اٹھا کر رکھ لیجیے۔ اگر ذرا سا سنگ جراحت پیس کر مل دیجیے تو دیر تک چلے گا۔ ربڑ کو گرمی سے بچائے رکھے گا کیونکہ ربڑ کچھ دن کے بعد یوں بھی خراب ہوجاتا ہے اور گرمی سے تو اور جلد گل جاتا ہے۔ چڑھانے کے پہلے مرد کو چاہیے کہ کھینچ کر دیکھ لے کہ گل تو نہیں گیا ہے اور آگے کی طرف تھوڑا حصہ علاوہ اخراج کی تھیلی کے بھی لٹکا رہنے دے کیونکہ اخراج کے وقت مرد کا بدن بہت پھول جاتا ہے۔ اس وقت اگر ربڑ کس کر چڑھایا گیا ہے تو پھٹ جائے گا۔ یہ بازار میں ہر جگہ ملتے ہیں اور اگر گھر میں ایک آدھ پڑے رہیں تو اچھا ہے۔ دوسری چیز اسی طرح کی عورتوں کے لگانے کی ہوتی ہے۔ یہ ایک ربڑ کی ٹوپی سی ہوتی ہے جو عورت بچہ دانی کے منہ پر چڑھا لیتی ہے۔ اگر یہ ٹھیک طرح لگ جائے تو بڑے کام کی چیز ہے۔ مگر پہلے پہل ممکن ہے چڑھاتے نہ بنے۔ کسی لیڈی ڈاکٹر سے ایک مرتبہ سمجھ لیجیے تو پھر کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ٹوپیاں بڑی چھوٹی تین ناپوں کی ملتی ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر بتا دے گی کہ کون ناپ ٹھیک اترے گی۔ سمجھ دار عورتیں یوں بھی اندازہ کرسکتی ہیں۔ جن

عورتوں کے بچے بہت سے ہو چکے ہیں یا جو ہاتھ پاؤں کی اچھی خاصی ہیں ان کو منجھولی یا بڑی ٹوپی درکار ہوگی۔ جو لوگ دھان پان ایسی ہیں اور بچے بہت نہیں ہوتے ہیں ان کو چھوٹی یا منجھولی ٹوپی چاہیے۔ اکثر ٹوپیوں کے ساتھ ایک تصویر بھی ملتی ہے جس سے لگانے کی ترکیب سمجھ میں آجائے گی لیکن پھر بھی بہتوں کو ڈاکٹرنی کی مدد ضروری ہوگی۔ اس میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ مرد کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ فراغت کے بعد جسم کو پانی سے بلکہ ''ڈوش'' سے خوب دھو ڈالے۔ آخری ترکیب ایک اور بھی ہے جو ہارے کا ہتھیار ہے۔ عورت ایک ریشم کا بڑا سا پھندنا خوب پانی میں تر کر کے پلنگ پر جانے سے پہلے انگلی سے جہاں تک جا سکے رکھ لے مگر پھندنا ذرا بڑا سا ہو اگر آپ کو خیال ہو کہ نکالنے میں دقت ہوگی تو پھندنے کا ایک مہین سا دھاگہ باہر نکلا رہنے دیجیے۔ اگر ریشم نہ موجود ہو تو روئی بھگو کر رکھ لیجیے۔ مگر اتنا یاد رہے کہ کیلے کا ریشم بھولے سے بھی نہ استعمال کیجیے گا۔ اول تو روئی یا ریشم مرد کے کیڑے کو بچہ دانی تک پہنچنے سے روکیں گے دوسرے پانی آدمی کے کیڑوں کو مار ڈالتا ہے مگر اتنا پھر کہے دیتا ہوں کہ یہ ترکیب مجبوری کی ہے۔ اس پر پورا بھروسہ نہ کیجیے گا۔ اس میں دھوکہ ہو جانے کا بڑا ڈر ہے۔ اگر ہر طرح کی مجبوری ہو جائے اور بالکل بے بسی کی نوبت آجائے۔ اسی وقت کا یہ حربہ ہے۔ اگر اس کے بعد دن ٹل جائیں تو تعجب نہ کیجیے گا۔ نہ مجھ کو کوسنے دیجیے گا کہ موئے نے ترکیب بتائی تھی آگ لگے اس ترکیب کو۔ اتنا اور خیال رکھیے گا کہ بہت دنوں کی بیماری یا بہت لمبا سفر کرنے سے بھی ایک آدھ دن کا اَل بَل ہو جاتا ہے۔ اگر کسی بات میں دھوکا نہیں ہے تو وہ یہ ہے کہ عموماً مہینہ ہو چکنے کے آٹھ دن بعد تک اور پھر جب دوسرا مہینہ ہونے کے دس دن رہ جائیں تب لڑکا نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی بات کے پوچھنے کی ضرورت پڑے تو میں رازداری کے ساتھ جواب دینے کو ہر وقت حاضر ہوں۔

بیویو صاحبزادیو اس چھوٹے سے رسالے کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھیے گا۔ میں نے دریا کو کوزے میں رکھ دیا ہے اتنے بڑے مسئلے کا عطر کھینچ دیا ہے۔ اگر اب بھی آپ تعریف نہ کریں تو میری قسمت ہے۔

○

فکاہیہ

اتالیق بی بی

مصنفہ

عالیجناب چودھری محمد علی صاحب، تعلقہ دار و رئیس ردولی ضلع بارہ بنکی

جس میں شوہروں پر عورتوں کی بے معنی نکتہ چینیوں اور بیجا شکایتوں کا بہت ہی سچا خاکہ دکھایا گیا ہے

اور جو

انگریزی کی کتاب "کرٹین لیکچرز" سے اس خوبی کے ساتھ ماخوذ کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ خوبی پیدا کرنا ممکن نہیں

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

میاں نے ایک دوست کو پانچ روپیہ قرض دے دیے ہیں، بیوی کا نصیحت نامہ، اصول کفایت شعاری و خانہ داری

خاک باشی، خوک باشی یا سگ مردار باش
ہرچہ باشی باش عرفی اند کے زردار باش

دے آئے نا؟ ہزار منع کیا آخر نہ مانا۔ یہ میں کہتی ہوں تم کہاں کے روپے والے ہو جو روپیہ بانٹتے پھرتے ہو۔ انھیں پانچ روپیوں سے نہ معلوم کیا کیا کام نکلتے اور اگر ابھی مانگنے جاؤ تو کوئی کوڑی بھی نہ دے۔ عورت کی مٹی خراب ہے تمھارے گھر میں، کیا کیا جتن کر کے خرچ کم کرتی ہوں اور تم قرض دیتے پھرتے ہو۔ روپیہ پیسے والی عقل تم کو کبھی نہ آئے گی۔ تمھارے گھر میں اسی طرح کی پھٹکار ہمیشہ برسا کرے گی۔ آج تین مہینے سے ایک گرنٹ کے پائجامے کو کہہ رہی ہوں مگر تم نہیں سنتے۔ وہ تو قرض دینے سے جب بچے نہ؟ بی بی کا پائجامہ نہ بنے، موئی چیتھڑے لگائے پھرے، مگر تم قرضے بانٹتے پھرو۔ دنیا کہتی ہے کہ بی بی کے کہے میں ہیں، کیوں نہیں؟ اگر دنیا یہ حال جانتی تو کاہے کو کہتی! تمام زمانہ تو تھوکتا ہے کہ اتنے بڑے گھر کی بی بی اور ایک پائجامے سے دوسرا نصیب نہیں۔ جہاں دیکھو اسی کو لادے ہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ بچے تک بھوکوں مریں مگر میاں قرض بانٹتے پھریں گے ضرور۔ لڑکیوں کی اوڑھنیاں روئی روئی ہوگئیں، مگر تمھارے یہاں ابھی چھ مہینے پورے نہیں ہوئے، میں کہتی ہوں، قرضہ بانٹنے کے چھ مہینے ہوگئے؟ اور کپڑے بنانے کے چھ مہینے، کبھی ختم ہونے کو نہ آئیں گے؟ مجھے کیا؟ آپ ہی تم کو لوگ ہنسیں گے کہ باوا قرضہ دیتے پھرتے ہیں اور لڑکیوں کے سر پر اوڑھنی کا تار بھی نہیں۔ ٹیکس والا صبح کو پکار گیا ہے۔

اب دیکھیں کہاں سے آتا ہے روپیہ وہی گھر وارہ[1] دے جائیں گے جن کو روپیہ قرض دیا ہوگا۔ آج دو دن سے کھڑکی کا پٹ نکل گیا ہے، بڑھئی کو بلانے والی تھی، مگر اب بلواؤں کیا خاک؟ مزدوری کہاں سے آئے گی؟ مزدوری تو قرضہ میں گئی۔ اب کھڑکی یوں ہی رہے گی؟ یہ تو ٹھنڈک اور یہ ہوا۔ اتنا سا بچہ گود میں اور ایسی قہر کی ہوا چل رہی ہے۔ اللہ حافظ ہے بچے کی جان کا۔ زکام اس کو ایک ہی دن کی ہوا میں ہوگیا ہے۔ اب پسلی بھی ہوجائے گی۔ تب حکیم ڈاکٹر کرتے پھروگے۔ مگر ابھی کھڑکی کی فکر نہیں لیتے۔ اگر بچے پر آنچ آگئی تو تمھیں پر خون ہوگا۔ میں کہے دیتی ہوں، منگل منگل آٹھ، بدھ نو، جمعرات دس دسویں دن چوکیدار کا مہینہ پورا ہوگا اور اگر اس نے تنخواہ اسی دن نہ پائی، چلا جائے گا، پھر میاں کو قرض دینے کا حال معلوم ہوگا کہ ایسا ہوتا ہے قرض بانٹنا، اور چوریاں آج کل اتنی ہوتی ہیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ جب چوکیدار چلا جائے گا تو اللہ ہی نے کہا کہ چور آئے گا جس دن مُوس لے جائے گا اس دن قدر و عافیت کھل جائے گی۔ جب گھر کی جمع پونجی سیند کے راستہ نکل جائے، تب قرض بانٹنا ابھی نہیں، منجھلی لڑکی کا یہ حال ہے کہ آئے دن بیمار رہتی ہے۔ کب سے جی چاہتا ہے کہ کچھوچھے[2] لے جاؤں۔ مگر کیسے لے جاؤں، آپ کو تو قرض سے نہیں چھٹی، کچھوچھے کیسے لے جاؤں؟ چاہے لڑکی مرے، چاہے جئے، ان کو روپیہ پھینکنے سے مطلب، گھر بھر میں ایک پلنگ کی اَدوائن ٹھیک نہیں، جس پلنگ پر لیٹو قبر کا مزہ آتا ہے۔ کھانا الگ ہضم نہیں ہوتا، گھر بھر کا پیٹ بگڑ گیا ہے۔ اگر رسّی مول آجاتی تو کاہے کو یہ ہوتا؟ مگر تم کو اس سے کیا واسطہ؟ میں چاہے مروں چاہے جیوں بچے چاہے چارپائی پر رہیں چاہے بھاڑ میں جائیں۔ تم کو روپیہ پھینکنا۔ گھر میں بل اتنے ہوگئے ہیں اور چوہے اس قدر ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ کب سے کہتی ہوں کہ ایک مزدور لگا کر بند کروا دو؟ مگر نہیں سنتے۔

''اچھا تو چوہے دان لگا دو''۔

چوہے دان لگا دو؟ چوہے دان کہاں سے آوے جو لگاؤں؟ جب قرض بانٹنے سے فرصت ملے تب چوہے دان آوے۔ یہ آواز کہاں سے آئی؟ اے لو چور ابھی سے آنے لگے۔

---

1. ہاؤس ٹیکس
2. ایک بزرگ کا مزار جہاں لوگ دعا تعویذ کے لیے جاتے ہیں۔

''چور وور کوئی نہیں ہیں بلی دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے تم کو ناحق کی وحشت ہے۔''

مجھ کو ناحق کی وحشت ہے! زنجیر آج برسہا برس سے ویسی ہی ڈھیلی ہے۔ روز چلاتی ہوں کہ کنڈی بدلواؤ مگر کون سنتا ہے؟ جس کا جی چاہے ہاتھ ڈال کے کھول لے اور گھس آوے۔ مگر تمھارے تو خیال ہی نہیں آتی بات۔ اگر قرض کی جگہ تم گھرواہے کی خبر لیتے رہتے تو میں کاہے کو روتی؟

قصہ مختصر، حضرات انھیں پانچ روپیوں کے بغیر ریشمی پائجامہ نہ بنا۔ لڑکیوں کے کپڑے پڑے رہ گئے۔ گھر وارہ الگ نہ ادا ہوسکا۔ کھڑکی میں کنواڑ نہ لگ سکا۔ بچے کو پسلی کا عارضہ ہوتے ہوتے رہ گیا، چوکیدار چھوٹا، لڑکی بیمار ہوئی، پلنگ غارت ہوئے، چوہوں نے گھر کھود ڈالا، چور گھس آئے، غرض کہاں تک عرض کروں؟ شوہر بہ زبان حال یہ شعر پڑھتے ہوئے سو گئے۔

حالِ من از دست خاتوں ابتر است　　　در گلویم سنتِ پیغمبر است

○

دوسرا باب

ہمارے ہیرو کی اہلیہ کو حقّے سے نفرت ہے. شوہر صاحب نے صحبت بد میں بیٹھ کر یہ خراب عادت سیکھ لی ہے. ہیروئن صاحبہ کی شکوہ و شکایت ہدیہ ناظرین ہیں.

دم بدم لیتا ہے بوسے یہ لب جاناں کے
ہم سے دیکھا نہیں جاتا یہ ستم حقّے کا[1]

بھلا اگر عورتوں کو کچھ بھی اندازہ اس تکلیف کا ہو تو کون ایسی ہوگی جو نکاح کے وقت ہوں کرے گی؟ ہم تو دن رات مرتے کھپتے ہیں اور یہ ہیں کہ ان کو سیر تماشے سے فرصت نہیں، صبح ہوئی اور روانہ باشد۔ دن بھر غائب، آدھی رات تک پتہ نہیں۔ صاحب کام کیا کہیے؟ سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملی۔ ارے میں جانتی ہوں، جیسا کام کیا کرتے ہو دن بھر یار دوستوں میں دنیا بھر کے قصّے ہوا کرتے ہیں۔ گانے بجانے میں بھی مصروف رہتے ہوں گے اور پھر رات کو آئے تو ایسی سڑی تمباکو کی بو منھ سے آتی ہے کہ قے ہو جائے۔

''اے لو مجھ کو گاتے کب سنا؟ حقہ البتہ پیتا ہوں۔''

حقہ پیتے ہو کہ اللہ جانے کیا بلا پیتے ہو؟ میں کہتی ہوں کہ تم گانجا بھی پیتے ہوگے اور گانے کو کیا میں نے نہیں سنا تو کیا ہوتا ہے؟ میں جانتی تو ہوں کہ تم یار دوستوں میں بیٹھ کر خوب گاتے ہوگے؟ اور آج کل تو یار دوستوں کا روگ کچھ اور زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ سنو میں ایک بات کہتی ہوں مجھ سے نہ ہو سکے گا کہ آدھی آدھی رات تک تمھارے لیے دروازہ کھولے مسٹ ماری پڑی رہوں۔

''اچھا تو تم سو رہا کرو۔''

میں سو رہا کروں، جس میں تم کو اطمینان ہو جائے، پھر صبح ہوتے آیا کرو۔ ارے میں

---

[1] یہ شعر بزبان ہیروئن صاحبہ ہے۔ مترجم بری یا بھلی داد سے معاف رکھا جائے۔

تمارے ہتھکنڈے خوب جانتی ہوں، میری عادت بولنے کی نہیں مگر جب ناک سے پانی اوپر ہو جاتا ہے تو بولنا ہی پڑتا ہے۔

''اچھا تو ہم سویرے کام ختم کر دیا کریں گے۔ اب سویرے آیا کریں گے، لو سو رہو۔''

سو رہیں! لو صاحب بارہ بجے تک خود ہی بٹھال رکھتے ہیں، پہرا پھرتا ہے، جی کانپا جاتا ہے، تب کہیں آپ آتے ہیں اور پھر مجھ ہی سے کہتے ہیں، سو رہو۔ یہ تو بتاؤ کہ روز خدائی رات اگر اسی طرح ہوئی تو میں جیوں گی کاہے کو؟ ارے کیسی سخت بو، منھ میری طرف نہ کرنا، بھلا میں اتنا کہتی ہوں کہ یہ سلفہ پینے سے سوائے میرے ہلکان کرنے کے تمھارا اور کیا مطلب ہے؟ یہ سب بس اسی موئے کا بویا ہوا ہے جس کو تم بڑا دوست سمجھے ہوئے ہو۔ کیا نام ہے؟ ''محمد حسین''۔

ہاں ہاں محمد حسین، اللہ سمجھے محمد حسین سے جو دوسروں کو اس طرح خراب کرتا ہے؟ یہی تو اس کی بیوی آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتی ہے کہ میرا لکھا پھوٹ گیا، کوئی بھی دن ایسا نہ ہوگا کہ تین پہر بجے کے پہلے وہ گھر آتا ہو؟ اور پھر آتے ہی دروازے ہی سے غصہ اور مزاج دکھاتا ہے جس میں بی بی ڈر جائے۔ میں کہے دیتی ہوں کہ جس دن تم تین پہر بجے گھر آئے، نہ میکے چلی جاؤں تو نام بدل ڈالنا اور یہ غصہ اور مزاج مجھ سے نہ اٹھایا جائے گا۔

یہ دیکھو لوگو کیا غضب ہے؟ میں ہی ہوا سے لڑتی ہوں۔ اے جب اسی موئے سے ایسے ہی پینگ بڑھے ہوئے ہیں تو خدا ہی نے کہا ہے کہ وہی ہتھکنڈے سیکھو گے۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، مگر میں کہے دیتی ہوں کہ جس دن تم نے آنکھیں دکھائیں، اپنی اور تمھاری جان ایک کر دوں گی۔ بس کہہ دیا ہے جتنے یار دوست تمھارے ہیں سب اپنی بیویوں کو چھوڑے بیٹھے ہیں، تم بھی چھوڑ دو، تم کو قسم ہے جو نہ چھوڑو، اور چھوڑ دگے ہی یہ تو پہلے ہی سے معلوم ہے۔

''اچھا پیاری اب سو رہو نہیں تو سر میں درد ہونے لگے گا۔''

اے لو پھر وہی، میں سونے کو منع کرتی ہوں، سو رہو اور درد کو کیا؟ جب روز کا یہی حال ہے تو اللہ ہی نے کہا ہے کہ درد ہوگا ابھی کیا ہے؟ صبح جب اٹھو گے تو اور درد ہوگا۔ یہ سزا ہے رات بھر ہڑدنگا مچانے کی اور پھر غضب تو یہ ہے کہ مجھی کم بخت کو سر دبانا پڑے گا۔

نا بابا یہ روز کی تیمارداری کس سے ہوگی؟ اب دس بجے دن تک پلنگ پر پڑے رہنا۔
"نہیں سویرے اٹھوں گا، چائے وائے ذرا جلدی تیار ہوجائے گی تو سویرے ہی پی کے دفتر چلا جاؤں گا۔"

اس دھوکے میں نہ رہنا، میں قسم کھاتی ہوں کہ یہ مجھ سے نہ ہوگا کہ میں رات بھر تو یہ رونا روؤں اور کوا بری چیز نہ کھا چکے کہ تمھاری چائے پانی کروں، جو ایسا ہی ہے تو دوسرا بیاہ کرلو، مجھ سے یہ نہ ہوگا میں کہے دیتی ہوں، اے پھر وہی سلفے کی بو آئی۔ افوہ! جو یہ جانتی کہ تم مجھ کو یوں سلفے کی بو سے گھونٹ گھونٹ کر مارو گے تو میں اپنے باپ ہی کے گھر سے کاہے کو آتی؟ کیا مجھے پاگل کتے نے کاٹا تھا کہ اس جنجال میں پھنستی مگر تقدیر کا لکھا، میں تو کب کی ڈوب مری ہوتی، مگر کیا کروں بچوں کا خیال ہے؟ پتھر کے نیچے ہاتھ دبا ہے نہیں تو بتلاتی، پھر معلوم ہوتا میاں کو کہ ایسا ہوتا ہے کسی کم بخت کی تقدیر کا پھوڑنا اور اب تو یہ آئے دن کی بات ہے۔ روز ہی غائب ہوگے، اے اب تو شروع ہوا ہے، ابھی تو حقہ ہی سیکھا ہے ارے آگے چل کر شراب نہ پیو تو ناک ہارتی ہوں اور خالی یہی تھوڑی، سڑک پر لپاڈگی بھی کرو گے، موئے نشے میں کچھ سوجھتا ہے پھر اور بھی فضیحتا لکھا ہے۔ پہرے والا پکڑے گا، مقدمہ ہوگا، تم قید خانے میں چکی پیسو گے، میں گھٹ گھٹ کر گھر میں مروں گی۔ ابھی کیا جانے کیا بدا ہے؟ میری تو نگاہ کے آگے ہے جو جو پاپڑ تمھارے ہاتھوں مجھ نگوڑی کو بیلنے ہیں اور تم کو کیا تم نے تو پہلے ہی سے دھو کر پی لی ہے۔ چار آدمیوں کے سامنے میری نگاہ نیچی ہوگی اور جتنے تمھارے پاس اٹھتے بیٹھتے ہیں سب لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے ہیں نہ کوئی کام نہ کاج۔ موئے خدائی خوار، تم بھی ایسے ہی نہ ہوجاؤ تو الٹی جوتی سے میری ناک کاٹ ڈالنا، یہ ذرا سی موئی نوکری ہے، وہ بھی ہاتھ سے کھولو گے تب کہیں کل پڑے گی۔ محمد حسین موئے کے کرتوت اللہ نہ کرے کسی میں ہوں، اور وہ آپ کے بڑے دوست، بڑے لنگوٹیئے یار ہیں، اللہ سمجھے موئے سے جو بنا بنایا گھر بگاڑنے پر لگا ہے۔

ہر نصیحت کے بعد میاں کچھ نہ کچھ عذر گناہ کرتے ہیں، مگر اس سبق کے بعد آپ نے کچھ نہیں فرمایا جس سے خیال ہوتا ہے کہ دراصل دل میں نادم ہے۔

O

تیسرا باب

"شوہر صاحب نے ایک کلب میں شرکت کی ہے. بیوی ہزاروں دلیلوں سے اس کے نقائص ثابت کرتی ہیں اور زبان شکوہ کھولتی ہیں."

زاہد از کوچۂ زنداں بہ سلامت بگذر
تا خرابت نہ کند صحبت بدنامے چند

میری تو دعا ہے کہ جس کم بخت کی قسمت میری طرح پھوٹنے والی ہو، وہ عین تخت کی رات کو مر جائے تو لاکھ درجہ اچھا ہے یا تو میاں طریقہ کا ملے اور نہیں تو اسی طرح ارمان گور میں لیے چلی جائے۔

سو رہوں، سو کیسے رہوں؟ تمھارے کرتوتوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ نیند تو مجھ سے کوسوں بھاگتی ہے اور میں تم کو خراٹے تھوڑے ہی لینے دوں گی۔ جیسا تم نے مجھ کو جلایا ہے ویسی ہی میں تم کو کو اَوپڈا کے جلاؤں گی۔ عورت موئی ایسی بے بس چیز اللہ نے بنائی نہیں تو بتا دیتی کہ ایسا ہوتا ہے مجھے ہلکان کرنا۔ ہاں تو یہ کلب کون چیز ہے؟

"کلب پیاری ایک جگہ ہے جس میں......"

بس رہنے دو، سب جانتی ہوں، لے بھلا یہ روز کے جلسے تو بادشاہ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تم کہاں کے کروڑپتی آئے جو روز موئی رنڈی نچاؤ گے اور جلسہ دیکھا کرو گے یہ تم کو کیا ہوگیا ہے۔ میں کہتی ہوں تم اپنے ہوش میں ہو؟ یہ کہیے تو جب ہی بارہ بجے تک غائب رہنے لگے تھے۔ تب ہی میں سمجھ گئی تھی کہ کچھ دال میں کالا ہے لو کھلا نہ اب روز ناچ رنگ ہوتا ہے؟

"اے لو، کیا میں کہتا ہوں، کیا تم لے اڑتی ہو، پوری بات تو سنو۔"

نہیں میں سب پوری بات سن چکی، تقدیر کا لکھا پورا ہو چکا۔

''بھئی سنو تو ناچ واچ کیسا کچھ خبر ہے؟''

بس جو کچھ خبر ہونی تھی ہو چکی۔ اب خبر وبر نہیں، تم ابھی اپنے منھ سے ناچ جلسہ کہہ چکے ہو۔ اب مکرنے سے کیا ہوتا ہے؟ یا خدا یہ بدی میرے آگے آئی۔ لو صاحب ہم کو خبر ہی نہیں اور وہاں روز رنڈی آتی ہے، بس رہنے دو، میری تقدیر میں یہی لکھا تھا وہ تو میں اسی دن سے نگاہ بدلی بدلی پاتی ہوں، خیر صاحب میرا بھی خدا ہے............

''اے لو زبردستی کا رونا دیکھو، بھلا میں نے ناچ کا کب نام لیا؟''

ناچ، ہائے غضب آپ ہی ناچ جلسہ پکارتے پھرتے ہیں اور آپ ہی مکرتے ہیں۔

''ارے میں نے تو جلسہ کہا تھا، ناچ کہاں ہوتا ہے؟''

ہاں ہاں مکر جاؤ، کون نہیں جانتا کہ جلسے میں وہی موئیاں ناچتی ہیں۔ اب باتیں نہ بناؤ، بس ہو چکا۔

''ہائے غضب سنتی نہیں اور بارود کی طرح اڑتی ہیں۔ میرا مطلب ہی کچھ اور تھا تم نے تو اپنے جوش میں آکر بات ہی کچھ کی کچھ کر دی۔''

بات کیسی؟ تقدیر ہی رنگ بھنگ ہوگئی۔ جس گھر میں ان سبز پریوں کا قدم آیا اسے جڑ بنیاد سے کھد جاتے ہی دیکھا۔ اللہ مجھے یہ دن دیکھنے کو نہ رکھتا تو بہتر تھا۔

''بھئی اب کیا کروں؟ تم نے تو زبردستی کا رونا نکالا۔ تمھارے سر کی قسم۔''

بس کہہ دیا ہے میرے سر کی قسم نہ کھانا، نہیں تو اچھا نہ ہوگا۔ کسی کنوئیں تالاب میں جا کر ڈوب مروں گی۔ ان انگاروں پر مجھ سے نہ لوٹا جائے گا۔

''خدا کے لیے میری بات تو سنو، پھر جو جی چاہے کرنا، کلب ایک مکان ہوتا ہے جس میں دوست آشنا جمع ہوتے ہیں۔''

ہائے خدا موت بھی نہیں آتی؟ میرے ہی جہیز کے پلنگ پر لیٹے لیٹے آشنا گوڑی کی تعریفیں ہو رہی ہیں اور میں سننے کو زندہ بیٹھی ہوں۔

''میری تو عقل خبط ہوئی جاتی ہے۔ آشنا بہ معنی دوست ملاقاتی۔ میں خدا اور رسول کو درمیان دے کر کہتا ہوں کہ مجھ کو رنڈی منڈی سے کوئی سروکار نہیں۔ صرف تمھاری بدگمانی ہے اور کلب تو ایک مہذب مقام ہے وہاں اس طرح کے لوگ گھسنے بھی نہ پاتے، جس سے چاہے پوچھ لو۔''

تو تم اتنی دیر سے مجھے ستایا کیے اور میرے رونے پر بھی تم کو رحم نہ آیا؟ اچھا تو بتاؤ کہ اگر وہاں کوئی بات اس طرح کی نہیں تو جاتے ہی کیوں ہو؟

''صرف دو گھڑی باتیں کرنے میں جی بہلتا ہے۔''

ہاں تو وہاں جی بہلتا ہے اور گھر کاٹے کھاتا ہے، میں تو جانتی ہوں کہ جس کا جی اپنے بیوی بچوں میں نہ بہلا، اس کا جی کہیں اور نہ بہلے گا۔ یہ تم نے اچھی قدر کی ہماری۔ لیجیے صاحب ہم تو ان کے انتظار میں اس طرح بیٹھے رہیں اور آپ کو جو دل بہلانا ہو تو کہیں اور جائیں۔ میں کوئی سوئیاں چبھوتی ہوں یا چٹکیاں لیتی ہوں، جو تم الب کلب بھاگے پھرتے ہو، آخر تمھارا جی گھر میں کیوں گھبراتا ہے؟ کیا سو گئے؟ ابھی تو بول رہے تھے! یہ سو کیسے گئے؟ سنو تو سو رہنا، یہ میں کہتی ہوں کلب میں کیا دھرا ہے جو گھر میں نہیں؟

''اجی کلب میں پڑھے لکھوں کی صحبت رہتی ہے۔ لائق لوگوں کا مجمع ہوتا ہے اور کیا؟''

اچھے لائق لوگوں کا مجمع ہے کہ بجز سڑی ہوئی تمباکو اور پان پر پان کھانے کے کچھ نہیں۔ جب گھر آتے ہو تو منھ اگالدان ہو جاتا ہے اور وہ بو کہ سونگھ کے جی نفرت کرے۔ اگر یہی لیاقت ہے تو میرے سات سلام ایسی لیاقت کو۔ یہ سب بس اسی محمد حسین کا بویا ہوا ہے۔ اسی کی صحبت میں بیٹھ کر حقہ پینا سیکھا۔ پان آدھی ڈھولی[1] کے ایک ڈھولی ہو گئے اور اب کلب موئے کی ہڑک اسی نے لگائی، موئے نے اپنی بیوی کی وہ حالت کر دی۔ اب تمھارے اوپر دانت لگایا ہے۔ یہی تو وہ بیچاری رویا کرتی ہے، مگر یہ نہ سمجھنا کہ میں بھی اسی کی طرح رو رو کر چپ ہو رہوں گی۔ میں تم کو رلا کر چھوڑوں گی جس دن ایسی باتیں تم نے

---

[1] دو سو پان اکٹھا بندھے ہوتے ہیں، اس کو ڈھولی کہتے ہیں۔

شروع کیں بس دیکھ لینا تماشہ۔ زمین آسمان کے قلابے ملا دوں گی۔ ان خراٹوں سے میں چپ تھوڑی ہو رہوں گی۔ ایسے بہت دیکھے ہیں بن کے سونے والے۔ ان سب جھنجھوں سے تو بہتر تھا کہ بگاڑ ہی ہو جاتا۔ اے مجھ کو کل تو پڑ جاتا؟ اپنے بچے لو، اپنا گھر لو، جو جی چاہے کرو، جس طرح دل چاہے رہو اور رہو گے کاہے میں؟ گھر ہی موئے کی اینٹیں نہ بک جائیں، تب ہی کہنا۔ بھلا کسی کم بخت کی بی بی لڑاکا ہو، بدمزاج ہو، یونہی بیکار سر کھایا کرتی ہو تو البتہ ایک بات ہے کہ صاحب کیا کریں جو کلب گھر نہ دوڑے جائیں۔ میں اپنے منہ سے اپنی تعریف کیا کروں؟ لے تمھیں خدا اور رسول کو درمیان دے کر کہہ دو کہ میں نے تمھارے ساتھ کوئی برائی کی ہے؟ کبھی تمھاری مرضی کے خلاف کوئی کام کیا ہے؟ اور یوں تو بدنام کرنے کو جو چاہے کہو۔

''بھئی میں تو منہ سے بولا بھی نہیں، بدنام کرنا کیسا؟''

بدنام کرنا تو ہے ای ہے، بدنام کرنا اور کیسا ہوتا ہے؟ جب تم اس طرح سے کلب گھروں میں مارے مارے پھرو گے تو آپ ہی دنیا کہے گی کہ جو گھر بیٹھنے کے قابل ہوتے تو یوں اِدھر اُدھر کیوں مارے مارے پھرتے؟ ضرور کچھ ٹی ہے۔

''نہیں پیاری، تم تو ناحق کو وسواس کرتی ہو، میں کچھ کہتا ہوں؟''

ہائے یہی تو اور غضب ہے کہ کچھ کہتے بھی نہیں، میں یہی تو روتی ہوں اور تم جواب تک نہیں دیتے، نہ معلوم کون ہذیان بک رہا ہے؟ آپ ہی منہ تھکا کے چپ ہو رہے گی؟ خیر صاحب جو سمجھو۔ یہ دیکھونا۔ وہ تو میں جانتی ہوں، ان ٹھنڈی سانسوں کا مطلب، پھر اللہ مجھ کو اٹھالے تو اس سے چھٹی ملے۔ جیتے جی تو نہیں مفر ہے۔ ان جھوٹ موٹ کے خراٹوں سے کیا حاصل؟ میری بات سن لو، پھر سونا، میں دن رات یہی سوچا کرتی ہوں کہ تھوڑے ہی دن کی صحبت میں تم کو ہو کیا گیا ہے؟ یہ ہر وقت کا کلب، ہر وقت کا ہنسی ٹھٹھا، ہر وقت کا ٹھٹھول، پانچ لڑکوں کے باپ ہو گئے اور جب اس کے دن تھے تب تو کچھ نہ ہوا۔ اب یہ باسی کڑھی میں ابال، یار دوست جمع ہیں، دنیا بھر کے قصے چھڑے ہوئے ہیں۔ یا اللہ کب ختم ہوں گے؟ اچھا رہ جاؤ، کل ہی تو منجھلے بھائی سے کہتی ہوں، نہ بڑے

صاحب سے کہہ کر رکوا دوں تو سہی۔ منجھلے بھائی تھانہ دار تو ہئی ہیں، اپنے صاحب سے کہہ دیں گے کہ صاحب یہاں جوا ہوتا ہے، جتنے موئے جمع ہوتے ہیں نہ سب کی مشکیں کسی ہوں تب ہی کہنا۔

''کیا واہیات خرافات بکتی ہو؟''

اے تم خرافات، تم آپ واہیات خرافات بکتے ہو گے، لو صاحب ہم ہی خرافات بکتے ہیں اور زبان تو دیکھو۔ اپنی سیاہنا بی بی کو خرافات خرافات ابھی جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے جو بدزبانی بری صحبت مین بیٹھ کر نہ سیکھو کم ہے۔ ذرا سی انگلی میں درد ہو تو وہی خرافات سر پکڑ کر بیٹھے گی تب یار دوست ایک نہ دکھائی دیں گے اور پھر وہی خرافات یہ تو خیال نہیں کہ گھر بار رکھاتے ہیں۔ بی بی ہے، بچے ہیں، جو کچھ ہو گھر ہی کے کام میں آوے مگر نہیں غیر لے جائے اپنے انگ نہ لگے اور کچھ نہیں، تو کلب ہی سہی، خرچ ضرور ہو۔

''کلب میں تو کچھ ایسا خرچ نہیں۔''

کلب میں کچھ خرچ ہی نہیں؟ ایسی نادان مجھ کو جان لیا ہے۔ یہ روز کلب جاتے وقت صندوقچہ کیوں کھلتا ہے؟ میری نظر بچا کر پاکٹ میں کیا رکھا جاتا ہے؟ جیسے میں جانتی ہی نہیں۔ کوئی سودے والا، خوانچے والا ادھر سے نکلا نہیں اور تم نے آواز دی نہیں، یار دوست بیٹھے ہیں، چہ میگوئیاں ہوتی ہیں، ہنس ہنس کھائیں پھوہڑ کا مال اور جتنے کھاتے ہیں سب تم پر ہنستے ہوں گے کہ خوب پھنسا ہے اور پھر یہ تو سوچا ہوتا کہ بیوی نگوڑی ایک ایک پیسے کو ترستی ہے۔ ایک پیچک[1] کے لیے پیسہ نہیں جڑتا ہے۔ تلے دانی[2] میں ایک ٹوٹی سوئی تک نہیں نکلتی۔ موئی قینچی کے دونوں پھلڑے آج کب سے الگ پڑے ہیں، پیسہ نہیں جو کیل ڈلوالوں۔ مگر تم کو اس سے کیا مطلب؟ بچوں کی حالت دیکھنے کے قابل نہیں۔ کوئی آگ لینے بھی ادھر نکل آتا ہے تو میری آنکھ نیچی ہو جاتی ہے کہ کیا میری اوقات کو تھوکتا ہوگا؟ کیسی پھوہڑ ہے کہ سب بچے ایسے برے حالوں رہتے ہیں مگر تمھاری بلا ان باتوں کو سوچے۔ تم کو کلب ہو، چاہے بچے ننگے گھومیں، چاہے چیتھڑے لگائے رہیں تم کو میاں اللہ

1. تاگے کی پھولی پھولی گولی سی
2. چھوٹی سی تھیلی جس میں سوئی تاگا رکھتے ہیں۔

بخش کے ایسے یار دوست ملیں، بی بی بچے اپنا سر کھائیں، مگر اتنا میں کہے دیتی ہوں کہ میری چوکھٹ اللہ بخش صاحب نہ نانگھیں، باہر جتنا جی چاہے کھُل کھیلو، گھر میں یار دوستوں کا مجمع اگر ہوا اور اللہ بخش موا خدائی خوار یہاں بھی آیا تو دیکھ لینا، کیا قیامت مچاتی ہوں؟ میاں کو جوتی ہی سنبھالتے بنے گی، پھر چاہے کچھ ہو، اور ہوگا کیا؟ کوئی میرا کر ہی کیا لے گا؟ میاں بہت خفا ہوں گے ایک روٹی اورزیادہ کھالیں گے اور نام تو دیکھو کیسا رکھا ہے؟ انجمن...... بولتے نہیں، جیسے آدمی کا نام، میں سونے تھوڑی دوں گی تم کو۔ کون انجمن نام ہے۔

''انجمن فرح بخش۔''

ہاں ہاں انجمن فرح بخش، موئے اللہ بخش ہی کے جوڑ کا نام بھی ہے جیسا کلب ویسے ہی بیٹھنے والے، جیسی روح ویسے فرشتے۔

''اچھا بھئی ہوگا، اب سونے دوگی کہ نہیں؟''

اب سونے سے کیا ہوتا ہے؟ تھوڑی دیر میں صبح کی اذان ہوگی۔ سونا کیا ملے گا؟ بارہ بجے کے قریب گھوم کے آئے، کھانا بڑھاتے، بچھونا بچھاتے، ایک بج گیا۔ آج کل رات ہی کتنی ہوتی ہے؟ سو رہو، میں کچھ کہتی ہوں؟ میری قسمت میں رونا لکھا ہے، رویا کروں گی۔

اس کے بعد شوہر صاحب کا بیان ہے کہ میرے اوپر غفلت طاری ہوگئی اور پھر مجھ کو خبر نہیں۔

O

چوتھا باب

"آج شام کو صرف صبح کا رکھا ہوا گوشت اور چپاتیاں دسترخوان پر آئیں. شوہر صاحب سے بغیر مٹھائی کے کھانا نہیں کھایا گیا جس کو شکایةً انھوں نے اپنی زوجہ سے بیان کیا جوابات قلمبند ہوتے ہیں."

دال ارہر کی بے نمک پھیکی مطلقاً جس میں بو نہیں گھی کی

یہ آج مہینوں سے میں دیکھ رہی ہوں کہ تم بات بات پر ناک بھوں چڑھاتے ہو اور ہر چیز میں عیب نکالتے ہو، اگر تمھارے کھانے کا انتظام مجھ سے نہیں بنتا تو باورچی نوکر رکھ لو، تب تو کھانا مزے کا ملے گا؟ عمر بھر تو کھانے کی کوئی شکایت نہیں سنی۔ اب آئے دن روز کے اعتراض، روز کی تیوری، بھلا مجھ سے کاہے کو اٹھائی جائے گی؟ نا بابا آج تک جس نے ایک مرتبہ میرے ہاتھ کی پکی چیز کھائی، انگلیاں چاٹا کیا اور کبھی تم کو بھی تو میرے ہاتھ کی دھوئی ماش کی دال اور کباب بہت اچھے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اب نہ معلوم کیا ہوگیا ہے کہ جو کام میں کرتی ہوں تم کو برا ہی معلوم ہوتا ہے۔ مزے سے مزے کی چیز جان کھپا کے پکاؤ، نمک کم ہے، مرچ زیادہ ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ مجھی سے جی ہٹ گیا ہے پھر خدا ہی مجھے اس گھر سے اڑائے تو تم کو چین ملے۔

''اچھا بھئی ہوگا، قصہ مختصر کرو، دسترخوان پر ایک بات اتفاقاً میرے منہ سے نکل گئی، اب اس کا خیال ہی کیا؟ لو چپ ہو جاؤ۔''

تو زبان تو بادشاہ بھی نہیں روک سکتا۔ تم کیسے قفل چڑھاؤ گے؟ لو صاحب یہ تو سب کچھ کہہ جائیں اور دوسرا منہ سی لے۔ ایسا حلق کا داروغہ تو میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ جو بات نہ کرنے دے، تو بی بی کاہے کو ٹھہری، لونڈی ہوئی؟ لونڈی زرخرید بھی موئی زبان رکھتی ہے۔ یہ روز کا غصہ یہ روز کی عیب چین کس سے سہی جائے گی؟ بغیر مٹھاس کے حلق

سے لقمہ نہیں اترتا اور یہ زبان کا مزہ تو وہ ہے کہ بڑے بڑے اس میں بگڑ گئے۔ تمھاری اوقات ہی کیا ہے؟ اور اس نوکری کی کیا ہستی؟ ہونھ کھیر پکاؤ تو یہ کھائیں گے۔ نہیں تو نہیں۔ یہ روز پلاؤ تنجن کہاں سے آوے گا؟ سات آدمی گھر کے، ایک ماما اندر، ایک لڑکا باہر، نو آدمیوں کی روٹی، پھر اسی میں فاتحہ درود، آئند روند، فقیر فقرا اور اوپر سے کپڑے کی ضرورتیں، بچت کہاں سے کروں؟ کون جتن کروں، جو میاں کھیر کھائیں، آخر ہمارے ہی پڑوسی اور بھی ہیں جو کچھ ملا موٹا جھوٹا کھا لیا۔ خدا کا شکر بھیجا، بچوں کو بھی اسی چٹورے پن کی عادت پڑے گی اچھا سبق پڑھایا جاتا ہے ان کو۔ تین تین لڑکیاں آگے، اللہ رکھے بیاہ ہوگا، شادی ہوگی، خانہ داری موٹا بھی جھوٹا بھی۔ لے آپ تو یہ عادت کہ جب تک تر لقمہ دسترخوان پر سامنے نہ ہو ہاتھ نہ دھوئیں تو پھر بھلا لڑکیوں کا ساس نندوں کے بیچ میں کیسے نباہ ہوگا؟

''خدا کے لیے سونے دوگی کہ نہیں، میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ خالی گوشت تھا اگر کچھ اور بھی پکا لیتیں تو اچھا ہوتا۔''

اور کیا پکا لیتی اپنا بھیجا؟

''وہ تو میرا پکا کرتا ہے۔''

یہ دیکھیے اب ضلع جگت ہونے لگی۔ مجھ سے دل لگی نہ کرنا، نہیں تو ابھی پٹی پر سر دے ماروں گی۔ یہ دیکھیے صاحب اول تو بات کا جواب نہیں دیتے اور پھر دیا بھی تو یہ جلے کٹے بول، یہ تو نہیں خیال کرتے کہ سیکڑوں خدا کے بندے پڑے ہیں جن کو باسی گوشت بھی میسر نہیں آتا۔ آپ ہیں کہ ناشکری کرتے ہیں۔ گوشت دونوں وقت، دوسرے تیسرے قیمہ، یہ وہ بیس چیزیں۔

''وہی قیمہ آج پکا لیا ہوتا تو اس پنپا ڈھب ڈھب شوربے سے تو اچھا ہوتا۔''

اے خدا کی شان، آپ کو حال ہی بہت معلوم ہے پکانے کا اور جو ہڈی نکل جاتی تو بچوں کو کیسے سمجھاتی؟ اس کے علاوہ جہاں گوشت سل پر گیا طاقت نکل گئی، عیب نکال دینا تو بہت آسان ہے، جب کرنا پڑے تو معلوم ہو۔

''معلوم کیا ہو؟ میں کہتا ہوں اچار، مربہ نہ سہی ایک ذرا سی چٹنی میں کیا خرچ ہوتا ہے اگر پیس کے دسترخوان پر رکھ دو۔''

چٹنی میں تمھارے حسابوں کچھ لگتا ہی نہیں۔ یہ پودینہ تمھارے کس باغیچے میں بویا ہے؟ اور ادرک کس جگہ لگی ہے؟ جو میں توڑ کے چٹنی بنالوں اور یہ تو دیکھیے مربہ اچار نہ سہی، جیسے میرے اوپر کوئی احسان کیا ہے، ابھی کیا ہے، آگے بڑھ کے باقر خانی، مزعفر سے نیچے اتر کر بات ہی نہ کریں گے۔ کتنا کہا کہ فصل میں آم سگوا دو، شکر گھر میں ہے، مربہ بنالوں، تب تو سنا نہیں، اب مربہ مربہ پکارتے ہیں۔

''آم تو ہم نے لا دیے تھے تم نے کھٹائی بنالی، اس میں میرا کیا قصور؟''

اور اب جو میں نے کھٹائی بنالی تو کونسا گناہ کیا؟ آخر وہ بھی تو ضروری چیز تھی کہ نہیں؟

''اچھا بھئی تھی ضروری چیز، اب سونا ملے گا کہ کہیں اور جاکے پڑ رہوں؟''

پڑ کیوں نہیں رہتے؟ مجھے ایسی بڑی غرض ہی ہے آپ کی۔ زبان جب تک اللہ نہ بند کرے گا آدمی کے بند کیے تو نہیں بند ہوتی، دیکھیں تو کون زبان بند کرتا ہے؟

گو کہ ارادہ مصمم تھا کہ موعظۂ مونیشہ کو اور طول دیا جائے۔ مگر نیند کا غلبہ ایسا ہوا کہ آخر آنکھ لگ ہی گئی۔

O

پانچواں باب

میاں فرامشن ہوکر آئے ہیں۔ بی بی صاحبہ کے سوالات۔ مادہ پوچھنے لگی کہ او نر

میں تجربہ کر چکی جہاں کا　　کھلتا نہیں کچھ طلسم یاں کا

دنیا بھر میں جتنی برائیاں ہیں ایک نہ چھوٹے، جتنی باتیں میرے خلاف ہیں، سب ہوں۔ بَن بَن کے سونے کی کوئی ضرورت نہیں، جب تم میری باتوں سے گھبراتے ہی ہو، تو میں بولوں کاہے کو؟ مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ اب ہمارے تمھارے نبھے گی نہیں۔ میں جو کہتی ہوں تمھارے ہی بھلے کے لیے اور وہ تمھیں ناگوار ہوتا ہے تو پھر کیسے نباہ ہوگا؟ جب میاں نے بی بی سے اور بی بی نے میاں سے اپنے دل کی بات چھپائی تو لطف ہی کیا رہا؟ میاں بی بی کے درمیان تو کوئی راز ہونا ہی نہ چاہیے جو راز ہی ہوا تو میاں بی بی کاہے کے؟ میں یہ کہتی ہوں وہاں کون ایسی بات ہوتی ہے جو میں نہیں سن سکتی؟ میں تو سوچتی تھی کہ اگر تم کسی کا گلا کاٹ کے آؤگے تو بھی مجھ سے نہ چھپاؤگے یہ موئی ذرا سی کون بات ہے؟ یا بھئی کوئی ایسی بات ہو جو بی بی ہی سے چھپانے کے قابل ہو اور یہ تو ہے ہی۔ لے اب سمجھ میں آگیا، اسی مارے تو عورتوں کو فرامشن نہیں کرتے، ضرور کوئی بات عورت ہی کی برائی کی ہے۔ نہیں تو عورت کو کیوں نہ کرتے؟ اونھ ہوگا جو نہیں بتاتے تو نہ بتادیں، میری بڑی غرض ہی اٹکی ہوئی ہے............ (وقفہ تین منٹ) مگر میں کہتی ہوں کہ اگر عورت بھی اسی طرح مرد سے اپنے دل کی بات چھپاوے تو خوب دنیا کا کام چلے۔ اچھا اب بات نہ بڑھاؤ، بتادو، تو پھر وہاں گئے تو کیا ہوا؟

"ہوا کیا کچھ نہیں۔"

اے وا! کچھ نہیں کی ایک ہوئی، تمھیں ہمارے سر کی قسم، ہمارا ہی لہو پیو، جو نہ بتاؤ،

بس اتنا بتا دو کہ وہاں کیا کرتے ہیں اور کچھ نہیں۔ بولو، اے بولتے کیوں نہیں؟ یہ اچھا وطیرہ سیکھ کے آئے ہیں کہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں اور منہ سے بولتے نہیں، اچھا کچھ تو بتا دو۔"

"کیا بتا دوں؟"

اے وہی فرامشن اور کیا؟ اتنا تو سوچو کہ اگر میری کوئی بات ہوتی، تو میں تم سے چھپاتی؟ تم ہی کہو، پھر تم مجھ سے کیوں نہیں کہتے؟ اگر میں ایسا جانتی تو آفت کر دیتی۔ اور تم کو جانے ہی کیوں دیتی؟ ضرور کوئی چوری یا عیب کی بات ہے۔ نہیں تو یہ گہرا پردہ کیوں ہے؟ کوئی عورت ہی کے نقصان کی بات وہاں بتائی جاتی ہے کہ اس طرح سے ستاؤ، اس طرح پریشان کرو، تب ہی تو میرے سامنے بیان کرتے شرماتے ہو۔ (وقفہ) کہیں بند کر کے مارتے تو نہیں۔ اے ضرور یہی بات ہے، کہو قسم کھالوں کہ آج تم مارے گئے ہو۔ جب ہی چپ چاپ لیٹے ہو اور وہ روز کی بحالی بھی تو آج چہرے پر نہیں ہے۔ یہ تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ لو کھل گیا نہ؟ یا الٰہی ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں کہ اپنا ہی پیسہ خرچ کرتے ہیں اور مار اوپر سے کھاتے ہیں۔ اے لو کراہتے بھی تو ہیں؟

"کراہا کون؟"

لو، کراہے نہیں تو تم ہنستے ہو گے۔ میں بسرن تو ہو ہی گئی ہوں، کہ اب میری باتوں پر قہقہے لگائے جاتے ہیں۔ خیر میں صبر کرتی ہوں، اس کا بدلہ تم سے وہی لے گا۔ جیسا تم مجھ کو جلا کے مارتے ہو۔

"میں نہ مارتا ہوں نہ جلاتا ہوں، تم ناحق کے سوالوں کی بھرمار کر رہی ہو، جانتی ہو کہ فریمزی کا راز آج تک نہیں کھلا، پھر میں کیسے بتا سکتا ہوں؟"

کھلا کیسے نہ ہوگا؟ سب نے اپنی اپنی بیبیوں سے کہہ دیا ہوگا اور تم بھی اگر مجھ کو ویسے ہی چاہتے ہوتے تو کہہ دیتے۔

"کوئی کہہ سکتا ہی نہیں، کہہ کیسے دیا ہوگا؟"

کہہ کیسے نہیں سکتا؟ کیا کوئی زبان پکڑے بیٹھا ہے یا بول بند ہو گیا ہے؟ یہ کہو کہ نہ

کہنے کا جی، ورنہ کہنے میں کیا ہے؟ اور میں تو یونہی پوچھتی تھی نہیں تو جس سے جی چاہے پوچھ لوں اس میں ہووے گا کیا؟ کچھ ایسی ہی ویسی باتیں ہوں گی، بور کے لڈو ہوں گے، بات ہے نہ بتاؤ، رنج تو ہوگا کہ بیکار اتنا روپیہ صرف ہوگیا اور یہ خط میں بھائی کیسا لکھا تھا، یہ بھائی کہاں سے پیدا ہوگئے، تمھارے؟

''وہ فریمشن جتنے ہیں سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''

تو یہ کہو چوڑا، چمار جو فرامشن ہوا وہ بھائی ہوگیا۔ اچھی بھائی بندی ہے۔ ان بھائیوں میں نسبتیں بھی ہوتی ہوں گی؟ اتنا میں کہے دیتی ہوں کہ اگر تم نے میرے بچوں کی نسبت اپنے فرامشن بھائیوں میں کہیں کی تو کچھ کھا کے سو رہوں گی۔ لڑکے کچھ تمھارے اکیلے کے تھوڑی ہی ہیں۔

''پیاری اب سو رہو نہیں تو............''

تم پیاری ویاری مجھ کو نہ کہا کرو، میں تمھاری پیاری دیاری نہیں ہوں، جہاں گھر میں مامائیں نوکر ہیں، میں بھی پڑی ہوں، کس گنتی شمار میں ہوں؟

''تم گنتی شمار میں نہیں ہو تو کون ہے؟''

میں گنتی شمار میں ہوتی تو مجھ سے بات نہ کہی جاتی؟ یوں راز چھپایا جاتا۔ ایک تو ایسے ہی آفت تھی۔ اب تو اور نئے نئے طریقے میرے ستانے کے سیکھ آئے ہوں گے۔ آپ ہی معلوم ہوجائے گا جو بات میرے دل دکھانے کی نئی کریں گے، سمجھ جاؤں گی کہ یہی ہے...... (وقفہ 5 منٹ) اب میں نہ پوچھوں گی، بتانا ہوگا تو آپ ہی بتا دیں گے، نہیں تو نہ سہی۔

''اچھا تو اب نہ پوچھنا۔''

پوچھے میری بلا، میں کاہے کو پوچھنے لگی؟ مجھ کو کیا غرض پوچھنے سے جو نہیں بتاتے نہ بتاؤ۔

''اچھا پیاری خفا نہ ہو، آؤ سو رہیں۔''

سو تو رہوں گی مگر ایک کہنا میرا مانو۔

''اچھا کہو۔'' .... میرے سر پر ہاتھ رکھ دو کہ مانوں گا۔

''اچھا مانوں گا'' .... اچھا تو پھر اب بتادو کہ کیا ہوا؟

''یہ تو نہیں بتا سکتا۔'' .... تو تم نے میرے سر پر ہاتھ کیوں رکھا تھا؟

کاڈل صاحب کا بیان ہے کہ یہ موعظہ موثیہ بہت طولانی تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ چار بجے رات تک جاری رہا۔ مگر بوجوہ آگے قلمبند نہیں ہوا۔

○

''..... اس مصنف کی میری نظروں میں اس لیے ہی بے اندازہ اہمیت نہیں ہے کہ ان کا مجھ سے بہت بزرگی کا رشتہ ہے بلکہ ان کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ میں سمجھتی ہوں کہ بحیثیت اسٹائلسٹ چودھری محمد علی اردو کے ایسے منفرد ادیب ہیں کہ کوشش کر کے بھی ان کی زبان اور اظہار بیان کا تتبع نہیں کیا جاسکتا۔ محمد علی ادب میں اپنے ساتھ یہ اسٹائل لائے اور یہ محض انہی کا حصہ ہے.....''

(قرۃ العین حیدر۔ سوغات 9 بنگلور)

چھٹا باب

شوہر صاحب کو گیارہ بجے رات کو ایک دوست کی ضمانت کرنے کو جانا پڑا ہے۔ واپسی بہت دیر کو ہوئی، اس فعل ناپسندیدہ پر رائے زنی۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

یہ تو میں جانتی ہی تھی۔ ان لوگوں سے دوستی کرکے اور کیا ہوتا؟ یہ تو میں نے اسی وقت کہہ دیا تھا جب تم نے فرح بخش کلب گھر کھڑا کیا تھا۔ لے بھلا سوچو تو تین پہر بجے ضمانت کرنے جانا پڑا اور ان شہدوں سے مل کر کیا ہوگا؟ یہی دن رات کی جھوٹی گواہی، جھوٹا قرآن، ضمانت، مچلکہ اور اس کے سوا ہونا ہی کیا ہے؟ اور ضمانت کرنا تو کوئی بات نہیں، جب وہ موا بھاگ جائے گا اور تم کو ضمانت کا روپیہ دینا پڑے گا تو معلوم ہوگا ابھی تو کچھ نہیں۔ جب موا محمد حسین تم کو کسی کام کا نہ رکھے گا۔ تب تمھاری آنکھ کھلے گی، ابھی تو اس کے برابر کوئی نہیں۔ بی بی بچے اس کے اوپر سے صدقے اتارے جاتے ہیں۔ اچھی بات ہے، اسی طرح تلنگا دو بجے رات کو کنڈی کھڑکایا کرے، تو ٹھیک ہے۔ آپ ہی پڑوسی سوچیں گے کہ کیا ہے جو یہ رات کو دیکھنے آیا کرتا ہے کہ گھر میں ہیں یا نہیں اور ناک کو دیکھو جاڑے سے کیسی ہوگئی ہے؟ جیسے کسی نے پڑیا مل دی ہے۔ یہی سزا تمھاری، اب صبح زکام نہ ہو تو میں ناک ہارتی ہوں، بخار بھی چڑھے گا کیا کیا نہ ہوگا؟ میں ابھی سے کہے دیتی ہوں یخنی اور مونگ کا چونگا مجھ سے نہ کہنا، میرے کیے نہ ہوسکے گا۔ جس کی ضمانت کی ہے اسی کی امان میں تم کو سونپتی ہوں، بیماری حیرانی میں اب مجھ سے امید نہ رکھنا، حاکم نے بھی سوچا ہوگا کہ ضمانت کرنے والا بھی اسی گروہ کا ہوگا، نہیں تو بدمعاش کی ضمانت کرنے کیوں آتا؟

''پھر میں کیا کرتا؟ ایک دوست عزیز اپنا پھنستا تھا، میں نے کہا لاؤ میں ہی ضمانت کرلوں۔

کیسا دوست؟ وہی دوست جو بری راہ لگا دے اور یہ عزیزداری کب سے ہوگئی؟ یہ خون کب سے مل گیا؟ عزیزوں کے معاملہ میں تو خون سفید ہوگیا اور یہ محمد حسین موئے ایسوں سے کیسے خون مل گیا؟

''محمد حسین کا بھلا کیا ذکر ہے؟ ان سے کیا مطلب؟ میں نے تم سے کب کہا کہ محمد حسین کا معاملہ تھا؟''

تم نے نہیں کہا، میں تو جانتی ہوں؟ اور کون ایسا چور اچکا گرہ کٹ سوائے اس مونڈی کاٹے کے ہے؟ اب بہلانے سے کیا فائدہ؟ بتا دو، ہے نہ وہی؟

''نہیں وہ نہیں ہے محمد حسین نہیں ہے۔''

میں تو کہتی ہوں سب جھوٹ، تم نہ معلوم کہاں رہتے ہو، اور نہ معلوم کس کام کے لیے گئے ہو، اور اب مجھ سے باتیں بناتے ہو، بولو؟

''کیا بولوں، تم تو ناطقہ بند کیے ہو، پوری بات نہیں کہنے دیتیں اور شکایتوں کی بوچھار کردیتی ہو، محمد شفیع کی نوکری کی ضمانت کرنے گیا تھا۔''

کون محمد شفیع؟ منجھلے بھائی؟ لے بھلا مجھ کو کیا معلوم تھا؟

شوہر فرماتے ہیں کہ ہزار ہزار شکر اس کے بعد لڑکوں کی ماں نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور میں سلام ھی حتیٰ مطلع الفجر پڑھتا ہوا سو گیا۔

O

ساتواں باب

"ایک دوست کے آجانے کی وجہ سے شوہر صاحب کو میزبانی میں دیر ہو گئی، اور دوست صاحب قریب ایک بجے کے واپس گئے."

لطف قلیاں دھواں دھار و پان و لب سرخ
تا دم صبح ترا کار بہ شب دوش ایں بود

ابھی کا ہے کو آئے؟ کون ضرورت تھی آنے کی؟ مرغے کی آواز سن لیتے تو اٹھتے، یہ تم سویرے کیوں چلے آئے؟

''بھئی کیا کریں، وہ مرد آدمی اٹھے ہی نہ اور تم نے اور ہی غضب کیا کہ کوئلے قفل میں بند کر دیے۔ بغیر انگیٹھی کے سارا بدن ٹھٹھر کے رہ گیا۔''

تو یہ کہو ابھی بیٹھنے کا ارادہ سلامتی سے تھا وہ تو کہو انگیٹھی نہ تھی نہیں تو دراصل صبح ہی کر کے اٹھتے۔ تب کی مرتبہ بھی تو یہی ہوا تھا۔ اسی مارے تو میں نے آج یہ ترکیب کی تھی اور ایمان کی بات یہ ہے کہ آنے والے بے چارے کا کیا قصور، وہ پرائے گھر کا حال کیا جانے؟ عقل تو گھر والے کو ہونی چاہیے کہ جو ادھر بھول پڑا، صاحب کھانا کھاتے جائیے۔ یہ تو سوچتے کہ بی بی بچوں والا گھر ہے، لاؤ ذرا پوچھ تو لیں کہ کھانا ہے بھی یا نہیں، مگر نہیں وہیں سے بیٹھے بیٹھے حکم لگ رہا ہے کہ تین کھانے لاؤ، چار کھانے لاؤ۔

''پھر میں کیا کرتا؟ جو دروازے پر آجائے کیسے کہہ دوں کہ چلے جاؤ؟

یہ کاہے کو کہو؟ کھانے کا ذکر ہی کیوں کیا؟ تھوڑی دیر میں چلا ہی جاتا۔

''لاحول و لاقوة الا باللہ۔ یہ تو مجھ سے کبھی نہ ہو سکے گا۔''

یہ نہ ہو سکے گا تو یہ بھی جان لو کہ اتنے خرچ میں یہ روز کی دعوتیں مجھ سے بھی نہ

ہوسکیں گی۔ یہ زبردستی تو دیکھو کہ دیں گے تو اتنا ہی، چاہے جتنے آدمی آویں، دیکھو ابھی کروٹ نہ بدلو، میری پوری بات سن لو، آدمی جو کام کرتا ہے نتیجہ سوچ لیتا ہے۔ ان روز کی ضیافتوں میں گھر رہا کہ گیا؟ اور پھر یہ تو سوچو کہ جتنے کھانے والے جمع ہوتے ہیں ایک بھی تو ایسا نہیں کہ تم کو ایک وقت بھی کھلا دے۔ ایسے کھلانے سے فائدہ کہ جو نہ دین کا نہ دنیا کا؟ میں تو تمھارے دوست ملاقاتیوں کو خوب جانتی ہوں، اپنا رکھ پرایا چکھ کے سوا کچھ نہیں۔ ادھر کھانے کا وقت آیا، ادھر جمع ہونے لگے۔ سلام کیا ایسے یار دوستوں کو۔ اب میں کھانے کا وقت ہی بدل دوں گی۔ اذان ہولے گی تب آگ جلاؤں گی، آپ ہی کھانا دس بجے رات کو تیار ہوگا۔ تب تو ان موؤں سے نجات ملے گی۔

''تم تو دنیا بھر کی برائی ہی کیا کرتی ہو۔ اگر کسی نے ایک وقت ہمارے یہاں کھانا کھالیا تو کیا برا کیا؟ دوستی ملاقات میں یہ ہوتا ہی ہے۔''

''اچھا ہوتا ہی ہے۔'' تم نے تو یہ کہہ کر چھٹی پالی۔ اس کے دل سے پوچھو جس کو خانہ داری کرنی پڑتی ہے۔ لے آج ہی دیکھو، جمعرات تھی میں نے کہا لاؤ مرغ پکوالوں۔ ابھی ہانڈی اتری بھی نہیں کہ حکم نادری آگیا، دو کھانے بھیجو۔ لیجیے صاحب جس راہ آیا اسی راہ گیا۔ بچے منھ دیکھ کر رہ گئے۔ مجھ سے قسم لے لو جو مجھ نگوڑی نے شوربہ تک آنکھ سے دیکھا ہو، لے میں دوسرے وقت بھی اسی میں کرتی اور تمھارے واسطے آدھا سینہ صبح کو بھی رکھ چھوڑتی مگر جب تمھارے مارے چلنے بھی پاوے؟ اور یہ تو یہی ہے تم تو رکھی رکھائی چیز بھی منگوا بھیجتے ہو۔ یہ میں کہتی ہوں کہ اگر کہیں سے دو پیڑے آگئے تو اس میں تمھارا کیا اجارہ ہے، جو وہ بھی منگوا بھیجتے ہو۔

''اور تم بھیج بھی دیتی ہو؟''

کاہے کو بھیج دیتی؟ کون تھا جس کے لیے بھیج دیتی بچوں کے لیے نہ رکھتی۔ ان کے دوستوں کو بھیج دیتی، میں نے جن کو پیٹ سے پیدا کیا ہے ان کے لیے رکھ چھوڑتی ہوں۔ تم نے جن کو پیدا کیا ہے ان کے لیے بازار سے کیوں نہیں منگاتے؟ اور میرے نہ بھیجنے سے کیا ہوا؟ آج ہی جب میں نے پیڑے نہیں بھیجے تو کھویا بازار سے آیا۔

''بھئی اب برائے خدا پڑ رہنے دو، تم نے تو ناک میں دم کردیا ہے۔''

تو تم سو کیوں نہیں رہتے؟ منع کون کرتا ہے۔ میری تقدیر میں جاگنا بدا ہے جاگوں گی۔ اتنی دیر تو جگا رکھا اور جب نیند اچٹ گئی تو آپ اپنے کروٹ لے کر خراٹے لینے لگے۔

''تم کو کس بھکوے نے کہا تھا کہ تم جاگو؟ تم سو کیوں نہ رہیں؟''

میں سو رہتی تو بَن پڑتی تمھاری۔ نعمت خانہ سے لڑکوں کی باسی[1] الماری سے اچار، مٹھائی سب ہی کچھ نکال کے موئے مہمان کے سامنے لگا دیا جاتا۔ میں ایسی ننھی نادان تھی کہ سو رہتی۔ تمھارے اوپر سب کچھ چھوڑ کے؟ اور ذرا مہمان صاحب کا پیٹ تو دیکھنا، جلندھر[2] ہوگا موئے کو۔ پورا مرغا چٹ کر گیا اور ڈکار نہ لی۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟ میں کہتی ہوں مرغا ہڑپ کر کے ڈکار تک نہ لی؟ اے بولتے کیوں نہیں؟

بولوں کیا؟ تم نے تو جان عذاب میں کر دی ہے۔ اللہ مجھ کو موت دے یا تم مرو تو یہ قصہ تمام ہو۔''

یہ تو جانتے ہی ہو کہ مانگنے سے نہیں آتی۔ آتی ہوتی اور مانگتے تو جانتی، اور میری موت کو کیا؟ میں تمھارے ہاتھوں یونہی زندہ درگور ہوں۔ مجھے تو تم نے ایسا کر دیا ہے کہ خدا دشمن کو بھی نہ کرے اور یہ تو کہو، یہ شکر کیوں مانگ بھیجی تھی؟ اتنے وقت شکر کا کیا کام تھا؟

''چائے کے لیے مانگی تھی اور کاہے کے لیے؟ اب سوؤ گی بھی؟''

یہ گیارہ بجے رات کو چائے کا کون موقع تھا؟ اور میں بسکٹ نیچے بھول کے چلی آئی تھی وہ تو نہیں کھلا دیے؟ لیجیے چھٹی ہوئی، وہ بھی گئے۔ وہ تو ضد ہے مجھ سے جس بات کو جانیں گے کہ میرے خلاف ہوگی ادبدا کے وہی کریں گے۔ آج ہی میں نے بسکٹ لیے تھے، اب آٹھ روز بسکٹ کھانا تو معلوم ہوگا۔ اور یہ بچے بھی خالی چائے پی کے مدرسے جائیں گے۔ اس کا عذاب بھی تمھاری گردن پر یا اس موئے پر جس کو تم نے زہر مار کرایا۔ خدا کرے سنکھیا ہی ہو کر لگے، پھر کھانا نصیب نہ ہو۔

---

1 رات کا کھانا صبح بچوں کے ناشتے کے لیے

2 بہت کھانے کی بیماری

اس کے بعد میاں غصے میں اٹھ کر الگ پڑ رہے اور نیند میں اکثر الفاظ مثل مرغی کا مرغا، جمال گوٹہ، دسترخوان کی مکھی سنتے رہے۔ یہاں تک کہ غافل ہوگئے اور خواب میں دیکھا کہ ایک دیونی گرم گرم چائے کی ایک بڑی سی پیالی میں مجھ کو غوطہ دے رہی ہے۔

O

''وادیٔ گنگ وجمن کے معاشرے کی بنیاد جن تضادات پر قائم تھی وہ طبقاتی تھا مذہبی نہیں۔ رؤساء اور تعلق دار کا گروہ ایک طرف تھا اور حویلی کے ملازمین کسانوں، کہاروں اور تنبولیوں کا دوسری طرف۔ راجہ پرتھی پال سنگھ اودھ کے ایک ہندو تعلقدار اور ٹھاکر درگاہی خاں ایک مسلمان تعلقدار (محمد علی کے دو نمائندہ کردار) ایک گروہ کے افراد ہیں۔ امامن مہری اور بی دھنا (محمد علی کے دو اور کردار) اور ان کے سارے دوسرے ساتھی جو دوسرے گروہ میں شامل ہیں... ان سب نے مل کر ہندوستان کی تاریخ کے اس دور کے frescoes کو بڑے دلآویز رنگوں کے ساتھ مکمل کیا ہے.....''

(قرۃ العین حیدر، سوغات۔ 9 بنگلور)

آٹھواں باب

"شوہر صاحب دوستوں کے اصرار سے ایک میلے میں چلے گئے تھے. بمصداق "نیش بعداز نوش" واپسی کے بعد جو کچھ پیش آیا پیشکش ناظرین ہے."

پھبن، اکڑ، چھب، نگاہ، سج دھج، جمال و طرزِ خرام آٹھوں
اگر نہ اس بت کے ہوں پجاری تو کیوں ہو میلہ کا نام آٹھوں

اب تو کوئی میلہ ٹھیلہ آپ سے نہیں بچتا، کیوں صاحب یہ تو سن، بال کھچڑی ہو گئے ہیں مگر میلے کی سیر نہیں چھوٹتی۔ سینگ کٹا کے بچھڑوں میں داخل ہوں گے، مونچھوں میں کاجل لگا لیا کرو جس میں خوب جوان معلوم ہو۔

''میری مونچھیں کہاں سفید ہیں جن میں کاجل لگا لیا کروں؟ البتہ سر میں دو چار بال ہیں تو وہ بھی نزلے کے باعث تیس بتیس برس کہیں بال سفید ہونے کے دن ہیں؟''

اے دن ہوں یا نہ ہوں، ہو تو گئے ہیں، بزرگوں کی دعا لگی ہوگی نہیں تو میرا صبر پڑا ہوگا، رات دن جلاتے ہو یہ بھی نہ ہوگا؟

''اچھا خیر، وہ جو کچھ سمجھو، اب انشاء اللہ تعالیٰ خضاب منگواؤں گا، لاہور میں سنا ہے کہ......''

اب وہ لاہور میں بعد کو سننا، اس وقت بات کو نہ ٹالو، اور یہ بتاؤ کہ اب تمھارے میلے ٹھیلے کے دن ہیں جو تم یہ باتیں کرتے ہو؟ بوڑھے ہو گئے دو چار برس میں ناتی پوتے والے ہو گے۔ میلے ٹھیلے کی سیر تم پر نہیں پھبتی، ابھی دیکھو بی ہمسائی مسکراتی ہوئی آئیں اور پوچھنے لگیں ''کہاں گئے تمھارے میاں؟'' مگر کیا کروں جب............

''تم نے کہہ کیوں نہ دیا کہ معلوم نہیں کہاں گئے ہیں۔''

ان کو خود ہی معلوم تھا۔ اسی لیے تو آئی تھیں اس طرح پوچھتی ہوئی۔

''بی ہمسائی کو دوسروں کی بہت پڑی رہتی ہے اور ان کے میاں بھی تو گئے تھے، میلے میں۔''

اچھا خیر، وہ گئے ہوں کہ نہ گئے ہوں تم کیوں گئے؟ وہ جو جی چاہے کریں تم کو تو سوچنا تھا کہ اب تمھاری عمر میلے تماشے کی نہیں ہے۔

''ارے بھئی بندہ بشر ہے یار دوستوں کے اصرار سے چلا گیا تھا۔ ایک بات ہوگئی۔''

تمھارے لیے تو ایک بات ہوگئی اور میں اپنا خون جگر پی پی کر رہی اور ہنڈولے پر سوار ہوئے تھے یا نہیں؟

''لاحول و لاقوۃ، نہیں جی۔''

تم نے نہیں جی کہہ دیا اور میں نے مان لیا۔ اے کہو قرآن اٹھا لوں کہ ضرور سوار ہوئے ہوگے۔ موئے ذلیل بھنگیڑیوں، بگڑی ہوئی گھر گرستوں کے بیچ میں ایک تخت پر تم بھی بیٹھے ہوئے ہوگے اور یہی تھوڑی۔ رومال ہاتھ میں لیے، دوسرے تخت کو چھوتے جاتے ہیں۔ اٹھکھیلیاں ہوتی جاتی ہیں، بدن میں آگ لگ جاتی ہے جب یہ سوچتی ہوں، اس وقت مجھ نگوڑی کا خیال بھی نہ رہا ہوگا؟''

''تم تو اپنے دِل سے باتیں کیا کرتی ہو، اول تو میں ہنڈولے پر چڑھا ہی نہیں، دوسرے یہ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ میں تم کو بھول گیا تھا؟ تم بھولنے والی چیز ہو بھلا؟''

میں بھولنے والی چیز کیوں نہیں ہوں؟ تمھارے ایسے کے ساتھ میں بھول ہی جانے والی چیز ہوں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اگر میری تقدیر کسی اچھے کے ساتھ ہوتی تو پاؤں ہی دھو دھوکر پیتا، تمھارے یہاں تو میری قدر ہی نہیں۔''

''اس میں کیا شک ہے، سچ کہتی ہو۔''

تو اب مجھ کو بتاؤ گے بھی؟ یہ دیکھیے اتنی دیر سے مجھ نگوڑی کی سمجھ ہی میں نہ آیا۔ مارے اور رونے نہ دے۔ اسی کو کہتے ہیں۔ اس کی داد وہی دے گا۔ میں کچھ نہ بولوں گی۔

''برائے خدا، اب کوسنے نہ دو اور مجھ سے قرآن اٹھوالو کہ میں ہنڈولے پر سوار ہوا

ہوں تو خدا مجھ کو دین دنیا میں غارت کرے۔ اب اور کون قسم کھاؤں لو اب تو جان چھوڑو گی؟"

یہ ناحق کا غصہ تو دیکھیے آپ ہی دل کی کرتے ہیں اور آپ ہی غصہ دکھاتے ہیں اور پھر کس پر؟ کمزور پر، واہ کیا بہادری ہے؟

"مجھے غصہ وصہ تو نہیں آیا۔ یوں کہنے کو جو جی چاہے کہو، تمھیں نے ہنڈولے والی بات نکالی تھی میں نے قسم کھالی کہ غلط ہے بس ہوگیا۔"

اے وہ ہنڈولے والا نہ سہی، چکر پر تو ضرور ہی چڑھے ہوگے۔ گھر میں گھوڑے اونٹ باندھنے کی تو مقدرت نہیں، کاٹھ ہی کے گھوڑے پر چڑھ کر حسرت نکل جائے اب نہیں بولتے۔ اب پتے کی بات سن کر یہ چپ سی کیوں لگ گئی؟ کچھ تو کہو، کچھ تو بولو، ذرا چار آنکھیں کرو مجھ سے، خالی آنکھیں بند کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں اِتنے یہ تھوڑی سمجھ لوں گی کہ سو گئے۔ بھلا میں پوچھتی ہوں سوائے تمھارے کوئی مرد آدمی (کہنی کا ٹھوکا دے کر) بھرے میلے میں چکر پر چڑھے گا؟ (شوہر صاحب نیند سے چونک کر)

اوں ولایتی چکر کلکتے میں ہے۔"

اے لو اب کلکتے کی خبر لانے لگے، اے سنو تو ابھی سو رہنا۔

"اچھا کہو، ذرا غافل ہوگیا تھا۔"

غافل وافل تو کیا ہوئے ہوگے؟ مجھ کو چھیڑنے کے لیے بَن کے سوئے تھے۔ میں کہتی ہوں کہ ایک جوڑا چوڑیوں کا بھی ہمارے لیے نہ لائے؟

"ہاں پیاری یہ تو بڑی بھول ہوگئی، معاف کرنا۔"

میں نے سب معاف کیا، میں تو معاف کرنے کے لیے بنی ہی ہوں۔ مگر ان بچوں نے کیا قصور کیا تھا کہ ان کو بھول گئے؟ جب سے بی ہمسائی میلے کا نام لے کے گئی ہیں بچوں نے آفت کردی۔ ابا میلے سے یہ لائیں گے ابا میلے سے وہ لائیں گے۔ یہی کہتے کہتے بیچارے سب کے سب سوگئے اور وہاں سے ابا آئے تو خالی ہاتھ۔ موئے دو پیسے کے مٹی کے کھلونوں میں کون چھپّن ٹکے کا خرچ تھا جو نہ لائے؟ اب صبح دیکھنا بچے کیسا منھ دیکھ کر

رہ جائیں گے؟

''خیر چوڑیوں تک تو ایک بات تھی، یہ میں کھلونے کیونکر لاد کے لے آتا؟''

اے یہ کہو کہ لانے کو جی نہ تھا۔ اے رومال میں لپیٹ لیتے، کوئی کیا علم غیب پڑھا تھا جو جان لیتا؟ اور جو جان ہی لیتا تو اس میں شرم کی کونسی بات تھی۔ ابا ہمارے تھے کبھی خالی ہاتھ ڈیوڑھی کے اندر انھوں نے قدم نہیں رکھا، کچھ نہیں تو دھنیا پودینے کی دو گڈیاں ہی لا کے اماں کے آگے رکھ دیں اور نہیں تو ریوڑی ہی سہی۔ جیب سے نکالی اور ہم لوگوں کے ہاتھ میں دھر دی۔

''تو وہ افیمی تھے میں کہاں سے لاؤں ریوڑیاں، افیم کی گولی تو نہیں دے دی کسی کو؟''

یہ دیکھو، اب تم بزرگوں تک پہنچنے لگے، نشے میں تم ہی نے شراب کی بوتل دے دی ہوگی کسی دن، وہی تم کو یاد ہے۔

''میں شراب کب پیتا ہوں؟''

پیتے ہی ہوگے، میری بلا جانے اس کو۔ دیکھو میں کہے دیتی ہوں باپ دادا کی دل لگی مجھ سے نہ سہی جائے گی، کہہ دیا ہے۔ اپنی موت بھول گئے ہو جو مُردے کی برائی کرتے ہو! لیجیے صاحب جس دن سے میں بیاہ کے آئی اور چھ برس وہ اس کے بعد جیے پانی تک تو انھوں نے اس گھر کا پینا روا نہیں رکھا، کبھی پیسے کے شرمندہ اِن کے نہیں ہوئے، جب آئے آپ ہی کچھ سلوک کر گئے اور یہ چلے ہیں برائی کرنے، ہو تو لے کوئی ہمارے باپ کا ایسا اور یوں تو سب اپنی ناک سوا ہاتھ کی سمجھتے ہیں۔

شوہر صاحب فرماتے ہیں آج میں بہت خستہ تھا، لہٰذا تمام لکچر نہ سن سکا اور سو گیا اور خواب میں دیکھا کہ ہمارے سسر صاحب تشریف لائے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری لڑکی کو فوراً رخصت کردو۔

○

نواں باب

شوهر صاحب کو دراصل دیر هوگئی هے. بیوی نے غصه میں دروازه بند کرلیا. پانی بهت برس رها تها. شوهر صاحب اچهی طرح شرابور هوگئے تو دروازه کهولا، شوهر صاحب کا غصه، بیوی کا جواب ترکی به ترکی.

بیوی کنوڑیا کھولو رس کی بوندیں پڑیں

''لاحول و لاقوۃ یعنی سنا کیں اور دروازہ نہ کھولا، یہ کیا مذاق تھا؟''

مذاق کیسا؟ مذاق دل لگی میں نہیں کرتی اور مذاق دل لگی جو کرتے ہیں ان کو بھی جانتی ہوں، کیا میری آنکھیں پھوٹ گئی ہیں جو تم سمجھتے ہو کہ یہ باتیں میں نہیں دیکھتی، مگر مجھ سے مطلب؟ جو جی چاہے کرلو۔

''فضول بیکار بک بک مت لگاؤ، یہ بتاؤ کہ تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟''

دروازہ کھولتی میری بلا، میں یونہی دن بھر مرتی کھپتی ہوں، اب رات کو بھی آرام نہ کروں؟ اور ان کے لیے مَسّٹ مارے بیٹھی رہوں۔

''اچھا خیر میں کہے دیتا ہوں کہ اگر اب کی مرتبہ ایسا ہوا تو بس دیکھ لینا۔''

دیکھ کیا لیں گے؟ کیا دکھا دوگے؟ کیا مارو گے؟ اس کا خیال بھی نہ لانا دل میں، تم نے ہاتھ اٹھایا اور نہ نکل پڑوں دن دہاڑے باہر تب ہی کہنا۔ اب جڑ سے کٹ جائے گی یہ غُزّے پتّے کسی اور کو دکھلانا۔

''اچھا ان فضول باتوں سے کیا فائدہ؟ کل سے کھڑکی میں باہر سے قفل لگا کر کنجی اپنے پاس رکھا کروں گا اور اندر سے کنڈی ہی نکلوا ڈالوں گا۔ کل ہی صبح بڑھئی نہ لگاؤں تو سہی۔''

یہ بھی کر کے دیکھ لو، میں ابھی اپنے میکے نہ چلی جاؤں تو سہی۔ لگاؤ تو تم کنڈی، یہ دیکھیے صاحب، اب بی بی بچے قید فرنگ میں رکھے جایں گے کہ جب میاں آئیں تو دروازہ کھلے۔ نہیں ڈھابلی بند۔ ایسا ظلم تو میں نے آج تک سنا نہیں، گھر کے کاروبار کے لیے دروازہ کھلا نہ رہے گا، تو یہ کہو اب پڑوسنوں کو جو آنا ہوگا وہ مردانے سے ہوکر آیا کریں گی۔ ایک تو یونہی تمھارے گھر میں کوئی جھانک کے نہیں دیکھتا تھا، اب تو اور بھی کوئی اس طرف نہ تھوکے گا۔ ایسے کبھی کبھی آدمی کی صورت بھی دیکھنے کو مل جاتی تھی، اب تو اس کو بھی جی ترسے گا۔

گھر میں آگ لگے، سانپ نکلے کوئی آفت آئے یا دن دوپہر سڑک پر نکل کھڑی ہو، نہیں تو گھٹ گھٹ کر مرو۔ میں ابھی سے کہے دیتی ہوں، صبح ہی میں اپنے میکے چلی جاؤں گی، اپنے بچے لو، اپنا گھر سنبھالو، مجھ سے کوئی واسطہ نہیں، چاہے اس میں آگ لگے، چاہے جو ہو۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ میاں باہر کے مالک، گھر کے اندر بی بی ہوئی تو وہ مالک، یہ تو آج تک نہیں دیکھا کہ کوئی اپنی سہرے جلوؤں کی بی بی کو مرغی کی طرح ڈھابلی میں بند کرے۔ یہ کوئی اور ہوں گی اس طرح داد بے داد اٹھانے والیاں۔ مجھ سے اس کی برداشت کہاں؟ جی چاہتا ہے پانی پی پی کر کوسوں، اُن موؤں کو جنھوں نے مجھے اس طرح بھاڑ میں جھونک دیا۔

''خوب کوسنے دو، ہم خوش ہمارا خدا خوش۔''

جب جی چاہے گا دیں گے۔ کچھ تمھارے کہنے سے دیں گے؟ یہ تو میں جانتی ہوں کہ تم ہمارے لوگوں کے خون کے پیاسے ہو، نہ معلوم انھوں نے تمھارا کیا بگاڑ رکھا ہے جو اس طرح جانی دشمن ہوگئے؟ نہ تمھارے لینے میں نہ دینے میں، مگر ناحق کو خار کھاتے ہیں ان کے نام سے، کبھی جو اماں بچوں کو دیکھنے کو چلی آتی ہیں دن بھر ناک بھویں چڑھی رہتی ہیں، تمھارا ایسا سسرال والوں کا دشمن تو میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ مجھی سے پھرے پھرے معلوم ہوتے ہو، اسی وجہ سے سسرال والے بھی نہیں دیکھے جاتے، ذرا سی دیر ہوگئی دروازہ کھلنے میں، اس کے اوپر یہ آفت، شام سے دم مارنے کی فرصت نہیں جو ذرا دھندے سے چھٹی ملے تو آرام کیسے کرو؟ میاں کے انتظار میں در سے لگی کھڑی رہو تو خوش، نہیں

چیتھڑوں سے بیزار، اسی جاگنے نے تو مجھے بیمار ڈال دیا۔ ایک دن کا ہو تو کوئی کہے روز کا یہ قرینہ ٹھہرا۔ کوئی ایسی منحوس رات ہوتی ہوگی جو ایک بجے کے ادھر آتے ہوگے اور پھر جاگو تو جاگو، نہیں یہ خفگی انگیز کرو، یہ مزاج داری تو میں بادشاہ کی بھی نہ کروں، تم بیچارے کون کھیت کی مولی ہو؟ اپنا آرام، اپنی آسائش کھو بیٹھے ان کے لیے اور یہ انعام ملا کہ چاہے بیمار ہو، چاہے حیران ہو، دروازہ کھلنے میں دیر کیسے لگے؟ آج مہینہ بھر سے ساری رات کھانستے گزرتی ہے، اتنا کوئی پوچھنے والا نہیں کہ کیسی ہو؟ ابھی ذرا سی انگلی اپنی دکھتی ہو تو حکیم بھی ہوتے، ڈاکٹر بھی، پولیس بھی، ہائے ہائے بھی، کیا کچھ نہ ہوتا؟ مگر سچ ہے کوئی اپنا نہیں سب اپنا آرام چاہتے ہیں۔

''میں نے کھانسی وانسی نہیں سنی، کھانسی ہوتی تو میں بھی تو کبھی سنتا۔''

تم کاہے کو سنتے؟ تمھاری بلا کو کیا غرض تھی کہ تم سنتے؟ اور پھر تم سنتے تو نہیں نہیں کرکے دو ایک پیسے ''رب السوس'' ملہٹی میں خرچ ہی کرنے پڑتے۔ یہاں جان پر بن جائے تو تم تو یوں ہی انجان بنے رہوگے، یہی تو امید ہے مجھے تم سے، تم سوچتے ہوگے کہ مر ہی جائے کہیں کمبخت، کال کٹے تمھاری دعا پوری ہی ہوگی میں بہت تھوڑی جیوں گی۔ ایک میں یونہی دو ہڈی کی آدمی تھی، اور دوسرے برا نہ ماننا تمھارے برتاؤ نے اور بھی مجھ کو مار اتارا، خیر یاد کروگے جب مر جاؤں گی۔ جب دوسری آئے گی تو میری قدر ہوگی، ابھی نہیں۔ کسی چیز میں میرا سا برتاؤ اس کے ساتھ کرکے دیکھنا، نہ کھانا پانی حرام کردے تب ہی کہنا، ہاں ہاں میں جانتی ہوں تم ہنس رہے ہو، خوش ہو رہے ہو۔

''اے لو تم نے کیسے جانا کہ میں ہنس رہا تھا؟''

اے چرپائی[1] کے ہلنے سے منہ کی جنبش سے اور کیسے جانا؟ خیر خوش ہو منت مانو کہ گھی کے چراغ جلائیں گے جو یہ مرجائے گی۔ میرا بھی جی سیر ہوگیا ہے اب مالک اٹھا ہی لے تو بہتر ہے اس طرح کے جینے سے۔

''خدا نہ کرے کہ اٹھالے، یہ آخر تم اس طرح کی باتیں کیوں کرنے لگیں؟''

1　چارپائی۔ پلنگ

اس طرح کی باتوں پر موقوف ہیں اب میرا جی بھی بھر گیا ہے، تمھاری طرف سے ایسی بے پروائی ہونے لگی کہ جیسے محبت ہی اٹھ گئی۔ تمھیں یاد کرو ایک زمانہ وہ تھا کہ جو میں تھی وہ کوئی اور نہیں، اور وہی اب ہوں کہ مجھ سے تم چھٹکے ہی پھٹکے رہتے ہو، کہیں کلب گھر ہے، کہیں فرامشن ہے، یار ہیں، دوست ہیں، اور مجھ کو بڑی فکر اس بات کی ہے کہ تمھارا تو یہ حال ٹھہرا، میرے بعد ان بچوں کی خبر کون لے گا؟ محلے والے ترس کھا کر منھ دھلا دیں گے۔ کرتی اوڑھنی کی پھونک[1] سی دیں گے۔ اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتے ہیں؟ رہا کھانا اس کی فکر لینے والا اللہ ہے۔ اول تو گھر میں چیز بست کیا ہے اور جو تھوڑی بہت ہے بھی، وہ محمد حسین اور ان کے ہوتے سوتوں کے نیگ لگے گی۔ یہ بچے معصوم بیچارے بھیک مانگیں گے مگر اتنا میں کہہ دیتی ہوں کہ کہ اگر تم نے دوسرا بیاہ کیا تو ان بچوں کے خیال سے میری پیٹھ قبر میں نہ لگے گی تم ان کو پڑھوا لکھوا کے بیاہ شادی کر کے پروان چڑھا دینا، پھر جو جی چاہے کرنا نہ میں ہوں گی نہ منع کروں گی۔

''شوہر صاحب کا بیان ہے کہ الحمدللہ خلاف امید آج وہ خود سو گئیں۔ اور لکچر تمام ہوگیا، گوکہ کھڑکی میں باہری زنجیر کا ارادہ مصمم تھا مگر ارادۃ اللہ غالب علی ارادۃ الناس. نہ لگا سکے۔

○

---

[1] کپڑے میں پھٹی ہوئی جگہ

دسواں باب

بچوں کے لیے سرمائی کپڑوں کا بجٹ اور اس کی منظوری

سرمائی دلائیے ہماری ورنہ
تم کھاؤ گے کوسنے جو ہم کھائیں گے ٹھنڈ

تم جانتے ہو کہ میری عادت مانگنے کی نہیں۔ اگر میری بات ہو تو میں مصیبت اٹھا لوں مگر مجھ سے کہتے نہیں بنتا۔

''اچھا تمہید ختم کرو اور مطلب کہہ چلو۔''

مطلب کیا کہہ چلوں؟ جو تم اپنے گھر بار کو دیکھتے تو مجھ سے مطلب کیوں پوچھتے؟ دیکھ لیتے کہ بچوں کی کیا حالت ہوگئی ہے۔

''خیریت تو ہے کیا حالت ہوگئی؟''

حالت کیا ہوگئی؟ یہی حالت ہوگئی کہ جاڑے سر پر آپہنچے اور ایک کے پاس کپڑے نہیں ہیں، مجھے بُرا بہت معلوم ہوتا ہے، تم سے بار بار کہتے مگر............

''تو پھر کہتی کیوں ہو؟''

کہوں کیسے نہ؟ سنکھیا گھول کے گھر بھر کو پلا دو تو نہ کہوں۔ جب تک جان میں جان ہے روٹی کپڑے کے خرچ سے نجات نہیں۔ خدا جانتا ہے اگر میرے پاس کچھ بھی ہوتا تو یوں میں فقیروں کی طرح روز سوال نہ کرتی گو کہ روٹی کپڑا تمھارے ذمّے ہے مگر میں نہ مانگتی۔ لیکن مجبور ہوں، بے پیسے کوڑی کے عورت نگوڑی کس شمار میں ہے۔ پیسے پیسے کے لیے مصیبت اٹھانی پڑتی ہے اپنے پاس ہوتا، صندوقچہ کھولتی اور نکال کے دے دیتی۔ تمھارے ہی لڑکوں کے لیے مانگتی ہوں، کچھ قبر میں تھوڑی لے جاؤں گی؟ تمھارا جی چاہے

دو، جی چاہے نہ دو، دو گے بزاز کے یہاں سے کپڑا منگوا کر قطع کردوں گی، سی دوں گی، نہ دو گے تمھارے ہی بچے جاڑا کھائیں گے۔ لنگوٹی باندھے پھریں گے، مجھے کیا؟ دیکھو! سونے کا سامان ابھی سے نہ کرو، میری بات کا جواب دے لو تو سونا، میں کہتی ہوں تم کو معلوم ہے کون مہینہ ہے یہ؟

''مہینہ پوچھ کے کیا کروگی؟ مطلب کہو۔''

مطلب یہی کہ جاڑے کا مہینہ کا تک ہوتا ہے نہ؟ کہوتاں تو اب کچھ جڑاول کا بھی سامان کروگے یا نہیں؟

کرنا ہی پڑے گا جب تک پارسال کے گرم کپڑے پہناؤ، کچھ ملے گا تو نئے بھی بنوادیں گے۔

پارسال کے گرم کپڑے ہیں کہاں؟

''کیوں کیا ہوئے؟''

پھٹ گئے چھوٹے ہوگئے، اور کیا ہوئے؟ اب کے ماشاء اللہ ایک اور بڑھ گئے، پہننے والے۔

''اچھا تو میں بتاؤں جو کپڑے تنگ ہوگئے ہیں وہ چھٹن کو پہناؤ اوروں کے بَن جائیں گے۔''

لے معاف رکھیے، اس کے کپڑوں سے آپ کو مطلب نہیں۔ یہ تو کوئی سنے؟ پرانے کپڑے اس کو میں پہناؤں گی۔ اس کے کپڑوں میں خرچ ہی کیا ہے جو تم ابھی سے اس کو شمار میں لانے لگے؟ تم کو پرانے کپڑے پہنانا ہیں تو جب میں مرجاؤں گی پہنا لینا۔ اپنے جیتے جی تو میں اس کو اچھا ہی پہناؤں گی اور تم کو کہتے ہوئے بھی برا نہ معلوم ہوا کہ ابھی چھ مہینے کی تو اس کی جان، ایسی کون مصیبت پھٹ پڑی ہے جو اس کے دشمن ابھی سے چیتھڑے لگائیں۔ اب جو اس کے کپڑوں کے لیے کبھی تم سے کہوں تب ہی کہنا۔

''اچھا بھئی ہوگا اب یہ بتاؤ کہ کتنا خرچ ہوگا؟ روپیہ مجھ سے لو......''

میں کیا کروں گی روپیہ لے کے؟ کیا کچھ میرا کام ہے؟ تمھارے ہی لڑکوں کا کپڑا بنے گا، میں جو بتاؤں تم لادو بس۔

''نہیں مجھ سے نہ بنے گا، روپیہ لے لو اور خود منگوا کر بنالو، مجھ سے نہ طے کرتے بنے گا نہ حساب کرتے۔''

اچھا وہ خیر روپیہ ہی دے دینا، میں ہی منگوالوں گی، پہلے سُن تو لو کہ کیا کیا بنے گا؟

''جو جی چاہے بناؤ، مجھے فہرست سنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی مارے تو میں ٹالتا تھا فہرست سے میرا دم الجھتا ہے۔''

واہ اچھا آپ کا جی ہے کہ جب نئے کپڑے اللہ رکھے بنتے ہیں تب ہی آپ کا جی الجھنے لگتا ہے۔ تم کو شک بھی نہیں آتا یہ کہتے؟

''اچھا کہو میں سنتا ہوں۔''

کہوں کیا؟ بڑی لڑکی کی چار اوڑھنیاں[1] آٹھ گز، منجھلی کی چار اوڑھنیاں آٹھ گز، سولہ گز ہوئے؟ مُنّی بھی کہتی ہے میں اوڑھنی ہی لوں گی، دو اس کی بھی رکھو، تین گز؟ اس میں سے پٹی اترے گی؟ اس کی کلیاں کرتوں کی ہوجائیں گی۔ مُنّی کے آٹھ کرتے، بڑے عرض کی تنزیب اگر ہوئی تو بارہ گرہ میں ایک کرتہ بنے گا۔ آٹھ کرتوں کے کَے گز ہوئے؟ بولتے نہیں (کہنی مار کے) سو ہی رہنا ہے تو پھر مجھے کیوں بکواتے ہو؟ میں پوچھتی ہوں بارہ بارہ گرہ کے حساب سے آٹھ کرتے کَے گز میں ہوئے؟

''چھ گز میں۔''

اچھا چھ گز میں، اب چھ کرتے، چھ پائجامے بڈھن کے، ڈیڑھ گز میں پائجامہ، ڈیڑھ گز میں کرتا، حساب لگاؤ۔

''چوبیس گز۔''

چوبیس گز، بارہ گز تنزیب، بارہ گز چھالیٹن[2]، جھٹّن کے لیے کوئی اچھا کپڑا ہو، کوئی

1　دوپٹہ

2　لٹھے کو کہتے ہیں پائجامے عموماً اسی کے بنتے ہیں۔

اچھا کپڑا دیکھ کے لے آنا۔ دو کرتے فلالین کے ہوں گے۔ آخر جاڑے کی فصل ہے۔

''جھوٹی فلالین کے بنالو۔''

جھوٹی فلالین کے میں نہ بناؤں گی تم ہی نہ بنالو؟ وہی محلے میں دھنئے جلاہوں کے لڑکے پہنیں، وہی ہمارے لڑکے پہنیں، یہ مجھ سے نہ ہوگا، کسی اور سے بنواؤ۔

''بھئی بہت خرچ پڑ جائے گا، اچھا یہ کرو ایک ایک کرتا فلالین کا اور ایک ایک شلوکہ روئی دار۔''

روئی دار شلوکے میں بھی وہی بیٹھے گا۔ چاہے یہ کرو چاہے وہ کرو۔ اب رہے لڑکیوں کے پائجامے وہ کاہے کے بنواؤ گے؟

''یہی معمولی چھینٹ؟''

اچھا چھینٹ سہی، مگر ایک ایک پائجامہ بھی تو جھوٹے مشرو کا ہو؟

''اچھا وہ بھی سہی۔''

اور بڈھن کی اچکن کاہے کی بنے؟

''اب صبح پوچھنا، اس وقت نیند بہت آرہی ہے۔''

نیند تو تم کو روز ہی بہت آتی ہے پھر جو تم اس طرح سے نیند بلایا کرو گے تو گھر کا کام تو بند ہوا۔ آخر یہ بھی ضروری کام ہے کہ نہیں؟ دن بھر تو تم کو قسم ہے گھر آنے کی۔ پھر رات کو بھی تم سے نہ پوچھوں تو کب پوچھوں؟ اب یہ بتاؤ کہ بڈھن کی اچکنیں کاہے کی بنیں گی؟

''جس چیز کی چاہے بناؤ۔''

دام تو تم دو گے میرا جی کون چیز ہے؟ اور تمھارا یہ مطلب ہو کہ اس طرح کی لاپروائی سے میں گھر کا حال نہ کہوں تو یہ دل سے نکال ڈالو، بھگتنا تو مجھے پڑتا ہے، کہوں کیونکر نہ؟ دو اچکنیں بڈھن کی ہوں، اگر گرنٹ کی روئی دار اور پھول دار مخمل کی۔

''جی نہیں جامہ دار کی معہ بنارسی بیل کے۔''

یہ مخمل میں کون ایسا صرفہ ہے جو تم نے جاے دار کا طعنہ دیا؟ غریب آدمیوں کے لڑکے تو مخمل پہنے پھرتے ہیں جو میں نے مخمل کو تجویز کیا تو کونسا گناہ کیا؟ جس پر تم نے یہ آوازہ کسا۔ آخر ایک اچکن کہیں آنے جانے کے لیے ہونی چاہیے کہ نہیں؟ یا وہی گرنٹ پہن کے عیدگاہ بھی جائیں گے جواب دو؟

''اچھا وہ بھی سہی، سب کتنا ہوگیا؟''

سب جتنا ہوا حساب لگا لو اور اے لو رضائی، لحاف تو رہ ہی گئے۔

''رضائی لحاف تو موجود ہیں۔''

اے وہ ہوں یا نہیں، آخر اب کی تیسرا سال ہے بنے ہوئے، نئے بننے چاہیے یا نہیں؟ اور ہیں کس جگہ؟ تمام روئی پھٹ پھٹ کر ادھر کی ادھر ہوگئی ہے۔ ایسے لحافوں سے بے لحاف بھلا۔

''اچھا پچاس روپیہ صبح دے دیں گے۔''

کیا کہا! کیا کہا! ذری پھر تو کہنا! پچاس روپیہ اور ماشاء اللہ سے گھر بھر کا کپڑا؟ تمھیں بنوانا، مجھ نگوڑی کی تو سمجھ میں بھی نہ آوے گا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

''اچھا تو پھر کتنا لوگی؟''

میں کیا کروں گی لے کے؟ گھر بھر کا حساب میں نے بتلا دیا۔ اب تم آپ ہی خرید کر بنوا دو، مجھ سے پچاس روپے میں نہ ہو سکے گا۔

''یہی تو پوچھتا ہوں کہ پھر کتنا دوں؟''

اے سو روپے سے کیا کم ہو؟

''سو روپے تو اس وقت نہیں ہیں۔''

نہیں ہیں تو جانے دو، اب کی سال نہ بنواؤ، کوئی ہنسے گا ہنس لے گا، بچے سردی کھائیں گے، کھالیں گے۔

''اے بھئی کچھ تو کم کرو سو روپے سے واللہ آج کل کام نہیں چلتا نہیں تو میں ایسا نہ

کہتا۔"

"پچھتر لے لو۔"

اچھا پچھتر ہی سہی۔ مجھ کو خود ہی تمھاری تکلیف کا خیال رہتا ہے مگر کیا کروں گھر کا خرچ رکتا ہی نہیں، جس طرح بنے گا پچھتر ہی میں گھٹا بڑھا کر کرلوں گی، مگر کچھ ہم کو بھی بنوا دوگے یا نہیں؟......"جو کہو۔"

کہوں کیا؟ وہی ریشمی پائجامے کو جی چاہتا ہے......"اچھا۔"

اور وہ ڈھاکہ کی ململ............"وہ بھی سہی۔"

شوہر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ آج شروع سے میں ڈر رہا تھا کہ بات بڑھے گی ضرور، مگر اول تو مجھے نیند بہت آرہی تھی، دوسرے خرچ بھی ضروری تھا۔ ایک یہ البتہ نہ سمجھ میں آیا کہ صبح کو لڑکوں کی اماں میرے سر کی قسم کھا کر کہنے لگیں کہ ریشمی پائجامے کے ساتھ تم نے ایک پڑاتے دار گوٹ کی دلائی کا بھی وعدہ کیا تھا۔ کہتی ہیں تم نیند میں تھے، مگر تم نے وعدہ کیا تھا ضرور۔

○

"محمد علی گنتی کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن کو نئے لکھنے والے بھی اپنا رفیق سمجھتے ہیں اور جنھوں نے غیر مشروط طریقے سے ادب کی نئی تحریک کا شروع سے ساتھ دیا تھا۔

(محمود ایاز۔ سوغات 9)

گیارھواں باب

لڑکوں کی اماں ایک روز کے لیے اپنے میکے گئی تھیں. شوھر صاحب نے فرصت کو غنیمت سمجھ کر چند احباب کو مدعو کیا. دعوت کے بعد جو مکالمہ ھوا وہ ھدیۂ ناظرین ھے.

رقعہ دعوت

عیشے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں بیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

یہ تو صاحب بڑے غضب کی بات ہے۔ ادھر میری آنکھ اوٹ ہوئی اور ادھر تم کھُل کھیلے۔ ذری دیر اماں کو دیکھنے چلی گئی تھی کہ آفت آ گئی۔ گھر کی صورت ہی بدل گئی۔ پہچان نہیں پڑتا کہ وہی گھر ہے، موئے بھنگیڑ خانے میں ایسی ابتری کیا ہوگی؟ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں، جتنا اسباب ہے تتر بتر؟ یہی تو میں کہتی تھی کہ آج کیا ہے جو یہ مجھ سے کہتے ہیں کہ رات کو بھی اپنی اماں کے وہاں رہ جانا۔ رات کو آؤ گی تو سردی میں زکام ہو جائے گا، بیمار پڑ جاؤ گی۔ یہ مجھ کم بخت کو کیا خبر تھی کہ یہ ارادے ہیں اور یار دوستوں کی دعوت ہوگی۔ یہ کمبخت گھر میں رہے گی تو لطف نہ آوے گا۔ کسی طرح اس کو دفان کرو۔ یہ تو اب میری سمجھ میں آیا کہ یہ اصرار اسی وجہ سے تھا اور حقّے کی بو، تو دیکھو، اس وقت تک گھر میں بسی ہوئی ہے، جدھر پھر کے دیکھو کولوں[1] کا انبار ہی نظر آتا ہے اور باورچی خانہ کے باہر اللہ جھوٹ نہ بلائے کوئی سو سوا سو جلے گُل پڑے ہوں گے۔ اے میں کہتی ہوں کتنے حقّے تھے اور کتنے پینے والے موئے تھے جو اتنی تمبا کو پی ڈالی؟ اور چاندنی تخت پر کل ہی بچھائی تھی، معلوم ہوتا ہے دو مہینے کی بچھی ہوئی ہے اور پھر دو تین جگہ پیسے پیسے بھر جل بھی تو گئی ہے؟ یہ کیسے جلی؟

---

[1] کوئلوں۔

بولتے نہیں۔

''حقہ گر پڑا تھا۔''

اے لو حقہ گر پڑا تھا۔ آسمان نہ گر پڑا گرانے والے موؤں پر؟ نئی چاندنی ملیامیل کر کے رکھ دی اور اے لو یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں، یہ نئے قالین کی گت؟ یہ بھی جل گیا؟ یہ کیسے جلا؟

''یہ بھی اسی حقہ سے جل گیا تھا چنگاری پڑی رہ گئی، کسی نے دیکھا نہیں۔''

آنکھیں بھی پھوٹ گئی تھیں؟ اور آنکھ تو آنکھ میں کہتی ہوں ان نکٹوں کے منہ پر ناک بھی نہ تھی کہ غالیچہ جلا کیا اور ان کو خبر نہ ہوئی؟

''بو ہی سے پتہ چلا، قالین کے جلنے کا تو مجھے بھی افسوس ہے، مگر خیر اب تو ہوگیا۔''

اے افسوس تو تم کو گھر جل جانے کا بھی نہ ہو، یہ قالین کون بڑی چیز ہے؟ ایسا تو میں نے آج تک آدمی ہی نہیں دیکھا، جس کو اپنی چیز کا درد نہ ہوا وہ کیا گھر رکھے گا اور مجھے بھی ناحق ہی فکر ہے، جب تم ہی چاہتے ہو گھر نہ رہے تو میری حماقت ہے جو میں اس طرح سے ایک ایک چیز سنبھال کے رکھتی ہوں۔ اب خدا چاہے تو ایسا قصور نہ ہوگا۔ گھر تمھارا، مال تمھارا، چاہے رکھو چاہے پھینکو۔ میں بیچ میں بولنے والی کون؟ دعوت دنیا کرتی ہے مگر اس طرح گدھوں سے کھیت کوئی نہیں چرواتا۔ ابھی چوتھا روز ہے کہ شکر کی بوری آئی تھی، ایک مٹھی بھر شکر باقی ہوگی؟ یہ شکر کیا ہوئی؟

''شربت بنوایا تھا۔''

اور میری دوا کے لیے کاغذی نیبو آئے تھے وہ تو نہیں صرف کر ڈالے؟''

''نہیں نیبو میں نے بازار سے منگوائے تھے۔''

یہی تو میں نے کہا کہ بے ترشی شربت ان چٹوروں کے حلق سے کاہے کو اترتا، گھر میں چاہے گڑ کا شربت بھی نہ میسر آتا ہو مگر یہاں جب تک نیبو نہ ہو شربت ہی نہ پئیں گے۔ خدا نہ کرے ایسی دعوت کوئی کرے، معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں بھونچال آیا تھا، جو چیز ہے ٹوٹی پڑی ہے۔ ایک گلاس ٹوٹا، ایک طشتری ٹوٹی، سنہرے کام والی پلیٹ میں

بال پڑ گیا، میں اس کے جوڑ کی تلاش میں تھی، یہاں وہ بھی گئی۔

"تو اس میں بال تو پہلے ہی سے پڑا تھا۔"

اے کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ کھاؤ تو میرے سر کی قسم کہ اس میں بال پہلے ہی سے پڑا تھا۔ یہ تو سب ایک طرف، جس بات پر بدن میں آگ لگ جاتی ہے وہ تو یہ ہے کہ نقصان کا نقصان کریں اور پھر اوپر سے چال بازی۔ دالان کے طاق پر والا چینی کا کھلونا دو ٹکڑے کر کے پھر اس کو ویسے ہی جما کے رکھ دیا کہ معلوم نہ ہو، ایسی چھچھوری حرکتیں، چھی چھی! اس وقت تک تو اتنا ہی نقصان کھلا ہے اب دیکھیں کل کو کون چیزیں ٹوٹی ہوئی نکلتی ہیں؟

خیر بھئی ہوگا ہم سے کیا مطلب؟ جس کا مال ہے جب اس کو خیال نہیں تو ہماری جوتی رنج کرے۔ جو کچھ بچا ہے خدا کرے وہ بھی نہ رہے مگر دیکھ کے تاب نہیں رہتی، نقصان سے دل کڑھتا ہے، تو منھ سے نکل ہی جاتی ہے بات۔

تم کو تو ایسی کے ساتھ بیاہ کرنا تھا کہ جو گھر لٹتے بھی دیکھتی تو منھ سے نہ بولتی۔ جیسی تمھاری طبیعت لاابالی تھی، اگر ایسی ہی وہ بھی ہوتی تو اچھا تھا، نہ گھر میں ستھرائی[1] دی جاتی، نہ لڑکوں کے سر اور کپڑوں کی خبر لیتی، نہ انھیں نہلاتی دھلاتی، ہر چیز تتر بتر یوں ہی پڑی رہتی تو تمھارا جی خوش ہوتا، خیر جب میں مرجاؤں گی تو ایسی ہی کے ساتھ بیاہ کر لینا پھر معلوم ہوگا کہ پھوہڑ اور سوگھڑ میں یہ فرق ہوتا ہے۔

آج میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ سو رہوں، لہٰذا میں سو رہا، لکچر نہ معلوم کب تک ہوتا رہا۔

O

---

1. جھاڑو۔

بارھواں باب

گھر میں ایک دور کی رشتہ کی مہمان آئی ھیں، بیوی کو بہ مصداق ۔

با سایہ ترا نمی پسندم عشق است و ھزار بدگمانی

کچھ اور وسواس ھوا ھے. دن تو خیر لڑکوں کی ماں نے کسی طرح بسر کرلیا. رات کا سماں شوھروں کی تنبیہ کے لیے قلم بند ھوتا ھے. فاعتبروا یا اولی الابصار.

بنتی نہیں ہے بزم میں اس کی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

اللہ مجھے آنکھوں کی اندھی، کانوں کی بہری پیدا کرتا تو اس سے اچھا تھا، نہ دیکھتی نہ سنتی، نہ دل کڑھتا۔ ان انگاروں پر زندگی بسر کرنے سے تو اچھا تھا؟ بلا سے کچھ نہ دکھائی دیتا، یہ تو نہ دیکھنا پڑتا؟ اور پھر گھر کے اندر باہر کے تم مالک ہو، جو جی چاہے کرو، گھر میں تو نہ کرتے۔

''یہ آج کیا نیا رنگ ہے؟''

وہی نیا رنگ ہے جو تمھارے دل میں ہے اور کیا رنگ ہوگا، جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔

''مجھ کو تو کچھ نہیں معلوم، اتنا جانتا ہوں کہ جب تک رات کو تھوڑی دیر دنیا بھر کی بے سر و پا باتیں نہیں کرلیتی ہو، سونا نہیں ملتا، ایک رات تو ذری آرام سے پڑ رہنے دو۔''

ہائے اللہ پھر میں ہی بُری، میری ہی چھاتی پر یوں کو دَوں دَلی جائے اور پھر میں ہی آرام نہیں لینے دیتی۔

''کچھ خیر ہے؟ یہ کہہ کس کو رہی ہو؟''

اے انھیں کو کہہ رہی ہوں جو بڑی نیک پارسا دن بھر ماموں ماموں کہتے کہتے منھ تھکاتی ہیں اور ہتھکنڈے یہ کہ بیسواؤں کے کان کاٹ لیے۔ خدا نہ کرے کسی کی آنکھ کا پانی یوں مرجائے۔ ایسی موئی تو پیدا ہوتے ہی مرجائے تو اچھا ہے۔ خاندان کا نام تو نہ ڈوبے، نہیں تو کسی کسبی بازاری کے گھر میں پیدا ہو، خدا نہ کرے، کسی بہو بیٹی کے دیدے ایسے چرباگئے ہوں اور پھر وہ دیدہ دلیری تو دیکھو کہ میرے ہی سامنے بن بات کی بات پر ہنسی، تم نے گھر میں قدم رکھا اور ان کے دانت نکل آئے۔ یوں چاہے گھی کے گھڑے ڈھلک جائیں وہ بندی جگہ سے نہ ٹسکے گی اور اِدھر تم آئے اُدھر آٹھ آٹھ مرتبہ آنگن میں چک پھیریاں ہونے لگیں، کہیں یہ کام کہیں وہ کام اور پھر جو کام کریں گی تمھاری موجودگی میں بگڑ ہی جائے گا۔ پانی انڈیلیں گی تو اس طرح کہ آدھا گھڑا بہہ گیا تو کٹورا بھرا۔ پھر اس پر قہقہہ۔ وہ تو دیکھ کر آپے ہی میں نہیں رہتیں۔ بات کریں گی تو چہرے کی حالت اور ہوجائے گی، اللہ خاک میں ملاوے اس چہرے کو جس کے باعث دوسروں کی بربادی ہو، اچھے خاصے آدمی سڑی ہوجائیں کہ آدمی کا ڈر رہے نہ خدا کا۔

''یہ تم ہذیان کیا بک رہی ہو؟ اول تو جتنی باتیں تم نے کہی ہیں ان میں سے ایک بھی نہیں دیکھا اور اگر بغرض محال ہوں بھی تو کسی کے ہنسنے میں میرا کیا قصور؟''

اے تمھاری بھی تو صورت بدل جاتی ہے ان کو دیکھ کر۔ تمھاری بھی تو آنکھیں انھیں کو ڈھونڈھا کرتی ہیں۔ پان مانگیں گے تو انھیں سے بیٹھیں گے تو اس طرح کہ سامنا انھیں کا رہے، کیا یہ باتیں میں نہیں دیکھتی ہوں، اتنا سن آیا، اتنے دن کا سابقہ تمھارا ہے، کیا اتنی بھی نگاہ نہیں پہچانتی ہوں؟

''اس بدگمانی کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔ میں کیا کرسکتا ہوں، تم زبردستی کہتی ہو کہ ہئی ہے، مجھ سے قرآن اٹھوالو جو میرے دل میں کوئی برا خیال آیا ہو۔''

قرآن کتاب میں کون اٹھوانے والی اور میں کیوں اٹھوانے لگی؟ مجھ کو کیا غرض؟ تم مختار ہو اپنے فعل کے، مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ اگر تمھارا دل مجھ سے بھر ہی گیا تھا تو میرے سامنے تو یہ نہ کرتے، آج نہ سہی، کبھی تو ہم بھی کسی گنتی شمار میں تھے، اسی وقت کا خیال

کر کے آنکھوں کی مروت باقی رکھتے؟

"یہ تمھارا خیال کدھر ہے؟ ادھر دیکھو، مجھ کو دنیا میں تم سے زیادہ کس کا خیال ہوگا؟"

یہ ناحق کہتے ہو، ہوگا کیسے نہیں؟ میں پانچ لڑکوں کی ماں، وہ ابھی جوان جہان، کوئی پانچ برس مجھ سے چھوٹی، پھر نہ کوئی لڑکا بالا، میں تو الگنی[1] پر ڈالنے کے قابل ہو جاؤں گی تب بھی وہ ایسی ہی پٹھیا[2] بنی رہیں گی۔

"لاحول و لاقوۃ تم نے یقین ہی کر لیا کہ مجھے ان سے لگاؤ ہے، تو اب یہ خیال تمھارے دل سے کیونکر دور ہو؟"

دور اس طرح سے ہوگا کہ اس موئی سبز قدمی کو ہمارے گھر سے نکال دو۔

"اچھا تو صبح جب میں کام پر چلا جاؤں تم کہیں جانے وانے کا بہانہ کر کے کسی اچھے اسلوب سے رخصت کر دینا۔"

ہائے یہی تو میں کہتی ہوں کہ اس وقت بھی تمھیں اس کا خیال ہے کہ مروت نہ ٹوٹے، چاہے بی بی کا دم نکل جائے، مگر آشنا کے دل پر کیسے میل آئے؟

"پھر وہی، آخر ذرا غور کرو میں کیسے انھیں کھڑے کھڑے نکال دوں؟ کوئی بات ہے؟"

اچھا تم کو اتنی مروت ان کی ہے تو مجھی کو جانے دو، اپنی آبرو اپنے ہاتھ ہے، کیا فائدہ کہ سَوت کے ہاتھوں جوتیاں کھالوں تب نکلوں؟ پہلے ہی نہ چوکھٹ چوم کے چلی جاؤں؟ اللہ تم کو تمھارے بچوں کے سر پر برقرار رکھے، تم وہ خیر سے رہو، میں سمجھوں گی کہ میرے دشمن ویسے ہو گئے۔

ناظرین آج کا لکچر زبردست ہوا۔ وہ تھوڑی دیر رویا کیں اور پھر آپ چپکی ہو کے سو گئیں۔ مگر مجھ سے کچھ عذر کرتے نہ بن پڑا۔ بہت دیر تک جاگتا رہا، چونکہ آپ لوگ میرے رازدار ہیں۔ لہٰذا اگر یہ راز بھی آپ کو معلوم ہو جائے تو کوئی ہرج نہیں۔

---

1. ڈوری جس پر کپڑے لٹکائے جاتے ہیں
2. بھینس کی کٹّی

مجھ سے اور ان صاحب سے کسی طرح کا واسطہ نہ تھا اور نہ ہے مگر لڑکوں کی ماں کے کہنے پر میں نے جو اپنے دل کو تولا تو معلوم ہوا کہ دراصل بلا ارادہ میرے دل میں ایک بات پیدا ہوگئی تھی اور گو کہ پان مانگنے اور سامنے بیٹھنے کا کوئی فعل میں نے عمداً نہیں کیا تھا مگر کوئی چیز دل کے اندر مجھ پر ضرور نفرین کر رہی تھی۔ چونکہ اس بیماری کی خبر مجھ کو ٹھیک وقت پر ہوگئی۔ لہٰذا وہ مسماۃ بلطائف الحیل رخصت کردی گئیں۔

○

"...... چودھری محمد علی کے یہاں قصے اور ان کے کردار خیالی یا فرضی نہیں ہیں...... سچ مچ کے لوگ ہیں..... یہ ہماری رچی ہوئی عوامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان کی کمزوریاں، ان کی نیکیاں، ان کی معصومیت—— اس بیتی ہوئی دنیا میں یہ حکایتیں لگتا ہے جیسے کسی اور سیارے کے قصے ہیں، وہ سیارہ جو کہیں کھو گیا ہے یہ حکایتیں جزئیات نگاری کا شاہکار ہیں۔ یہ لوگ جنھیں لکھنے والے نے انتہائی ہمدردی، یگانگت اور خلوص کے ساتھ اپنے پڑھنے والوں سے متعارف کیا ہے۔ گویا دیکھیے یہ میرے لوگ ہیں، میری دنیا کے باسی، شاید کوئی دلچسپی کوئی رنگینی کوئی سنسنی خیز امکانات آپ کو ان میں نہ ملیں لیکن یہ میری، میرے پُرکھوں کی زمین کے بیٹے بیٹیاں ہیں، میری زمین جو سارے ہندوستان کی زمین ہے۔ ان کا دکھ سکھ جو ہماری ساری تاریخ کا دکھ سکھ ہے......"

(قرۃ العین حیدر "داستان طراز" 'سویرا' لاہور۔ 1955)

تیرھواں باب

باھر سے گھر آتے وقت ڈاکیے نے ایک رسالہ جو نمونے کے طور پر آیا تھا. شوھر صاحب کو دیا. شوھر صاحب نے خاصہ نوش فرمایا، بیوی گھر کے کسی کام دھندے میں مصروف ھوگئیں. شوھر صاحب پلنگ پر لیٹ کر رسالہ دیکھنے لگے، یہاں تک کہ بیوی تشریف لائیں.

نئی تہذیب ہوگی مشرقی پُتلے صنم ہوں گے
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

یہ آج کس چیز کا مطالعہ ہو رہا ہے؟ کیا کوئی امتحان پاس کرنا ہے، جب کرنے کے دن تھے تب تو پاس نہ کیا، اب آموختہ پڑھنے سے فائدہ؟

"آموختہ واموختہ نہیں ایک اخبار نیا نکلا ہے، نمونہ کا پرچہ تھا، میں نے کہا لاؤ ذرا دیکھ لوں، ابھی رکھے دیتا ہوں اتنا پڑھ لوں۔"

اور اس کا نام کیا ہے؟

"نیا فیشن"

ہاں تو یہ کہو، یہی تو میں کہتی تھی کہ نیا فیشن آج کیسا نکلا ہے کہ سوتے وقت اخبار بینی ہو رہی ہے؟ کیوں صاحب تو اب یہ فیشن تو روز کا ہوا اور میں دن بھر کی تھکی ماندی سوؤں گی کیونکر؟

"تم سو رہو، میں ابھی ختم کیے دیتا ہوں، ایک ذرا یہ مضمون ختم ہو جائے۔"

مضمون گیا بھاڑ میں، میری بات سنو، تم جانتے ہو کہ مجھے تیز روشنی میں نیند نہیں آتی اور بغیر تیز روشنی کے تم سے مضمون نہ پڑھا جائے گا۔ اگر تمھارا یہی دل چاہتا تھا کہ یہ کم بخت الگ سویا کرے تو ویسا ہی کہہ دیتے؟ ان چالوں سے کیا فائدہ؟ یہ تو میں جانتی ہوں

کہ تمھارا دل مجھ سے اکتا گیا ہے۔

''تم سے دل کیسے بھرے گا؟ میں ابھی ابھی رکھے دیتا ہوں، ذرا ٹھہر جاؤ۔''

ٹھہرے میری بلا (اخبار چھیننے میں آدھا ادھر آدھا ادھر)

''اے لو آخر نچ گیا نہ؟''

نُچ گیا ہوگا جانے دو۔

''اچھا تو لیمپ کم کردوں؟''

کردو۔

تو تم ہی ہاتھ بڑھاکے کم کردوگے تو کیا ہرج ہوگا......؟ اے لو خفا ہوگئے، تمھیں ہمارے سر کی قسم بتاؤ خفا ہوگئے؟

''نہیں پیاری میں خفا نہیں ہوا۔''

اچھا تو تمھارا دل چاہتا ہی ہے تو دیکھو میں منع نہیں کرتی۔

''منع اور کیونکر کرتیں؟ کیا آنکھیں پھوڑ دیتیں؟''

نوج، ایسی باتیں نہ کیا کرو، لیمپ تیز کرلو، میں اب کچھ نہ بولوں گی۔

''لیمپ تیز کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ اب تو وہ تم نے پھاڑ ہی ڈالا۔''

میں نے تو نہیں پھاڑ ڈالا۔ میں نے اخبار لینا چاہا، تم نے اس زور سے پکڑا کہ نگوڑا کپڑا بھی ہوتا تو ٹکڑے ہوجاتا، کاغذ کی کیا بساط تھی؟ اچھا تو نہ پڑھو، تو یہ بتاؤ کہ اس میں لکھا کیا تھا؟

''کچھ نہیں ایسی ہی ویسی باتیں تھیں۔''

تو دیکھتے کاہے کو تھے؟

''یونہی دیکھتا تھا۔''

خوب ایسی ویسی باتیں تھیں۔ یونہی دیکھتے تھے۔ یہ آخر پردہ داری کیوں ہے؟ کیا یہ بھی موا فرامیشن ہوگیا؟ بولو میں پوچھتی ہوں، اس میں کیا لکھا ہے؟

''ہوگا بھئی کسی بارے میں، اب چپ چاپ پڑ بھی رہنے دوگی کہ کہیں اور جاکے پڑ رہوں؟''

تو یہ ناحق کا غصہ کیوں کرتے ہو؟ میں ہی نہ علیحدہ جاکے مر رہوں؟ تم کاہے کو اٹھوگے؟ ادھر میں کئی دن سے دیکھ رہی ہوں کہ تمھاری طبیعت بدلی ہوئی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر رنج کرتے ہو، ہنسی کی بھی بات ہوتو تم منھ پھلا لیتے ہو، یہ آخر کیا بات ہے؟ ابھی اس دن بھی باتوں ہی باتوں میں تم رنج کر بیٹھے، آج بھی وہی ہوا، آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا یہی نیا فیشن ہے؟

''نہیں کوئی بات نہیں، یونہی کام وغیرہ آج کل زیادہ ہے۔''

اچھا تو جانے دو، اب ذرا اپنے نئے فیشن کے اخبار کو تو سناؤ، آخر اس کے اغراض کیا ہیں؟

''اغراض اس کے یہی ہیں کہ چونکہ زمانے کا رنگ بدل گیا ہے۔ لہٰذا وضع قطع، تراش خراش، نئی نئی ہونی چاہیے۔ اسی طرح کی باتیں ہیں۔''

یہ عورتوں کے کپڑوں سے اخبار کو کیا واسطہ؟ جو یہ موا ہم کو سکھانے آیا ہے۔ یہ ہوتا کون ہے ہمارے کپڑوں کا ذکر چھاپنے والا؟ اور واہ ری عزت مردوں کی کہ اپنی عورتیں یوں بکھانی[1] جاتی ہیں اور تم لوگ ہنس ہنس کے پڑھ رہے ہو؟ خوشی خوشی اخبار خریدا جاتا ہے۔ ماں بہنوں کے چھوٹے کپڑوں، بڑے پائنچوں کا پردہ فاش کیا جاتا ہے؟ اور آپ خوش ہورہے ہیں واہ کیا عزت نئے فیشن کی ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟

''اور یہ لکھا ہے کہ برقع پہن کر اگر عورتیں باہر نکلا کریں تو بہت بہتر بات ہے۔ علم کو ترقی ہوگی، تعلیم زیادہ پھیلے گی۔

تعلیم کسبیوں[2] کے یہاں ہوتی ہے۔ شریفوں کے یہاں تو سنا نہیں کہ استاد جی نوکر ہوئے ہوں؟ اب جو نہ ہو تھوڑا ہے، شرم ہی سے سب کچھ ہے، جب تم لوگوں نے وہی بھون کھائی تو سب ہی کچھ ہوگا اور اللہ کی مار اس اخبار والے موئے پر جو ایسی باتیں چھاپ چھاپ کر سب کے پاس بھیجتا ہے۔

1۔ تفصیل سے ذکر کرنا۔

2۔ خراب عورتیں

''بھیجتا کاہے کو ہے؟ لوگ منگواتے ہیں۔''

وہ کون لوگ ہیں جو منگواتے ہیں؟

''میں تم سب ہی خریدتے ہیں۔''

تم ایسے خریدتے ہوں گے؟ میں تو لاکھ برس نہ منگواؤں اور تم کو بھی نہ منگوانے دوں گی۔

''کیوں؟ آخر اس میں کیا ہرج ہے؟''

اے لو ابھی سے نیا فیشن بدل گیا؟ ایک ہی دن کی اخبار بینی میں یہ کایا پلٹ ہوگئی۔ کہتے ہیں کیا ہرج ہے؟ اگر اس میں ہرج نہیں تو ہرج کاہے میں؟ ایک دن میں یہ ہوا ہے تو میں جانتی ہوں کہ کچھ دنوں پڑھ کر مجھ سے کہوگے کہ مونڈھا بچھا کے بیٹھو؟ لے اب اخبار رہے اس گھر میں یا میں ہی رہوں۔ میرے سر پر ہاتھ رکھو کہ آج سے اس موذی اخبار خدائی خوار کی صورت نہ دیکھوں گا، تو میں گھر میں رہوں گی نہیں تو کچھ کھا کے سو رہوں گی۔ آبرو پر سے جان قربان کی ہے، جب اسی کے لالے پڑ گئے تو زندگی پر تین حرف ہیں۔

''آبرو جانا کیسا، ترکی میں............''

ترکی رومی تو میں جانتی نہیں، سیدھی سادھی بات جانتی ہوں کہ جب تم نے یہ کہا کہ باہر نکلنے میں ہرج ہی کیا ہے تو آبرو رہی کہ گئی؟ یا تو میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ نہیں مجھ سے نہ رہا جائے گا۔ میں عورت ذات، بے بس چیز، تم اپنے اخبار کے جوش میں کسی دن یار دوستوں کو اندر بلا لو تو میں تو کہیں کی نہ رہی، نہ میکے میں منھ دکھانے کے قابل رہوں گی، نہ سسرال میں۔

ناظرین آخر وعدہ ہی کرتے بنی کہ میں خود اس اخبار ناہنجار سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہ رکھوں گا اور جو شخص اِس سے واسطہ رکھے گا اس سے اور اس کے واسطے والوں سے مجھ سے آج یا کسی وقت کوئی سروکار نہ ہوگا۔ (پرچہ کلب کے پتہ سے جاری ہوگا)۔

O

چودھواں باب

"آج شوهر صاحب فری میشن کے ایک جلسے میں شریک هوئے هیں. کوئی چنده هونے والا تها. اس خیال سے شوهر صاحب نے بٹوه کپڑوں کی جیب میں رکھ دیا تها. وهاں پهنچ کر بٹوه جیب میں نه پایا، سمجھے که راستے میں کوئی شخص نکال لے گیا، یهاں تک که گھر واپس آئے، اور راز کھلا."

بھاگ ان بردہ فروشوں سے، کہاں کے بھائی
کھودیں چندے میں جو یوسف سا برادر پائیں

''کیا کہوں؟ خدا نے مجھے عورت بنایا جو مردوا ہوتی......''

''جو مردوا ہوتیں تو میرا دل بہت خوش ہوتا۔''

''تمھارا دل کیوں خوش ہوتا؟''

''یوں ہی۔''

''یونہی نہیں بلکہ اس واسطے کہ میں بیاہ کے نہ آتی تمھارے گھر، کیا میں مطلب بھی نہیں سمجھتی؟''

''یہ مطلب نہ تھا میرا، تم نے ایک بات کہی وہی الٹ کے میں نے بھی کہہ دی۔''

یہ تم نے الٹ کے کہی کہ آج پھر روز کے جھنجھٹ کا ڈھنگ ڈالا؟ دن بھر تو میں کام دھندے میں مروں پھروں۔ رات کو بھی سونا نہ نصیب ہو؟ لیجیے صاحب دعا مانگی جاتی ہے کہ خدا کرے میں مردوا ہوجاؤں۔ ایسے بھی کسی کے پیچھے نہیں پڑ جاتے۔ ایسا بھی کسی کو بے بس کر کے نہیں جلاتے ہیں۔

''لے بھلا میں نے کیا کہا تھا؟ جس پر تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی؟ تم نے نہیں تو میں نے کیا کہا؟''

تم نے کچھ کہا ہی نہیں اپنے نزدیک؟ اور کیا کہتے؟ کیا لاٹھی مارتے یا جھونٹے پکڑ کے باہر نکال آتے؟

(شوہر صاحب نے اونھ کر کے کروٹ پھیر لی)

میں جانتی ہوں جس بات پر ناک بھوں چڑھائے ہو، مگر جو غور کرو تو تمھارے ہی فائدے کے لیے کیا تھا، کوئی اپنے نفع کی بات نہیں کی تھی۔

''کون بات؟''

وہی بٹوے والی۔

''کون؟''

اے وہی جو بٹوہ میں نے رکھ لیا تھا۔ اسی کا تو غصہ ہے؟ اب یہ دانت پیس پیس کر لمبی لمبی سانس نہ بھرو، میں نے یہی خیال کر کے تو جیب سے نکال لیا تھا کہ وہاں کسی واہی تواہی چندے میں پھینک آؤ گے، نہ دین کا نہ دنیا کا، اسی مارے میں نے نکال لیا تھا۔

''تو یہ کہیے کہ بٹوہ آپ ہی نے نکال لیا تھا؟ یہ تو اب مجھ کو معلوم ہوا مگر تم نے بڑی نالائق حرکت کی۔ آج مجھ کو بڑی خفت اٹھانا پڑی تم کو اپنے شوہر کی آبرو کا بھی خیال نہیں؟''

آبرو کا اس میں کون بیچ تھا؟ آبرو کا اگر خیال ہوتا تو ایسی جگہ جاتے ہی کیوں جہاں بے آبروئی کے خیال سے لوگ عورتوں کو نہیں لے جاتے؟

''خیر یہ تو پرانی بات ہے کہ عورتیں فری میشن نہیں ہوتیں اس لیے فریمشنری بری چیز ہے۔ مگر یہ بتاؤ کہ تم کو کونسی دولت مل گئی اس حرکت سے جو میں چار ہم چشموں سے شرمندہ ہوا۔''

اسی چار ہم چشموں میں شرمندگی کے خیال سے تو میں نے بٹوہ رکھ لیا تھا۔ جانتی تھی

کہ جو کچھ گھر کی جمع پونجی ہوگی وہاں حوالے کر آؤ گے؟ دو چار جلسے فرامشن کے یوں ہی ہوں تب البتہ آبرو جائے گی اور تب ہی تمھاری آنکھ بھی کھلے گی کہ ہاں ہم چشموں میں خفت اس طرح کی ہوتی ہے۔ جب روپیہ پیسہ چند دن میں اڑ جائے گا اور میاں کھکھ رہ جائیں گے اس وقت پھر نئی بھائی بندی والے بھی نہ پوچھیں گے۔ اس وقت تک کی بھائی بندی ہے جب تک جیب میں چار پیسے ہیں۔

"لاحول و لاقوۃ، تم نے فریمشنری کو بھی کوئی وہ جان لیا ہے۔ یہی تو دنیا میں ایک جلسہ ہے جس میں امیری غریبی کا فرق نہیں۔"

بس رہنے دو، ناحق منہ کھلواتے ہو، ابھی اسی روز اخبار میں فخریہ پڑھ کر مجھے سنا رہے تھے کہ دعوت میں صدر نشینی عالی جناب برادر معظم نواب فلاں صاحب نے قبول فرمائی۔ اگر فرامشنی میں روپے کا خیال نہیں ہے تو اتنے بھائی بندوں میں ان کو کیوں صدر نشینی ملی؟ تم کو کیوں نہ مل گئی؟ اور پھر یہ بھی کہ اور سب کے نام کے آگے خالی برادر اور ان کے نام کے آگے معظم کی مثال بھی روشن۔ یہ دولت کی وجہ سے نہیں تو اور کیا؟

"(دراصل غصہ میں) زیادہ بک بک مت کرو، میں نے کہہ دیا کہ جس چیز کی واقفیت نہ ہوا کرے اس میں بحث ہی کرنا فضول ہے، مگر تم نہیں مانتیں۔"

مانوں گی کیسے نہ؟ کمزور مانے گا نہ تو کرے گا کیا؟ مگر زبان تو نہیں رکے گی۔ بس اتنا اپنے دل میں تول لو کہ اسی طرح میں بھی کہیں بہناپا قائم کر آؤں تو کیسی مرچیں لگیں؟

"قائم کیوں نہیں کر آتیں؟ تم کو کسی نے منع کیا ہے؟"

جانتے ہو کہ نہ قائم کرے گی، نہیں تو ایسا نہ کہتے۔ ابھی کوئی کام تم سے چھپا کے کروں تو تمھارے دل میں سو طرح کے وسوسے آئیں گے، چاہے چُرا کے نماز ہی کیوں نہ پڑھنے جاتی ہوں، ایسا ہی دوسرے کا دل بھی جانو، میں سچ کہتی ہوں، جتنی دیر تم جادو گھر میں رہتے ہو، میرا دل نہیں ٹھکانے ہوتا ہے، نہ معلوم کیا کیا شک پیدا ہوتے ہیں۔

"ناحق کو شک پیدا ہوتے ہیں، اس میں شک کرنے کی کونسی بات ہے؟"

ہے کیسے نہیں؟ ایک تو اس کے نام ہی سے وحشت معلوم ہوتی ہے۔ بچپن سے سنتے آئے ہیں جادو برحق کرنے والا کافر؟ اور پھر یہ بات کہ عورت نہیں شریک کی جاتی۔ دنیا بھر میں کوئی کام ایسا نہیں جو بغیر عورت کے ہاتھ کے بنتا ہو، جو کام بے عورت کی مدد کے ہوگا خدا ہی نے کہا کہ خراب ہوگا۔ بابا آدم پہلے پیدا کیے گئے، جب دیکھا کہ بغیر ماما حوا کے کام نہ چلے گا وہ پیدا کی گئیں۔

"جی ہاں، جب ہی تو دونوں جنت سے نکال باہر کیے گئے۔"

اب یوں کہنے کو چاہے کہو، مگر قائل ہوگئے ہوگے دل میں؟ نکالے گئے تو اس میں ماما حوا کا کیا قصور تھا؟ اور یہ تو صاف بات ہے کہ اگر ان کا قصور ہوتا تو چھوڑ نہ دیتے ایسی عورت کو؟ خیر یہ باتیں تو اور ہیں، یہ بتاؤ کہ چندہ وندہ تو نہیں تھا آج؟

"تھا کیوں نہیں؟"

تو پھر تم نے تو نہیں دیا؟ بولتے کیوں نہیں؟ تمھارے مسکرانے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دے آئے ہو، جیسے؟ تمھیں ہمارے سر کی قسم؟

(گردن ہلا کے رہ گئے)

پہیلیاں نہ بجھواؤ، منھ سے بولو۔ روپیہ کہاں تھا، جو دے آئے؟

"چک بک پڑی تھی میری جیب میں۔"

ہاں تو یہ کہو کہ بنک گھر سے روپیہ نکلوایا گیا ہے۔ ہاں ٹھیک تو ہے، اس میں شان ہی اور معلوم ہوتی رہے گی۔ لوگ خیال کریں گے کہ بھائی صاحب بڑے آدمی ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر بینک گھر کے نام حکم بھیج دیتے ہیں۔ یہ کسے معلوم کہ ہاتھی کے دانت فقط دیکھنے ہی کے ہیں؟ چک بک ہی چک بک فقط ہاتھ میں ہے ورنہ بنک گھر میں سوائے دو چار سو کے میاں کا کچھ بھی نہیں۔ اور پھر میں کہتی ہوں، اگر تم کو اس طرح بنک گھر سے روپیہ نکال لینا ہی تھا تو پھر جمع ہی کاہے کو کیا تھا؟ اِس سے تو اچھا یہی تھا کہ جمع ہی نہ کرتے۔ گھر ہی میں رہنے دیتے، گھر میں واہی تواہی کاموں کے لیے روپیہ نکالتے کچھ طبیعت رکتی ہے۔ یہی خیال ہوتا کہ کہیں یہ کم بخت پوچھ بیٹھی تو کیا بتاؤں گا؟ بنک میں تو یہ ڈر نہیں۔

ان سے کیا مطلب؟ جتنا روپیہ جس کا ہے وہ جس وقت چاہے لے جائے، چاہے پھینک دے، چاہے لٹا دے، مگر یہ کہے دیتی ہوں کہ یہ چال اچھی نہیں۔ اس چال میں گھر نہیں رہنے کا، نہ نوکری ہی رہے گی، نہ گھر، آخر کچھ بتاؤ گے کتنا دے آئے ہو؟ بولو؟ اے بولتے کیوں نہیں؟ کہیں خون کے جوش میں میرے نام کا روپیہ بھی تو نہیں دے آئے؟

"تمھارے روپے میں سے میں کیوں دیتا؟"

اچھا تو اپنے حساب میں سے کتنا خرچ کر آئے؟

"سو روپیہ۔"

سو روپیہ!! مجھ کو تو سن کے سکتہ سا ہو گیا۔ اس وقت سو روپیہ؟ لے اب خدا ہی ہے اس گھر کا۔ ادھر پھرو، ذرا منھ تو سونگھوں تمھارا؟ کہیں شراب پی کر تو نہیں آئے ہو؟

"لاحول و لاقوۃ! اس میں شراب کا کیا دخل ہے؟"

شراب کا دخل نہیں تو پھر کیا ہے؟ تمھاری اوقات والا آدمی کہیں ہوش و حواس میں بھلا سو روپیہ اس طرح پھینک سکتا ہے؟ میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، یہ سن کر۔

"اچھا جو اڑ گئے ہیں تو اڑنے دو، اور منگوا لینا، اب آؤ آرام کریں۔"

آرام تم کرو، میں آرام کر چکی، آرام کرنے کا حال تو جب معلوم ہوگا جب بھائی بند لوگ بیچ کھائیں گے۔ جب نخاس[1] میں کھڑے ہو کر پرانے کپڑے بیچتے ہونا، تب آرام کرنا، ابھی نہیں، میں تو جیوں ہی گی کاہے کو تب تک؟

ناظرین دیکھا آپ نے روپے کی قوت کو، نہ معلوم کتنا طولانی لکچر ہوتا آج کا۔ مگر سو روپے والی بات سن کر کروٹ بدل کر جو سوئیں تو پھر خبر نہ ہوئیں۔ حالانکہ میں نے اصل میں دس ہی روپیہ چندہ دیا تھا۔ مگر زچ[2] ہو کر سو بتائے۔ صبح باہر جاتے وقت کہہ دوں گا۔

O

---

1 پرانے کپڑے اور پرانی چیزوں کا بازار جو لکھنؤ میں ہے

2 عاجز ہو کر، تنگ آکر۔

خاکے

یادِ احباب

عرضِ مرتب

اچھے خاکے کی خوبی غالباً یہی ہوتی ہے کہ اس میں کسی شخصیت کے کچھ اہم اور منفرد پہلو اس انداز سے پیش کیے گئے ہوں کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں اس کی مخصوص شخصیت کی موثر تصویر بن جائے، تصویر جس میں اس کی صورت، سیرت، افتاد، ذہن، اس کے کردار اور اس کی فکر کی خوبیاں اور خرابیاں سامنے آجائیں۔ خاکہ لکھنے والے کو اپنے ذہن میں یہ بھی رکھنا ہوتا ہے کہ خاکہ کسی فرد کی مکمل داستان حیات نہیں ہوتا۔ اس میں تفصیل سے زیادہ اختصار اور توضیح سے زیادہ ابہام سے کام ہوتا ہے۔ فن کی پاسداری کے ساتھ ساتھ مزاح کے چھینٹے بھی ضروری ہوتے ہیں، طنز سے دامن بچانا ہوتا ہے کہ طنز اور ہجو میں حد فاصل بس تخیئلی ہوتی ہے۔ پھر ذاتی پسند یا ناپسند، شخصی عناد اور ذاتی بغض و حسد سے بھی اجتناب لازم ہے۔ خاکہ نگاری مدّاحی بھی نہیں ہوتی اور ہجونگاری بھی نہیں ہوتی۔ اچھے خاکے سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر بھی نہیں لکھے جاتے۔ اچھا خاکہ تو بس لکھنے والے کے اپنے مشاہدے اور ذاتی تجربے میں آئے ہوئے واقعات پر مبنی ہوتا ہے۔

اردو میں خاکہ نگاروں میں فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی سے لے کر علی جواد زیدی، غلام احمد فرقت کاکوروی اور بلونت سنگھ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ چودھری محمد علی کے لکھے ہوئے خاکوں کو پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ اب آپ پر ہے کہ آپ انھیں خاکہ نگاروں کی صف میں کہاں کھڑا کرتے ہیں۔

آخر میں یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جلد میں خاکے کے عنوان کے تحت جو سات خاکے دیے گئے ہیں، وہ کشکول محمد علی شاہ فقیر کے پہلے ایڈیشن میں تھے۔ میں نے انھیں ان کی دلچسپی اور جلدوں کی ضخامت کے پیش نظر وہاں سے نکال کر اِس جلد میں شامل کردیا ہے۔

راجہ پرتھی پال سنگھ

پودوں میں ایک قسم ہوتی ہے جن کو انگریزی میں ''پیراسائٹس'' کہتے ہیں۔ اپنے ملک کی زبان میں ان کو بیل کہہ لیجیے، ان میں یہ بات ہوتی ہے کہ دوسرے کے بل بوتے پر خوب پھلتے ہیں۔ اگر یوں زمین پر بو دیجیے تو تھوڑے سے بڑھ کر رہ جاتے ہیں۔ اگر کوئی چیز ایسی پا گئے جس پر چڑھ سکیں تو جی بھر کر پھولتے اور پھلتے ہیں۔ ہمارے بچپن کے یار، ساتھ کے کھیلے ساتھ کے پڑھے راجہ پرتھی پال سنگھ تعلقہ دار سورج پور کی افتادِ طبیعت ایسی ہی تھی اگر اس بات کو یاد رکھیے گا تو ان کی زندگی کا ہر پہلو ان کے ہر قول ہر فعل ہر کام کی چھپی ہوئی تہہ آپ پر کھل جائے گی۔ میرا ان کا ساتھ کالون تعلقہ دار کالج جو اس زمانے میں اسکول کہلاتا تھا 1892 سے ہوا۔ یہ کوئی گیارہ برس کے ہوں گے اور میں دس برس کا تھا۔ پرتھی پال سنگھ کی خصوصیات حسب ذیل تھے۔

صاف دلی، ذہانت، نیکی۔ بعض باتوں میں بہت نڈر، بعض باتوں میں بڑے ڈرپوک۔ مثلاً اندھیرے میں ہَو سے کر دو تو بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ بجلی چمکے تو لحاف سے منہ بند کر کے لیٹ رہیں۔ اگر بات پر اڑ جائیں تو چاہے جان ہی جائے اس پر قائم رہیں۔ دوست احباب کے کام آنے کے موقعے ڈھونڈھا کریں۔ موٹے تھلتھلے آدمی تھے۔ فٹ بال فیلڈ میں خود فٹ بال معلوم ہوتے تھے۔ ٹینس غنیمت کھیلتے تھے، گھوڑے پر اچھا چڑھ لیتے تھے۔ ان کی عشق پیچاں والی افتادِ طبیعت کا پہلا نمونہ جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ ہمارے رائڈنگ اسکول کے دفعہ دار کے مرید ہو گئے۔ دفعہ دار بے چارہ ان پڑھ سرکاری پنشن خوار سپاہی بھرتی ہوا اور دفعہ داری سے پنشن پائی۔ پرتھی پال سنگھ کے مشیر تھے، انگریزی کپڑے بنوائیں گے تو دفعہ دار سے مشورہ کر کے، ٹینس کا بلّا خریدیں گے تو دفعہ دار سے پوچھ کے حتیٰ کہ کوئی کتاب بھی مول لیں گے تو دفعہ دار سے صلاح لینے کے بعد۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

یہ سلسلہ پڑھے لکھے جاہل، نیم تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ عمر بھر جاری رہا۔ پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھے۔ مذہبی تعصب کہیں چھو تک نہیں گیا تھا۔ چوکا برتن تو بڑے احتیاط سے ہوتا تھا مگر چھوت چھات سے پیدائشی نفرت تھی۔ اتنی جرأت تو تھی نہیں کہ پندرہ سولہ برس کے سن میں کھلم کھلا ہم لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتے مگر چوری چھپے کسی چیز سے پرہیز نہیں تھا۔ اس کے بعد دو آدمیوں کا اثر ان کے اوپر بہت پڑا ایک کورٹ آف وارڈس کے ہیڈ کلرک تھے اور دوسرے میرے خیال میں ایک تھیا سوفسٹ تھے۔ کلرک نے تو شمپین اور گزگ کی آزاد خیالی اور آزادہ روی کی راہ لگائی۔ بڑی جھبج داڑھی والے وکیل زیادہ اہم باتوں کی طرف لے گئے۔ پولٹیکل خیالات ہندو مسلم فرق ملک کی سیوا، انگریزوں سے نفرت یہ باتیں پختہ ہونے لگیں۔ اس جگہ پرتھی پال سنگھ کی مضبوطی کا ایک واقعہ سن لیجیے۔ یقیناً ہم لوگ انیس بیس برس کے رہے ہوں گے، ہم لوگوں کے علاقے ابھی تک کورٹ کے انتظام میں تھے۔ فیض آباد میں ایک کمشنر تھا جو نہایت منصف مگر بہت بد دماغ آدمی مشہور تھا۔ علاوہ اور باتوں کے ایک سنک اس میں یہ بھی تھی کہ اگر لوگ اس سے ملتے نہیں تھے تو وہ برا مانتا تھا۔ بعض انگریز تھے، جو زیادہ ملاقاتیوں کا آنا پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے ہم غریب نابالغوں کو بڑی دقّت پڑتی تھی۔ حکام میں کوئی غرّاتا تھا کوئی دُم ہلاتا تھا اور ہم بدقسمتوں کو ملنے کے پہلے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ انگریز غرّانے والا ہے یا دُم ہلانے والا۔ بعض تھے جو غرّاتے بھی تھے اور ساتھ ہی دم بھی ہلاتے جاتے تھے۔ ان کا سمجھنا سب سے مشکل تھا کہ کس سرے کا اعتبار کیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس کمشنر نے ایک بوڑھے ذی عزت تعلقہ دار کو بھنبھوڑ کھایا۔ ان سے اس نے پوچھا، آپ ہم سے کبھی اور ملے ہیں۔ انھوں نے کہا نہیں۔ اس نے کہا تو ہم آپ سے نہیں ملنا چاہتا۔ یہ کہہ کر اٹھ گیا۔ یہ بے چارے بہت شرمندہ ہوئے۔ ان کو عمر بھر میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا، ان کی تکلیف کا اندازہ مشکل ہے۔ اس کے بعد یہی مصیبت مجھ پر پڑی، میں مبہوت رہ گیا اور اٹھ کر چلنے لگا۔ لیکن اس نے پھر بٹھا لیا۔ مگر مجھ سے کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑتا تھا۔

تیسرا واقعہ پرتھی پال سنگھ کا ہوا، ان سے بھی اس نے یہی کہا۔ انھوں نے جواب دیا، مجھ کو بڑا افسوس ہے کہ میں ایسے گستاخ آدمی سے ملنے آیا اور اٹھ کر چلے آئے، اس کے

بعد سے اس کے کان ہوگئے اور پھر اس طرح کی حرکت اس کی سنی نہیں گئی۔ بغیر پہلے اور بعد کا لحاظ کیے ہوئے ہمارے دوست کا ایک اور واقعہ سن لیجیے، جو تصویر کا دوسرا رخ دکھاتا ہے۔

اُس وقت ہم لوگوں کا سن اور بھی کم تھا مگر ٹھیک وقت یاد نہیں، بڑے دن کی چھٹی ہونے کو دو تین دن باقی ہیں،دل کی خوشیاں بڑھ رہی تھیں۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے ہوں گے پرتھی پال سنگھ ہیڈ ماسٹر کے پاس پرائیویٹ ٹیوشن لے رہے ہیں۔ پڑھنے کے بعد رخصت ہوتے ہیں، برآمدے میں اندھیرا ہے کونے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کالا بھجنگ آدمی دس فٹ کا قد مٹکے کا ایسا سر لیے کھڑا ہے۔ یہ ایک چیخ مار کر پھر کمرے میں گھس گئے اور ہیڈ ماسٹر صاحب پر پھاٹ پڑے، جھڑپ جو لگی تو لیمپ بھی گر کر بجھ گیا۔ اچانک واقعہ ایسا ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی پرتھی پال سنگھ کی چیخ میں چیخ ملائی،نوکر جب تک آویں آویں کالا دیو رفوچکر ہوگیا تھا۔ لیمپ جلا تو لوگوں کے حواس بجا ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب جو رضائی اوڑھے بیٹھے تھے اور اس وقت جو کرسی کے گدے کا کام بھی دے رہی تھی، صبح کو بیچ میں دھوئی نچوڑی ہیڈ ماسٹر صاحب کی دیوار پر پھیلی تھی۔ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے خطا ہوگئی یا پرتھی پال سنگھ سے آج تک نہ دریافت ہوسکا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد آزادی کے خیالات زیادہ ہوگئے، علاقہ بھی کورٹ سے چھوٹ گیا۔ عالی ہمت آدمی تھے، ہاتھ بھر کا کلیجہ تھا جو کام کرتے تھے بڑے پیانے پر ہوتا تھا، اگر کسی کو دیں گے تو اس کی امید سے زیادہ، اگر مکان کی بنیاد ڈالیں گے تو ایسی کہ دو منزل کا اگر بنوانا ہے تو تین منزل سنبھال لیے۔ اگر ہنسیں گے تو جی بھر کے، بچپن میں اگر غصہ کریں گے تو اسی طرح جی بھر کے۔ چنانچہ ایک مکان بنوایا، کلکتہ کے مشہور انجینئرس مارٹن اینڈ کو ٹھیکہ دیا تھا۔ اس زمانے میں ڈھائی لاکھ کا مکان آج دس لاکھ کا اسٹیمیٹ بیٹھتا، دو منزلیں، تیسرا ہوادار گنبد، غسل خانے اول درجے کے، جس میں اسپرے باتھ، شاور باتھ اور نہ معلوم کیا کیا لگایا تھا، لفٹ بھی تھا، کتب خانہ بھی اسی پیانے کا تھا۔ کارل مارکس ینگ فرائیڈ سے تو شاید مشکل ہی سے واقف رہے ہوں گے، مگر مل اور ہربرٹ اسپنسر اور مسز اینی بیسنٹ برائٹ، بریڈلا کے ماہر تھے۔ یقیناً ہولاک ایلس سے بھی ناواقف نہ رہے ہوں گے۔ تلک کا فلسفہ تو تھا ہی، یہ کتب خانہ

آج بھی الہ آباد یونیورسٹی میں موجود ہے۔ لاوارث پڑے رہنے سے تو بہتر ہوا کہ پرتھی پال سنگھ کی خیرات مرنے کے بعد بھی ان کے ملک والوں کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔ میرا ان کا ساتھ بیچ بیچ چھوٹ جاتا تھا مگر دل کے تعلقات میں فرق نہ آتا تھا۔ مختلف زمانوں میں برسوں ملنے کی نوبت نہ ہوئی مگر جب ملے تو اسی صفائی سے ملے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، ان کی پوری سوانح عمری نہیں ہے۔ اس یاد احباب کی مثال اس طرح سمجھ لیجیے۔ جیسے کوئی مصور ہو اور روٹیاں کمانے سے الگ خالی یاد پر اپنے بچپن کے یاروں کے اسکیچ بنانے کی کوشش کرے۔ کامیاب ہو یا نہ ہو مگر جو انداز ان لوگوں کے اس کے دماغ میں ہیں وہ تو نکال ہی لے گا۔ کسی دوسرے کو اچھے لگیں یا نہیں، اس کے لیے تو پرانی یاد تازہ ہو کر مزا دے جائے گی۔ بوڑھی ماں زندہ تھیں۔ بیاہ کا تقاضا شروع ہوا۔ مگر پرتھی پال سنگھ اس رنگ پر نہ آتے تھے، وجہ نہیں معلوم ہوتی تھی کہ شادی سے کیوں گھبراتے ہیں۔ ہم لوگوں نے اکثر کہا مگر سوا ہنس کر ٹال جانے کے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب ملک کی سیوا کی خواہش اور پولٹیکل خیالات اور گہرے ہونے لگے۔ لوک مانیہ تلک کا دور دورہ تھا، نہ معلوم کس سلسلے سے وہاں پہنچ گئے کچھ دن وہاں رہ کر کام کیا اس کے بعد واپس آگئے باوجود آزادی اور صاحب اختیار ہونے کے جاننے والوں کو دو باتوں کا پتہ چلتا تھا۔ ایک تو یہ کہ ملک کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ کام کچھ برہمچاری ہی خوب کرتا ہے۔ اگر شادی ہوگئی تو چلتی گاڑی میں روڑا اٹک جائے گا۔ دوسرے یہ بھی انداز ملتا تھا کہ ابھی تک یہ طے نہ کر سکے تھے کہ سیوا کا کون کام تجویز کریں جس پر اپنی پوری زندگی تج دیں۔ دفع الوقتی کے لیے غریب لوگوں کی تعلیم میں مدد کرنا، بڑے اداروں کو چندہ دینا، پولٹیکل بتنے بازوں کے جعل فریب میں آجانا فی الحال یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔ تعلیمی خیرات کے سلسلہ میں ایک غریب خاندان کی ایک لڑکی کو کُمائیوں کے پہاڑ میں دیکھا۔ اس کا وظیفہ مقرر کر کے کسی پاٹھ شالا وغیرہ میں بھیج دیا۔ میرے خیال میں اچھے آدمیوں کی پہچان میں سے یہ بڑی پہچان ہے کہ اس کو بچوں سے محبت ہو۔ پھر اگر بچہ خوبصورت ہو تو اس کی طرف تو دل اور کھنچتا ہے۔ اس لڑکی کو بھی دیکھ کر لوگوں کے دل میں ویسی کیفیت پیدا ہوتی تھی جیسے کوئی کلی جو رنگ پکڑ چکی ہو یا شمع روشن ہو۔ پرتھی پال سنگھ جب گرمیوں میں نینی تال جاتے

تھے تو یہ لڑکی بھی چھٹیوں میں آتی تھی اور اس کے گھر والے سلام کے لیے لے آتے تھے۔ سال دو سال میں لڑکی کی شان ہی دوسری ہوگئی۔

قدم قدم پہ اٹھاتے ہو فتنۂ محشر
یہ کم سنی کا ہے عالم شباب کیا ہوگا

کچھ دنوں میں یہ ہوا کہ دیکھنے والے درود بھیجنے لگے اور دن گزرے تو قرآن پڑھنے لگے۔ "فتبارك الله احسن الخالقين" ایک ڈراما میں ایک ڈویل ہونے والی تھی میدان بدا گیا۔ جن صاحب نے لڑنے کا پیغام بھیجا تھا، ان کو اپنی بہادری کا بڑا دعویٰ تھا، جب موقع پر پہنچے تو اپنے ساتھی سے کہنے لگے ارے یار اب تو بہادری کچھ کم ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ اے لو یہ تو بہت ہی کم ہوگئی۔ اس لڑکی کا اٹھان دیکھ کر پرتھی پال سنگھ کا برہمچاری پن بھی اسی بہادر کی راہ جاتا دکھائی دیا۔ آخر کھیت رہے، پرتھی پال سنگھ گزر گئے، ان کی بی بی کی مٹی نربدا نے اپنی گود میں لے لی، ہم خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں مگر پرانے تذکروں سے کچھ تازگی سی آگئی ۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

جوانی کی منزل پار کر چکے، بڑھاپے کا راستہ بھی کٹنا چاہتا ہے مگر ''دل ابھی تک جوان ہے، پیارے ایک آفت میں جان ہے پیارے۔ دوست کا قصہ پھر کہوں گا لگے ہاتھوں دو چار شعر سن لیجیے، ان کا ربط قصے سے ہو نہ ہو آپ جانیں۔ میرے دل میں لہر اٹھی ہے۔ میں لکھے جاتا ہوں، آپ کا جی چاہے گا چھوڑ جایئے گا۔

چھپ چھپ کے دیکھنے کے مزے سب یہ اے اثر
معلوم ہوں گے جو کبھی ان نے نگاہ کی

نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزا میں کیا کہوں آغاز آشنائی کا

اے فغاں دیکھنا سمجھ لینا
دے کے دل پھر لیا نہیں جاتا

سایۂ طوبیٰ و دل جوئی حور و لبِ حوض
بہ ہوائے سر کوئے تو ہرفت از یادم

ز بادشاہ و گدا فارغم بحمد للہ
گدائے خاک در دوست بادشاہ مست

اڑائے ساتھ یہ مشت غبار لیتا جا
ہمیں رکاب میں او شہسوار لیتا جا

کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد
بریدہ ز ہمہ با خدا گرفتار است

اب زندگی ہی دوسری ہوگئی ملنا جلنا کم ہوگیا، پولٹیکل دلچسپیاں ماند پڑ گئیں۔ اگر کوئی ملتا ہے تو اسی طرح مل لیتے ہیں، جیسے ہمیشہ ملتے تھے مگر دل کہیں اور ہوتا ہے۔

''میں تو پیا تورے رنگ ماں سمائی رہی''

سے مطلب سمجھ جائیے۔ آدھا علاقہ رانی صاحبہ کے نام لکھ گیا، باقی آدھا خرچ اخراجات کے لیے رہا، اس آدھے کی مادھو لوٹ پڑ گئی۔ نہ معلوم کتنا قرضہ ہوگیا۔ بدقسمتی دیکھیے کہ اولاد کوئی نہ ہوئی۔ ان کے سالے کی ایک پیاری پیاری لڑکی تھی اس کو اولاد سے زیادہ چاہتے تھے۔ غالبؔ سے کہا گیا تھا کہ جو شخص شراب پیتا ہے اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ انھوں نے جواب دیا کہ جب شراب مل گئی تو اب کون چیز رہی جس کے لیے دعا مانگی جائے۔ یہی حال ہمارے دوست کا تھا۔ مذہبی پختہ دلی سے دل مضبوط، رعایا پروری سے ضمیر کو آرام، وہ لڑکی آنکھوں کا نور چاہنے والی سے دل کا سرور زندگی کی چاشنی، علم اور کتابوں سے دل کی طاقت، دماغ کی روشنی گرمیوں میں مسوری جاڑوں میں ہتھوندا کی

جنت نما کوٹھی اور سب پر اضافہ مزے کا حقہ لکھنؤ کا خمیرا، لچھے دار دھواں خوشبو کی لپٹیں جو بابو بنکم چندر چٹرجی کو للچا ئیں۔ عمر خیام کے خوابوں کی تعبیر اگر یہاں نہیں مل رہی تھی تو کہاں مل رہی ہوگی۔ ظاہرا ٹیم ٹام اور اوچھے پن سے نام پیدا کرنے سے ان کو ہمیشہ نفرت مگر وہ بھی بن مانگے مل رہی تھی۔ سر ولیم میرس کا زمانہ، راجہ سورج پور یوں ہی کہلاتے تھے اب گورنمنٹ نے بھی یہ خطاب بے مانگے ان کے سر منڈھا ان کو ذری سی خوشی نہ ہوئی مگر مفت کی لڑائی کون مول لے۔ اس لیے چپ رہے۔ پرتھی پال سنگھ بلاوجہ انگریزوں سے لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر ان کو بھی دوسرے پڑھے لکھوں کی طرح انگریزی حکومت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ سر ولیم کے پہلے ایک مرتبہ بارہ بنکی میں لیفٹیننٹ گورنر آئے تھے، ایک چھوٹی سی لیوی ہوئی، پرتھی پال سنگھ اس میں مجبوراً آئے مگر بالکل معمولی کپڑے پہن کر۔ اس زمانے میں فلٹ کیپ اور گھٹنوں تک کا بند کوٹ کلارک لوگ عموماً پہنا کرتے تھے۔ پرتھی پال سنگھ بھی ہیڈ کلارک کے بھیس میں آئے تھے۔ شام کو جب گارڈن پارٹی ہوئی تو یہ بڑی عمدہ انگریزی پوشاک پہنے تھے اس کو بعض انگریزوں نے بھی دیکھا، دانت پیس کر رہ گئے۔ تھوڑے دنوں بعد سر ولیم نے پرتھی پال سنگھ کو لکھا کہ ہم تم کو وزارت میں لینا چاہتے ہیں، انھوں نے کیا یا رانی صاحبہ نے رائے تو اسی وقت قائم کر لی تھی، مگر دنیا کو قائل کرنے کے لیے دو چار احباب سے مشورہ بھی لے لیا۔ نتیجہ تو پہلے ہی معلوم تھا۔ انھوں نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ خوشی کی پینگیں مزے کی لہریں، عیش کی راتیں آرام کے دن کب تک رہتے ۔

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

لیجیے صاحب ورق جو الٹتا ہے رانی صاحبہ چل بسیں، اس کے بعد وہ لڑکی بھی بعد کو گزر گئی۔ پرتھی پال سنگھ تنہا رہ گئے۔ مذہب سے کبھی بے خبر نہ تھے۔ اب سوا اس سہارے کو کون سہارا پکڑیں۔ ممالک متوسط میں کھنڈوا بڑی جگہ سمجھا جاتا ہے۔ داداجی کا دربار ہندستان کی بڑی جگہوں میں سے ہے۔ پرتھی پال سنگھ کا عقیدہ بہت دنوں سے ادھر مضبوط تھا۔ اب بالکل وہیں کے ہو گئے۔ خاندان کے ایک لڑکے کو راس بٹھایا اور خود کھنڈوا چلے

گئے۔ کھنڈوا میں داداجی کے دربار جانے کو بہت جاتے ہوں مگر پرتھی پال سنگھ اس طرح گئے کہ پھر کسی چیز سے واسطہ ہی نہ رکھا۔ ''جوبن پیا بارے سے تج دیں'' انھیں کو کرتے دیکھا، روپیہ ضرور گھر سے جاتا تھا مگر اس کا انتظام ٹرسٹ کے ذریعہ سے پہلے ہی کر چکے تھے۔ جان جسم عقل رائے سب کچھ داداجی کا ہوگیا تھا ان کو جینے کا حکم تھا جیتے تھے، جب مرنے کا حکم ملا اسی آن مر بھی گئے۔ نہ دل میں خوف نہ ہراس، نہ خوشی، نہ غم نہ دھڑکا نہ قلق، نہ نفرت نہ رغبت، یورپ والا تو سمجھ نہیں سکتا تھا دنیا دار ہندستانی جوان باتوں کو کچھ سمجھتا بھی ہے وہ بھی راضی برضا کا یہ درجہ دیکھ کر مبہوت رہ جائے گا۔ عشق پیچاں والی بات جو شروع میں عرض کی گئی اب ایسی ایسی صورتوں میں ظاہر ہونے لگی کہ اگر ہمارے دوست کی جگہ دل میں نہ ہوتو ناواقف دماغ کی خرابی سمجھے۔ میں خود کھنڈوا نہ پہنچ سکا، لیکن ہمارے دوسرے احباب جو وہاں گئے اور جن کے بیان میں شک کی گنجائش نہیں ہے اپنے چشم دید واقعات بیان کرتے ہیں۔

اس مذہبی دربار کی خصوصیات میں سے ہے کہ داداجی مہراج کے منھ سے وجدان میں کبھی کبھی ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں کہ ظاہردار لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آتے، ان باتوں کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس استھان کے فیضان میں حصہ رکھتے ہیں اور روحانیت کی روشنی حاصل کر چکے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اسی طرح کے ارشادات کی بنا پر پرتھی پال سنگھ نے کسی بہت چھوٹے آدمی کو بہت قیمتی ریشمی گاؤن بنوا دیا ہے۔ کسی اسی درجے کے آدمی کو موٹر کار خرید دی ہے جواہرات اور دولت سے وہ لوگ مالا مال ہوگئے جو نہ علم رکھتے تھے اور نہ ہنر اور جن کا برتاؤ پرتھی پال سنگھ کے مرنے کے بعد اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوگیا۔ اتنا پڑھا لکھا آدمی اتنا سمجھ دار شخص اور اس طرح معمولی آدمیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہوکر رہ جائے۔ اگر آدمی زحمت نہ اٹھانا چاہے تو یہ پورا معمہ ایک لفظ میں حل ہوسکتا ہے۔ یعنی سٹری پن، ہاں اگر کوئی دماغ پر زور دے تو ممکن ہے کچھ معنی بھی نکل سکیں۔ ویدانت اور تصوف میں پہلی شرطوں میں ہے کہ خودی نہ رہ جائے۔ اس درجے پر پہنچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کھانا پینا، روپیہ پیسہ، ضروریات زندگی کی خواہش دور کردی جائے۔ مختصراً مایا کی محبت نہ رہ جائے۔ آدمی کھانا کھائے مگر صرف اس واسطے کہ اس کو حکم دیا گیا

ہے کہ کھاؤ۔ پانی اس واسطے پیے کہ اس کو حکم دیا گیا ہے کہ پیو اس واسطے نہیں کہ اس کو خود اس میں لطف ہے۔ زندہ رہنے کا حکم ہے، زندگی کے لیے یہ ضروری چیزیں ہیں، اس لیے یہ بھی سہی جب حکم ہوگا کہ مرجاؤ، اسی انداز سے مر بھی جائیں گے ۔

بیٹھے نہیں زمیں پہ خزانے کو گاڑ کے
موت آئی اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

اسی انداز سے مر بھی جائیں گے جس انداز سے جیا کیے ہیں۔

خود اپنی خواہش اگر شریک ہوگئی تو سب محنت ملیامیٹ ہوگئی۔ لکھنے والا دنیادار آدمی جب ان باتوں کو خود نہیں سمجھتا تو دوسرے کو کیا سمجھائے گا۔ مایا سے یہ بے تکلفی اور وہی پیراسائٹ والا مزاج اگر اکٹھا کیا جائے تو شاید سمجھ میں آجائے۔

تھوڑا سا حال میرے دوست کا اور رہ گیا ہے، اس کو پڑھ لینے سے شاید وہ کچھ سمجھ میں آجائے جس کو بیان کرنے میں میرا قلم اور میری زبان دونوں ہار گئے۔ کچھ دنوں کے بعد پرتھی پال سنگھ بیمار پڑے لوگوں نے کہا دوا کیجیے۔ انھوں نے جواب دیا میں تو اپنی جان دادا جی کو سپرد کرچکا، اب مجھ سے اور دوا سے کیا واسطہ۔ دادا جی جانیں اور ان کی مصلحت، مجھ سے مطلب۔ نمونیا ہوگیا، دق ہوگئی۔ پرتھی پال سنگھ نے علاج کیسا، فکر بھی نہ کی۔ جب حالت بہت خراب ہوئی تو مہراج نے خود فرمایا کہ اپنے گھر چلے جاؤ۔ انھوں نے جواب دیا، صرف دادا جی کے چرنوں میں میرا گھر ہے اس در کو چھوڑ کر میں کہاں جاؤں۔ چیلے کی خاطر سے گرو خود ہتھوندا آنے کو تیار ہوئے، پرتھی پال سنگھ ان کے قدموں سے لگے، یہاں بھی چلے آئے، مگر جیسے کوئی غیر آدے، میں نے سنا دل تڑپ گیا۔ فوراً ایک خط لے کر بھیجا کہ میری آرزو تھی کہ اپنے مرنے سے پہلے تم کو دیکھ لوں، خدا کا کرنا ایسا کہ تم آگئے۔ اب جب تم کہو میں آؤں۔ پرتھی پال سنگھ حقے کے نیچے مجھ سے ہی منگوایا کرتے تھے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ دو نیچے بنوا کر رکھ دیے ہیں۔ اگر تم نے حقہ چھوڑ نہ دیا ہو تو اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔ اس کا جواب کسی اہلکار کے ہاتھ کا لکھا ہوا آیا کہ راجہ صاحب بیمار ہیں کسی سے ملتے جلتے نہیں۔ لیکن تم سے ملیں گے۔ جب چاہو چلے آؤ، میں دوڑا گیا، وہی کوٹھی، مگر باغ

اجاڑ، برساتی کے پیچھے برآمدے میں راجہ صاحب کے گرد آرام کر رہے ہیں۔ سیاہ فام دبلے سے ایک آدمی ہیں داڑھی مونچھ صاف سبز پتمبر کا کرتہ، کسی اور رنگ کی ریشمی دھوتی ہاتھوں میں بے گھنڈیوں کے موٹے موٹے سونے کے کڑے، پاس ہی ایک بڑے سے تسلے میں دھونی کا سامان۔ ہال کے بیچ میں بھی دھونی کی راکھ پڑی ہے۔ ایک چھوٹے سے بغلی کمرے میں راجہ صاحب ہیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بجائے تن و توش کے آدمی کے ایک منحنی سا پھوسڑا قضا کا چیتھڑا پڑا ہے۔ جو نہ جانتا ہو وہ سمجھے کہ سات آٹھ برس کا کوئی بچہ بیمار ہے۔ داہنی طرف دیوار پر داداجی کی چھوٹی سی تصویر لگی ہے اور اسی کروٹ پرتھی پال سنگھ پڑے ہیں ۔

کل آپ عیادت کو جدھر بیٹھے تھے آکر
اب تک اسی کروٹ سے یہ بیمار پڑا ہے

آدمی نے کہا مہراج چودھری صاحب آئے ہیں۔ پرتھی پال سنگھ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہی مسکراہٹ وہی انداز، صورت میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا تھا۔ مگر پرتھی پال سنگھ وہی تھے۔

محمد علی اچھے ہو۔

ہاں اچھے ہیں۔

تم اچھے ہو۔

بالکل اچھے۔

میں دل میں سوچنے لگا کہ باوجود ترک دنیا کے بچپن کا یار یار ہی ہے۔

بال بچے اچھے ہیں گھر پر سب عافیت ہے۔

''بال بچے اچھے گھر پر سب خیریت!'' یہ تو پرتھی پال سنگھ والا انداز نہ رہا یہ تو جیسے کوئی ظاہر دار بات کر رہا ہے۔

میں: (دل سے) ارے یہ کیا (میرا دل) یہ سب باتیں صرف حلق سے تھیں دیکھتے نہیں ہو کہ ان کی لو دوسری طرف لگی ہے۔

پرتھی پال سنگھ: لال جی کو بلاؤ (مجھ سے) لال جی کو دیکھ لو۔

نوکر: لال جی مہراج باہر گئے ہیں۔

میں: میں نے لال جی کو دیکھا ہے مگر اب اچھی طرح مل لوں گا۔ اس کے بعد پرتھی پال سنگھ کی آنکھیں نقاہت سے بند ہوگئیں۔ ان چند لمحوں میں میرے برسوں برس کی آرزو پوری ہوگئی تھی، اس لیے فوراً چلا آیا۔

باہر نکل کر راجہ صاحب کے ماموں ٹھاکر جگموہن سنگھ کہنے لگے مجھ سے کہتے تھے کہ میرے اندر بہت طاقت ہے۔ فقط دیکھنے میں کمزور معلوم ہوتا ہوں اتنے میں لال جی بھی آگئے۔ یہ ان کے متبنیٰ تھے مگر عجیب بات۔ سامنے کے دانت وہی، ہنسی کا انداز وہی، جسم کی تھلتھلاہٹ وہی، پرتھی پال سنگھ پھر چھوٹے ہوگئے۔ میرے کان میں جیسے کسی اپسرا کسی گندھارو نے کہا۔ ارے کہیں یہ تصویر بھی تو پرتھی پال سنگھ کے ساتھ مٹنے والی نہیں ہے۔ ہتھوندا اور لکھنؤ کے درمیان میں بارہ بنکی پڑتا ہے جو ہمارے ضلع کا صدر مقام ہے۔ وہاں کے ڈپٹی کمشنر میرے ملاقاتی تھے۔ میں وہاں ٹھہر گیا۔ رات کو میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب کی آواز سنی کہہ رہے ہیں کہ چودھری صاحب سے کہہ دینا کہ راجہ صاحب سورج پور کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں صبح کو چائے پر انتظار نہ کریں۔ کوئی نو بجے کے قریب وہ لوٹے۔

میں: کہیے کیا حال ہے۔

وہ: افاقۃ الموت معلوم ہوتا ہے۔ جب میں پہنچا تو وہ سنبھل گئے تھے۔ صاحب وہ تو معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ تو کوئی بڑا رسیدہ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بڑے اطمینان سے اس نے باتیں کیں۔ میں نے کہا راجہ صاحب خدا آپ کو اچھا کر دے مگر احتیاط سب کا فرض ہے۔ اگر کچھ روپیہ وغیرہ نج کی تحویل میں ہو تو ریاست کے خزانے میں داخل کروا دیجیے، یہ بھی آپ کا، وہ بھی آپ کا، راجہ صاحب نے کہا اچھا داخل کردیجیے۔ میں نے کہا جواہرات وغیرہ بھی داخل کروا دیجیے۔

راجہ صاحب: جواہرات وغیرہ تو کچھ رہے نہیں۔ پچپن ہزار کے زیورات تھے، وہ میں

نے اپنی بی بی کی لاش کو پہنا کر نربدا میں بہا دیا تھا، اب کچھ نہیں ہے۔ دوسرے دن راجہ پرتھی پال سنگھ ختم ہوگئے، ان کی لاش بھی ان کی وصیت کے موافق نربدا کو لے جائی گئی۔ تھوڑے دنوں میں وہ متبنیٰ لڑکا بھی ختم ہوگیا ؎

ہم سا کوئی گم نام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

(کشکول)

○

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لیے

چودھری صاحب میرے شاگرد رشید اور دوست عزیز ہیں .. کالون اسکول میں جس طرح یہ میری صحبت اور باتوں کے دلدادہ تھے اور کوئی نہ تھا۔ کالون اسکول میں یہ بہ عمر 13/ 14/ سال داخل ہوئے اور 9/ 10/ برس تک تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانے سے ان کے مزاج میں زور شور، حد کی ذہانت، صرف بیجا جس کو سخاوت کہہ لیجیے، صنف نازک کے ساتھ دل چسپی، خمریات کا شوق، اشعار سے عشق، نیچے نہ بیٹھنا، لوگوں کو دق کرنا، بزرگوں کی صحبت کا شوق۔ غرض کہ یہ صفات عالیہ اسی وقت آپ میں موجود تھیں ..."

(''من کیستم'': مرزا محمد عسکری ۱۹۴۲ء)

مرزا منش

یاد احباب کے سلسلے میں رطب و یابس سب ہی آ جاتا ہے۔ قصہ بھی میرے بچپن کا ہے، بہت سی باتیں خیال سے اتر گئی ہوں گی۔ ہماری یاد کے ہیرو دو بھائی تھے، بڑے کا نام مرزا عابد اور چھوٹے کا مرزا سجاد تھا، ان لوگوں نے بہتر دن دیکھے تھے اور ان کے خاندان والوں کا بڑا زمانہ تھا۔ عالی ہمتی اور دولت مندی کی نشانیاں آج بھی کھنڈر کی صورت میں باقی ہیں۔ ان کے مورث کئی پشتوں سے رودولی میں آ کر بسے تھے۔ سب صاحب جائداد، مرزا سجاد کے نانا چکلے دار تھے جن کا مکان امام باڑہ پائیں باغ، ٹوٹے مگر باوقعت گواہ ہیں، مرزا صاحب کے والد کی شادی لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اس سلسلے سے ان دونوں بھائیوں نے تربیت یا بے تربیتی لکھنؤ میں حاصل کی تھی۔ یہ تو پرانی باتیں ہوئیں، اس وقت خاندانی اور اکتسابی صفات غریبی کی وجہ سے حسب ذیل پائے جاتے تھے۔

بہادری، سیر چشمی، قد کی لمبائی معہ اپنے دوسرے لوازم کے، فضول خرچی، دوستی کا نباہ، ڈنڈے بازی اور ضرورت پڑے تو چکو بازی بھی۔

چھوٹے چھوٹے مشاغل مرغ بازی، بٹیر بازی کے۔ شریفانہ زندگی کی حماقتیں تھیں۔ بڑے بھائی کو ان چیزوں کا شوق خاندانی روایات کی وجہ سے رہا ہوگا، مگر ہم نے جب دیکھا تب صرف چھوٹے بھائی انہماک رکھتے تھے۔ مرزا عابد اپنے چھوٹے بھائی کو اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے ہر شوق میں چھوٹے بھائی کی پشت پناہی کیا کرتے تھے۔ گذر اوقات کے لیے لکھنؤ میں ایک سدابرت تھا جو پچاس ساٹھ برس ادھر خوب بٹا کیا اور اب کبھی کبھی دیکھنے میں آ جاتا ہے۔ یہ سدا برت ان پرانی چیزوں کا ہوتا ہے جو بگڑے رؤسا کاروباری زندگی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے احباب یا دوسرے آدمیوں کے ذریعہ سے بیچا کرتے ہیں۔ اس میں ہزاروں چیزیں ہوتی تھیں۔ سونا، چاندی، جواہرات، شال کے ریزے، پرانی چینی، تصویریں، قلمی نسخے، اس کو سدابرت اس لیے کہا گیا ہے کہ بگڑی

سرکاروں سے یہ چیزیں برآمد ہوتی تھیں اور سوا ان سرکاروں کے سب کو مالا مال کر دیتی تھیں۔ مرزا صاحب بھی یہی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ عطر کچھ قوام کا تمباکو وغیرہ بھی رکھتے تھے۔ اسی طرح دوڑ دھوپ کر کے چھوٹے بھائی کے شوق اور گھر کی روٹیاں پوری کیا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں نرمی و بردباری تھی، مگر خاندانی خصوصیات ضرورت کے وقت ان میں بھی موجود تھیں۔ قصہ مختصر بس یہ سمجھ لیجیے کہ مرزا عابد شری رام چندر جی کی طرح نرمی بھی برت سکتے تھے، مگر مرزا سجاد لچھمن جی کی طرح سُپر نکھا کی ناک کاٹنے پر تلے ہی رہتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر محلے والے ان حرکات سے پریشان ہو کر شعر کہنے پر اتر آئے تھے ۔

کریما بہ بخشائے بر حال ما
رودولی سے آئے ہیں دو ظالماں

ہمارے دونوں مرزا منش مرغ اور بٹیر کی پالیوں میں بازیاں اسی انداز سے بدتے تھے جیسے آغا خان یا مہاراجہ بڑودھا گھوڑ دوڑ کھیلتے ہیں کہ جیت میں جتنا ہاتھ آیا اس سے پچاس گنا زیادہ خرچ ہو گیا۔ مثلاً فتح مند بٹیر یا مرغ کی سواری دولہا کی طرح حضرت عباس کی درگاہ جاتی تھی۔ چڑھاوے چڑھتے اور نذریں دی جاتی تھیں۔ جب جائدادیں مہاجنوں کے بھینٹ چڑھ گئیں تو بازی لگاتے وقت نفع و نقصان کا بھی خیال ہونے لگا۔ ضرورت نے دوسروں کے مال پر اوپر کی بازیاں لگانے پر مجبور کیا۔ آج جتنا پیسہ فلش، سولو میں گھڑی بھر میں نکل جاتا ہے، اتنا دون تگون چوگون میں دن بھر میں نہیں نکلتا تھا، مگر اس زمانے میں روپیہ اس قدر تھا کہاں تب بھی تباہی پھیلانے کو جتنا تھا وہی کافی تھا۔ رہا لطف، حضرات اس کی نہ پوچھیے، انگریزی کھیل گولف دیکھنے میں بڑا نرم کھیل معلوم ہوتا ہے نہ کوئی جوش نہ خروش، گہما گہمی، نہ طنطنا، کاندھے پر لکڑی رکھے کف دست میدان طے کرتے پو قدمے چلے جاتے ہیں کیڈی یعنی لکڑیاں دلانے والا لونڈا دُم میں لگا ہے۔ دیکھنے والے کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ یوں ہی سیر گشت کی ٹھہری ہے یا کوئی نتیجہ بھی نکلے گا۔ مگر جو لوگ جانتے ہیں وہ جانتے ہیں۔ جو نہ جانتے ہوں جان لیں کہ ہاتھ خالی جانے پر جزبز ہونا پاؤں پٹخنا، دانت پیسنا، ڈیم کی جھڑ باندھ دینا، کھیل کے چٹخارے کو کافی چوکھا

کر دیتا ہے۔

اسی طرح بٹیر بھی دیکھنے میں تو مٹھی بھر پر ہے مگر جب لڑتا ہے تو دونوں پالنے والے اس سے کڑے لڑتے ہیں، حریف کا بٹیر جو لات مارتا ہے وہ پالنے والے کے سینے پر موگری ہوکر پڑتا ہے۔ جو منھ مارتا ہے وہ بٹیر باز کے کلیجے میں برچھی کی اَنی ہوکر چبھتا ہے۔ پھر اس کے بعد حریف کی زبان کی چوٹیں تیر تلوار کا کام کرتی ہیں۔ تلوار کا زخم اچھا ہوجاتا ہے، زبان کا زخم تب ہی بھرتا ہے جب دوسرا تیر ہمارا بھی ترازو ہوجائے اور ہم بھی چوکھے جملے تیز فقروں سے کسر نکال لیں۔

مرزا صاحب کا ایک بٹیر صوف کرتا تھا اور حریف کا کلّہ پکڑ کر جھنجھوڑیاں بتاتا اور سینہ تان کر پر پھُلا کر مقابل کو ڈھکیل ڈھکیل کر پالی باہر کر دیتا تھا اور چھوڑنے کے پہلے پوٹے میں پنجے گڑا کر ایسی لات بتاتا تھا کہ بٹیر باؤلا ہوجاتا تھا۔ اس صوفی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی جس دن نواب الّن صاحب کے کھڑدمے کو اس نے بھگایا ہے۔ بڑی شدت ہوئی نواب صاحب کے بٹیر نے بڑی راڑ ڈالی، مگر صوفی نے وہ صوف کیا کہ حریف نوک دم نکل گیا۔ مرزا صاحب کی لمبائی کی رعایت سے نواب صاحب کے مصاحبین کی طرف سے شور تھا مار پیڑا ڈ پھینک کر، مرزا نواب صاحب کی داڑھی کی رعایت سے پکار رہے تھے ہاں بیٹا گل مچھوموں کی ٹھیک آج نکل جائے۔ مرزا کا بٹیر بڑھ گیا۔ پھر کیا تھا مرزا صاحب کے طرف داروں کی چڑھ جاتی تھی۔ قریب تھا کہ بٹیر کی جگہ آدمی لڑنے لگیں، مگر نواب صاحب خاندانی شائستہ، ان لوگوں کے منھ کیا لگتے مصاحبین بھی کپڑوں میں بے موقع شکن پڑ جانے کے خیال سے طرح دے گئے۔

خیر یہ تو لکھنؤ کے لوگ تھے۔ اگلا جمعہ ایسا پڑا جس میں باہر والوں سے بُد تھی۔ پٹھان لوگ یوں ہی لڑنے کو تیار رہتے ہیں نہ کہ جب پالی پڑ جائے دو چار موقع ایسے ہوچکے تھے جس میں بٹیر کسی کا بڑھے مگر آدمی باہر ہی والوں کے زوردار رہتے تھے۔ دیہاتی کانوں کی لَو تک لاٹھیاں باندھے فوجداری کے نہ معلوم کتنے میدان سر کیے۔ لکھنؤ والوں پر ایسی دھونس ڈالتے تھے کہ ان غریبوں کی زبان بند ہوجاتی تھی۔ منھ پر ہوائیاں اڑنے لگتی تھیں۔ مرزا سجاد کہنے لگے یار ان لوگوں نے تو کچا کرلیا ہے۔ جب دیکھو دبا لیتے ہیں، کیا

لکھنؤ والے ایسے بیٹھے ہوگئے کہ جس کا جو جی چاہے کہہ جائے اور ہم کھابدیں۔ دو چار منچلے نوجوان تیار ہوگئے۔ جمعہ آیا، گونگے نواب کی بارہ دری میں پالی تھی۔ دو چار شرفاء جن کو اس تیاری کی سُن گُن مل چکی تھی گھر ہی سے نہ نکلے۔ باقی لوگ مرزا سجاد کی سرکردگی میں پہنچ گئے۔ دیہات والوں کا غول بھی پہنچ گیا کہ کریز تو بیٹھ چکے تھے، دو ایک نوکار ابھی مد پر تھے۔ ان کی بھی لڑائی ختم ہوئی، لکھنؤ والوں کا پالا بہت گرم رہا، ایک بٹیر بھی ان کا نہیں بھاگا نہ برابر پر چھوٹا۔ ان نئیوں کی باری آئی۔ مرزا صاحب نے ایک نئے پر بڑا ریاض کیا تھا جس بٹیر سے اس کی شُد ہوئی تھی وہ دو بٹیر بھگا چکا تھا۔ اس لیے اب کی مرزا صاحب کا بٹیر اس کے مقابلہ پر آیا تھا۔ مرزا کے بٹیر نے کابک سے نکلتے ہی ٹھاٹھ کیا۔ مرزا صاحب کی چھاتی پہاڑ ہوگئی مگر اتنا بڑا کھلاڑی ایک بات میں چوک گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ آج جیت کی خوشی میں احتیاط ہاتھ سے جاتی رہی تھی۔ حریف کا بٹیر ان کا پہچانا ہوا ضرور تھا، مگر چوک یہ ہوئی کہ اس کو آج پھر اچھی طرح دیکھا نہیں، لیجیے صاحب لڑائی شروع ہوئی۔ ارے یہ کیا غضب ہوا ہر منھ پر مرزا صاحب کا بٹیر سوکھتا چلا جارہا ہے۔ دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ ان کے بٹیر کے نوک پنجے بنے ہوئے ہیں۔ یہ کیا ہوا، اتنے اتنے بڑے مبصروں کا مجمع اور جیت کی خوشی میں آنکھوں پر ایسے پردے پڑ گئے کہ اس چین پر کسی نے نظر ہی نہ کی۔ ایں یہ کیا ہے! مرزا صاحب کہہ ہی رہے تھے کہ بٹیر نکل گیا وہ مارا کا شور ہوا۔ ایک طرف سے آواز آئی کُل مغل یوں، مرزا صاحب کے مورث بکسر میں کھیت رہے تھے۔ شجاع الدولہ کی یہ تاریخ ہوئی تھی۔ مرزا اپنے حواس سے چوک گئے آنکھوں پر پردے پڑ گئے حریف کا بٹیر دانے پر لگا تھا، مرزا صاحب نے اٹھا کر پٹخ دیا۔ خاں صاحب مرزا سے لپٹ گئے۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرنے کے بجائے اپنی اپنی پالی الگ الگ قائم کردی۔ لات، گھونسا، طمانچہ، کشتم کشتا، گدم پٹخنی کا بازار گرم ہوگیا۔ کابکیں ٹوٹی پڑی ہیں۔ انگرکھے عشاق کا گریبان ہوگئے۔ مرزا صاحب کے بڑے بھائی جو الگ بیٹھے تھے وہ بھی اکھاڑے میں اتر آئے۔ اتنے میں پٹھانوں نے لاٹھیاں سنبھالیں، گونگے نواب کی بارہ دری کوئی ایلچی خاں کا میدان تو تھا نہیں جہاں لاٹھیاں گھوم سکیں۔ لکھنؤ والے چھوٹے چھوٹے ڈنڈے آستینوں میں لیے تھے۔ بند جگہ پر خوب کام کرنے لگے۔ بڑی گھمسان ہوئی، وہ یورش پڑی کہ رن بولنے

لگا۔ ہمارے مرزا ہیں کہ بھپر بھپر کے حملے کر رہے ہیں۔ بانک بنوٹ، بچھوا ظفر پیکر کے کمالات دکھا دکھا کر لوگوں کے دل بڑھا رہے ہیں۔ پٹھان بڑی بودی مار کھا رہے ہیں، اتنے میں کسی دیہاتی نے چکّو چلا دیا، ہائے کا نالہ مار کر نواب اللّن صاحب کا ایک عزیز گر پڑا۔ خون دیکھ کر لڑائی کے خاتمہ کی صورت بندھی۔ دیہاتی مثل ہے کھائے اور پڑ رہے مارے اور ٹل رہے۔ باہر والوں نے جانا قتل ہوگیا، وہ تو صفائی دینے کی فکر میں اپنے گھروں کو بھاگے۔ لکھنؤ والوں نے بھی دیکھا معاملہ سنگین ہوگیا۔ اتنے میں لال پگڑی دور سے دکھائی دی۔ اب کیا تھا، جس کے سینگ جدھر سمائے نکل گیا۔ بارہ دری میں دو چار چپٹیل گھیلے پڑے اور فاتح جنرل مرزا کھڑے ہیں۔ گزشتہ مہابھارت کے آثار بتانے کو چالیس پچاس جوڑے جوتے اِدھر اُدھر دکھائی دے رہے ہیں۔ دوسروں کے تو خیر معمولی چوٹیں کھرونچے، گُلم، موچوں کی آئی تھیں جس شخص کے چاقو لگا تھا وہ البتہ لہولہان سانس نہ ڈکار غش میں پڑا تھا۔ مارنے والے نے بڑا کاری ہاتھ پیٹ پر مارا تھا مگر خدا کا کرنا ایسا کہ کنجی کے چھلّے میں چکّو کی نوک پھنس کر ادھر سے ادھر تک صرف ایک گہرا سا خط دیتی چلی گئی تھی۔ زخمی نے دو پشتوں کی غلامی میں اتنا خون اتنا لمبا زخم کاہے کو دیکھا تھا۔ بے تکلف جاں بحق تسلیم ہونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ غش بھی آگیا۔ ان کے خیال میں وعدہ پورا ہو رہا ہے۔ ابھی پولیس تحقیقات ہی کر رہی تھی کہ ان کے گھر والوں کو خبر ہوئی تو چل میں چل سر و پا برہنہ مرد اور بین کرتی ہوئی ڈولیاں سینہ کوٹتی ہوئی انائیں چھو چھو خادمائیں، مہریاں ایک تانتا بندھ گیا۔ پولیس نے ایک کی نہ سنی مضروب کو معائنہ کے لیے اسپتال چلتا کیا اور مرزا صاحب کا چالان بول دیا۔ اب معاملے نے ایک نئی صورت پکڑی یعنی ہر شخص پورے واقعہ کا ذمہ دار سجاد مرزا صاحب ہی کو ٹھہرانے لگا۔

عدالت کے جھمیلے سے تو یوں چھٹی ملی کہ ڈاکٹر نے صرف ضربِ خفیف لکھی۔ مرزا صاحب اس طرح بچے کہ ملزم تو ضرور حوالات میں تھا مگر مستغیث کا کہیں پتہ نہ تھا۔ عربی قواعد میں ایسا مفعول بھی ہوتا ہے جس کے فاعل کا پتہ نہ ہو یہاں ایسا فاعل تھا جس کا مفعول ڈھونڈھے نہ ملے۔ خیر بڑی آفت سے بچے۔ مرزا سجاد کے اکھڑ پن سے پولیس یوں ہی پریشان تھی۔ محلّے والے روز ان کا دکھڑا روتے، تھانے پہنچا کرتے تھے۔ لہٰذا تھانہ

دار صاحب نے ان کو بلا کر کہا کہ اگر تم اپنی خیر چاہتے ہو تو لکھنؤ خالی کر دو۔ نہیں تو ہم تم کو بے کرا۔ یَ کے گھر پہنچائے بغیر دم نہ لیں گے۔ مرتا کیا نہ کرتا، بے چارے لکھنؤ چھوڑ کر اپنے موروثی وطن رودولی پہنچے۔ یہاں پشتینی گھر گر چکا تھا۔ اپنے ماموں کے یہاں رہنے لگے۔ بڑے بھائی محبت میں جب چھٹی ملتی تھی آ کر دیکھ جاتے تھے۔ پھر چلے جاتے تھے۔ اگر وہ بھی یہاں رہ جاتے تو پیٹ کہاں سے بھرتا۔

اس تازہ مصیبت سے تکلیفیں بڑھ گئی تھیں مگر عمر بھر کی پڑی ہوئی عادتیں کیسے بدلتیں۔ وہی ڈنڈا، وہی باتوں کا انداز وہی شرافت کی جھلک، رہے ہتھکنڈے اجی اس سے شرافت کو کیا بٹا لگتا ہے۔ اہل وطن بھی حسبِ رواجِ ملک غریبی کو الگ چیز سمجھ کر ان کی قدر کیا کیے اگر کوئی سیدھی طرح بولا تو مرزا سجاد انکسار سے بچھ گئے۔ اگر کسی نے امیری کی لی تو مرزا سجاد ماش کا آٹا ہو گئے۔ ماموں صاحب بھی پریشان حال تھے۔ صرف گنڈا تعویذ فال کھولنے پر گزر اوقات تھی مگر

طبل و علَم ہی پاس کچھ اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

بھانجے کو اسی طرح گلے لگایا۔ رہو جو کچھ میسر ہو تو تم بھی کھاؤ، نہ ملے تو یونہی پڑ رہو۔ ایک دن مرزا عابد آئے، اپنی فلاکت پریشانی کا دکھڑا رویا جا رہا تھا، مرزا سجاد کہنے لگے۔ فیض آباد میں ایک یکہ موقع سے مل رہا ہے اگر روپیہ ہوتا تو وہی خرید لیتے۔ یکہ ہی چلاتے۔ بھلے کو اس وقت مرزا عابد کے پاس روپیہ تھا۔ ڈیڑھ سو نکال کر کھٹ سے گن دیے، اب مرزا صاحب یکے والے ہو گئے۔ رودولی چھوٹی سی جگہ اور وہ بھی پچاس پچپن برس ادھر کی۔ قصبے میں دو چار یکے پرانی گورکھ پوری چال کے تھے جن میں دوہرے بم اسپتالوں کی بیساکھی کے ایسے لگتے تھے۔ کمانی دمانی کا کسی نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ چھوٹے بڑے کھانچوں کا پتا سواری کو اپنے سر کی دھمک سے چلتا تھا، یعنی جتنا گہرا کھانچہ ہوا اتنا ہی زور سے بھیجہ ہل گیا۔ دوسری پہچان ایک اور تھی یعنی جتنا گہرا کھانچہ ہوا اتنا آدمی اچکا اور اتنا ہی بڑا گلم سر میں پڑ گیا۔ مرزا صاحب کے یکے نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں کہ ایسے آرام کی سواریاں بھی ہوتی ہیں۔ مرزا صاحب نے بیاہ نہیں کیا تھا، اولاد کہاں

سے ہوتی، لہٰذا جتنی اولاد والی محبت ان کو خدا کے یہاں سے ملی تھی، وہ سب ٹٹو پر صرف ہوتی تھی۔ عورتوں میں جتنی اوہام پرستیاں اولاد کے معاملے میں ہوتی ہیں وہ سب یہاں پائی جاتی تھیں۔ مالش صفائی تو ہوتی ہی تھی۔ صبح شام لوبان دی جاتی تھی نہ معلوم کتنی دعائیں دَم کی جاتی تھیں۔ ماموں ابا سے فال کھلوائی جاتی تھی۔ چوراہے پر روز مٹھائی اور سفید پھول ہلدی کی گرہ سات لونگیں فال کے احکام کے مطابق رکھی جاتی تھیں۔ صبح کو جب یکہ نکلتا تھا تو گھوڑے کے ماتھے کی سفیدی پر ایک طرف سیاہ ٹیکہ کاجل کا لگایا جاتا تھا کہ نظر نہ لگے۔ گلے میں نیلا گنڈہ، کہربا کا دانہ تعویذ جج کی تختی نہ معلوم کیا کیا پہنایا جاتا تھا۔ قصہ مختصر جو جو باتیں زہرِ عشق کے ہیرو کی والدہ نے ان کے لیے کی تھیں وہ سب مرزا صاحب اپنے ٹٹو سلمہ کے لیے کرتے تھے۔ کبھی آنکھ بھر کے دیکھتے نہ تھے اگر کسی وقت مرزا کو دیکھ کر ٹٹو ہنہنایا یا کوئی اور ادا کنوتیوں کی جی میں کھپ گئی تو فوراً اپنی ایڑی دیکھ لیتے تھے کہ کہیں خدانخواستہ شیطان کے کان بہرے لاکھ کوس دور سات قرآن درمیان دشمنوں کو نظر کا پھیر نہ ہو جائے۔

ٹٹو بھی جاندار تھا۔ پھر اس دیکھ بھال پر کیوں نہ بوٹی چڑھتی اور یکے کے گھوڑوں کا شاہزادہ معلوم ہوتا تھا۔ کٹ کٹ کٹ کٹ ایسی دلکی چلتا تھا کہ راہ گیر کی نگاہ پڑتی تھی۔ اگر کبھی کسی جاننے والے نے تعریف کر دی تو مرزا لجاجت سے گھگیانے لگے کہ بھئی ایسا نہ ہو کہ جنور[1] کو نظر لگ جائے گی، شدہ شدہ گھوڑے اور مرزا کی یہ کمزوری لوگوں کو معلوم ہوگئی۔ اگر سڑک پر کسی نے کہہ دیا، واہ مرزا تو فوراً مرزا نے بڑی زور سے جھپٹا دے کر ایک بارگی گھوڑے کو روک لیا اور تعریف کرنے والے سے نیلے پیلے پڑنے لگے۔ کوئی ہنس دیا کوئی مرزا کا قد اور بدلی ہوئی نگاہ دیکھ کر دب گیا، چونکہ گھوڑا واقعی جاندار تھا، اس لیے اَن جان لوگوں سے یہ غلطی اکثر ہو جاتی تھی اور مرزا ہمیشہ زور کا جھپٹا دے کر یکہ روک لیتے تھے کہ جتنی نظر لگ چکی ہو اتنی ہی رہے، زیادہ نہ ہو رفتہ رفتہ گھوڑا جھٹکوں سے ایسا ڈر گیا تھا کہ کسی نے واہ کہا نہیں اور گھوڑا سہم کے رکا نہیں۔

اب تو لونڈوں کو مشغلہ ہاتھ آیا۔ جدھر سے مرزا نکلتے ہیں۔ واہ مرزا کی آوازیں آرہی

---

[1] جانور

ہیں گھوڑا کھڑا ہے اور مرزا صاحب یکہ سے نیچے اترے کوڑا ہاتھ میں لیے لونڈوں کی نانیوں، دادیوں اور ان کے خاندان کی دوسری عورتوں کے جنسی رجحان کی بکھان مختلف انداز مختلف پیرایوں سے بالا علان کر رہے ہیں جس میں شاعرانہ پہلو پر نظر رکھتے ہوئے اپنا تخلص بیچ بیچ ڈالتے چلے جاتے ہیں۔

(کشکول)

○

"......ایک دن اپنی نئی نئی شادی کا اور بیوی پر فریفتگی کا قصہ بیان کرنے لگے کہ میری بیوی کے پیٹ میں زور کا درد اٹھا میں دواؤں پر دوائیں دے رہا تھا اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ اتنے میں قصبے کی ایک بیوی ملنے کو آئیں۔ وہ کراہ رہی تھی تھیں اور میں بیتاب ہو رہا تھا۔ درد کی شدت سے انھوں نے ایک چیخ ماری اور میں دیوانہ وار یہ کہتا ہوا ان پر جھک پڑا "جان من میں کیا کروں کیسے تمھاری تکلیف دور کروں۔"

ان بیوی نے جب یہ سماں دیکھا تو دوپٹے سے اپنا آدھا چہرہ ڈھک لیا اور بولیں "بھیا مجھے کوئی ڈولی بلا دو میں اپنے گھر جاؤں۔ اب یہاں جان من وان من ہونے لگا ہے......"

(انیس قدوائی۔ اب جن کے دیکھنے کو......صفحہ ۵۷)

میر باقر صاحب

سید محمد باقر رضوی المشہدی ثم اہرولوی مرحوم۔ مضافات رودولی موضع اہرولی سادات کے رہنے والے تھے۔ ان کے بچپن میں ان کے والد گورکھ پور میں سرکاری ملازمت کرتے تھے، ان کے ماموں مرحوم بستی میں اچھے خاصے زمیندار تھے۔ اہرولی یا رودولی آتے تھے۔ مگر کم۔ باپ کی نوکری کا سلسلہ ختم ہوگیا ماموں کا انتقال ہوگیا، ناچار اپنے آبائی گھر واپس آئے۔ بچپن میں مجھ سے بتایا گیا تھا کہ کسی بابا آدم کے رشتے سے یہ ہمارے چچا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے چچا کہنا شروع کیا۔ آخر میں تو ان کو آدھی رودولی چچا کہنے لگی تھی۔ جگت چچا ہوگئے تھے۔ چار بھائی تھے بھرا پُرا گھر تھا۔ ماں کے پاس دولت تھی، ماموں کی زمینداری کے وارث تھے۔ ان کے باپ یعنی سجاد دادا تو خاموش آدمی تھے، شہد کی مکھی کے نر تھے، مگر ہماری دادی بڑی منتظم تھیں۔ اگر دروازے پر دس آدمی پہنچ جائیں تو گھڑی بھر میں سب کو کھانا کھلا دیں۔ مہمان نوازی، چلّا کے بات کرنا اور ہر وقت کام میں لگی رہنا، ایک ایک جملے میں تین تین قسمیں کھانا، ان کی خاص الخاص خصوصیات میں سے تھے۔ پہلی دوسری اور چوتھی صفت ان کے بچوں کو پوری طرح وراثت میں پہنچی تھی اور حق بات کہنا چاہیے۔ ان صفات کو ان لوگوں نے مرتے دم تک خوب نباہا۔ چونکہ ان کی جائداد بستی میں تھی، اس لیے رودولی والے ان کی دولت کا معیار نہیں قائم کر سکے، مگر ان کا شمار خوش حال لوگوں میں ہوتا تھا۔ کچھ روپیہ بھی قرضے پر دیتے تھے، اس لیے دولت گھٹنے کے بجائے بڑھنے کی امید کی جاتی تھی۔ شامت کہیے یا تقدیر کا لکھا۔ سید محمد باقر صاحب کی شادی ایک لکھ لٹ رئیس کی لڑکی سے ہوگئی، سب وہی عیوب ان لوگوں میں بھی سرایت کر گئے۔ خودداری نے سسرال والوں کا مقابلہ کرنے کا خیال دل میں پیدا کیا۔ خوش حالی میں پہلا گھن یہیں سے لگا۔ اس کتاب میں نواب راحت حسین مرحوم کی یاد موجود ہے۔ ہمارے نواب صاحب ہی کی بہن ان کو بیاہی گئی تھیں۔ میر باقر باقر سے میر باقر داماد ہوگئے۔

صفات کی نہ سہی نام کی نسبت تو بلند ہوگئی۔ جہیز میں جان لیوا دق بھی آئی جس نے ان کی سسرال کا گھر اور نہ معلوم کتنے گھر گھالے تھے۔ تھوڑے دنوں کے بعد سجاد دادا نے انتقال کیا، یوں تو موت مکروہ ہے لیکن اگر ایمان کی پوچھیے تو کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ البتہ متذکرۂ بالا مزاجی اور خاندانی خصوصیات اس وقت جو تھوڑے تھوڑے دکھائی دیتے تھے۔ ان کا بھرپور مظاہرہ ہوگیا۔ نواب راحت حسین صاحب مرحوم اپنے خاص انداز میں اس غم فزا واقعہ کی جو تصویر کھینچتے تھے اس سے شاید پڑھنے والوں کو بھی کچھ اندازہ ہو جائے۔

نواب صاحب کہتے تھے اس حادثے کے بعد سوا میر باقر صاحب کی والدہ کے کسی کے حواس برجا نہ تھے۔ حالانکہ ان کا غم حقیقی غم تھا مگر لڑکوں کے خیال سے موصوفہ نے مجھ کو خاص اس کام پر تعینات کیا کہ لڑکوں کو تسلّی و تشفی دوں۔ راضی برضا رہنے کی تلقین کروں اور صبر کی خوبیاں ان لوگوں پر اچھی طرح روشن کروں۔ دفن کے پہلے تو خیر سب ہی کے اوپر اثر ہوتا ہے لیکن قبرستان سے واپس آنے کے بعد بے کاری میں رونے کا مشغلہ بہت ترقی پکڑ گیا، اس لیے میں نے یہ تدبیر نکالی کہ میاں باقر کے چاروں بھائیوں کو یک جا نہ ہونے دوں۔ چنانچہ ایک کو میں نے صدقے کے کام کو دیکھنے کو کہا۔ دوسرے کو مہمانوں کی طرف بھیج دیا۔ دو چھوٹے تھے وہ بغیر دونوں بڑے بھائیوں کی مدد کے زیادہ آفت نہیں جوت سکتے تھے اس لیے ان کو دلاسا دے کر یوں ہی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد نواب صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں رفع حاجت کے لیے چلا گیا۔ وہیں سے سنا کہ پھر کہرام پڑ گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو یہ چاروں بھائی، اکٹھا ہوگئے۔ جلدی جلدی واپس آیا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ سب کے سب جمع ہیں اور نئی طرح کے بین کر رہے۔ ایک کہہ رہا ہے خدا کی قسم بابو مرحوم آٹھ آٹھ دن منہ نہیں دھوتے تھے اور اس پر سب مل کر بڑی زور سے روتے ہیں۔ پھر دوسرا کہتا ہے، رسول مقبولؐ کی قسم دانت بھی تو نہیں مانجتے تھے اور پھر وہی گھمسان پڑتی ہے۔ تیسرا کہتا ہے اور نہاتے کب تھے، قسم کلام مجید کی لقاں کے ڈر کے مارے غسل خانے میں یوں ہی پانی پھینک کر چلے آتے تھے اور وہی شور مچتا ہے۔ چوتھا ڈاڑھیں مار کر کہتا ہے کہ دو بجے رات کو مرحوم کا چھینکے سے ہانڈی اتار کر گپ گپ وہی بڑے کھانا یاد آتا ہے اس پر تو پوری محفل ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتی ہے۔ نواب

صاحب کا رشتہ مذاق کا تو تھا ہی آپ کا بیان ہے کہ میں نے ایک ڈانٹ بتائی اور کہا سالو! ابھی ان کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی ہے اور تم نے ان کے یہ بکھان شروع کر دیے۔ کچھ سچی بات کچھ مذاق کا پہلو کچھ نواب صاحب کی زبان کا اثر غم مدھم پڑ گیا۔ پہلے تو ہم لوگ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ نواب صاحب مرحوم کی شاعری ہے لیکن بعد کو تصدیق ہوئی کہ کچھ اصلیت بھی تھی۔ باقر مرحوم کے چھوٹے بھائی محمد جعفر مرحوم نے بیان کیا کہ راحت حسین نے روایت کرنے میں تدیُّن سے کام نہیں لیا ہے۔ ہم لوگ تو صرف یہ کہتے تھے کہ گو منھ نہیں دھوتے تھے مگر چہرہ چاند کو ماند کرتا تھا۔ گو دانت نہیں مانجتے تھے مگر ان کے آگے موتی بے آب تھے، نہاتے کم تھے، مگر ان پر میل کچیل کا کبھی گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ رہی دہی بڑوں والی بات اس میں اعتراض کرنے کی گنجائش کہاں ہے۔ ان کا مال تھا، کھاتے تھے راحت حسین کے باپ کا اجارہ۔

میرے پڑھنے والو آپ کو ہمارے ہیرو کی حسب ذیل باتوں کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ خودداری، مہمان نوازی، سسرالی رشتے سے امیری کی چھاؤں زور سے بولنا اور قسمیں، مذاق کا چٹخارہ جو آگے چل کر بہت چوکھا ہو گیا موجود تو تھا مگر ابھی تک اس کے اظہار کا پورا موقع سوا معمولی ہنسی ٹھٹھے کے نہیں آیا تھا۔ البتہ ہنسی ٹھٹھے میں شروع ہی سے یہ حال تھا کہ میر باقر جہاں جاتے تھے وہاں محلے بھر کو معلوم ہو جاتا تھا۔ اجنبی جگہوں میں تو یہاں تک ہوا کہ لوگ صبح کو ان کے میزبان کے یہاں خیریت پوچھنے آئے۔

دوسرا باب اس دفتر کا اس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ اس گھر کی لچھمی اٹھ گئی، یعنی میاں باقر صاحب کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ خرچ کی تنگی اب بھی نہیں تھی۔ دو چار آدمی اب تک ان کے قرض دار تھے۔ مگر وہ بات جاتی رہی تھی۔ پھر ان کا گھر بیماریوں نے دیکھ لیا دولت، بودگی زیادہ تر دوا علاج میں اور کچھ رکھ رکھاؤ میں ختم ہو گئی۔ بستی کی جائداد کا بھی وارا نیارا ہو چکا۔ یہاں تک کہ تنگی سے بسر ہونے لگی۔ کثرت اولاد بڑا کنبہ مشکلیں زیادہ ہو گئیں۔ چھوٹا بھائی جو اُن کے بڑے لڑکے کے ہم سن تھا۔ اس کو پڑھانے میں دقتیں پیش آنا شروع ہو گئیں۔ غریبی بڑا سخت امتحان ہے، اس امتحان میں پاس کا درجہ کسی کو مل جائے مگر آنرز ہزاروں میں کہیں ایک کو نصیب ہوتا ہے، ہمارے ہیرو کا بھی یہی حال ہوا کہ

اِدھر اُدھر ملازمت کی تلاش کرنے لگے۔ سن زیادہ، کوئی ڈگری نہیں، پابندی سے کام کے عادی نہیں۔ اگر کسی جگہ ٹھکانا ہوا بھی تو مصاحب کی صورت میں، اب تو ان کی بذلہ سنجی ہنسی ٹھٹھے کی دھوم مچ گئی۔ اس کے بعد لڑکے جوان ہوگئے۔ کوئی سو کمانے لگا، کوئی دو سو، چھوٹا بھائی وکیل ہوگیا مگر میاں باقر کی نہ کوئی ضرورت پوری کرسکا اور نہ انھوں نے اپنا رویہ بدلا۔ گورکھ پور بستی میں نشو ونما ہوئی تھی، وہاں تاڑی شراب کے قطرے بڑی بڑی داڑھیوں پر دکھائی دیتے ہیں۔ کسی طرح بدقسمتی سے یہ بھی اس کے مزے سے واقف ہوگئے۔ میں یہ ذکر ہرگز نہ کرتا کیونکہ یہ ذاتی فعل ہے جس سے دوسرے کو واسطہ نہیں۔ یہ تذکرہ صرف اس وجہ سے آگیا کہ بغیر اس کے ان کے واقعات ادھورے رہ جائیں گے۔ جوانی میں مجھ کو ایک کتاب آئرلینڈ کے متعلق پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا جس میں ایک خاص کلب کے ممبروں نے یہ قسم کھائی تھی کہ مذاق کی بات چاہے اپنی ماں ہی کی کیوں نہ ہو ہر ممبر ضرور بیان کرے گا۔ میاں باقر نہ آئرلینڈ گئے تھے نہ اس زمانے میں پیدا ہوئے تھے، جب یہ کلب قائم تھا، مگر کسی نامعلوم طریقے سے یہ اس کے ممبر ہوگئے تھے اور ہنسنے کا چسکا پڑ گیا کہ اپنی برائی یا کسی کی بات ہو اگر اس میں ہنسنے کی گنجائش ہوئی تو میاں باقر اس کے بیان کرنے سے نہ رکیں گے، بدقسمتی سے گھوڑ دوڑ کھیلنے کا بھی شوق ہوگیا۔ شوق کے بعد عادت ہوئی، عادت کے بعد لت ہوگئی۔ اس شوق کے پیدا کرنے میں شاید میری بھی کچھ ذمہ داری ہو بلکہ ضروری ہے، میں تو بچ گیا مگر وہ مرحوم فنافی الگھوڑ دوڑ ہوگئے۔ اس مشغلہ میں روپیہ کا خرچ اور یہاں پیسہ پاس نہیں، مگر انھوں نے ایک ترکیب نکالی، کسی کرنل، جنرل کا کوئی خانساماں تھا جس نے بہت سا اندوختہ کرنے کے بعد ریس کے احاطہ کے اندر چائے وغیرہ کا ٹھیکہ لینا شروع کیا تھا۔ گھوڑ دوڑ کی آمدورفت میں اس سے یاد اللہ ہوگئی۔ اب راوی چین لکھتا ہے۔ میاں باقر ہوٹل کا پاس لٹکائے ہوئے اول اسٹینڈ پر دوسرے اسٹینڈ پر پیڈک میں اصطبل میں ہر جگہ موجود تمام جاکیوں سے ملاقات، اکثر بکیوں سے جان پہچان ٹاؤٹس سے ان سے ملی مار بہتر سے بہتر ٹپ ان کو ملنے لگے، مگر اس تباہ کن کھیل میں سوائے جوا کھلانے والے کے اور کسی کو امیر ہوتے دیکھا نہیں، پھر اس کے لیے بڑے سرمائے کی بھی ضرورت ہے یہاں ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے، وہی روپیہ دو روپیہ کا کھیل مگر

شوق پورا ہوتا رہا مجھ سے ان سے زمینداری وغیرہ کے معاملے میں شکر رنجی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نوبتیں پہنچ گئیں۔ معاملات نے اکثر بہت طول کھینچا، مگر ہنسنے ہنسانے کے مراسم اسی طرح رہے۔ مثالاً عرض کرتا ہوں۔ ایک دن دوران ملال میں آئے، کہنے لگے محمد علی قسم ہے کلام مجید کی تم ہزار ہمارے دشمن ہو جاؤ مگر خدا کی قسم ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ مذاق کا کوئی واقعہ پیش آوے اور تم سے نہ کہیں مگر دیکھو واللہ کسی سے کہنا مت۔

میں: ہاں ہاں نہ کہیں گے، کہو تو۔

میر باقر: ارے تم ضرور کہو گے۔ قسم رسولؐ مقبول کی تم کہے بغیر نہیں رہ سکتے، تمھارے پیٹ میں بات ہی نہیں رہتی اور تم کیا ہم خود کہیں گے مگر ابھی تازہ تازہ واقعہ ہے قسم امام حسین کی، اگر تم نے کہا تو مجھ کو بہت تکلیف ہوگی۔

میں: بالکل ٹھیک میں سمجھتا ہوں۔ تم کہہ چلو۔

میر باقر: چند طالب علموں نے مل کر امین آباد میں ایک مکان لے رکھا ہے اس میں ہمارا چھوٹا بھائی بھی شریک ہے جگہ ضرور تنگ ہے مگر ان لڑکوں کے اعزا کو ضرورت کے وقت ایک چارپائی کی جگہ مل ہی جاتی ہے۔

ہم جو ریس سے لوٹے تو وہیں چلے آج بڑا اچھا دن تھا، قسم امام حسین کی اگر ہمارے پاس روپیہ ہوتا تو آج امیر ہو گئے ہوتے۔ تین گھوڑے ہمارے نکلے، ایک پلیس اور دو اول۔ فیورٹ تو فیورٹ ہم کو تو آوٹ سائڈر کی ٹپ ایسی ملی مگر کیا کریں صرف پانچ روپیہ پلیس پر لگائے، پچیس ملے۔ خدا کی قسم آج پانچ ریسوں میں تو بکیوں کا دِوالا نکل گیا۔ اچھا خیر، دل خوش تھا اس لیے ذری زیادہ پی گئے۔ گھر پہنچتے پہنچتے نو بج گئے تھے، زینے پر چڑھنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ رودولی کے فلاں فلاں کئی ریشائیل بیٹھے ہیں، بھلے کو زینے پر اندھیرا تھا، نہیں تو قسم خدا کی بڑا غضب ہوا تھا۔ ہم الٹے پاؤں واپس آئے۔ اب امین آباد میں اس ادھیڑبن میں ٹہل رہے ہیں کہ چلّے کے جاڑے ہم اس حالت میں کمبل لینے بھی نہیں جا سکتے۔ کیا کریں گے، ایک بڑھیا پان بیچ رہی تھی اس سے گلوریاں لینے لگے، وہ بھانپ گئی کہ نرم چارہ ہے کہنے لگی میاں ٹھکانا کیجیے گا، قسم قرآن کی محمد علی میں نے کہا وہ مارا

سب مشکلیں یکبارگی حل ہوگئیں۔ نہ لحاف کی فکر نہ رضائی کی، نہ گھر جانے میں فضیحتے کا خوف، ہم تیار ہو گئے۔ تم جانتے ہو کہ ہم کو ان باتوں کا شوق کبھی نہیں رہا مگر یہ موقع ایسا تھا کہ سوائے اس کے اور کون صورت تھی۔ اس بڑھیا نے ایک چھوٹی سی لڑکی میرے ساتھ کی، اس سے کہا میاں کو اپنی آپا جان کے یہاں لے جاؤ۔ گلی در گلی وہاں پہنچے، صورت دیکھتے ہی کہنے لگی جَنیا ہمیں بھی پلواؤ۔ خیر ایک ادھا منگوایا "تعاملوا ثم تعاشروا" کی ٹھہری۔ ہم تو پی چکے تھے، اس کی خاطر سے ذری سے چکھ لی۔ مگر وہ اَدھے کا اَدھا چڑھا گئی۔ اختلاط کی بے تکلفی میں ہماری واسکٹ میں دو ایک روپے اور ریزگاریاں تھیں۔ پان مٹھائی کے نام سے پہلے تو اس نے وہ اینٹھے، نوٹ وغیرہ نیفے میں تھے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا، اس کے بعد نشانی کے نام سے انگوٹھیاں لے لیں۔ ہم کو اس طرح کا اتفاق کاہے کو ہوا تھا، مگر اس وقت حالت بھی کچھ ایسی ہی باتوں کی تھی بندھا خوب مار کھاتا ہے، ہماری آنکھ قریب تین بجے کے کھلی۔ گھوڑ دوڑ سے لے کر اس وقت تک کے تمام واقعات نگاہ کے سامنے آگئے، اپنے اوپر غصہ، ان داڑھیوں پر غصہ، کچھ اپنی حرکتوں کا انفعال، لاحول و لاقوۃ۔ مگر قسم قرآن کی سب سے زیادہ غصہ اس رنڈی پر تھا، بھلا دیکھیے تو طے کیا ہوا تھا اور لے کیا کچھ گئی۔ انگلیاں خالی کردیں چڑیل نے اور وہ فیروزہ بھی تو نہیں ہے، اماں کی نشانی تھی اور ہاں دہانِ فرنگ والی انگوٹھی بھی اینٹھ لی۔ پھوپھی اماں مرحومہ کے پیٹ میں جب درد ہوتا تھا تو دھودھوکر پلائی جاتی تھی۔ حرام زادی قحبہ قطامہ، شقتل، غیبانی اور دیکھو تو کیسی میٹھی نیند سو رہی ہے۔ رہ جاؤ ہم باقر کاہے کو جو اس کی کسر نہ نکالی ہو، بھیا میں اٹھا اور اس کا لوٹا پاندان، گلاس، پان کی ڈبیا سب میں نے سنبھالی۔ دل نے کہا، باقر شراب تو پیتے ہی تھے، رنڈی بازی بھی کر گزرے، اب سب پر طرہ یہ کہ اچکا پن بھی کروگے۔ اس خیال کے آتے ہی مجھ کو ہنسی کی گدگدی اٹھی۔ یہ گدگدی پیدا ہوتے ہی تمام رکاوٹیں کافور ہوگئیں۔ بڑے آہستہ سے زینے سے اترنے لگا۔ اب جو اندھیرے میں کنڈی چھوتا ہوں تو قفل دیا ہوا ہے۔ اس طبقے کے لوگوں کو چور اچکوں سے روز ہی سابقہ رہتا ہے۔ پاؤں سے سر تک ایک سنّاٹا ہوا۔ پنڈلیاں کانپنے لگیں، پسینہ آگیا، سب چیزیں جہاں جہاں سے اٹھائی تھیں وہیں پر جمادیں اور مجبوراً اس کو جگانا چاہا کہ کنجی دو، وہ اس وقت تک نشے میں

اٹا غفیل تھی۔ اوں اوں کرکے کہنے لگی، تکیہ کے نیچے ہے اور پھر کروٹ لے کر خراٹوں کی سادھی۔ ہم نے کہا اس میں کیا گیا۔ محمد علی قسم رسول مقبولؐ کی۔ میں نے پھر سب چیزیں اٹھائیں، بغل میں پاندان ایک ہاتھ میں لوٹا گلاس دوسرے ہاتھ میں ڈبیا اور کنجی۔ قفل تو کسی نہ کسی طرح میں نے کھول لیا۔ اب جو کنڈی کھولتا ہوں تو بغل ڈھیلی پڑ گئی، کھڑ بڑ کھڑ بڑ کرکے زینے پر پاندان گرا۔ اسی گڑ بڑ میں لوٹا گلاس وغیرہ بھی میں نے پھینک دیا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ قسم قرآن کی اس وقت سمجھ میں آیا کہ چوری آسان کام نہیں۔ گلی میں سناٹا تھا، میرے پیر لگ گئے تھے، مگر قسم امام حسین کی معلوم ہوتا تھا کہ فوج پیچھے دھاوا کرتی چلی آتی ہے۔ ایک دو ہی موڑیں میں نے پار کی ہوں گی اب چال بھی آہستہ کردی تھی کہ ایک طرف سے آواز آئی ''چائے گرما گرم'' دل پر جیسے موگری سی پڑی آواز تو تھی چائے والے کی مگر خدا کی قسم مجھ کو معلوم یہ ہوتا تھا جیسے کوئی کہتا ہے وہ چوٹا جاتا ہے، پکڑنا جانے نہ پاوے، اگر راستے میں کتا بھی ملتا تھا تو معلوم ہوتا تھا پولیس کے انسپکٹر جنرل ہی آگئے۔ خیر بھئی کسی نہ کسی طرح امین آباد پہنچے، قسم کلام پاک کی حواس اس وقت درست ہوئے۔

باقر چچا نے ٹھیک اندازہ کیا تھا۔ بات میں بھی ہضم نہ کرسکا اور یہ قصہ اچھا خاصہ عام ہوگیا، مگر باوجود اس کے لوگوں نے باقر صاحب کے بارے میں رائے وہی رکھی جو ہمیشہ سے تھی۔ اسی امید پر یہ قصہ میں بھی لکھ گیا ہوں کہ پڑھنے والے بھی صرف مذاق پر نظر کریں گے اور مرحوم کو واقعی چور اچکا نہ سمجھیں گے۔

میرے پڑھنے والے! آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔ آپ کو پورا اختیار ہے کہ میرے دوست سید محمد باقر مرحوم کے لیے وہی رائے قائم کیجیے جس کے ہم دونوں آدمی سزاوار ہیں۔ مگر پھر بھی میں یہی کہے جاؤں گا کہ میاں باقر چوری کے کبھی قریب نہیں گئے تھے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اگر آپ باقر مرحوم کو ایسا جانے ہوتے جیسا میں نے جانا یا میرے قلم میں وہ طاقت ہوتی کہ ان کی سچی تصویر آپ کے سامنے آجاتی تو آپ بھی میرے ہم خیال ہوجاتے۔ مذاق کی تعریف کی گئی ہے۔ ''دو غیر چیزوں کو ایک خاص انداز سے ملا دینا۔'' باقر مرحوم میں یہ مادّہ اس درجہ تھا کہ جہاں اس کا موقع آجاتا تھا وہاں وہ

بے بس ہو جاتے تھے۔ گزشتہ واقعے میں غور کیجیے تو باوجود میری کج مج بیانی کے شاید اس بات کا پتہ چل جائے۔ میاں باقر جن کو رنڈی سے کبھی کا لگاؤ نہیں رہا، چوری سے کہیں دور کا بھی واسطہ نہیں، باوجود اپنی حرکتوں کے اپنے زعم ناقص میں شریف تھے۔ مذاق کی صورت بندھ جائے تو بے اختیار ہو جاتے تھے۔ ان سب چیزوں کو یکجا کیجیے تو شاید آپ بھی مرحوم اور راقم الحروف کو معاف کر دیں، ان کے سچے محسن اور دلی ہمدردوں کو ان سے اکثر یہ شکایت پیدا ہو جاتی تھی کہ یہ ایک طرف کی بات دوسری طرف لگا دیتے تھے جس کے زیر بار احسان تھے اس کی بھی ہنسی اڑا جاتے تھے۔ اس طرح کے اور بھی الزامات ان پر لگائے جاتے تھے، لیکن ان کے جاننے والے اکثر اس کا تجزیہ کرنے بیٹھے ہیں اور یہ بات ہمیشہ ثابت ہوگئی ہے کہ اگر کوئی مذاق کا پہلو نکل آیا تو چاہے تیسری جنگ عظیم ہی کیوں نہ چھڑ جائے، میاں باقر راز فاش کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس مذاق کے چسکے کے پیچھے جو شخص خود اپنا مضحکہ کروا دے اس سے دوسروں کو کیا شکایت ہو سکتی ہے۔

ایک زمانے میں باقر صاحب بہت پریشان ہوگئے تھے۔ ناچار ایک بڑی ریاست میں درخواست دی تھی ان کے بچپن کے ہم مکتب بے تکلف دوست ایک قاضی صاحب وہاں پہلے سے ملازم تھے۔ یہ قاضی صاحب نہایت بے دقوف مذاق سے ہزاروں کوس دور، بانگڑو، نیک نیت باوفا قسم کے آدمی تھے لنگڑے بھی تھے۔ جب میاں باقر ان کو بناتے تھے تو یہ ہاتھ پاؤں سے جواب دیتے تھے۔ اس لیے میاں باقر ان کو صرف ایسے وقت میں چھیڑتے تھے، جب جان لیتے تھے کہ قاضی صاحب کا دسترس ان تک ممکن نہیں ہے۔ قاضی صاحب رخصت پر آئے میاں باقر نے اپنی درخواست کا حال سنایا۔ قاضی صاحب نے نہایت ہمدردی کا اظہار کیا اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میں دفتر میں ایک معمولی جگہ پر ہوں، میں تمھاری کیا امداد کر سکتا ہوں لیکن اگر منیجر صاحب کے نام تم ایک درخواست یاد دہانی کی مجھ کو لکھ کر دے دو تو میں وہاں دفتر میں یہ کوشش کر سکتا ہوں کہ وہ درخواست آخری حکم کے لیے پیش کر دی جائے، منظوری، نامنظوری تمھاری قسمت کے ہاتھ ہے۔

میر باقر: ہم کو قاضی صاحب آپ سے یہی امید ہے تو بھائی صاحب جب واپس جانے لگیں تو میرا خط لیتے جائیے گا بھولیے گا۔ نہیں عنایت ہوگی۔

قاضی صاحب: نہیں، بھولوں گا کیسے اور کسی قابل خدا نے نہیں کیا تو کیا، اتنی خدمت بھی دوست کی نہ کریں گے ہم کوئی ہفتے عشرے میں جائیں گے۔ اس وقت خط لے لیں گے۔

اس گفتگو کے آٹھ دس دن بعد ایک روز میر باقر ہمارے یہاں آئے، کہنے لگے! افوہ بہت مارا سالے نے قاضی کا ہے کو قسائی ہے، قسم کلام مجید کی ہڈیاں ہڈیاں توڑ دیں۔

میں: کہو کیا ہوا۔

میر باقر: ارے میاں وہی درخواست نوکری کی جو ہم نے دی تھی نا تمھارے سامنے تو باتیں ہوئی تھیں۔

میں: ہاں ہاں، تھوڑی دیر ہوئے، وہ تو تم کو ڈھونڈھنے یہاں بھی آئے تھے۔

میر باقر: ہاں ہاں، آیا ہوگا۔ سب کہیں تلاش کرتے کرتے شاہ صاحب کے یہاں پہنچا۔ ہم لوگ کوٹھے پر خوش گپیاں کر رہے تھے۔ نیچے سے میاں باقر میاں باقر کی ہانکیں لگانا شروع کیں۔ میں نے کہا کیا ہے؟ قاضی صاحب کہنے لگے، بھئی میں آج دوپہر کی گاڑی سے جاؤں گا۔ رودولی بھر کے صدقے ہو آیا، تب تم یہاں ملے ہو وہ خط دے دو تو جو کچھ میرے بس میں ہوگا دفتر میں کوشش کروں گا۔ میں نے بہت بہت شکریہ ادا کیا اور خط لکھنے بیٹھ گیا، مگر قاضی مردود کا سبز کشمیرے کا دگلہ اور اس کا سڑک پر سے گردن ٹیڑھی کر کے باتیں کرنا کچھ ایسا تھا کہ میں نے درخواست کی یاد دہانی یوں کی۔

جناب منیجر صاحب تسلیم! یہ افریقہ کا بوٹ (بروزن نوٹ) حاضر خدمت ہوتا ہے۔ اس وقت میں ایک ضروری کام میں مصروف ہوں، لہٰذا تکلیف کر کے آپ اس کو پانچ جوتے پٹوا دیجیے، مشکور ہوں گا۔

لفافہ بند کر کے میں نے دے دیا اور شکریہ ادا کیا، اس نے کہا میاں باقر کیا شرمندہ کرتے ہو اور کسی قابل نہیں تو میں دوست کی اتنی خدمت سے بھی گیا۔ وہ تو چل کھڑا ہوا تھا مگر یاروں نے اس سے کہہ دیا کہ قاضی صاحب میاں باقر کا خط ہے کسی اور کا نہیں ذرا پڑھ

لیجیے گا تو پیش کیجیے گا۔ اس نے جو پڑھا تو میاں کوٹھے پر چڑھ آیا کسی اور طرف راستہ نہیں، بس اس نے پکڑ لیا۔ بہت مارا خیر ہم بھی کسی دن کسر نکال لیں گے جاتے کہاں ہو بچّا۔

سید باقر صاحب کے گھن اور ہتھوڑے والے مذاق کا ذکر آپ نے سنا بکنے اور ہنسنے کا جس کو عارضہ ہو وہ نظیر اکبرآبادی ہو جائے، مگر میر تقی میر کی نزاکتیں ہر جگہ نہیں پیدا کر سکتا۔ مگر ہمارے باقر چچا کبھی کبھی نازک خیالیاں بھی دکھا جاتے تھے۔ ایک دن صبح کو ہم لوگ چائے پی رہے تھے ایک شخص میلا سا منڈاسا باندھے آیا اور کہا کہ ہم جوہری ہیں جوہری، کسی طرف سے نہیں معلوم ہوتا تھا میر باقر صاحب نے اس کو اپنی دُرِ نجف کی انگوٹھی دکھائی، اس نے کہا کوئی اسّی روپیہ رتی کا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب ہیرا بھی ہر دوسری چیز کی طرح بابا مول نہیں تھا۔ جب بلور کو ہیرا بتا کر اس نے اپنی جوہر شناسی ظاہر کر دی تو آپ نے وہی مرحومہ دہان فرنگ والی انگوٹھی دکھائی اور کہنے لگے دیکھیے اس میں کچھ پشمینے کا میل تو نہیں ہے۔

ایک صاحب پرلے سرے کے جھوٹے تھے لڑکپن میں عادت پڑی اور جوانی میں مضبوط ہو گئی، اپنی عادت کے موافق بیان میں کچھ غلطیاں کر گئے۔ جو اسی وقت کھل گئیں۔ ہر شخص نے مختلف انداز سے نفرین کی۔ میاں باقر ہمدردی سے کہنے لگے:

"دیکھو تم جھوٹ نہ بولا کرو نہیں تو تمھاری عادت پڑ جائے گی۔"

ایک مرتبہ ایک صاحب لکھنؤ کے ہمارے قصبے میں آئے۔ ان کو یہ ناز تھا کہ ہم دیہاتی بولی خوب بولتے ہیں۔ کچھ ذکر اروی کا آ گیا جس کو دیہات میں گھُیّا کہتے ہیں، وہ صاحب اپنا دعویٰ بھول کر پوچھنے لگے گھُیّا کیا؟ میر باقر نے ان کو بتایا کہ اس کو ان کے یہاں اروی کہتے ہیں۔ ان کو اپنا دعویٰ یاد آ گیا اور کہنے لگے ہاں ہاں میں جانتا ہوں اور اس کو بھاٹا بھی تو کہتے ہیں (بھاٹا دیہات میں بیگن کو کہتے ہیں) بھاٹا کہتے وقت لکھنوی صاحب نے اس لفظ پر اچھا خاصا زور دیا تھا، باقر صاحب کہنے لگے جی ہاں جب غصّے میں ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ یہ امین آباد کے ایک بالاخانے پر ایک صاحب کے مہمان تھے۔ اس بالاخانے کے نیچے کی دکان پر ایک حافظ جی صاحب لال داڑھی، لانبا کرتا، ٹوپی دار

پائجامہ، مذہبی سنجیدہ آدمی ایک بڑی دکان رکھے تھے۔ رات کے وقت کوئی گیارہ کا عمل رہا ہوگا۔ ایک صاحب حافظ جی کی تلاش کرتے آئے۔ ان کو خیال تھا کہ اوپر کے حصے میں حافظ صاحب کے علاوہ اور کون ہوگا۔ سڑک پر سے انھوں نے حافظ صاحب کو پکارنا شروع کیا۔ ان کی بے تابی بتاتی تھی کہ کوئی بڑی تاک ہے کیونکہ وہ بار بار پکارتے تھے اور یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ ایک دو منٹ سے زیادہ زحمت نہ دیں گے۔ یہاں بجائے حافظ جی کے جنگلے سے چارپائی ملائے ہوئے میاں باقر لیٹے تھے۔ ہر آواز کے ساتھ ان صاحب کی بے تابی بڑھتی جاتی تھی دو چار آوازوں کے بعد یہاں سے نہایت اطمینان کی نپی تلی آواز اور مدھم سروں میں آئی ''دوت'' وہ صاحب سمجھے نہیں، انھوں نے کہا کیا فرمایا حافظ صاحب یہاں سے پھر مناسب وقفے کے بعد آواز آئی ''دوت'' اب تو اس شخص نے آواز بھی سنی اور معنی بھی سمجھا مگر اس کو یقین نہ آیا کہ دوت کہا گیا ہوگا۔ یہاں سے بھی مقررہ وقفے کے بعد وہی ''دوت'' کہا گیا۔ تعجب کے لہجے میں نیچے سے آواز آئی ''ایں یہ کیا'' مقررہ وقفے کے بعد اسی اطمینان اسی سنجیدگی سے انھیں مدھم سروں میں ''دوت'' ارے یہ کیا شرافت ہے ''دوت'' پھر وہی ''دوت'' یہ دیکھیے بڑا حافظ بن کے آیا ہے۔ ہاتھ بھر کی داڑھی لٹکائے چوری نکلے ہوئے اور حرکات یہ۔ ''دوت'' اب تو وہ سڑک پر اینٹیں پتھر تلاش کرنے لگا۔ مگر اول تو سڑک صاف تھی، دوسرے ان تک کوئی ڈھیلا پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ ''دوت'' پھر وہی کمینہ پن کیا پاجی آدمی ہے ''دوت'' لاحول ولا قوۃ ''دوت'' وہ جاتے جاتے پھر پلٹ پڑا اور حافظ جی کو گالیاں دینے لگا۔ اب برابر یہی ہوتا ہے کہ وہ حافظ صاحب پر نفریں کرتا ہوا جانا چاہتا ہے مگر ''دوت'' کی آواز پھر اس کو کھینچ لاتی ہے اور وہ نئی نئی گالیاں حافظ صاحب کی خدمت میں پیش کرتا جاتا ہے۔ وعدہ تو کر گیا تھا کہ صبح کو وہ اپنے مخاطب یعنی حافظ صاحب قبلہ کی جوتوں سے مدارات کرے گا، مگر باقر صاحب صبح تڑکے ہی کی گاڑی سے چلے آئے۔ اس وجہ سے پتہ نہ چل سکا کہ ان دونوں میں صحبت کیونکر گرم ہوئی۔

ہمارے قصبہ میں کربلا ایک تفریح کی جگہ ہے وہاں بڑی عمدہ عمارتیں امام باڑے، مسجدیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جناتوں نے بنوائی ہیں۔ ان کو دیکھنے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ ایک بار وہاں باہر کے ایک بڑے رئیس نے منت کی مجلس کی تھی۔ میں بھی مدعو تھا۔

وہاں باقر صاحب پہلے سے موجود تھے۔ کسی کونے میں بھڑوں نے چھتا لگایا تھا۔ میاں باقر جو ادھر سے نکلے تو گردن اور کان میں کئی ایک بھڑیں لپٹ گئیں۔ باقر صاحب کو اور کمالات کے ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ درد کی تاب نہ تھی۔ ذری سی بات میں چیخنا چلانا ہائے ہائے کے نعرے لگانا، معمولی بات تھی۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد پاؤں پٹخنا، افوہ کی جھڑ باندھنا، درد کی شکایت ہر شخص سے ہمدردی کی بھیک مانگنا، بڑے شدومد سے ہو رہا تھا۔ اتنے میں دو ایسے باہر کے حضرات کو آتے دیکھا جو ان کے شناسا مگر اس عمارت سے اجنبی تھے۔ یہ لوگ پڑھے لکھے، شائستہ، شرافت کی تصویر معلوم ہوتے تھے۔ میاں باقر نے جہاد نفس کر کے جزع فزع ایک دم روک دی اور باوجود تکلیف کی شدت کے چہرہ سنجیدہ کرلیا اور بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ عمارت دکھانے کے بہانے وہیں لے گئے جہاں خود ان پر مصیبت آگئی تھی۔ میں نے چاہا کہ ان کو آگاہ کر دوں۔ مگر جب تک میں آدمی بھیجوں یا پہنچوں، وہاں جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا۔ سید باقر غائب ہوگئے۔ اب دیکھتا کیا ہوں کہ وہ دونوں آدمی خیالی پٹا بانا ہلاتے مختلف پینترے بدلتے، سر گردن پر تھپڑ مارتے چلے آتے ہیں اور بھڑیں ہیں کہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اب اس سے اندازہ کر لیجیے کہ باقر مرحوم کو جب کوئی مذاق سوجھ جائے تو دل سے کیونکر مجبور ہو جاتے تھے۔

مکمل تصویر تو بڑے سے بڑا آرٹسٹ بھی نہیں کھینچ سکتا۔ یہ کام تو فقط احسن الخالقین ہی کا ہے۔ ایک آن، ایک دھج، ایک جذبہ، افتاد طبیعت کا ایک رنگ کوئی اتارنے میں کامیاب ہوگیا ہے تو وہ اپنے وقت کا رفیل اور ولیسینکر کہلاتا ہے۔ جب اتنے اتنے بڑے صاحبان موقلم کا یہ حال ہو تو ایک چھوٹا آدمی لکڑی لوہے کا قلم ہلانے والا کیا کرسکتا ہے۔ مگر میں نے کوشش کی ہے کہ باوجود تمام باتوں کے ہمارے باقر چچا اس قلمی خاکے میں ایسے معلوم ہوں کہ پڑھنے والا اگر ان سے محبت نہ کرنے لگے تو نفرت بھی نہ کرے۔ اگر میں اس میں کامیاب ہوا ہوں تو خیر اللہ کا شکر ہے اور اگر اس میں بھی ناکامیاب رہا ہوں تو مرحوم مجھ کو معاف کریں اور خدا مجھے بخشے۔

(کشکول)

○

میر یوسف

میر محمد یوسف غریبی کی گھریا میں تپائے گئے تھے۔ کھرا مال رہ گیا تھا، کھوٹا جل گیا تھا، لیکن گھریا سے نکالنے کے بعد سنار کھرے سونے کو بھی سہاگے وغیرہ سے چمکیلا کر لیتے ہیں۔ آدمی میں یہ سہاگہ تعلیم کا ہوتا ہے۔ تنگ دستی، مفلوک الحالی کی وجہ، وہ سہاگہ ان کو ملا مگر کم۔ بچپن ہی میں ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ باپ نے مجبوراً شادی کرلی تھی، ایسے لڑکے کی بدقسمتی بیان کی محتاج نہیں۔ ایک چھوٹا بھائی تھا اور یہ تھے شروع جوانی میں روٹی کے لیے گھر چھوڑ کر سفر پر جانا پڑا، خود فخریہ بیان کرتے تھے کہ میں کلکتہ کو پیدل چلا، کچھ پیال بچھانے کو اور جیب میں کچھ پیسے زندگی قائم رکھنے کو، کلکتے تقریباً ایک ماہ میں پہنچے، وہاں سے برہما گئے، کرایہ کہاں تھا جہاز پر کوئلہ جھونکنے یا پلیٹ وغیرہ دھونے کا کچھ کام کر کے رنگون پہنچے۔ بیان کرتے تھے کہ دن کو اینٹیں پاتھنے کا کام کرتے تھے تیسرے پہر کو ایک برف والے کا سامان سڑک کے کنارے لگاتے تھے۔ میز، برف کا صندوق، سوڈا واٹر کی بوتلیں اور گیارہ بجے رات کو پھر اس کے گھر یہ سب چیزیں پہنچاتے تھے۔ جب کچھ روپیہ ہوگیا گھر لوٹ آئے مگر غریبی نے دامن نہ چھوڑا، قصہ مختصر غریبی وفادار عورت کی طرح عمر بھر گلے کا ہار رہی۔ یہ بے وفائی پر ہمیشہ تلے رہتے تھے مگر اس نے ان کو نہ چھوڑا۔

مستقل نوکری کبھی نصیب نہ ہوئی مگر بے کار کبھی نہیں رہے زیادہ تر پیمائش میں جایا کیے۔ شادی بھی ہوگئی تھی۔ غریبی اور برخورداری بچے بھی بہت سے پیدا ہوگئے۔ ایک بار اڑیسہ میں تھے بیمار پڑ گئے، گھر پریشانی سے خط بھیجا کہ کرایہ بھیج دو، بیوی نے گردیں گانٹھ کر کے دس روپے بھیجے۔ منی آرڈر میں دو ٹکڑے دس روپے کے نوٹ کے ملے۔ اس زمانے میں نوٹ کے آدھے کرنا خلاف قانون نہ تھا اب جو گھر میں آ کے دیکھتے ہیں تو دونوں ٹکڑے مختلف نوٹوں کے ہیں۔ پوسٹ ماسٹر کے پاس گئے، خوشامد کرنے لگے کہ منشی جی ہم غریب آدمی ہیں بیمار ہیں ہم مر جائیں گے۔ للہ یہ واپس لے لیجیے ہم کو دوسرا نوٹ

دے دیجیے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب بہادر کبھی یہ غلطی کر گئے تھے اور یقیناً سرکاری روپیہ ان کو بھرنا پڑا ہوگا۔ اس کے بعد سے انھوں نے اس ذریعہ سے نہ معلوم کتنا کما لیا تھا۔ اکثر جاہلوں کو یہی ٹکڑے دے دیتے تھے اور جب وہ واپس لاتے تھے تو یہ روپیہ دو روپیہ کم پر معاملہ کرکے اپنا گزشتہ نقصان روز کے منافع سے بدلا کرتے تھے۔ میر یوسف نے غریبی، بیماری، غریب الوطنی، بے یاری مددگاری کے نہ معلوم کتنے سفارشی پوسٹ ماسٹر صاحب کے سامنے پیش کیے مگر وہاں شنوائی نہ ہوئی اور دو روپیہ انھوں نے لے ہی لیے۔ دو ٹکڑے واپس لیے۔ میر صاحب بے چارے پوسٹ آفس کے احاطے کے باہر ٹہلا کیے، جب پوسٹ ماسٹر صاحب دفتر بند کرکے باہر نکلے تو میر صاحب نے موصوف کو بلا تکلف اٹھا کر دے مارا اور چھاتی پر چڑھ بیٹھے اور نہایت لجاجت سے اپنے مصائب دوہرانے لگے۔ یہ بھی عرض کردیا کہ غریبی نے جان لینے اور جان دینے دونوں کا ڈر دل سے دور کردیا ہے اپنی تنہائی کا دکھڑا رونے میں یہ بھی کہا کہ آپ حاکم بالادست سرکاری ملازم ہیں۔ اگر آپ کے طرفدار لوگ چھوڑانا چاہیں گے تو فوراً میں آپ کا گلوئے مبارک جس پر میں احتیاطاً ہاتھ رکھے ہوں فوراً گھونٹ دوں گا، میر صاحب کا حلیہ بھی کچھ ایسا تھا کہ اس طرح کی باتوں کی امید میر صاحب سے کی جاسکتی تھی۔ نیچے کا جبڑا چوڑا ارادے کی مضبوطی بتاتا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں ایسے موقعے پر پھیل کر اور بڑی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ آخر کلام میں ہونٹ مضبوطی سے بند کرکے دہانہ اور چوڑا کرلیتے تھے۔ پوسٹ ماسٹر بہادر کے دو چار ہمدرد جمع ہوگئے مگر اس الٹی میٹم کے بعد ہاتھ کسی نے نہیں لگایا بلکہ یہی صلاح ٹھہری کہ پوسٹ ماسٹر صاحب میر یوسف کی غریبی پر رحم کرکے معاملہ طے کرلیں۔ لوگ وطن سے دور جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو وہاں کے واقعات بیان کرنے میں ذری طلسم ہوش ربا کا رنگ پکڑ لیتے ہیں مگر میر صاحب کے بیان کے پہلے دو دوسرے گواہوں نے مجھ سے یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا تھا اس لیے میر صاحب پر مبالغے کی تہمت نہیں لگائی جاسکتی۔ ارادے کی مضبوطی کی تصدیق مجھ سے زیادہ کوئی نہ کرسکے گا کیونکہ جب میرا علاقہ کورٹ سے چھوٹا تو میر صاحب نے ارادہ مضبوط کرلیا کہ میرے یہاں مختاری کریں گے میں نے ہزار ہاتھ پاؤں مارے بہت سمجھایا کہ میر صاحب آپ کے اور ہمارے برادری کے مراسم جوکھم میں

پڑ جائیں گے مگر پوسٹ ماسٹر صاحب کی طرح مجبور ہوگیا اور میر صاحب مرحوم کا ارادہ ایسا کامیاب ہوا کہ درمیان میں سوا ایک تھوڑے سے دم لینے کے وقفے کے یہ رشتہ صرف میر صاحب کی موت توڑ سکی۔ مختاری کا شوق کافی تھا مگر قانون سے کوئی خاص مناسبت نہیں تھی، سنا کرتے تھے کہ مختار لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ پیال کے پاؤں ایسے کھڑے کردیتے ہیں کہ عدالت سچ مچ کے سمجھنے لگتی ہے۔ دھول کی رسی بٹ کر تیار کردیتے ہیں مگر خود کبھی ان باتوں میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ایک مرتبہ ان کے محلے میں ایک مسماۃ کا انتقال ہوگیا وہ کچھ صاحب جائداد تھیں۔ چند شریف النسل کمینہ خصلت، بے کار لونڈوں نے یہ تجویز کیا کہ مسماۃ کا جعلی وصیت نامہ تیار کیا جائے۔ شامت کے مارے ادھر سے میر یوسف آرہے تھے کہ محلے کا معاملہ، ہر شخص سے جان پہچان لونڈوں نے کہا خوب آگئے ذری بتایئے تو کس طرح یہ مسودہ لکھا جائے۔ ان کو خود کوئی منفعت کی امید نہ تھی۔ صرف مختاری اور قانون دانی اور ایک مشکل کام میں کمال دکھانے کو بیٹھ گئے۔ مسودے میں کہیں کہیں اپنے قلم سے بھی اصلاح دی بعد کو جب لوگ پکڑے جانے لگے تو محلے بھر میں ام من یجیب المضطر اذا دعاہ و یکشف السوء کی دھوم مچی۔ خدا جھوٹ نہ بلائے دو چار لاکھ مرتبہ تو میر یوسف بھی بڑھ گئے ہوں گے۔ خیر آپس کی بات تھی، کسی نہ کسی طرح معاملہ دب گیا۔ لیکن اللہ میاں کی دنیا کچھ اس بات کے کہنے والے اور صرف اس کے پڑھنے والوں سے تو تیار نہیں ہوا کرتی۔ یہاں تو ہزاروں لاکھوں طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک صاحب تھے (ان کی روح نہ رنجے) جن کا قاعدہ تھا کہ دوستی ہمدردی کے پیرائے میں وہ اگر کسی کو ذلیل کرسکنے کا موقع پاجاتے تھے تو پھر کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ظاہر ہے کہ میر یوسف کا یہ فعل کوئی قابل تحسین تو تھا نہیں، لیکن جن لوگوں کے دل میں ان کی جگہ تھی انھوں نے اس بنا پر معاف کردیا کہ کوئی ذاتی فائدہ نہ ہو تو اس قسم کی حرکت حماقت کی حد سے باہر نہیں جاتی۔ مگر ان صاحب کے ہاتھ ایک مشغلہ آگیا جہاں دو چار آدمیوں کے بیچ میں میر یوسف کو دیکھا کہنے لگے کیوں جی یوسف پہنچ گئے، اپنی سزا کو نا، اب پھر جعل بناؤ گے، پہلے تو میر یوسف اظہار ندامت کے ساتھ ساتھ ان کی بے تکلفانہ ہمدردی کو بھی سراہا کیے لیکن جب یہ بات اور بڑھی اور ایک اچھے خاصے مجمع میں

انھوں نے پھر یہی کہا تو میر یوسف نے اپنی آنکھیں پھیلائیں اور ارادے کی مضبوطی والے جبڑے کا ٹھاٹھ بدلا، سینہ تانا، گردن اونچی کی تاکہ محفل بھر ان کی آواز اچھی طرح سن سکے اور فرمانے لگے، بس صرف ایک مرتبہ جعل اور بناؤں گا، جب تم مرو گے تو تمھارا وصیت نامہ تیار کروں گا، ایسے موقعوں پر میر صاحب چوڑے جبڑے کو اور چوڑا کر لیتے تھے۔ دونوں ہاتھ خم کر کے نیچے کمر پر جما لیتے تھے جیسے دوچشمی ھ۔ آنکھوں کو پھیلا کر جتنی حونق بنا سکتے تھے بنا لیتے تھے۔ اس کے بعد اعلان جنگ فرماتے تھے اور اعلان جنگ کے بعد سر کو دو تین بار اس طرح جنبش دیتے تھے جیسے ٹھڈی سے سینے کی ہڈی چھونا چاہتے ہیں۔ گویا ارادے پر تصمیم کی مہر لگاتے تھے، جب جملہ پورا کر لیتے تو اپنے ہونٹ دبا کر دہانہ اور چوڑا کر لیتے تھے، گویا زبان حال سے فرماتے تھے کہ اب تو میرے کہنے میں تم کو کوئی شک نہ رہا ہوگا۔

ظاہر ہے کہ یہ مضمون نہ میر یوسف کی تعریف کا قصیدہ ہے نہ ہجو لکھی جاتی ہے یہ تو ایک خاکہ ہے جس سے اگر میر صاحب مرحوم کی ایک دھندلی سی تصویر کھنچ جائے تو میں کامیاب ہوا نہیں تو اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

میرے پڑھنے والو! جب ہمارے آپ کے ایسے اچھے آدمیوں میں کوئی نہ کوئی عیب ڈھونڈھنے سے نکل آئے گا تو اگر میر یوسف میں کوئی کمی رہی ہو تو کیا تعجب ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں بچپن میں انھوں نے بڑی تکلیف اٹھائی تھی۔ پیش از وقت روٹی کی فکر نے ان کے اوپر دوامی اثر ڈالا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ بچوں کے پیٹ پالنے میں نہ خودداری باقی رہی تھی نہ ایسی حرکتوں سے شرماتے تھے، جو شخص دوسروں کے لیے ایسی محنت مزدوری کرے، یا دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے میں اپنے آرام کا خیال نہ رکھے اپنی تکلیفوں سے نہ گھبرائے، بچوں کے اوپر اپنی خودی کو نچھاور کر دے اس کی برائی کس منھ سے کی جائے۔ ایک مرتبہ ایک گاؤں میں روپیہ کم چل رہا تھا۔ ضلع دار کے کام کو دیکھنے کے لیے یہ بھیجے گئے۔ خیر کام تو جیسا دیکھا ویسا دیکھا ہی لوٹیوں کو گھر کے لیے جھاڑو باندھے چلے آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص حلقے کے ضلع دار کے اوپر تعینات کیا جائے وہ وہاں سے جھاڑو بغل میں دبائے واپس آئے اس کا رعب بھی تو کچھ ہلکا ہی پھلکا ہوگا۔

جوانی میں بڑے جفاکش تھے، بڑھاپے میں بلغم بڑھ جانے کی وجہ سے اوپر کی منزل بھاری ہوگئی تھی اور نیچے کی منزل یعنی پاؤں کو زیادہ محنت پڑتی تھی۔ اس لیے چلتے پھرتے ذری تکلیف سے تھے مگر فرض منصبی ادا کرنے میں ہمت سے سب کچھ کر لیتے تھے۔ میر صاحب غصہ کبھی کبھی تو دکھا دیتے ہی تھے، لیکن اصل صفت ان کی انکسار تھی۔ بڑے منکسر مزاج، کام میں عذر نہیں، بعض باتوں میں تصنع کی جھلک بھی پائی جاتی تھی، مثلاً مجلسِ عزا میں روتے بڑے زور سے تھے، مشاعرے یا قصیدہ خوانی کی محفلوں میں تعریفیں بھی مبالغے سے کرتے تھے چاہے اس میں سخن فہمی کی ٹھیک ہی نکل جائے۔ اپنے بچوں پر فدا تھے اور اگر کبھی گھر میں کسی پر خفا بھی ہوتے تھے تو لوگوں کو تصنع کا پتہ چل جاتا تھا۔ اس دوسرے قسم کے غصے کی تصویر کھینچنا میرے امکان سے باہر ہے۔ بھلے کو ایک مثال مل گئی ہے، اس سے شاید پڑھنے والوں کو کچھ اندازہ ہو جائے۔

اخبار میں اشتہار نکلا کہ ایک سنیما کمپنی میں ایکٹر اور ایکٹرسوں کی ضرورت ہے۔ ان کے لڑکے نے اپنی خدمات پیش کیں، وہاں سے جواب آیا کہ ہم تم کو ضرور لیں گے بشرطیکہ تم اپنے ساتھ ایک ایکٹرس بھی لاؤ۔ مجبوراً انھوں نے اپنی بے بسی ظاہر کی مگر یہ لکھا کہ اگر کہیے تو اپنے والد ماجد مدظلہ کو لیتا آؤں۔ غصے کا پارٹ موصوف اچھا کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ یہ تھوڑے دن کے لیے میرے یہاں سے چلے گئے تھے، مگر مختار نامہ منسوخ نہیں کرایا تھا اور ایک دوسری عقل سے دور جہالت سے قریب ریاست میں مختار ہو گئے تھے وہاں میر صاحب مرحوم نے اچھا خاصا کمایا۔ ہمارے ملک میں اوپر کی آمدنی علیحدہ مد ہے۔ کسی سے پوچھیے کیا تنخواہ ہے۔ وہ بتاتا ہے، اس قدر پھر پوچھیے اوپر کی آمدنی وہ کہتا ہے جی ہاں کچھ مل جاتا ہے۔ شکر ہے اللہ کا۔ اودھ میں ریاستوں کے مختاروں کی ایک برادری قائم ہوگئی ہے جن کے اصول اخلاق بھی بن گئے ہیں، اکثروں کا خیال ہے کہ شاعر کی طرح مختار بھی پیدا ہوتا ہے۔ یہ لوگ مقدمہ بازی کا شوق اللہ میاں کے یہاں سے لاتے ہیں اور اسی فطری تقاضے پر مختاری کو دوسری نوکریوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مالکوں کو لوٹنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں، لیکن مدمقابل کا احسان لینا یا اس سے مل جانا ان کے مذہب میں جائز نہیں۔ میں ایک ریاست کے مختار کو جانتا ہوں

جن کو فریق ثانی نے رشوت دے کر ملا لینا چاہا۔ اس نے نہایت حقارت سے کہا کہ لوٹنے اور نفع کمانے کے لیے خود ہماری ریاست کیا کم ہے۔ جو ہم غیر کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت قبول کریں۔ ہم حساب میں ایک کے دس لکھتے ہیں اور پا جاتے ہیں ہم شریف ہیں۔ مد مقابل سے مل جانا وہی کرسکتا ہے جس کے نطفے میں فرق ہو جہاں یہ رنگ ہو، وہاں اگر میر صاحب مرحوم نے کچھ جمع کرلیا ہو تو کون اَن ہونی بات کی۔ البتہ ایک آدھ لغزش ایسی کر گزرے جس سے ان کے نئے آقا پر تو ان کا رعب رہا مگر دوسرے ان کو پہچان گئے۔ یہ ریاست جس ضلع میں تھی وہاں کے حاکم ضلع میرے بے تکلف جاننے والے تھے۔ میر یوسف حاکم ضلع کے سلام کو گئے، ہمارے یہاں کسی حاکم سے گھر پر ملنے کی نوبت ان کو کبھی نہیں آئی تھی۔ اس نئی ملازمت میں اپنے آقائے ولی نعمت کو مرعوب کرنے کے لیے اور ریاست میں اپنا رنگ جمانے کو یہ بھی کر گزرے وہاں انھوں نے کہا کہ چونکہ اس ریاست کا انتظام بہت خراب تھا اور مالک ریاست نے میرے رئیس سے (یعنی اس حقیر سے) ایک منتظم مانگا تھا لہٰذا میں بھیجا گیا ہوں کہ ہر چیز درست ہوجائے۔ بدقسمتی سے وہ میرے لاابالی پن اور سٹرپٹر کام سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے آتش بازی چھینک گئی اور وہ سمجھ گئے اینٹھ راجا تیتھ پرجا۔ میر صاحب بھی کچھ ایسے ہی ویسے ہوں گے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں زمینداروں کو ایک نئی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ یہ کہ گاؤں سے جو نئے رنگروٹ بھرتی ہوکر فوج میں جاتے تھے وہ وہاں سب سے پہلے کام یہ کرتے تھے کہ اپنے زمینداروں اور دوسروں کی شکایتوں کے خطوط اپنی فوج کے کرنل کے ذریعہ سے بھجواتے تھے اور سول حکام ان کی چھان بین کرتے تھے۔ چنانچہ اس طرح کی کچھ درخواستیں ہمارے اوپر بھی گزری تھیں۔ لیکن یکے بعد دیگرے سب خارج ہوجایا کیں۔ چنانچہ کسی مقدمے میں میر صاحب میرے پیروکار تھے، ڈپٹی صاحب تھے تو بنئے مگر تجربہ کار اچھے خاصے تھے۔ علاوہ قانونی کارروائی کے دھونس ڈال کر بہت سا عدالتی کام کم کر لیتے تھے۔ صلح کرا دینا، مستغیث یا مدعی سے زور ڈال کر عرضی دعویٰ یا استغاثہ واپس کروا لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا، چنانچہ عدالتی کارروائی کے درمیان میں ان کو کسی فوجی آدمی کی درخواست یاد آگئی، مقدمہ چھوڑ کر ڈانٹ ڈپٹ شروع کردی۔

ڈپٹی: کیوں جی مختار تمھاری ریاست کے خلاف ایک درخواست تو پہلے ہی سے تھی، اب ایک اور آئی ہے۔ میں کہتا ہوں کون جیل خانے جائے گا۔ بتاؤ، جیل خانے کون جائے گا۔ فوجیوں کی درخواست بالا جانے والی نہیں ہے۔ اس میں کوئی نہ کوئی ضرور جیل خانے جائے گا۔ بتاؤ کون جیل خانے جائے گا۔

میر صاحب: (پیچھے سے بڑھ کر وکیل کے برابر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔) جیل خانے جائیں گے مالک ریاست یا ڈپٹی کلکٹر۔ ہم نوکر آدمی ہمسے کیا پوچھتے ہیں۔

ڈپٹی صاحب بے چارے بنئے آدمی تھے، پھر مقدمہ کرنے لگے۔

ایک بار میر صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے۔ اسی ریل پر میں بھی تھا، مگر ان سے علیحدہ تھا۔ لکھنؤ کے اسٹیشن پر ریل کا ایک آدمی مجھ سے آکر کہنے لگا کہ تمھارے ملازم سے اور ایک انگریز سے لڑائی ہو رہی ہے۔ میں چلا گیا کہ دیکھوں کیا معاملہ ہے، دیکھا کہ درجے میں کئی آدمی ہیں اور ایک بنچ کے بیچوں بیچ میں میر صاحب بیٹھے ہیں اور سامنے کے بنچ کے کونے پر ایک انگریز بیٹھا ہے، میں نے کہا، میر صاحب خیریت ہے، کہنے لگے، آپ جانئے سب خیریت ہے۔ میں نے کہا ڈنڈا ونڈا ہے، کہنے لگے، جی ہاں ڈنڈا ہے اور (مدمقابل کی طرف دیکھ کر) اور چکّو بھی ہے۔ یہ کہتے وقت میر صاحب کی وہی آنکھیں، وہی ٹھڈی، وہی ہونٹ اور وہی گردن کی جنبش، اس وقت نگاہوں کے سامنے ہے۔ ستّر سال کے ادھر رہے ہوں گے کہ کل عید ہے۔ آج درزی کے یہاں اپنے پوتوں کے کپڑوں کے لیے گئے تھے کہ عید کے پہلے مل جائیں۔ وہیں قلب کا دورہ ہوا اور گھڑی بھر میں ختم ہو گئے۔

لوگ کہتے ہیں آخر وقت اپنے عقائد بیان کرتے جاتے تھے اور پوچھتے جاتے تھے کہ صحیح الفاظ منھ سے نکل رہے ہیں نا۔

(کشکول)

○

یادِ احباب

دیو جانس یا ابی قورس؟

[درگاہی خاں]

تقریباً 1880 میں تعلقہ داران اودھ کا ایک البم نکلا تھا۔ اس میں ایک آٹھ نو برس کے لڑکے کی تصویر بھی تھی۔ اس مجمع کا یہ آخری بڈھا تھا جس نے تقریباً آٹھ نو برس ہوئے انتقال کیا۔ اب وہ محفل پوری کفن پوش ہو چکی، ان کا نام درگاہی خان تھا۔ اونچ گاؤں ان کے تعلقہ کا نام تھا اور مسلمان ٹھاکر تھے۔ میں ان کا نام دیکھنے کے بہت پہلے سنتا تھا۔ مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ مگر ایک ایسا زمانہ تھا کہ ہمارے اور ان کے دونوں کے علاقے کورٹ آف وارڈس میں تھے۔ نہایت کم سنی میں میرے کورٹ کی شروع تھی اور ان کے نابالغی کے زمانہ کا صرف دم چھلا باقی تھی۔ اسی وجہ سے ان کا نام اکثر سنتا تھا۔ جب ہوش سنبھالا تو ان کے واقعات زیادہ دلچسپی سے سننے لگا۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ ملاقات ہوئی۔ تھوڑے بہت مراسم بھی ہو گئے۔ لیکن ہمارے ان کے گھروں کے درمیان میں جنگل، دریا، پگڈنڈیاں، نالے، کھوئے، اوسل، بنجر، کھادر خاک دھول بلا اتنے حائل تھے کہ ملنے کا اتفاق کم ہوتا تھا لیکن ان کی طبیعت اس طرح کی واقع ہوئی تھی کہ اگر کوئی ایک مرتبہ بھی دیکھ لیتا تو عمر بھر نہ بھولتا۔ پڑھے لکھے کم تھے، وضع قطع بالکل ہندو کی، بڑی سی چُرٹی بھی تھی جس کو کہتے تھے کہ کچھوچھے شریف کی مَنت ہے۔ سنا جاتا ہے کہ جس قدر علم تھا بھی اس کو نہایت احتیاط سے چھپاتے تھے۔ بچپن میں کچھ انگریزی بھی پڑھی تھی، مگر کیا مجال جو کوئی اس کا پتہ پا جائے۔ بعضوں کا خیال تھا کہ جو کچھ پڑھایا گیا تھا وہ بھول گئے تھے۔ اکثروں کا خیال تھا کہ درگاہی خان ان لوگوں میں نہ تھے جو کوئی چیز بھی بھول جائیں۔ ان کی زبان بالکل جاہل دیہاتیوں کی تھی۔ ش۔ق کی چھاؤں بھی نہ تھی۔ مگر مطالب مارکس، اریلیس، سقراط، جرمی بینتھم، حافظ شیرازی، برٹرنڈرسل کے ہوتے تھے۔ انداز گفتگو میں

ڈاکٹر جانسن کی جھلک پائی جاتی تھی اور پھر دیکھیے تو خالص جاہل دیہاتی بانگڑو، کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی پہنانے والا، بہت دور کی کوڑی لانے والا، عقل سلیم کا لطف رکھنے والا، جنگلی، ہُوش، ان پڑھ اور گندۂ ناتراش۔ غرضکہ ہمارے دوست تمام تضاد باتوں کا مجموعہ تھے۔ حضرات ناظرین، بابودرگاہی خاں کی قلمی تصویر نہ میں کھینچ سکتا ہوں نہ آپ اس کو سمجھ سکتے ہیں، مگر مثالوں سے شاید کچھ اندازہ ہوجائے۔ ایک دن کسی نے پوچھا۔ بابو صاحب آپ کے کے صاحب زادے ہیں۔ بولے چار ہیں، مرے جیے سسر دوئی جانو۔ اسی طرح کسی نے خبر سنائی کہ فلاں تعلقہ دار کا علاقہ کورٹ آف وارڈس سے چھوٹ گیا، بولے ''بھیا...... کا علاقہ چھوٹ گوا'' تو اب مہروَن کی پھلواری لاگ ہوئی' یعنی اب عورتوں کا باغ لہلہا رہا ہوگا۔ ایک دن ایک دوست کے یہاں ملاقات ہوئی، بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے خوش دلی اور خلوص سے کہا بابو صاحب ہم آپ کے یہاں آئیں گے کہنے لگے ''کون پوادے اُیہوٗ' یعنی تم کو کیا حق ہے آنے کا۔ کس بنا پر آؤ گے۔ میں نے جواب دیا۔ خیر میں آؤں گا ضرور۔ آپ کا دل چاہے تو نکلوا دیجیے گا۔ فرمانے لگے نہیں ''اُیہوتو بکرا مَرائیک کا پڑہئے، مُل بے بلائے کوئی کے یہاں جاب ٹھیک نہیں۔'' یعنی آؤ گے تو بکرا حلال ہی کرنا پڑے گا۔ مگر بغیر بلائے کسی کے یہاں جانا اچھی بات نہیں ہے۔ درگاہی خاں صاحب بڑے منتظم تعلقہ داروں میں تھے۔ ایک دن میں نے ان سے ترکیب پوچھی کہ اخراجات کیوں کر کم کیے جائیں، کہنے لگے کہ اِی میز، کرسی، کوچ، سوفا جس مکان میں رکھے ہو اس کو بند کردو اور اُس حصہ مکان کی طرف اشارہ کرکے جو قدیم وضع کا دیوان خانہ کہلاتا ہے وہاں چارپائی بچھا کر بیٹھو۔ اگر مہاراجہ محمودآباد بھی آویں تو وہیں بٹھاؤ، سرہانے سے سرک کرتم خود پائتی جا بیٹھو اور معزز مہمان کو سرہانے جگہ دو۔ خرچ ابھی کم ہوجائے گا خود اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ جب ان کا علاقہ واگذار ہوا تو ناچ اور رنگ تھا۔ عیش اور جوانی کی امنگ تھی۔ اسی سلسلہ میں ایک مچھلی کا بیاہ بھی رچایا تھا۔ مچھلی کا بیاہ کیوں کر ہوا تھا، یہ نہیں معلوم پچاسوں رنڈیاں، ڈیرہ دار موجود تھیں بڑے زور کا مجرا ہورہا تھا۔ اتنے میں مسند کے پیچھے ایک پشاوری سوداگر آ کر کھڑا ہوا اور بھری محفل میں کہنے لگا بابو صاحب ہمارا روپیہ کب دوگے۔ تھیٹر میں جیسے جادوگر کے آتے ہی پردہ پھٹتا ہے اور

سین بدل جاتا ہے، اسی طرح بابو صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہم کہا کہ جب ایسے میں مہاجن اپنا کرجہ مانگ بیٹھا تو ای گانے ماکون مجا رہ گوا (میں نے کہا کہ جب قرض خواہ بھری محفل میں اپنا قرضہ مانگ بیٹھا تو عیش کہاں باقی رہا) محفل برخاست، رنڈی بھڑوے، حوالی موالی، تماشائی، طفیلیئے رخصت، مصاحب، خوشامدی، نیمبو نچوڑ، مہتمم، ناظرات، میراثی، بھانڈ، بھگتیے، سب یک قلم برطرف۔ رات تو جوں توں کٹی۔ صبح سے دوسرا رنگ دوسرا ڈھنگ، دوسرا سامان، خیمے شامیانے غائب، فرش وفروش جہاں کے تہاں پہنچے، خالی چوپال کے چھپر میں بابو صاحب کھٹیا (یعنی چارپائی) پر بیٹھے، سیر کا غلہ ٹلوا ٹلوا کر دیہاتیوں کو ڈیڑھی سوائی پر بانٹ رہے ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں ریولیوشن ختم ہوا۔ قرضہ، بدانتظامی، قصہ پارینہ ہوگیا۔ ایولیوشن کا وقت آیا۔ علاقے بھر میں جتنے پیشہ ور مثلاً تیلی، موچی، جلاہے ہیں سب بابو صاحب کے قرض دار۔ جتنے کاشتکار و رعایا ہیں، سب سے ڈیڑھی سوائی کا بیوپار، خود ہی زمیندار خود ہی ساہوکار، دل کی کھڑکی بند ہوگئی۔ دماغ کا دروازہ کھل گیا۔ رعایا پرایا اگر خوش نہیں تو مطمئن ضرور ہوگئے۔ بابوصاحب نے ابی قورس کا فلسفہ چھوڑ کر دیو جانس کا اختیار کیا۔ گاندھی کے کھدر کا کسی نے خواب بھی نہ دیکھا تھا اس وقت بابو درگاہی خاں گاڑھا زیب تن کیے اور اس پر کچھ رنگ ملامتی فقراء کا اضافہ کیے نظر آتے ہیں۔ مقامی صنعت وحرفت کی مدد کا خیال صرف کتابوں میں رہا ہوگا۔ اس وقت بابو صاحب اپنے علاقہ کے چماروں کا بنایا ہوا جوتا پہننے لگے تھے۔ اسی کے ساتھ امارت کی بھی شان باقی تھی۔ گاڑھے کے کرتے میں بڑے بڑے سونے کے بٹن جو شاید چھینی سے کاٹے گئے تھے، لگے ہیں۔ تین آنے کے نریل حقے میں دس تولے کا دست پنا سونے کا لٹکایا گیا ہے۔ مگر اس میں بجائے زنجیر کے سُتلی بندھی ہوئی ہے۔ اسی طرح بٹنوں میں بھی سوت کی ڈوری کرتے کے نیچے بندھی تھی۔ ضلع اور صوبے کے دربار کے لیے ایک پوشاک معہ ایک کامدار ٹوپی کے رکھتے تھے۔ مگر اس انداز سے پہنتے تھے کہ جس سے کپڑے کی شان اور دربار کا ڈھونگ دونوں کی ٹھیک نکل جائے۔ ان کے ضلع کے ڈپٹی کمشنر مجھ سے کہتے تھے کہ جب درگاہی خاں ملنے آتے ہیں تو ہمارے دفتر کے سامنے وہ جو آنبہ کا پیڑ ہے اس کے نیچے درباری کپڑے زیب تن کرکے اطلاع کروا دیتے ہیں۔ لکھنؤ

سے بابو صاحب کا مکان تقریباً ساٹھ میل ہوگا۔ یہ لکھنؤ کے دربار وغیرہ میں ہمیشہ چھکڑے پر جاتے۔ گھر سے جنس اور ایندھن ساتھ لے جاتے تھے اور سوا پانی کے لکھنؤ کی کسی چیز کے شرمندہ نہ ہوتے تھے۔ سپاہی، باورچی، سب ساتھ ہوتے تھے۔ غربت میں وطن کا لطف اٹھاتے تھے۔ آخر زمانہ میں کبھی کبھی ایک اکہ بھی ہمراہی میں ہوتا تھا۔ جس کو خود ہانکتے تھے۔ میں نے ان کو مجھلی کے بیاہ کے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن ان کی بات میں استہزا اور سماج سے نہ ڈرنے کا پہلو ایسا نکلتا تھا کہ جس سے شک ہوتا تھا کہ طبیعت کا رنگ جب سے بدلا تب ہی سے سینک ہو گئے تھے۔ عموماً اودھ کے دیہاتی زمینداروں کا یہ حال ہوتا ہے کہ ممکن ہے خود اپنی رعایا پر سختی کرلیں، لیکن دوسرے کے مقابلہ میں اپنے اسامی کے لیے جان ہی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بابو صاحب نہ اُسی رنگ میں تھے نہ اِسی رنگ میں مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ اضافہ بھی نہ کرتے تھے۔ بندوبست کے بعد جس قدر مال گزاری بڑھی اسی حساب سے انھوں نے آنکھیں بند کر کے اضافہ کرلیا۔ پھر اس کے بعد ہفت سالہ یا بے دخلی اور نت نیا انتظام جس میں لگان بڑھایا جائے ان کے یہاں نہیں ہوتا تھا۔ 1921 کے نان کوآپریشن اور کسان سبھا کے زمانہ میں ایک دن وہ میرے یہاں بیٹھے تھے کہ چند کانگریس کے لوگ آگئے اور مختلف علاقہ جات میں جو شورشیں ہو رہی تھیں ان کا ذکر کرنے لگے۔ بابو صاحب نے کہا کہ اگر آپ لوگ ہمارے علاقہ میں بدامنی پھیلا دیں تو ہم سو روپیہ آپ کو مٹھائی کھانے کو دیں۔ اردگرد کے علاقوں میں آفتیں مچی تھیں، مگر جہاں تک سنا گیا ان کے یہاں ہر طرح سے امن ہی رہا۔ اس کے بہت سے وجوہ ہو سکتے ہیں اور میرے خیال میں وہ سب تھے نذرانہ وغیرہ نہ لینا، ہر شخص کو قرضہ دے کر قابو میں رکھنا، ڈیڑھی سوائی کی وجہ سے رعایا کا ٹوٹا ہونا، پکی سڑک اور ریل سے دور ہونا، اور بے جا ظلم اور تشدد نہ کرنا، اضافے اور نذرانہ والا فائدہ ڈیڑھی سوائی سے نکال لینا۔ ان کے ضلع میں زراعتی نمائش تھی رؤسا اور تعلقہ داروں نے بڑے بڑے سامان کیے۔ ہر شخص نے نمائش کے میدان میں اپنے کیمپ قائم کیے۔ سپاہیوں کی وردیاں بنیں، تلواروں کے قبضوں پر چاندی کا پانی پھرا۔ کاٹھیوں پر مخمل پھر سے چڑھایا گیا۔ قصہ مختصر ہر شخص نے علیٰ قدر حیثیت خوب شان دکھائی۔ بابو صاحب کے وہی ٹھاٹھ رہے جو ہمیشہ سے تھے۔ وہی چھکڑا

وہی گھر سے اناج وغیرہ ساتھ آتا، نہ رتھ، نہ بہلی، نہ بیلوں کی نئی جھول، نہ چاندی کی سیکوٹیاں، البتہ ان کی گوئی نے ضلع بھر میں اول انعام پایا۔ دروازہ پر ایک شاندار مگر نہایت بے وقوف مینڈھا بندھا رہتا تھا۔ اس غریب کو خبر بھی نہ ہوئی اور بابو صاحب نے اس کا بھی اول انعام اپنے ڈب میں کیا۔ خود فخریہ حساب بتانے لگے کہ اور لوگوں نے اپنی آمدنی کا معتد بہ حصہ خرچ کیا اور ہم بجائے خرچ کرنے کے کچھ کما ہی لائے۔ نمائش کے سلسلہ میں راجہ صاحب مرحوم حسن پور نے سب تعلقہ داروں کی دعوت کی تھی۔ جس میں بابو صاحب بھی تھے سب سے پہلے ان کی نظر مزعفر پر پڑی اور ذرا سا چکھ کر طشتری دسترخوان پر سے اٹھا کر اپنے پہلو میں رکھ لی۔ میزبان نے اس کی وجہ پوچھی۔

بابو صاحب: ناہیں اب نہ کھیبا، اِی کا جگنو کے کھاتر لے جیبا (نہیں اب نہ کھائیں گے اس کو جگنو کے واسطے لے جائیں گے)۔

میزبان: یہ جگنو کون ہیں۔

بابو صاحب: جگنو ہمری مہروا ہوئے (جگنو ہماری بی بی ہیں)

میزبان: یہ خطاب ان کو آپ کے یہاں دیا گیا ہے یا پہلے ہی سے ان کا یہ نام تھا۔

بابو صاحب: ناہیں جب آئی رہے تو اَس لَو نکے جَس دِیا کی ٹیون، تو ہم کہا جگنو آئے۔ (نہیں جب بیاہ کے آئی تھی تو ایسی چمکتی تھی جیسے شمع کی لو تو ہم نے کہا تھا یہ جگنو ہے)۔

پڑھنے والوں نے یہ الفاظ تو دیکھ لیے مگر جگنو کہتے وقت درگاہی خاں کا چہرہ کہاں دیکھا۔ آپ اگر کسی رکاب دار سے عمدہ چٹنی بنوائیے اور کسی کو کھلا کر اس کا چہرہ غور سے ملاحظہ کیجیے تو شاید بابو درگاہی خان کے چہرہ کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ مچھلی کے بیاہ کے زمانے کی رنگینی آج بھی باقی تھی، مگر ڈھنگ دوسرا تھا۔ تب دنیا بھر کی آخور بٹیریں بَن پتریاں، چَمر بگلیاں بھری رہتی تھیں۔ اب بجائے ان کے لمبے گھونگھٹ والی دیہاتنیں، الھڑ نادان بے سمجھ مگر فطرت کی دولت سے مالا مال نیچ قوم کی عورتیں تھیں، جو اکثر سیر اور کاشتکاری کے سلسلہ میں گھر پر کام کرنے آتی تھیں۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ اِیماں ایک اُورَو بات

ہے (یعنی اس میں ایک فائدہ اور بھی ہے) پھر اناج چوری جائے کا ڈر نہیں رہجات ہے (پھر اناج وغرہ کی چوری کا ڈر نہیں رہ جاتا) اوسری پھر اپنے مال جانے لگت ہیں (یعنی ان تعلقات کے بعد پھر وہ بے وقوف لوگ اپنا مال سمجھنے لگتی ہیں اور بجائے چوری کے الٹے حفاظت کرتی ہیں) اس کے بعد بے تکلفی میں بابو صاحب نے صنف نازک کے بارے میں کچھ میرے تجربات دریافت کرنا چاہے مگر میں نے یہ کہہ کر سلسلہ کلام جاری رکھا کہ وسط حیات میں پہنچ کر ہم سِن دل نہیں گرماتی اور کم سن سے شرم آتی ہے۔ کہنے لگے، ڈَرَاوَا نہ کرو، روپیہ پیسہ مٹھائی سب کی پوری کردیتی ہے۔ معاملہ کے بہت صاف تھے اور زبان سے جو کہہ دیتے تھے وہ پتھر کی لکیر ہوجاتا تھا۔ اسی ذیل میں ووٹ دینا بھی تھا مگر ایک بات اور کرتے تھے۔ یعنی مبلغ پچپن روپے کرایہ کے نام سے لے لیتے تھے۔ پھر کوئی ہزار روپیہ بھی دے مگر درگاہی خاں یہی کہتے تھے کہ ہم تو بکائے گئین۔ (یعنی اب ہم بک گئے اب کچھ نہیں ہوسکتا) اس معاملہ میں ان کی دوربینی اور دوراندیشی کا قائل ہوجانا پڑتا ہے، یوں دیکھنے میں بڑی ذلیل سی بات ہے، مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان سے زیادہ دولت مند ان سے زیادہ پڑھے لکھے بات کھلم کھلا کرتے ہیں اور پھر کوئی تعداد بھی نہیں جس قدر مل جائے شیرِ مادر۔ تو صرف مرحوم کا گناہ ہلکا ہی نہیں ہوجاتا بلکہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے برسوں پہلے وہ کچھ دیکھ لیا تھا جو دوسروں کو نہ سجھائی دیا تھا، بعد کو انھوں نے رقم دوگنی کردی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی کہنے لگے کہ فلاں راجہ کے انتخاب میں گئے تھے۔ بڑی خاطر مدارات ہر وقت مزاج پرسی کے لیے ذی عزت ملازمین موجود۔ خدمت کے لیے نوکروں کی کمی نہیں۔ سواری بھی حاضر لیکن ووٹ گزرنے کے بعد کوئی بات نہیں پوچھتا۔ ہم لاوارث لڑکے کی طرح ادھر ادھر مارے پھر رہے ہیں۔ اتنے میں راجہ صاحب نے دیکھ لیا۔ راجہ صاحب "ارے بابو صاحب آپ کو سواری نہیں ملی، کوئی ہے، لاؤ موٹر کار آپ کے لیے، اس کے بعد نائب صاحب آئے، ارے بابو صاحب آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ارے میاں سواری منگواؤ بابو صاحب کے لیے، معاف کیجیے گا۔ موٹر سب سواری میں گئے ہیں، جوڑی حاضر ہے اسی پر چلے جایئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مختار صاحب آئے، بابو صاحب ارے ابھی تک آپ کے لیے سواری نہیں آئی۔ دیکھیے میں ابھی منگواتا ہوں البتہ آپ کو تکلیف تو ہوگی، اس وقت سواریوں کا ایسا توڑا ہوگیا ہے کہ کیا کہوں، تانگہ

منگواتا ہوں، سپاہی سے جاؤ ایک اچھا سا تانگہ لاؤ، دیکھ لینا ذرا صاف صوف ہو۔ ابھی آتا ہے، تانگہ، یہ کہہ کر وہ بھی تشریف لے گئے۔ کیسی کار، کیسی جوڑی، کیسا تانگہ جوتیاں چٹخاتے ڈیرے پر پہنچے ''تب سے ایک سو دس روپیہ کرَ دِیئے ہن'' اسی طرح کے ایک انتخاب کے سلسلہ میں مجھ کو بھی ایک دوست کی سفارش میں ایک خط بابو صاحب کو لکھنا پڑا۔ جواب آیا کہ مجھ کو آپ کے کہنے میں کوئی عذر نہیں ہے لیکن ایک سو دس امرود اپنے باغیچے سے بھجوا دیجیے۔ چنانچہ میرے دوست کے کارکن صاحب ایک سو دس امرود رائج الوقت چہرہ دار لے کر گئے۔ اس خاص معالمت پر پسندیدگی کی مہر لگانے کی غرض سے دو عدد پیڑے مختار کو عنایت ہوئے جن کا رنگ امتداد زمانہ سے بدل کر سفید کا سبز ہوگیا تھا۔ مختار نے وہاں سے واپسی پر مجھ کو دکھائے اور اس کے بعد اپنے آقا کو دکھانے کے لیے لیتے گئے۔

ووٹ حاصل کرنے میں جو خوشامدیں، چاپلوسیاں اور ابلہ فریبیاں کرنی پڑتی ہے معلوم ہیں، جو دھوکے اٹھانے پڑتے ہیں وہ بھی ظاہر ہیں، چنانچہ آزمودہ کار مختار نے غور کرنا شروع کیا کہ مکان، فرنیچر، باغ، سواریاں، کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں کہ جن کی تعریف کرکے میزبان کو خوش کیا جائے۔ جب ہر طرف سے مایوس ہوگئے تو کہنے لگے کہ بابوصاحب آپ کے مکان کے سامنے میدان بڑا عمدہ ہے جس میں تازہ ہوا کا فائدہ کھلا کھلا ہے۔ وہاں ایسے موقع پرست سے سابقہ ہوا تھا جو خوشامد کی لغویت اسی وقت کھول دیتا تھا۔ لہٰذا بابو صاحب نے ایک غلط انداز ''ہوں'' بلکہ ''ہو......م'' میں تصنع اور دنیاسازی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ مختار نے دوسرا حملہ کیا۔ ''بابو صاحب آپ کے دروازے، مسجد بڑے موقع سے ہے۔ مگر اس کی چھت بھی پٹوا دی جائے۔ اب کی بابوصاحب مقابلہ پر تیار ہوگئے۔ سنومکھتیار صاحب، ان کا جو بہت منھ لگاوَا اُوکا تباہے دیکھا۔ بس اِتنے بہت ہے، مالم ہوئے گوا کہ ہم ان کا مانت ہن اور کا چہیئے؟ او کچھ ہمری نماج کے بھوکے ہیں کہ ان کا رہے کا گھر چہیے، اس جگہ مجھ کو غالب کا ایک شعر یاد آ گیا ؎

بزم ترا نہ شمع و گل خستگی بو تراب
ساز ترا زیر و بم واقعہ کربلا

بابو درگاہی خاں انکسار و خاکساری کی تصویر تھے۔ ان کے ملازمین اکثر ان سے صاف ستھرے رہتے تھے۔ ایک دن ان کے ساتھ ایک اہل قلم ملازم تھے جن کو میں سمجھا کہ ان کے کوئی عزیز ہوں گے۔ میں نے دریافت کیا۔

بابو صاحب: ''ناہیں انچ نہ آئیں لالہ ہوئیں ہمرے یہاں کام کرت ہیں (دبی زبان سے) ریل پر سب کو وُ ہمیں کا دھکیاوت ہیں۔ ان کا راستہ دیت ہیں (صاف کپڑوں کی طرف اشارہ کرکے ریل پر سب لوگ ہم ہی کو دھکا دیتے ہیں اور ان کے لیے راستہ چھوڑ دیتے ہیں)

ایک مرتبہ تو انھوں نے غضب ہی کیا۔ میرے یہاں آئے معلوم ہوا کہ میں ایک دوست کے یہاں ہوں، وہ بھی وہاں پہنچے، دیکھتا کیا ہوں کہ بیچو بیچ پیٹھ پر کوئی چھ انچ مربع سرخ چھینٹ کا پیوند لگا ہوا ہے۔ واپسی میں مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا کہ دوسروں کی رائے سے بے پروائی کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ بابو صاحب نے اعتراض کا جواب اور معذرت سب دولفظوں میں کی۔ مسکراہٹ کے ساتھ آنکھ مار کر، مہرَ وَن کے لہنگا کا ہوئے (یہ پیوند عورتوں کے لہنگے کا لگایا ہے) ایک پہلو اُن کی شخصیت کا اور سن لیجیے۔ اگر موقع آن پڑے تو بابو درگاہی خاں دبنگ بھی تھے۔ پہلی جنگ میں ضلعے کے پارسی ڈپٹی کمشنر سے ملنے گئے۔ کسی بات پر مزاج برہم تھا۔ ڈپٹی کمشنر''بابو صاحب آپ نے جنگ میں کتنا چندہ دیا ہے۔''

بابو صاحب: ہم کچھونا ہیں دیا ہے ہم سنا کہ جرمن آوت ہیں اور چھین لے ہیں توُئے (تب ہی) ہم قرضہ بانٹ دیا۔

ڈپٹی کمشنر: یہ کیسی بات ہے۔ آپ نے اپنی سند پڑھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ سرکار تم کو یہ علاقہ عطا کرتی ہے۔ جب سرکار کو ضرورت ہو تو اس کی مدد کرو۔ آپ کو معلوم ہے کہ سرکار آپ کا علاقہ واپس لے سکتی ہے۔

بابو صاحب: ہاں صاحب ای ہم کا ناہیں مالم رَہے (یہ ہم کو نہیں معلوم تھا) اچھا کیو صاحب بتائیے دِیہو (اچھا کیا آپ نے بتا دیا) اب ہم اُو کے پاس نہ جاب (اب ہم اس

کے پاس نہ جائیں گے) ہاں صاحب پرائی چیج کے پاس جائی مارے جائی (ہاں صاحب دوسرے کی چیز کے پاس جائیں مارے جائیں)

ڈپٹی کمشنر: نہیں نہیں یہ مطلب نہیں۔ آپ کا علاقہ آپ کے پاس رہے گا۔ لیکن آپ کو سرکار کی مدد کرنا چاہیے۔

بابو صاحب: ناہیں صاحب الاکا ہمرا ہوئی ہے نہ گرے تو رہیے کیسے ہمرے پاس۔ اب صاحب تم جانو الاکا جانے۔ (نہیں صاحب جب علاقہ ہمارا ہیٔ نہیں تو رہے گا کیسے ہمارے پاس۔ اب آپ جانیے اور علاقہ جانے) مال گجاری وال گجاری اب ہم سے نہ مانگیو صاحب اپنا وصول کرلیو، ہم پرائی چیج کے پاس کیسے جان (مان گزاری وال گزاری اب آپ ہم سے نہ مانگیے گا۔ خود وصول کرلیجیے گا۔ ہم دوسرے کے مال کے پاس کیسے جائیں)۔

ڈپٹی کمشنر: نہیں نہیں۔

بابوصاحب: ناہیں ناہیں اب ہم سے کوؤ مطلب نہیں۔

ڈپٹی کمشنر نہایت پریشان کہ ذرا سی بات کے لیے کیا لوکل گورنمنٹ کو لکھا جائے اور کیا گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا جائے پشتینی تعلقہ دار علاقہ سے کیوں دست بردار ہو رہا ہے۔ کیا سختی کی گئی ہے جس کا یہ نتیجہ ہوا ہے۔ خیر اس وقت تو بابو ہی صاحب کی جیت رہی، مگر بعد کو قرضہ جنگ دینا ہی پڑا۔

اسی طرح ایک سینئر ڈپٹی کلکٹر سے میں نے ملایا اور کہا کہ آپ کے ضلعے میں یہ ڈپٹی کمشنر ہوکر آنے والے ہیں۔

بابو صاحب: ہاں کاہے ناہیں، بہت آئے بہت چلے گئے۔

یہ دونوں واقعات ہندستانیوں کے ساتھ ہوئے۔ نہ معلوم انگریز کے ساتھ بھی بابو صاحب یہی برتاؤ کرتے تھے یا نہیں۔ اس کا تجربہ نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ بابو صاحب ایک صاحب کے ہاں گئے۔ وہاں دوسرے کمرے میں ایک بہت بڑے شخص بیٹھے تھے اور چاہتے تھے کہ بابو صاحب کی دیہاتی باتوں سے لطف اٹھائیں۔ ان کے مصاحب نے

بابوصاحب کو وہاں بلانا چاہا۔ بابوصاحب نے کہا ''کا کری ہواں آئے کے ہم ڈونگیا اوئی جہاج تنی سے دھکا لاگے ڈوب جائی۔''

(کیا کریں ہم وہاں آکر ہم ذرا سی پن سوئی اور وہ جہاز۔ ذرا سے دھکا لگے گا تو ہم ڈوب جائیں گے)

ایک مرتبہ ایک دعوت کا رقعہ موصول ہوا جس میں بجائے بسم اللہ کے خمد لکھا تھا۔ رقعہ تین دن یا تین وقتوں کی مسلسل دعوت کا تھا مگر جو چیز مجھ کو پسند آئی وہ تتمہ تھا باضابطہ خط المکلف پر ختم تھا۔ اس کے بعد یگانگی کی حسب ذیل دو سطریں تھیں۔ مکرر آنکہ اگر آپ نہ آییئے گا تو مجھ کو شکایت نہ ہوگی۔ ہنسنے کو ہنس لیجیے، مگر اسی جملہ پر مجھ کو اپنے ایک دوست کا رقعہ یاد آگیا جو انھوں نے ایک ایسے ہی موقع پر لکھا تھا، ''بھائی محمد علی تم بہت دور پہاڑ پر ہو، میں جانتا ہوں کہ تم کو آنے میں بہت زحمتیں ہیں۔ یہ رقعہ صرف اس واسطے بھیجتا ہوں کہ تم یہ نہ سمجھو کہ ایسی خوشی کے موقع پر میں تم کو بھول گیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ملاقات کے وقت میں نے خمد کا مطلب پوچھا۔

بابو صاحب: ایک دن کہدائے کے نام کی دعوت ایک دن محمد کے نام کی اور ایک دن دنیا کے نام کی۔

ایک طرف تو یہ حال تھا، دوسری طرف پردے کو بالکل لغو جانتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنی قریب بہ جوانی لڑکی کو لڑکوں کی طرح دھوتی کرتہ اور ٹوپی پہناتے تھے۔ جب میں نے دیکھا تو بال بھی نہ تھے۔ البتہ ایک انگوچھا گردن پر ڈالے رہتی تھی۔ چونکہ وہ سینے تک نہیں پہنچتا تھا۔ اس لیے شرم کی وجہ سے اس کے سرے دونوں ہاتھوں سے اکثر پکڑ لیتی تھی۔ اب ماشاء اللہ بیاہی بال بچوں والی ہے۔ اس وقت بچہ ہی تھی مگر اس کی بارہ بور بتیس انچ کی بندوق الگ تھی۔ میں نے اسی وقت کہا تھا کہ اگر لڑکی کو ہسٹریا کی بیماری ہوجائے تو جو جرمانہ کہو میں دوں۔

(کشکول)

اُستاد

جیسے ''آیا تھا کسی ملک سے ایک ہنس بے چارہ'' اسی طرح کوئی پندرہ سولہ برس ہوئے ایک بڑے میاں ساٹھ پینسٹھ برس کا سن ہمارے قصبہ میں آئے، ان کے ساتھ ان کی اہلیہ انھیں کے سن و سال کی اور کچھ میلا میلا اسباب، قوم کے جلاہے تھے نہ معلوم کس طرح جان پہچان کی اور ایک اپنے ہم قوم کے یہاں ٹک گئے۔ پڑوس میں ایک بزرگ تہجد گزار رہتے تھے، ان کے مرید بھی ہوگئے اور دریاں بننے لگے، محلّہ کے بے کار لونڈوں کو اردگرد جمع کرلیا اور سب کو کچھ نہ کچھ کام سے لگا دیا۔ جب کاروبار اور بڑھا تو کپڑا بننے کا بھی ڈھچر ڈالا۔ لوگ استاد کے نام سے یاد کرنے لگے۔ اب استاد اپنے پیر کی خدمت کرتے ہیں اور محلّہ بھر کے نوجوان استاد کی خدمت کرتے ہیں اور ان کے طفیل میں چار پیسے کماتے ہیں۔ اگر کسی کو روپے، دو روپے کی ضرورت ہوئی تو استاد بلاتکلف جیب سے نکال کر دے دیتے ہیں۔ اگر سو دو سو روپے کی ضمانت کی ضرورت ہو تو بھی استاد منھ نہ موڑیں گے۔ پرونوٹ پر دستخط کرانا ہو تو استاد کے پاس چلے جائیے۔ کئی مرتبہ روپیہ ڈوب بھی گیا۔ یار لوگوں نے قرض لے کر پھر صورت بھی نہ دکھائی۔ مگر استاد نے اپنی وضع داری مرتے دم تک نہ چھوڑی۔ ان کی نیک کمائی میں نہ معلوم کہاں کا گولر کا پھول پڑ گیا تھا کہ باوجود گدھوں سے کھیت چروانے کے، کام چلا ہی جاتا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایک ازغیبی خرچ اور بڑھ گیا۔ یعنی ان کے پیر صاحب کا وصال ہوگیا، جہاں وہ عبادت کیا کرتے تھے وہیں دفن بھی ہوئے۔ استاد نے مقبرہ بنوادیا اور اسی جگہ بیٹھنے لگے۔ ان بزرگوار کو کسی بزرگ سے خاندانی تعلق تو تھا نہیں خود رَد تھے، یہ بھی نہیں معلوم کہ مرحوم کا خانوادہ کون تھا، لیکن محلّہ والوں نے اظہار شکر گزاری میں ہمارے استاد کو ان کا سجادہ نشین بنا ہی دیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت صاحب کا مقام عشق تھا، اس لیے ان کا جانشین نہ ہونا چاہیے۔ ان میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جنھوں نے استاد کا روپیہ مار لیا تھا۔ ضمانت

ضبط کروا دی تھی یا جن کے قرض کی علت میں استاد کے یہاں قرقی آ چکی تھی۔ جب استاد کو معلوم ہوا کہ ان کی سجادگی کے کچھ لوگ مخالف بھی ہیں تو انھوں نے معافی چاہی مگر ان کے طرف داروں نے کہا کہ اگر حضرت صاحب کا مقام عشق تھا تو آپ کا بھی تو مقام عشق ہے۔ بے چارے استاد اس کو بالکل نہ سمجھے کہ مقام عشق کیا ہوتا ہے اور ہچکچاتے ہی رہے لیکن ان کے طرف داروں نے نہ مانا اور ازراہ مزید احتیاط ان کی پیرانی کے ساتھ ان کے دو بول شرع کے بھی پڑھوا دیے۔ اب تو استاد کے بھی مقام عشق کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا۔ لہٰذا سجادگی قبول کر لی۔ سجادگی کے بعد دو تازہ آفتوں کا نزدل اجلال ہوا، ایک تو کام کاج کا وقت کم ملنے لگا کیونکہ عقیدت مندوں کا مجمع زیادہ رہنے لگا اور جو وقت بچتا تھا وہ صبح اور شام کی قوالی میں صرف ہو جاتا، دن بھر میں رومال دو رومال جو بُنے بھی وہ قوالوں کی نذر ہو جاتے تھے۔

دوسری آفت یہ تھی کہ شام کو جب آستانے پر محفل سماع ہوتی تھی تو مخالفین دور سے آوازے توازے کستے تھے اور مختلف جانوروں کی آوازیں نکال نکال کر رنگ بگاڑتے تھے۔

جس وقت استاد شروع شروع آئے تھے تو تمام اہالیان قصبہ اور پڑھے لکھے لوگوں کے یہاں آتے تھے مگر کچھ طبیعت کی مناسبت سے پرگت ہم ہی سے ملتی تھی۔ مرحوم مجھ کو بھائی شاب کہتے تھے اور میں بھائی صاحب شیخ جی استاد جو کچھ منھ میں آتا تھا کہہ گزرتا تھا، برا نہیں مانتے تھے مجھ کو اپنا بہی خواہ جانتے تھے اور اگر کوئی مشکل آن پڑتی تھی تو اپنی صاف دلی سے صرف مجھ سے مشورہ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس پر کاربند بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ جب اُوں اُوں پُوں پُوں ککڑوں کوں اور سی پُوں نے بہت زور باندھا تو میرے پاس دوڑے آئے اور پورا واقعہ بیان کیا۔ اپنے ہم وطنوں کے مزاج سے کون نہیں واقف ہوتا۔ اس لیے میں سمجھ گیا کہ چونکہ اس میں کوئی پڑھا لکھا آدمی یا خاندانی صوفی نہیں شریک ہے اس لیے یہ پریشانیاں ہیں۔ پس میں ان کو اسی وقت لیے ہوئے ایک خاندانی بزرگ کے پاس چلا گیا اور درخواست کی کہ ان کی دستار بندی کر دی جائے۔ چنانچہ چند عمائدین کی موجودگی میں یہ متبرک رسم ادا کی گئی اور ہمیشہ کے لیے فتنہ فرو ہو گیا۔ اس کارروائی کے پہلے میں نے شیخ جی سے وعدہ لے لیا تھا کہ بیعت نہ لینا اور مرحوم نے جیسا

وعدہ کیا تھا، ویسے ہی عمر بھر پیری مریدی سے بھاگتے رہے۔ یہ سب کچھ تو ہوگیا مگر روز مرّہ کا بڑھتا ہوا خرچ کہاں سے آوے۔ اگر اکیلے ہوں تو توکل پر کام چل جاوے۔ اپنا اور دو بڑھیوں کا پیٹ کرگہ چلاکر بھرلیں، مگر دس پانچ عقیدت مندوں کی روٹیاں چلانا تو نو سیکھیے متوکل سے بھی نہیں ہوسکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ آمدنی کیونکر بڑھائی جائے۔ بعد غور وفکر لکڑی کی سوداگری کی ٹھہری۔ اس سن و سال میں بلا کا محنتی بزرگ تھا اور دوسروں سے بھی کام لے لینے کا بادشاہ تھا۔ شروع میں دو ایک چکمے کھائے۔ مگر اس کے بعد لکڑی کا کاروبار ایسا چمکا کہ ٹھیکیوں پر ٹھیکیاں لگ گئیں۔ تعمیری لکڑی، ایندھن کی لکڑی، تھمڑے، سلیاں ہر چیز کا اَڑم لگا ہے۔ روپیہ برسنے لگا، ایک آرزو استاد کے دل میں وقتاً فوقتاً ابھرتی تھی جس کو میں روکتا رہتا تھا۔ اب اس کا موقع آ گیا۔ یعنی اہل قصبہ کی دعوتیں کرنا، کرتے پہلے بھی تھے لیکن اب تو چھوٹی گھوڑی بھوسیلے کھڑی، جب دیکھو دعوت بولے بیٹھے ہیں۔ مفت خوروں کی کمی کب رہی ہے۔ آج چائے کی دعوت ہے، توکل دھوبیا پلاؤ کی دیگ دم ہورہی ہے۔ شہدوں کے بادشاہ کو دھاوت کہتے ہیں۔ گالیاں دینا ہو، مارنا ہو، کھانا کھانا ہو یا مار کھانا ہو دھاوت سے امید کی جاتی ہے کہ ان خصوصیات میں بڑے سے بڑا شہدہ اس کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرے گا۔ اسی طرح ہمارے شیخ جی دو چیزوں کے دھاوت تھے، ایک اپنا کام کرنے کے، دوسرے اوروں کے کام آنے کے۔ صرف یہی نہیں کہ دوسروں کے پرونوٹ پر دستخط کردیتے تھے اگر کسی کا کام ہوتو شیخ جی کو دو چار کوس دوڑا بھی دو۔ محلے والوں پر کوئی مصیبت آئے ہمارے استاد سینہ سپر کیے کھڑے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ دوسرے کے الزام کا فیصلہ کرنے نہ بیٹھو مبادا کہ تمھارے الزام کا فیصلہ ہو۔ صاف بات ہے، ہمارے استاد کو یہ گرکسی نے پڑھایا نہ تھا مگر جس طرح درخت کی چھوٹی سی شاخ کو بھی جڑ سے غذا پہنچا کرتی ہے، اسی طرح ان کے دل کی شاخ بھی کسی بڑی جڑ سے آبیار تھی۔ اس وجہ سے کسی کے کام آتے وقت استاد کے یہاں مستحق غیر مستحق کی شرط نہ تھی، اتفاق کی بات محلے میں ایک عورت کے لڑکا ہو پڑا۔ شوہر اس کا برسوں سے باہر تھا۔ لاحول و لاقوۃ، لوگوں نے ایسا تعجب کیا گویا اَن ہونی بات ہوئی۔ ہمدرد عورتیں جو آڑے وقت میں کام آتی تھیں، ماں کی ہمدردی میں بچے کو کوسنے دینے لگیں۔

ایک عوت: ''موا آیا ہے منھ میں کالک لگانے کو، اور دیکھتی ہو کیسا ہٹا کٹا ہے، جیسے مہینہ بھر کا پالا جلایا ہو۔

دوسری عورت: جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب گھٹی بھی بناؤ گی یا کوسنے ہی دیتی رہو گی۔

پہلی عورت: گھٹی نہیں سنکھیا، ان کے لیے گھٹی آوے گی۔

پڑھنے والوں کو سن کر تعجب ہوگا۔ مگر واقعہ ہے انھیں عورتوں میں سے ایک نے ذرا سا پیڑا توڑ کر اس کے منھ میں رکھ دیا۔ بچے نے رونا بند کر دیا اور منھ چلبلانے لگا ''اوئی بہن یہ کون بلا پیدا ہوئی ہے۔ دیکھا تم نے۔'' یہ تعجب خیز خبر گھڑی بھر میں پھیل گئی کہ کھاتا پیتا لڑکا پیدا ہوا ہے لیجیے صاحب جو بات چھپائی جاتی تھی، وہ ہر شخص کے کان میں پڑ گئی۔ حلالی لڑکے ہوتے ہی رہتے ہیں مگر حرامی لڑکے کی شہرت کا بہانہ ہاتھ آیا۔ ذکر عیش نصف عیش اپنا جنسی معاملہ نہ سہی دوسرے کا سہی۔ مگر ہے تو مزے کی بات، جس کو دیکھو پیڑے برفی کا دونا ہاتھ میں لیے چلا آتا ہے۔ رفتہ رفتہ پولیس کو خبر ہوئی، باپ کا نام پوچھا گیا، ماں نے اندھیرے کی آڑ پکڑی۔ اب کیا کیا جائے۔ کسی لونڈے نے لپک کر استاد کو خبر سنائی کہ تھانہ سے دوڑ آگئی۔ استاد مع چند شاگردوں کے پہنچ گئے، تمام مجمع کو ڈھارس ہوگئی۔ باپ کا پتہ نہیں، لڑکا گپ چپ کا لڈو کانسٹبل اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ باپ کا نام معلوم ہونا چاہیے اتنے میں مجمع سے آواز آئی، ارے استاد ہی کا نام لکھ لو۔ بڑا قہقہہ پڑا مگر یہاں ہمارے شیخ کو کھلّی بازی سے کیا واسطہ۔ یہ ویسے ہی سنجیدہ رہے بعض شاگردوں نے ایسے ذلیل خیال پر ناک بھوں چڑھائی ہی تھی کہ کسی نے کہا۔ ارے استاد تو محلے بھر کے ماں باپ ہیں۔ اس لڑکے پر کیا، خبر گیری تو یہی کریں گے۔

کانسٹبل (ہنس کر): ''کیوں شیخ جی کیا کہتے ہیں، آپ۔

شیخ جی: جو چار بھلے مانسوں کی رائے ہو مجھ کو منظور ہے۔

کانسٹبل: ''تو لکھ دیا جائے آپ کا نام''

شیخ جی: لکھ لیجیے۔

دن یونہی گزرتے گئے شیخ جی کا کام چلتا رہا۔ پھر اُن کا گھر بیماریوں نے دیکھ لیا،

تھوڑے ہی دنوں میں دونوں بڈھیاں یکے بعد دیگرے چل بسیں۔ شیخ جی اسی طرح راضی برضا رہے۔ اس کے بعد لوگوں نے صلاح دی کہ گھر میں کوئی چراغ جلانے والا ہونا چاہیے۔ شیخ جی بولے ''بھائی آپ لوگوں کی جیسی صلاح ہو، چنانچہ ایک عقد اور پڑھوا دیا گیا، اس وقت تک شیخ جی پر بہت مصیبتیں پڑیں، مگر اس بندۂ خدا نے کبھی اف نہ کی۔ البتہ ان نئی مسماۃ نے ہوش بگاڑ دیے، کہنے لگے، بھائی ہماری نئی بیگم شاب نے ناکوں چنے چبوا دیے ہیں۔ جہاں میں نے گھر میں قدم رکھا، بس کہنے لگیں کہ کسی عورت سے اشارہ بازی کرتے رہے ہوگے۔ بھلا بھائی شاب اب ہمارا یہ سن ہے۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد انتقال کر گئے۔ موت کا آنا برحق ہے۔ نئی بی بی بہانہ ہوگئی۔

(کشکول)

○

''...... ہمارے بچپن میں ایک مسیح نانا تھے...... یہ جب مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو ایک ڈولی پر چڑھ کر رودولی میں نکلے اور جس جس بنیے اور مہاجن سے ان سے بیوپار رہا تھا سب کے یہاں گئے اور معاملہ چکایا۔ ہر شخص سے معاملہ چکایا، ہر شخص سے کہا سنا معاف کروایا اور مرگئے۔ آج کل ایک مثل کبھی کبھی سنائی دے جاتی ہے مگر شاذ و نادر۔ ''ارے میاں مسلمان ہو کر جھوٹ بولتے ہو۔'' جب ہم زندہ تھے اس وقت ہم میں بھی یہ صفات تھے......''

(ہما بیگم کے نام خط)

غریبی میں امیری

نواب راحت حسین صاحب مرحوم کو میں بھائی کہتا تھا۔ اگر آپ سے مرحوم سے ملاقات ہوئی ہوتی تو آپ بھی بھائی کہنے لگتے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ ان میں کوئی عیب ہی نہ تھا۔ یا ہر شخص ان سے محبت ہی کرنے لگتا تھا، جی نہیں ایسا آدمی کہاں پیدا ہے جس کے دشمن ہی نہ ہوں۔ اللہ میاں کے آسمان میں نہ معلوم کتنے ستارے نیک و بد ہیں لیکن ابھی تک وہ ستارہ وہاں بھی نہیں چمکا جس کے سایہ میں پیدا ہوکر آدمی دشمنوں کو ترسے، پھر بھی نواب صاحب کے خلاف کم لوگ تھے۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ وجیہ آدمی تھے۔ ان کو دیکھ کر نگاہ سفارشیں کرتی تھی۔ ہنس مکھ تھے، اس لیے کمینہ جذبات کم ابھرتے تھے، بہت امیری سے اتنی بڑی غریبی میں پڑ گئے تھے کہ حسد ان کے مقابلے میں بے دست و پا ہوگیا تھا۔ یکے بعد دیگرے ان کی سب اولادیں جوان ہوہوکر ان کی آنکھوں کے آگے خاک میں مل گئی تھیں۔ اس لیے ان کا ذکر کر کے لوگوں کو اپنی نرم دلی ظاہر کرنے کا موقع ملتا تھا۔ شیریں کلام تھے، خوش مذاق تھے، ان کی بڑی مبالغہ آمیز تقریریں سن کر دل کہتا تھا کہ ایسی باتوں کے لیے جھوٹ کا بھونڈا لفظ استعمال کرنا ظلم ہے۔ یہ ایک حد تک ٹھیک بھی تھا، کیونکہ ان کی واقعہ بافی کا سرچشمہ ہی دوسرا تھا۔ یہ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے سوچتے تھے کہ اگر ایسا ہوجاتا تو بہت اچھا ہوتا۔ رفتہ رفتہ یقین کر لیتے تھے کہ ایسا ہی ہوگیا۔ پھر اس کو بیان ایسے انداز سے کرتے تھے کہ غلط جان کر بھی آدمی سننے کا مشتاق رہتا تھا کیونکہ کسی کی برائی نہیں چاہتے تھے۔ ہم لوگوں کے ایک جاننے والے تھے جو صوبہ کی سروس سے بڑھ کر سیلیکٹڈ جگہوں پر مستقل ہوگئے تھے اور بجائے ضلع کا چارج لینے کے ادھر ادھر کے کام مثلاً صنعت وحرفت یا کوآپریٹیو زیادہ پسند کرتے تھے۔ بھائی راحت حسین کے دل میں آتا تھا کہ اگر ضلع کا چارج مل جاتا تو دوستوں کو اور اچھا معلوم ہوتا۔ ایک دن مجھ کو دیکھتے ہی کہنے لگے ''محمد علی سنا تم نے ہمارے ڈپٹی کمشنر اناؤ ہوگئے۔'' میرا بھی دل خوش ہوا۔ میں

نے پوچھا کس سے سنا، ادھر ادھر دیکھنے لگے، جیسے کسی کو ڈھونڈ ھتے ہیں۔ بولے یہ منشی جی کہتے تھے۔ اب بھی میں نہ سمجھا اور منشی جی کا نام پوچھنے لگا۔ کہنے لگے، نام تو نہیں معلوم اب میری سمجھ میں آیا کہ تعیناتی صرف نواب صاحب کی من گھڑت گزٹ میں چھپی ہوگی۔ میں نے نواب صاحب کے بہت سے صفات بیان کیے۔ مگر سب سے بڑی صفت آخر کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ نواب صاحب بڑے سخی تھے۔ غریبی اور سخاوت کبیرداس کی الٹواسی ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ دولت ثروت علاقہ نکل گئے۔ برسوں ہو چکے ہیں، مفلسی کے گھٹنے مضبوط ہو چکے ہیں مگر نہ چہرے پر شکن نہ ہمت میں کمی۔ ایک دن ایک صاحب نے بیان کیا کہ ہمارے کھانے کا سامان کہیں نہیں ہے۔ نواب صاحب نے کہا کہ آپ کھانا ہمارے یہاں آکر کھا لیا کیجیے۔ پتا لگا کہ جس دن نواب صاحب یہ دریا دلی فرما رہے تھے، اس دن نو بجے صبح تک گھر میں ہانڈی نہیں چڑھی تھی۔ اسی دن شام کو ہم اور ایک اور مہربان نواب صاحب کے وہاں پہنچے، محلے کی دو تین عورتوں کو دیکھا کہ اپنے گھروں سے مٹی کی رکابیاں لے کر آئی ہیں اور پلاؤ بھر بھر کے لے جا رہی ہیں۔ پلاؤ بالکل معمولی تھا جو شخص دو چار کو کھلائے بغیر کھا نہ سکے وہ اچھا پلاؤ کیسے کھا سکتا ہے۔

نواب صاحب کی والدہ مرحومہ اور ان کی بہنیں مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں، کیونکہ بچپن سے مجھ کو دیکھا تھا مگر بیگم صاحب اور جوان لڑکیاں مجھ سے پردہ کرتی تھیں۔ ان کی ایک لڑکی تھی اس کی آواز پڑ گئی اس لیے میں اس کو سامنے لے آیا کہ جس میں حلق وغیرہ اچھی طرح دیکھ سکوں اس واقعہ کو برسوں ہوگئے۔ مگر میرا افسوس آج تک باقی ہے کہ میں نے اس کو کیوں دیکھا تھا وہی نواب صاحب کی آنکھیں، وہی نواب صاحب کا شاندار چہرہ، وہی شرافت کی جھلک، چار دن میں خاک کا پیوند ہوگئی۔ حلق کا دق تھا جو اپنا کام کر گیا، رفتہ رفتہ بیگم صاحب بھی میرے سامنے ہونے لگیں اور ان آنکھوں نے دیکھا کہ ان کے گھر کے اندر امیری غریبی دونوں بہنیں کاندھے سے کاندھا جوڑے نہایت بے تکلفی سے بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک طرف بیگم صاحب خود کھانا پکا رہی ہیں، دوسری طرف روز کے آنے والے چند مہمان پہنچ گئے۔ کھرچن تک پونچھ کر کھا گئے۔ لیجیے صاحب گھر والوں کے لیے پھر سے ہانڈی چڑھی، بے حیا کھانے والے اور حمیت دار کھلانے والے، دونوں ہنس رہے

ہیں، کہیں فکر کا نشان نہیں ملتا۔

کرام ویل انگلستان کے پیش از وقت ڈکٹیٹر اور بادشاہ خوار کے پاس ایک مصور آیا کہ مجھ کو تصویر کھینچنے کی اجازت دی جائے۔ کرام ویل تیار ہوگئے اور کہنے لگے کہ میرے چہرہ پر بہت سے مستے ہیں اگر ایک بھی چھوٹا تو تم جانو گے۔ اگر غور کیجیے تو بات بڑی پکی کہی تھی۔ بھاٹوں کی طرح صرف اچھائیاں ہی اچھائیاں دکھانے سے نہ کسی شخص کا کیریکٹر ہی پیش کرسکتے ہیں نہ مستے چھوڑ جانے سے وہ چہرہ ہی سامنے آتا ہے جس سے آدمی کی افتادِ طبع معلوم ہوسکے۔ نواب صاحب کا حال بیان کرنے میں مجھ کو بھی اسی طرح کی دو دقتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں اپنی محبت کی وجہ سے شاید صحیح رائے نہ قائم کرسکتا ہوں۔ دوسرے جب تک ان کے بچپن اور ان کے خاندان کا حال نہ بیان ہو ان کی تصویر مکمل نہیں ہوسکتی۔ ہمارے قصبے کے رہنے والے نسل کی اصالت پر جان دینے والے شیخ انصاری، کسی پشت میں ان کے یہاں کسی نے لکھنؤ میں شادی کرلی تھی، تب سے یہ لوگ نام ہی کے نہیں بلکہ سچ مچ کے نواب ہوگئے اور گھر لٹا دیا۔ پچاس برس سے اوپر ہوئے ہوں گے کہ نواب راحت حسین لکھنؤ میں انگریزی پڑھنے بھیجے گئے نہ معلوم کیا پڑھا کیا پڑھا مگر گھر میں نوکروں کو انعام بٹ گیا اور احباب کی دعوتیں ہوگئیں کہ منجھلے میاں نے کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا ہے۔ اسی زمانہ میں ایک گونگا لڑکا نہ معلوم کہاں سے آگیا۔ راحت حسین بھائی کی والدہ نے اس کی پرورش اپنے ذمے لے لی۔ قسمت کا لکھا اس کو دِق ہوگئی۔ بڑی بیگم صاحب نے اس کی تیمارداری خود کی۔ لوگوں نے سمجھایا کہ اس مرض میں بڑی احتیاط چاہیے، مگر انھوں نے کہا کہ جیسے میرے تین بیٹے ویسے ہی چوتھا یہ۔ قصہ مختصر اس کا جنازہ اسی گھر سے نکلا۔ اس زمانہ میں دیہات میں اصول حفظانِ صحت اور چھوت نامعلوم چیزیں تھیں جن کا ذکر خواب میں بھی کسی نے نہ سنا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دق ایسی گھر میں گھس کر بیٹھی جیسے ہندستان میں اغیار۔ نواب صاحب اور نواب صاحب کے بچے، ان کی بہنیں اور ان کے بچے خدا جھوٹ نہ بلوائے اسی گھر میں پندرہ بیس جنازے تو میری آنکھوں کے سامنے سے نکل چکے ہیں اور سب اسی کم بخت مرض کے مارے ہوئے۔ نوابی کا اثر یہ بھی تھا کہ ان بیماریوں میں آخر وقت تک یہی ذکر ہوتا رہتا تھا کہ اب مریض

اچھا ہوگیا۔ اللہ بخشے نہایت اطمینان سے یہی کہا کرتے تھے کہ پرسوں تک مرض کی تشخیص ہی غلط ہوئی تھی، کل سے مرض کا پتہ چل گیا ہے۔ اب مریض بالکل اچھا ہے۔ لوگ نہ معلوم کیا کیا شکوک دل میں لاتے تھے، نہ معلوم کون کون بدفال زبان سے نکالتے تھے اور تھا صرف نزلہ ایک ہی خوراک میں صحت ہوگئی۔ اب ماشاء اللہ جیسے بیمار ہی نہ تھے۔ آج صبح کو یہ کہا اور کل ہی جنازہ نکلا۔ صبر اور استقلال اس درجہ کا تھا کہ جوان جوان بیٹے، بیٹیاں، بھانجے بھانجیاں، بہنوں کو اپنے ہاتھوں سپرد خاک کر آئے، مگر اظہارِ غم نہ کیا۔ دل پر جو گزرتی رہی ہو اس کو وہ جانتے تھے اور ان کا بنانے والا۔

ہمارے بھائی راحت حسین بذلہ سنج اور شیریں گفتار تو تھے ہی نثار بھی اچھے تھے۔ جوانی میں اخبار میں مضامین وغیرہ لکھتے تھے۔ آخر میں ایک سوانح عمری لکھ رہے تھے۔ کس کی سوانح عمری جی اس حقیر کی۔ انداز سے مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ میری بابت کچھ لکھا جارہا ہے۔ مگر مجھ کو دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا، ایک دن تنہائی میں ملاقات ہوگئی۔ چند اوراق میں نے دیکھے۔ میرے حواس باختہ ہوگئے۔ حضرت یوسف کی خوبصورتی اکبرِاعظم کا حوصلہ، نعمت خاں عالی کی بذلہ سنجی، حاتم کی سخاوت، رستم کی طاقت، سب ہی کچھ تو مجھ میں تھیں، میں گھبرا گیا۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا، نہ معلوم کتنی منت سماجت، کتنی لجاجت کی قسمیں دلائیں، تب وہ مانے نہیں تو میری رسوائی کا سامان مکمل ہوگیا تھا۔ اسی کتاب کا ایک جملہ سن لیجیے اور اس کے بعد بھول جانے کی کوشش کیجیے:

''ریل پر کوئی صاحب بھائی راحت حسین کو ملے۔ عندالذکر انھوں نے پوچھا کہ ردولی میں قابلِ زیارت کوئی چیز ہے۔ بھائی صاحب مرحوم فرمانے لگے دو چیزیں ہیں۔ ایک حضرت مخدوم احمد عبدالحق قدسرہ کا مزار اور دوسرے چودھری محمد علی۔ ایک مرتبہ بھائی صاحب مرحوم نے نوکری بھی کی تھی۔ قصہ ذرا طولانی ہے۔ نہ معلوم کس کے کہنے سے ڈپٹی کمشنر سے ملنے چلے گئے۔ ڈپٹی کمشنر نے جائداد ضائع ہونے کا حال سنا اور صرف افسوس ہی نہیں کیا بلکہ ہمدرد بھی ہوگئے۔ چنانچہ نوکری کی بسم اللہ اور تمت یوں ہوئی کہ تین مہینوں کے لیے کورٹ کی ضلع داری مل گئی۔ چھوٹی نوکری، قلیل تنخواہ، محلے بھر کے لوگ خدمت گار، باورچی کے نام سے حاضر، بدقسمتی سے سال تمام بھی انھیں کو بنانا تھا۔ تین سو روپے کی کمی

تحویل میں پڑی، کنجی خود اپنے پاس رکھتے تھے۔ پھر روپیہ آخر گیا کہاں۔ کوئی خرچ بھی یاد نہ پڑتا تھا۔ راتوں کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ مگر گم شدہ روپے کی بدہ کسی طرح نہیں ملتی، رشوت تو لیتے نہ تھے۔ اب روپیہ کہاں سے آوے۔

نہ معلوم کہاں سے انتظام کر کے روپیہ داخل کیا گیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اللہ کا شکر بھیجا کہ مال گیا مگر آبرو بچی۔

اتنے میں مستقل ضلع دار واپس آگئے۔ سال تمام داخل کرنے لے گئے۔ وہاں بڑی الجھنیں رہیں۔ آخرکار پتہ چلا کہ مبلغ تین سو روپے ضلع دار کا ہے جو غلطی سے تحویل میں زیادہ داخل ہوگیا ہے۔

(کشکول)

''چودھری محمد علی کی کتاب کو پڑھنے کے لیے یا ان کی عظیم اور دل آویز شخصیت کے تذکرے سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس ثقافتی ورثے اور اس پس منظر سے محبت لازمی ہے ورنہ ان کی اور میری کھینچی ہوئی یہ تصویریں آپ کے نزدیک بالکل بے معنی ہوں گی۔''

(قرۃ العین حیدر، سوغات 9 بنگلور)